

مگر گزشتہ

RIDRBOOKSFREE.PK

یہ ایک عورت کی کہانی ہے، جس کی زندگی بھر کی سب سے بڑی بات
اس کی زندگی میں پہلی بار اس کی زندگی میں پہلی بار اس کی زندگی میں
اس کی زندگی میں پہلی بار اس کی زندگی میں پہلی بار اس کی زندگی میں

سرگزشت

15

سویشی لکھاری

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

زندگی نامہ

51

استنبول کا شوق

ابن کبیر

نوبل پرائز حاصل کرنے والے
ایک مسلمان مصنف کی کتھا

جنگ عظیم

123

خطرناک مہم

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انسان اگر ٹھان لے تو ناممکن
مہم بھی آسان ہو جاتی ہے

روداد زندگی

167

مقد کی بات

تنویر ریاض

بالی ووڈ کے ایک لہجہ شاعر و
کہانی کار کی سرگزشت

گفت و شنید

16

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

واقعات عالم

71

جنون آزادی

سلیم فاروقی

آزادی حاصل کرنے کی چاہ
میں وہ زندگی کو داؤ پر لگا رہا تھا

تاریخی جھوٹ

135

راگ کی آگ

یعقوب جمیل

تان سکن سے بڑی ایک مفرودہ
روایت، دلچسپ پیرائے میں

معلومات

175

سینٹ لوچی

محمد امجد

ایک پراسرار مذہب کا تذکرہ
جو تیزی سے پھیل رہا ہے

شخصیات

24

پیش گو

ڈاکٹر ساجد امجد

ایک صاحب کمال نئی کا زندگی
نامہ آپ پیش گوئی کے ہاتھ

بقیہ واقعات

88

باری اڈول

محمد اختر

اس کے حسن فصول سازنے
نوجوان نسل کو پاگل بنا دیا تھا

فلم و صحافت

147

فلمی الفیلہ

علی سفیان آفاقی

فلم صحافت اور ادب کی ان کہی
کہانیاں فلم نگری کی باتیں یادیں

ایمان افروز

179

شہید مکتے نہیں

زین مہدی

ڈیڑھ سو سال بعد بھی ان
کی لاشیں تروتازہ ہیں

معاشرت

184

سراب

کاشف زبیر

بلند صلوں اور بے مثل ولولوں
سے گزشتہ تہلکہ خیز داستان

پہلی سچ بیانی

226

انتقام

طلعت

مغیر کا پار ٹکراتے وقت یہ نہیں
سوچا تھا کہ نتیجہ اتنا ہیما یک نکلے گا

چوتھی سچ بیانی

257

اپیل

محمد سلیم اختر

ایک کے دو گے کیے تک ہم
سب ایک نادیہ زور میں بندھے ہیں

ساتویں سچ بیانی

269

بگناہ گنہگار

شہزاد حسین زاہد

ایک قابل قدر جج کی
زندگی کا اچھوتا واقعہ

شعر و ادب

221

بیت بازی

قارئین

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

دوسری سچ بیانی

238

دھول بھڑانا

انور علی

اس نے جو کھڑا کھو دیا تھا اس
میں اس کی زندگی گر پڑی

پانچویں سچ بیانی

260

بلف

محمد طفیل

چور پر کبھی کبھی مور پڑ جاتے
ہیں، ایک ایسا ہی واقعہ

آٹھویں سچ بیانی

273

گہرا کنواں

بانو

وہ شوہر پرست تھی مگر
شوہر کی قاتلہ بن گئی

مطالعہ

224

علمی زہاں

ادارہ

ذہن قارئین کے ذوق و جستجو کی
تکسین کے لیے نفاذ و انہی سلسلہ

تیسری سچ بیانی

252

دوسری شادی

نوبہ احسن

ایک بدقماش شخص کی
عیاری و مکاری کا تذکرہ

چھٹی سچ بیانی

265

کبل

انصار حسین

وہ لڑکی پسند کر کے مصیبت
میں پھنس گیا ہے

نویں سچ بیانی

285

ٹوٹے رشتے

کوثر

اس نے شوہر کو قتل کر کے بچوں
کی زندگی میں خوشیاں بھر دیں

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نسل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح کے ذمہ دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سودیشی لکھنوی

سرگزشت

بندر این شہر کے ایک کوتوال تھے۔ نام ان کا منشی صدیق احمد تھا۔ اولاد کے لیے ترستے تھے۔ بڑی مہنگی مراواں کہ ہندو گھم کے پاؤں بھاری ہوئے۔ اس وقت تک شادی کو پورے بارہ برس ہو چکے تھے۔ اتنے دنوں کے بعد خوشی کی لہر پڑی؟ خوشی منہا لے نہیں سنبھلی تھی۔ جب ولادت کا وقت قریب آیا تو چراغاں کروادیا۔ پیدا ہوئی تو لڑکی۔ خاندان والوں نے ناک بھوں پر حاکم کر صدیق احمد خوش تھے کہ گود تو بھری ہوئی۔ وقت گزر رہا تھا۔ پھر پورے چار سال بعد 2 فروری 1904ء کی تاریخ آگئی۔ اس روز کہ والوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ننوں نے کرب دکھانے کی محفل سجائی، بھانڈوں نے ڈھول سنبھال لیے، سپاہیوں نے گولے والے صدیق احمد نے پورے شہر میں منٹھائی تقسیم کرنے کا اعلان کرادیا۔ خوب خوب خوشیاں منائی جانے لگیں۔ بچے کا تاریلی نام جید والے دن تنخیر احمد رکھا گیا مگر اصل نام محمد عمر تجویز ہوا۔ بچہ پیدائشی طور پر کمزور تھا اس لیے ہمہ روز ایک نہ ایک بیماری کھیرے رہتی دروازے پر ویڈو حکیم کا ڈر الگا رہتا۔ بیماریوں کی یلغار کو تندر نظر رکھتے ہوئے طبیعوں نے سخت پرہیز کا مشورہ دیا۔ ابھی عمر صرف سات سال تھی کہ زبردستی کی فاقہ کشی نے پہلا شعر کہلوا دیا۔

پانی میں کس سے کہوں
اللہ میں اسے کیا کروں

مدینہ احمد تھے تو مظفر نگر ضلع کے تھانہ بھونٹائی علاقے کے مگر نوکری کی خاطر مگر نگر گھومتے رہے تھے۔ بندرا سے بھوپال آ گئے۔ یہاں رہتے ہوئے نیچے کی تعلیم کا خیال آیا اور فوراً ماسٹر کی تلاش شروع ہو گئی۔ ماسٹر صاحب آئے، انہوں نے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی کتاب کو رٹوانا شروع کر دیا۔ اتفاقاً ایک دن صدیق احمد نے آموختہ سن لیا۔ غلط تلفظ پر چراغ پا ہو گئے اور ماسٹر صاحب کی چھٹی ہو گئی۔ ایک دوسرے ماسٹر کو ڈھونڈا گیا۔ وہ ذرا مزاج کے سخت تھے اور بچوں کی پٹائی میں بہت آگے تھے۔ ان کی بھی چھٹی کر دی گئی، اب ایک تیسرے ماسٹر کو بلا دیا گیا۔ نام ان کا میرا امجد علی، چھوٹا سا قد، ناک کی پھٹکی پر رو پہلی عینک منہ میں دو چار دانت باقی پان۔ جیب میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیریں لٹکا قطب نما تھا۔ ان کے پڑھانے کا انداز کچھ یوں تھا۔ آراءے ٹی، ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا۔ اتنا کہا اور غنودگی میں چلے گئے۔ اذکھنے، پڑھانے کا یہ سلسلہ بھی زیادہ طویل ثابت نہ ہوا اور ان کی بھی چھٹی کر دی گئی۔ پھر الیگزینڈر ہائی اسکول کے جماعت اطفال میں داخلہ دلا دیا گیا۔ سیاہ شیروانی اور ٹیلے صافے میں ایک سیاہی کے ساتھ اسکول جاتا پھر ایک دوسرا سیاہی سفید کیریز میں کھانا لے آتا۔ 1914ء میں صدیق احمد بھوپال کی نوکری چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر محمد عمر کو دسہ فرقانیہ میں بٹھا دیا گیا مگر یہاں آ کر دینی تعلیم میں دلچسپی کم اور غیر نصابی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ لینے لگے۔ ماسٹر پیارے لال نے انگریزی اور حساب کی تعلیم دی پھر مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے فارسی میں طاق کر دیا۔ پھر لال اسکول میں خالد بن کے سہارے چوتھی جماعت میں داخلہ دلوا دیا گیا اور وہاں سے گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد آ گئے۔ گھر پر ٹیوشن کے لیے جو پور کے بخشش احمد رکھے گئے۔ ان کی کوشش سے محمد عمر نے تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اسی دوران بھائی جان ارشد تھانوی لکھنؤ تشریف لائے تو ماسٹر بخشش احمد نے ذکر کر دیا کہ ہمارا شاگرد شاعری بھی کر سکتا ہے۔ انہوں نے مصرع طرح دے دیا۔ ”سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا“ اور کہا کہ اس پر گرہ لگاؤ۔ عمر احمد نے شعر کہہ دیا۔ ”سب چاند ستارے ماند ہوئے، خورشید کا نور ظہور ہوا۔ غم ناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا“ بھائی جان نے خوشی سے لگے لگالیا۔ پھر تو شاعری کا چسکا لگ گیا اور ماہنامہ ”ترجمی نظر“ میں غزلیں بھیجنے لگے۔ افسانے بھی لکھنے لگے۔ 1924ء میں حکیم مولوی محمد سجاد حسین کی پھیلی صاحب زادنی سے نکاح اس شرط پر ہوا کہ اتر کے بعد رخصتی ہوگی۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کالج میں داخلہ دلوا دیا گیا۔ ترجمی نظر امین سلووی کی ادارت میں آ کر ”نظر“ بن چکا تھا اس کے ہر شمارے میں ایک نہ ایک تحریر ضرور ہوتی۔ اسی میں بیٹے چاول کے نام سے ایک مزاحیہ تحریر لکھ بھیجی جو بہت پسند کی گئی اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ”ہمد“ کی ادارت میں شامل ہوئے تو دو دو باتیں کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ ہمد بند ہوا تو ادھ اخبار میں چلے گئے۔ 1931ء میں لکھنؤ سے ”سرخ“ خود نکالا، ان کے ساتھ امین سلووی اور نسیم انہووی بھی شامل تھے۔ پھر روزنامہ ہند میں آ گئے جہاں تنخواہ بھی زیادہ تھی۔ پھر روزنامہ حق میں چلے گئے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو میں آ گئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی تشریف لے آئے۔ اس مشہور زمانہ قلم کار محمد عمر جسے سودیشی ریل نے دنیا بھر میں مشہور کر دیا کو ہم شوکت تھانوی کے نام سے جانتے ہیں جنہوں نے مئی 1963ء کو اس جہانی فانی سے کوچ کیا۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

لوڈ شیڈنگ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمیں تباہی کی جانب لے جا رہا ہے۔ صنعتیں بند ہونے لگی ہیں۔ اندھیرے اور گرمی سے پریشان لوگ سڑکوں پر آنے لگے ہیں۔ مظاہرے، پرتشدد دھڑلے، احتجاج کرنے لگے ہیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور بے روزگار جرم کی جانب بڑھنے لگے ہیں۔ گویا ملک کو ایک خاص جانب دھکیلنے کی سازش ہے۔ اس پرمیڈیا کا کردار، ایک ٹی وی چینل نے تو قیام پاکستان کے مخالف مولانا ابوالکلام آزاد کی تقاریر اور ان کی کتابوں سے اقتباسات بھی نشر کرنا شروع کر دیے ہیں جس میں مولانا نے قیام پاکستان کی مخالفت کھل کر کی تھی۔ گویا نئے اذہان میں پُرانا زہر منتقل کرنے کی کوشش ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب عوام کو ناگوار مسائل سے دوچار ہیں، مسائل بھی ایسے کہ انسان مایوسی کی انتہا مہر ایوں میں گر جائے۔ زندگی سے مایوس کرنے کے لیے مسائل کا انبار تو ہے ہی ساتھ میں دہشت گردی بھی عروج پر ہے جو مزید مایوسی پھیلا رہی ہے۔ شہر کو سیکڑوں لے لیں۔ وہاں اس قبیلے کو مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے جو افواج پاکستان میں شمولیت کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جنرل موسیٰ خان سے محمد علی حیدری شہید تک بہت بڑی تعداد میں نامور افسران اسی قبیلے کے تھے۔ گویا اس قبیلے کو برگشتہ کر کے افواج کو زک پہنچانا مقصود ہے اسی طرح صدیوں سے امن کی سرزمین گلگت، بلتستان کے امن کو تہ و بالا کر کے وہاں والوں کی سوچ کو منہ پیٹنے پر موڑنے کی سازش ہو رہی ہے جبکہ ہر ایک اس مسئلے سے آگاہ ہے کہ وہ علاقہ دفاعی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے اور صرف ایک سڑک کے ذریعے ملک کے دیگر شہروں سے جڑا ہوا ہے جبکہ سرحد کی دوسری جانب کارگل و لد اکھ کا علاقہ ہے جو انتہائی حساس ہے اور ہمارا دیرینہ دشمن بڑی آسانی سے وہاں شورش کو ہوا دے سکتا ہے۔ یہ تمام مسائل دیکھنے میں الگ نظر آتے ہیں مگر یہ غور دیکھیں تو تانے بانے ایک جیسے ہیں کہ پاکستان کو مسائل میں الجھا کر عوام میں مایوسی پیدا کی جائے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر فی الفور قابو پایا جائے۔ امن و آشتی، اخوت و محبت کو بڑھا دیا جائے۔ اس کے لیے خود عوام کو آگے آنا ہوگا۔ عوام کو مضبوط کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اپنا کردار نبھانا ہوگا تاکہ جرائم پیشہ کمزور سے کمزور ہوتے جائیں۔ قانون شکنی کا کسی کے پاس حوصلہ نہ رہے۔ ایک کنڈاکا نے والا بھی گھنٹوں سوچے کہ اس کی سزا ملے گی ورنہ مٹی سوچے پروان چڑھتی ہی رہے گی بقول جاذب قریشی

اے میرے چہرے گر بجا مجھ کو
اے پتھروں کا ہے سامنا مجھ کو

معراج رسول



✉ راجا ثاقب نواز ثاقب، رتی ٹی، ساہیوال سے "اپریل کا سرگزشت ارتھ لے کے آس پاس ملا۔ بھری دنیا میں کوئی نہیں جو پاکستانی قوم کو ہر روز یہ دن پورے جوش و خروش سے منانے پر مبارکباد پیش کرے۔ نیشنل پر کسی ہوم کی منگنی کی انگوٹھی بھول چوک سے رہ گئی ہے۔ نشانی تھلا کر لے جائیں۔ سرزمین بنگال کے غالب، رناتل وحشت کلکتہ کی ملاقات کی۔ محفل و سنگ میں رانا محمد سجاد ہمارے جمہوری صدر بن گئے۔ ناصر حسین رند سرگزشت اور سسٹن میں میری آمد، میرا کارنامہ نہیں بلکہ ان کا اعلیٰ معیار ہے جو دھڑلے سے مجبور کرتا ہے کہ ان کے بارے میں لکھا جائے (آپ کی محبت کا شکر یہ) ایم اے خالد بھٹی، آپ کا مشورہ۔ کھالو، پی لو، خوب سوچ اڑالو۔ یار میں سیاست دان تو نہیں ہوں۔

احمد خان قحیدی، علی مغل اور مظفر گڑھ سے ہماری دیرینہ ساتھی جو ریہ قاضی نے متاثر کیا۔ معراج الدین، ویکم جی، ویکم۔ اور لیجے صاحب، ہمارے خط کو "او ایس ڈی" کر دیا گیا (ہماری معذرت قبول فرمائیں) بارلی ڈول میں تو محمد اختر نے جیسے جیسے لوہیوٹ کے پورے حالات زندگی کو نکال دیا۔ اختتامی حصے کا ابھی سے انتظار ہے۔ سفید سرزمین معلومات کا خزانہ تھی۔ نیا خیمہ قدرے طویل ہوئی۔ توانی نے جھوٹے پر مجبور کر دیا۔ عزم کی ہیکر شرمین عبید چٹائے نے فخرہ کا دکھ تازہ کر دیا۔ بد قسمت ہمیںک وے کے بارے میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ شہرت کے ساتھ ساتھ بڑے نصیب نے بھی عمر بھر اس کا ساتھ نبھایا۔ درو آدمی میں میدان جنگ میں کسی نہ جھکے والے منکولوں پر مکافات عمل نے رخ پالی۔ بنگوان شکاری کا خاتمہ ہوا۔ ٹوپی ڈراما میں مصنف نے آخری سطور میں ہمارے سیاست دانوں کے بھی خوب لٹے لیے ہیں۔ بہت مردوں پر ہر کرلوں سے بے اختیار نکلا، بہت مردوں کا خدا۔ آفاقی صاحب کی بے حد کی محسوس ہوئی (آفاقی صاحب کی جانب سے آپ سب کی محبت اور دعاؤں کا شکر یہ) نیشنل کچ جیتی میں فریہ کے دھندلے ماضی نے چھٹکا دیا۔ بزنس از بزنس میں ابا نے آخری سودا بہت کمال کا کیا اور اپنی عاقبت سنواری۔ خالہ روشنائے آنکھوں کے گوشوں کو نم کر دیا۔ سفید گوا میں شاہ ماسوں تو ڈبل شاہ ثابت ہوئے۔ بے اماں میں فرزانے اللہ بخشے سلطان راہی مرحوم کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ پھیلی پرانگہ کا فائل پھیلی پر سروں بھانا جیسا نکا۔ اچھے میں شاذ یہ کی جان بال بال بچی۔ کاش میں خبر کی روح کو تو قرار آ گیا مگر عرفان رضا مسلسل بے چینی کا شکار ہو گئے۔ آخری کہانی بدائی میں کہانی کی آڑ لے کر مصنف نے ہمیں آئینہ دکھانے کی سحر شکن کوشش کی ہے۔ سرگزشت کا شق نام کا نمبر کی آمد بھی سسٹن بنتی جا رہی ہے۔"

✉ سدرہ بانو ناگوری کا غلوں نامہ، کراچی سے "اس وفد کا شمارہ 25 تاریخ تک مل گیا تھا لیکن آج تک اپریل ہے، دل نہیں چاہتا ہے کہ کچھ پڑھیں، کچھ لکھیں۔ جب چاروں طرف آگ اور خون کی بارش ہو۔ فی دی کی اسکرین بچتی دعاؤں کی ہیڈ لائنز سے بھری ہوں۔ موہاں پر بیڈنوز موصول ہوں تو بندہ ایسے میں کیا مطالعہ کرے، کیا پڑھے، جب گھر کے بڑے کام پر جائیں تو ان کے آنے کی منتظر آنکھیں دروازے پر اور کان موہاں فون کی گھنٹیوں پر ہوں تو کچھ سرگزشت کو چھو جائے، جبکہ جتنے سکرانے لوگ خاک میں مل کر سرگزشت بنے جا رہے ہوں، گولیوں کی بو چھانڈ اس قدر ہو کہ جھپٹ پر جانے اور سونے سے منع کرو یا جائے۔ بھائی گھروں سے باہر ہوں تو بہنوں کے آٹھلے دعاؤں کے لیے پھیلے ہیں، شوہر کام پر جانے تو سہاگن اپنے سہاگ کی خیر کی دعا مانگے۔ بچے اسکول سے لیت ہو جائیں تو ماں کا کبیر پھلتی ہوئے کو آئے۔ تقریبات ماضی کا نقشہ بننے لگیں تو کیا پڑھا جائے اور کیا لکھا جائے، سو شہر خیال کے پاسو! کراچی کے اس کی دعا کو اپنی دعاؤں میں شامل کر لیتا کہ ہم اہل کراچی بارود کے ڈمیر پر بیٹھے ہیں، جانے کب کوئی چنگاری ہمیں بھی یادوں میں تبدیل کر دے۔" (سدرہ بانو!) اللہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اللہ کی قدرت اور رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور ہم سب کو "لاحصول ولا فوٹو الا باھ الطلی العظیم" کا ورد کرتے رہنا چاہیے کیونکہ اللہ سے بڑی کوئی طاقت نہیں اور وہی ہم سب کا مای و ناصر ہے)

✉ اعجاز حسین سٹھار نے نور پور محفل سے لکھا ہے "اس بار پر چارہ وقت مل گیا ہے۔ پڑھنے اور لکھنے کے لیے وقت، ذہنی یکسوئی اور صحت کی خاصی اہمیت ہے، اس کے بعد تخلیق کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ سب شرطیں بخیر و خوبی طے کرنے کے باوجود اک تقسیم کرنے والے دور پیاں پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے بڑی محنت سے تبصرہ لکھا لیکن اس ننگ کی غفلت کی وجہ سے چھپ نہ سکا جس کا مجھے سخت افسوس ہے۔ اس ماہ ہمارا پندرہ سلسلہ طبعی الف لیلہ بھر قائب ہے اس کے ساتھ ہی ہم بزرگ بھائی آفاقی صاحب کی محنت و تندرستی کے لیے دل سے دعا گو ہیں (جزاک اللہ)" عزم کی جیکہ "پڑھ کر حیران رہ گیا ہوں۔"

پاکستانی بچے اور بڑے کتنے کارنامے اور اعزازات سمیٹ رہے ہیں لیکن اپنے گھر میں ان کی قدر ہی نہیں ہے۔ پچھلے دنوں انکے بانی اکمل کے طالب علم نے پوری دنیا سے ریاضی کا مقابلہ جیتا لیکن ان کا بھی ہم ارفع کریم جیسا انجام نہ کر دیں (اگر آپ سے ملن ہو سکتا تو اس بچے کی کھانا کھانے کے ساتھ بھجوا لیں تو ہمیں شائع کر کے خوشی ہوگی) زندگی میں قدر نہیں کرتے اور مرنے کے بعد جلتے کر کے اور میان دے کر اپنے ہاں کھانا کھاتے ہیں۔ ادا یہ بے حس ترک کر دیں اور حالات کے مطابق سپورٹ کریں، یہی ذمہ دہنوں کا شیوہ ہے (درست فرمایا آپ نے) لیکن ان کا آپ نے کم پرائز مل کر کی گئی ہے۔ سو دکھدہ رپوش نے بھیلوں کی بود و باش اپنا کر انہیں اپنا اسیر بنالیا۔ اس سلسلے کی کہانیوں کا ہمیں ہر ماہ انکسار دہا ہے، اس ماہ ۱۱۰۱ء اول مطالعہ کا شوق پورا ہوتا رہے گا (انشاء اللہ! ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی پسند کے مطابق مضامین شائع کرتے رہیں) سراب میں والہا کی اگلا لے رہے ہیں۔ برٹ شاہ کی سرکشی فتح خان نے نہ سنی ہو کر نہ شہباز کا قیام یہاں بڑھ سکتا ہے اور مشکلات سے بھی سامنا کرے گا۔ جی مانڈ میں پہلا مس "ہم ماضی" معاشرتی کہانی ہے۔ فریہ و خدی اور انا پرست عورت ہے لیکن وہ محض ایک انکشاف کے بعد ہی ذمہ کی ورنہ ایک نئی کہانی ہم لے لے گی ماضی کی ثابت قدمی اور بھرپور محبت نے رضوان کے قدم اکھاڑ دیئے تھے یوں کوئی المیہ ختم لیتا یا پھر کیا خیر حالات کیا رخ اختیار کرتے اور کتنی ٹوٹ پھوٹ مٹی، امر انجام کا کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا، یہ دونوں کی نیک نیتی کا پھل ہے کہ گھر کی چار دیواری کے اندر خوشیوں نے ڈیرے ڈال دیے ہیں جو لوگ ہذا ہذا کام لے کر شیطان کے بہکاوے میں آ جاتے ہیں، کبھی ماضی سامنے آ کھڑا ہوتا ہے تو شرمندگی سے نظریں زمین پر گر جاتی ہیں اور فریہ کی طرح پاپندہ و فیصلہ کر کے مصالحت کی زندگی گزارنا پڑتی ہے لیکن یہی قدم انسانی ہمدردی اور سہارا دینے کے لیے اٹھایا جائے تو آخرت کی منزل آسان بن جاتی ہے۔ بزنس اور بزنس میں شروع میں بزرگ کا کیا کردار تھا، وہ قبروں کے کا رو بار جیسا کر یہ کام کر رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالب نے خود کو پیش کر کے دراصل ان کے اندر مردہ انسانیت کے جذبے کو جگانے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب رہی۔ "سفید گوا" کے شاہ ماسوں کا کردار نیا نہیں ہے، آج بھی عورتیں سونا اعلیٰ کرانے کے پکر میں اپنے حصے کے سونے سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں (یہ صرف عورتوں ہی تک محدود نہیں، گزشتہ دنوں اخبارات میں ایک ایسے شخص کی روداد بھی شائع ہوئی جو سونے کی ویک حاصل کرنے کے پکر میں ایک کروڑ روپے سے زائد رقم گنوا بیٹھا)۔ بے اماں "دلچسپ اور مہمانی کہانی ہے، اس کا پلاٹ و یہاں زندگی سے متعلق ہے اس لیے کردار، ماحول اور واقعات دیکھے بھالے گئے ہیں۔" پھیلی پرانگہ "میں دیکھ پر ترس آتا ہے، انہوں نے بیوی بچوں کے لیے کیا کچھ نہ کیا، ہر سولت اور آسائش فراہم کی، اس کے باوجود انہیں قابل غرت جان کر گھر سے بدر کر دیا گیا۔" کاش "پڑھنے کے بعد یہ یقین ہونے لگا ہے کہ مظلوم ہونے کے ساتھ نیک روہیں کوئی بھی روپ و عمارت نہیں ہیں جیسے امیر نے اپنی لاش کی نشاندہی کی۔" ہڈائی "میں کامران کی شوٹی اور چٹنے سکرانے کی عادت زیادہ قابل گرفت نہیں ہے۔ محفل میں سب دوستوں نے یاد کیا اور تبصرے کو سراہا جس کے لیے دلی شکر یہ قبول فرمائیے۔ غلام حسین نوٹاری صاحب، میں ہر ماہ طویل تبصرہ لکھتا ہوں لیکن پالیسی کی پٹینی اسے مختصر کر دیتی ہے۔" (اگر ہم تراش فراش سے کام لیں تو بہت سے خطوط جگہ پانے سے روہ جائیں)

✉ عبدالعزیز جی آنے پکوال سے لکھا ہے "مشرق نام نمبر کے اشتہار پر نظر پڑی، کما ہی اچھا ہوتا کہ مینا بھی لکھ دیتے۔ شہر خیال سے قلی معراج رسول صاحب کا ابتداء یہ اور غالب بنگالہ بھی پڑھا کر جلدی جلدی قارئین کے خطوط پر آ کر بریک لگی۔ جی ہاں رانا محمد سجاد صاحب، صدارت کی کرسی پر براجمان تھے مگر تبصرہ بھی خوب لائے۔ باقی سب کے تبصرے بھی حسب معمول پسند آئے۔ کہانیوں میں بارلی ڈول کی پہلی قسط بالکل پسند نہ آئی۔ اس سے اگلی اسٹوری سفید سرزمین پڑھی، معلوماتی تحریر تھی، گڈ طارق عزیز خان۔ آرٹ کی دنیا میں محمد عفاں آزاد کی کہانی نیا خیمہ بھی کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ بخار آزاد کی کہانی توانی بہت پسند آئی۔ عزم کا بیکر قوم کی بیٹی، جس کا نام پوری کہانی میں کہیں شامل نہیں کیا گیا (سرگزشت عام ڈائجسٹوں سے مختلف معراج کا ہے اور اس میں شامل تحریریں اعلیٰ انداز کی ہوتی ہیں۔ یہی اس تحریر کی انفرادیت ہے کہ پوری کہانی بیان کر دی مگر کردار کا نام شامل نہیں کیا گیا پھر بھی قاری سمجھ گیا کہ یہ کہانی کس کی ہے۔ ہمارے خیال سے آپ فیرنگی تحریریں نہیں پڑھتے ورنہ یہ شکایت آپ کو نہ ہوتی۔ اعلیٰ معیار کی تحریریں ضرور پڑھا کریں تاکہ سے نئے انداز تحریر سے واقفیت ہوتی رہے)۔ بد قسمت "بہت پسند آئی اور آخری دس کہانیاں ہی دراصل رسالے کی جان ہوتی ہیں۔ محترم، میں نے آپ کو ایک نظم ارسال کی تھی، اس کا کیا بنا؟" (آپ کسی اچھے شاعر سے جو محنتی کا ماہر ہو، اس سے اوزان و بحر پر صلاح مشورہ کر لیا کریں)

✉ ظہیر احمد تبسم، کراچی سے "معراج صاحب ڈمیروں دعا میں و سلام۔ آپ کا شکر یہ، آپ نے میرا خط اللطاف صاحب کو ای میل کر دیا، ان کا کوئی جواب نہیں آیا، میں نے یہ عرض کرنا تھا کہ طاہر جاوید فضل صاحب کی میں بہت فہم ہوں ان کی ہر تحریر اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ اللہ کرے دوسرے اور زیادہ۔ میرا خیال ہے کہ لکاکر ختم ہونے کے قریب ہے (یہ اندازہ آپ کو کیونکر ہوا، لکاکر تو ابھی درمیان میں نہیں آیا) ان سے کہیے کہ سسٹن کے لیے بہت خوبصورت ڈول تیار رکھیں (اس ماہ سسٹن میں ان کی ایک مختصر مگر دلچسپ کہانی شامل ہے۔ انشاء اللہ جلد وہ آخری صفحات کے لیے بھی تحریر کریں گے) دوسری بات یہ کہ سرگزشت میں اشفاق احمد مری خیر پور میرس سے لکھتے ہیں کہ آپ کو پڑا لے سرگزشت کی ضرورت ہے، میرے پاس کافی سرگزشت ہیں۔ آپ ان کا ایڈریس دے دیں، بھربائی ہوگی۔" (اشفاق صاحب، آپ مکمل پتا ہمیں بھجوا دیں)

✉ سعید احمد چاند، کراچی سے لکھتے ہیں "بعد سلام عرض ہے کہ پڑھا لا صاحب معمول لیٹ۔ اب اتنے کم وقت میں کیا لکھیں اور کیا پڑھیں۔ غضب تو یہ ہے کہ ہمارا نام دوسرے آنے والوں کی فہرست میں بھی نہیں ہوتا۔ اس مہنگائی کے دور میں تقریباً 60 روپے خرچ کرنا فضول سا لگتا ہے مگر دل ہے

فرماتے اور ان کے گھروالوں کو صبر عطا فرمادیں۔ میرا نام شاید گزار غلط شائع کیا گیا ہے (خط دوبارہ نکال کر دیکھا، شاید ہی پڑھا جا رہا ہے) اٹکل پشاور والوں کو بہت دیر سے تینوں ڈائجسٹ ملتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے خطوط بھی آپ کو گھٹتے ملتے ہیں۔ رانا محمد شاہ صاحب لکھا ہے آپ کو عشقِ داستان پڑھنے کی حد تک پسند ہے یا حقیقی زندگی میں بھی؟ آپ نے صحیح کہا کہ ہم وہ قوم ہیں کہ دوسروں کی بنی بنائی چیزوں کی حماقت تک نہیں کر سکتے۔ سائنس مسلمانوں کے گھر کی لوٹی تھی لیکن اب دیکھو کیا ہمارے پاس کچھ ہے، ہم صرف لوٹنے، بگاڑنے اور ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ غلام ٹہیں، آپ نے صحیح کہا کہ اب تو ہم بس صرف ڈگری حاصل کرنا چاہتے ہیں جو سرکاری جاب کے حصول کے کام آئے۔ جو جوان ملک کو چھوڑ کے جا رہے ہیں، میں ان کو انسان ہی نہیں کہتی۔ ایم اے خالق یعنی صاحب، آپ اور نصیر عباس بابر بھائی کا تبصرہ تو لا جواب ہوتا ہے۔ آپ نے راجا تاج توبہ نواز کے بارے میں بہت صحیح فرمایا ہے کہ کھالو، پی لو اور موج اڑالو۔ مہوش رفیق، آپ نے صحیح کہا کہ عورت ہی قربان ہوتی ہے اور بستی بھی ہے، اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں۔ چار مرد ہر وقت اس کو بچاتے ہیں لیکن مرد انتہا دشمن نہیں جتنا عورتیں ہیں۔ مثالی ساس، ننہ، دیورانی اور سوکن۔ شکر یہ طاہر الدین بیک صاحب کہ آپ نے میرا اسلام قبول کیا ورنہ یہاں کچھ لوگ ہیں جن سے ملنے کی پوری دہری ہے۔ طاہر صاحب، اب تو لوگ اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ ملانچے سے کام نہیں ہوتا، ان پر تو پ جلاتا چاہیے۔ احمد خان توحیدی، عشق نام کام کے لیے اتنی بے تابی، ویسے ہمارے پشاور یو سے پہلے ایک گلوکار گزرے ہیں احمد خان، بہت میٹھی آواز تھی ان کی، بہت اچھا گاتے تھے۔ جام اکبر علی ماہر، آپ اپنی منہمی میں مشکل یہ زور نہ ڈالیں ورنہ وقت سے پہلے ختم غلام۔ چھوٹے بھائی معراج الدین آف مردان، پیارے بھائی میں بھی چار سہہ، کلاؤ حذب بالا کی ہوں اور F.C.W پشاور میں جاب کرتی ہوں۔ خط پسند کرنے کا شکر یہ۔ ویسے جہاں نو دوست تو ایک دشمن بھی ہوتا ہے اور وہ دشمن تینوں ڈائجسٹ میں حاضر ہے۔ ملک جاوید محمد خان سرکاری درانی کیوں تھا ہر ہے ہو یہ تو اس ملک کے تو بے فیصلہ لوگوں کی عادت ہے کہ دوسروں کی باتیں کانٹنے ہیں لیکن آپ بتائیں کہ آپ کے نام کے ساتھ سرکاری کا کیا مطلب ہے؟ ویسے لگتے آپ خوب ہیں۔ میں آپ اور نصیر عباس بھائی کا تبصرہ بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ کہاں غائب ہیں نصیر بھائی، اب تو اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے۔ اب تو تبصرے سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے کافی پڑانے دوست غائب ہیں۔ ان کو واپس آنا چاہیے۔ اٹکل، آپ بھی اگر کوئی تبصرہ اچھا ہو اور لیت بھی پہنچے تو آخری وقت تک شائع ضرور کیا کریں۔ اٹکل، کبھی پشاور کے قلعہ بالا حصار، مسجد مہابت خان اور اسلامیہ کالج پر بھی لکھیں۔ اگر میں اپنے کالج فریئر کالج برائے خواتین کی ہسٹری بھیج دوں تو آپ شائع کریں گے؟ (آپ بھیج دیں، اسے ہم بورڈ کے سامنے پیش کر دیں گے) اب کہانیوں پر تھوڑا تبصرہ۔ مٹی جی آپ اپنی میں دوسروں کو نصیحت کرنا بہت آسان ہے لیکن خود اس پر عمل کرنا بہت مشکل۔ اور ہم جو نقصان اٹھا رہے ہیں، اس میں کافی ہاتھ ہمارے بڑوں کی غلط تربیت کا بھی ہے۔ خود میں بچ سننے کی طاقت نہیں اور تجوں کو ہر وقت تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ خود کا فیصلہ غلط ہو جائے تو اس کو مقدر پر ڈال دیتے ہیں کہ بس اللہ کو بھی منظور تھا اور وہی فیصلہ چھوٹے کر لیں تو پھر قیامت آ جاتی ہے۔ اولاد نافرمان کہلاتی ہے۔ ہر وقت کا طعنہ اس وقت پھر اللہ کو بھول جاتے ہیں۔ طیبہ نے فرید کو صحیح آئینہ دکھایا۔ تب ہی تو رضوانہ اور عرفان کا گھر بن گیا۔ دوسری کہانی بڑی بڑی کتب خانے کی بات تو نہیں ہے، یہ ہے جسے تو کتب سے جاری و ساری ہے۔ قبر بیچنا تو بڑی بات ہے لوگ تو قبروں سے مردے کا کفن نکال لیتے ہیں۔ وہ تو چلو سائے لوگوں سے قبر کی قیمت لے رہا تھا۔ تیسری کہانی سفید گوا کچھ یاد دل رہا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے کچھ اسی طرح کی کہانی سپنس میں پڑھی تھی اور سرورق کی ٹری بھی دیکھی بھائی ہے۔

سہیل احمد عباسی کی بدعاقب سے تشریف آوری "اور یہ درحقیقت عوام کے دل کی آواز ہے۔ دشت کلکتہ کی منفرد داستان حیات ہمیشہ کی طرح معلومات افزا ہے اور ایک شاعر بے بدل کی جھلسل کا لسانہ ثانی ہے۔ شہر خیال میں اگرچہ ہم موجود نہیں تھے پھر بھی یاروں نے بھلا نہیں تھا اس لیے سرائیکی خطے کی مناس وائے ناصر حسین رند کا بہت شکر یہ۔ اب ہمیں محسوس ہونے لگا ہے کہ سرائیکی گوشت سے بھی زبان کھانے کا ہے۔ رانا محمد سجاد کا صدارتی خط بہت اچھا ہے جس میں وہ غیر ملکی یونیورسٹیوں سے کیے گئے معاہدے کو پورا نہ کرنے پر دنگی تھے۔ رانا صاحب کہا کیسے اور کس کس بات کا شکوہ کیجئے کہ آدے کا آدہ اسی بگڑا ہوا ہے۔ رانا محمد شاہ اپنی شادی کا اعلان کر رہے تھے، کہتے ہیں کہ جس نے شادی کی وہ بھی بچھتا یا اور جس نے نہ کی وہ بھی بچھتا یا۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ کر کے بچھتا نہ لکھ رہا ہے گا۔ پریس کلب، اللہ آباد کے تاحیات صدر ایم اے خالق یعنی صاحب کا تبصرہ بھی اچھا ہے جس میں میرے سوا سب لوگوں کے نام انہوں نے لکھے ہیں۔ ارے یعنی صاحب ایسی بھی کیا ہے مروٹی۔ احمد خان توحیدی، صحیح بیانیوں پر اس طرح تبصرہ کر رہے تھے جس طرح کرکٹ میں ماہر کھلاڑی کرتے ہیں۔ ملک ثاقب شاد تو لی سرگزشت کا جاوید اٹکل ایسا ہی ہے جیسا آپ نے بیان فرمایا۔ ہمیں تو 22 سال ہونے کو آئے، اس کے سحر سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور یہ واقعی اردو کا ریلوے ڈائجسٹ ہے۔ جو یہ قاضی، خط وقت پر لکھا جائے تو مایوسی نہیں ہوتی۔ سدرہ بانو ناگوری، آپ کا انسانیت کے بلند تر ہونے کا نظریہ قابل ستائش ہے، اسلام میں بھی انسانیت کی خدمت سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے اور یہ اسلام کے دین فطرت ہونے کی دلیل ہے۔ ملک جاوید محمد خان درانی حسب معمول تاریخ پر جامع تبصرہ فرما رہے تھے، خدا کرے کہ زور قلم اور زبانا۔ جینیلر لوہیٹ کی داستان ہوشربا کافی طویل ہو گئی ہے۔ انارکلیا پر پاکستانیوں کے پہنچنے کا نظارہ سفید سرزمین کی صورت میں خاصے کی چیز ہے، بہت معلومات افزا اور سرگزشت کے معیار کی چیز ہے۔ توالی اور روحانیت کا چوٹی واسن کا تعلق ہے۔ مختار آزاد صاحب نے دنوں کو جاننے والی تحریر لکھی اگرچہ مسئلہ سماع، سلسلہ تصوف کا متنازع مسئلہ رہا ہے۔ آسکر ایوارڈ یافتہ شرمین عبید کا قصہ خوب ہے لیکن ان کی تربیت کی وجہ سے وہ بھی مغربی میڈیا کا حصہ بنتی ہیں اور ان ہی موضوعات کو شوٹ کرتی ہیں جسے مغربی میڈیا اہمیت دے اور دکھانا پسند کرے، ان کی شہرت بھی اسی وجہ سے ہے ورنہ یون روٹی جو کہ برطانوی نو مسلم صانی ہے اسے تو مغربی میڈیا بخشنی اعزاز

سے پیش کرتا ہے کیونکہ وہ مسلم معاشرے کے مسائل کو اُٹھا کر کرتی ہیں۔ ارنسٹ ہیمنگ وے کی داستان مہابت خان نام بہت سہمیں پڑھا میں اگ۔ 62 سالہ بھر پور کامیابیوں والی زندگی گزارنے والے کو بد قسمت کہنا مناسب نہیں لگتا۔ محترمہ مریم کے خان صاحب کی لہر عشقِ داستان، نگاروں کی داستان اس ماہ کا سب سے شاندار مضمون ہے۔ مریم کے خان اپنے موضوع کی ہر سطر کا اس انداز سے احاطہ کرتی ہیں کہ بندہ مسرور ہو رہا ہے۔ 1400 سالہ اسلام لبریشن کی شدت سے انتقاد ہے، اس میں جاوید لال تھرو کی بہن ویجے لکشی پنڈت اور سید حسین کے عشقِ بلاخیر کا احوال بھی آتا ہے۔ (آپ کی لکھنا لکھ کر لی ہے)

افتخار احمد گھمن کا مکتوب، لاہور سے "کافی عرصہ کے بعد شہر خیال میں حاضری دے رہا ہوں۔ اس المیہ کے بارے میں ادبی اہل میں امریکن حینہ کے بارے میں پڑھنے کو ملا، ایسی کہانیاں ہیں اس کی زندگی کے واقعات میں کہ دستوں پر شائع کی جا رہی ہے؟ (لاہور، مئی 2012ء) لکھنا لکھ کر لی میں کے شائقین کی سب سے جیتی اداکارہ ہے اور ہم ہر مشہور شخصیت کی رد و اوزد کی کوڑیج دیتے ہیں) شہر خیال میں رانا محمد سجاد کا خط اچھا رہا۔ مصر میں، ر، آپ کی یاد آوری کا بہت شکر یہ۔ آپ خود بھی کم آتے ہیں لیکن میری کی کو محسوس کیا۔ علی سفیان آفاقی کی علامت کا پڑھ کر تو ان کے لیے بے ساختہ دل سے، ما لکلی۔ آفاقی صاحب قلمی الف لیتے جولائی کا انسائیکلو پیڈیا ہے، تحریر کرتے ہیں اور ہمیں وہ معلومات دی جو کتب اور رسائل پڑھنے کے بعد بھی نہ ملتی۔ ایم اے خالق یعنی، طاہر الدین بیک، احمد خان توحیدی، معراج الدین اور ملک جاوید خان سرکاری درانی کے خطوط اچھے رہے۔ قرآن مجید میں انسان کے لیے خلیفہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، میں یہاں انت کے معنی کے پکڑ میں نہیں پڑنا چاہتا (صحیح کہا) ماہ جنوری کے شمارے میں سرگزشت کے تجزیہ کار خالد کبیر صاحب کے سال گزشتہ کے بارے میں خوب تجزیہ کیا لیکن کئی نام لکھنا بھول گئے۔ کئی قارئین نے اس کا ذکر اپنے خطوط میں کیا۔ وقت ملا تو آئندہ تفصیل سے خط لکھوں گا۔"

معراج الدین کا خلوص نام، مردان خیبر پختون خواہ سے "شہر خیال میں اپنا خط پاکر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس حوصلہ افزائی کے لیے ہم مشکور و ممنون ہیں۔ ادارے سے ہم سو فیصد متفق ہیں۔ ہمارے معاشرے کا الیہ یہ ہے کہ یہاں اربابِ اقتدار کا انتخاب سوچ سمجھ کر نہیں کیا جاتا۔ آج ہمیں جن حالات کا سامنا ہے اور جو کرپٹ اور دوغلتے حکمران ہم پر مسلط ہیں، اس کے لیے ہمارے عوام برابر کے ڈتے دار ہیں کیونکہ عوام نے ہی ان کو منتخب کیا ہے۔ جب تک ہمارے عوام میں دھوکے کی صحیح استعمال کا شعور نہیں آئے گا، ہماری تقدیر نہیں بدل سکتی۔ یک مٹی سرگزشت میں غالب بنگالہ سے متعارف ہوئے۔ باری ڈول میں جینیلر لوہیٹ کا جوش و جذبہ اور ہمت و حوصلہ واقعی لا جواب تھا۔ مسعود کھدر پوش صاحب کی طرح انسانیت کی خدمت کرنے والے لوگ اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ ٹوپی رانا نے ہماری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ہمت مردان ایک سبق آموز تحریر تھی۔ ضرب اللہ ہمت مردان مدد خدا اس کہانی پر صادق آتی ہے۔ سرباب کی 60 ویں قسط بھی کچھلی اقساط کی طرح بہترین اور سنسنی خیز تھی۔ برٹ شاکی موت نے ایمن شاکی وجہ سے کافی افسردہ کر دیا۔ نکس ماضی بہترین تحریر تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو طیبہ کی طرح دیکھ افسانوں کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔ بڑی اذیت جبریت ناک تحریر تھی۔ ہمارا معاشرہ اس قسم کے کئی دوسرے گمراہ کرنے کاروباروں سے بھرپور ہے۔ خالد روشنائے ہماری پرائی ویز تازہ کر دیں۔ جنگ وجدل کے ان حالات میں ہم ایسے بے شمار لوگوں سے ملیں جو اپنے عزیز و اقارب کو کھو چکے تھے۔ سفید گوا نے ہمارے معاشرے کا ایک برا پہلو ہمیں دکھا دیا۔ آج کل تو جھلساڑی کے ایسے طریقے نکل آئے ہیں کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ بے ماں سب سے اچھی تحریر تھی۔ بھٹی پرانگرا میں دیم احمد کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اس کی بیوی کو شادی سے پہلے اسے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ نجمہ مجیب ترین تحریر تھی۔ کاش نے اپریل کے شمارے میں پراسراریت کے Ingrodion کا کام کیا تھا۔"

ملک جاوید محمد خان سرکاری درانی کی خیال آفرینی، برہ زلی مجھ سے "اس ماہ یک مٹی سرگزشت کی شخصیت تاریخ وقات 1952ء لکھی گئی جو کہ 1956ء بھی بیان کی جاتی ہے (آپ کی اطلاع ملے ہے۔ وہ صرف دو سال پاکستان میں گزار پائے تھے۔ 1950ء میں وہ مشرقی پاکستان آئے، دو سال بعد انتقال کر گئے) رانا محمد شاہ زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔ رند صاحب ہم نے تو صرف یہ کہا تھا دل چھوٹا نہ کریں۔ اس ماہ سرگزشت کے خاص مضامین میں سفید سرزمین، نیا جنم، عزم کی بجکر، بد قسمت، ٹوپی رانا تھے۔ زرد آدھی نے سپنس میں مشکلوں پر لکھی گئی الیاس بیٹا پوری کی کہانیوں کی یاد تازہ کر دی۔ مسعود کھدر پوش کی دلچسپ فکا کہانی کی دوسری قسط پہلے سے اچھی رہی۔ کیا یہ وہی مسعود کھدر پوش ہیں جنہوں نے سندھ ہاری رپورٹ مرتب کی تھی، پنجابی زبان وادب کے سرپرست تھے اور جن کی یاد میں مسعود کھدر پوش ایوارڈ برائے پنجابی ادب کا اجرا کیا گیا تھا؟ (جی ہاں، یہ وہی قابلِ قدر ہستی ہیں) مختار آزاد کا مضمون توالی جامع نہیں تھا، اس میں افسانے کی کافی گنجائش تھی۔ مصنف نے خواتین توالوں کا ذکر تو سرے سے کیا ہی نہیں اور مرد توالوں کے ناموں میں سے عالمی اور کھلی سطح پر مشہور بہت سارے توالوں کے نام تحریر نہیں کیے جیسا کہ یوسف آزاد، اسماعیل آزاد، متا آزاد، سراج آزاد، قرآ آزاد، احمد آزاد، اختر آزاد، حاکم والے۔ قلندر آزاد، حبیب پنیر، عبدالرحمان کالج والا، جیو توال، شیخ لعل، ماسٹر ایاز علی عہد تاجی، واجد علی منکے والے۔ کمن توال بھی دو تھے۔ میا عابد توال اور ان کے فرزند بدر میا عابد، شیر میا عابد، صالح محمد چھوٹے اور صالح محمد بڑے۔ مہر علی، مستان توال، عزیز تازاں ہانی بابو، فیض علی فیض اور ہمارے علاقہ مجھ سے تعلق رکھنے والے فضل الرحمان عرف فقیر محمد اور ان کے فرزند حاجی شیر الرحمان برہ زلی والے۔ ایوب خان، ماسٹر غلام سرور اقبال خان راہی، لوشاد احمد کوٹکے والے، یعقوب خان توہا، عبدالکریم پونکا، عبدالرحیم کھسا، غلام اکبر غورخشی والے، صدیق بنگٹی، شرموز بنگٹی، مولوی فقیر، فیاض مرزا والے، احسن شیدی، افرود عدل زلی، حافظ غلام رسول حمید، زمر دوسن پور علی، اکثر غازی، ایوب توال قبلہ باغی، بشیر شاہ رومیان، اہل باکی والے وغیرہ ان کے قلمی معیار اور مقام کا اندازہ ماہرینِ فن ہی کر سکتے ہیں۔ آزاد صاحب کی خدمت میں عرض ہے ایسا لکھا کریں کہ عقلی نہ رہے بلکہ

✉ منظر علی خان کا تبصرہ، لاہور سے۔ "بارنی ڈول میٹر لو ہیوٹ فلمی میدان میں ایک مسلسل جدوجہد کی کہانی ہے جو بلاخر کا میابی اور حصول دولت و شہرت پر منتج ہوئی۔ عالمی پیمانے پر فلمی دنیا میں دلچسپی لینے والے لوگوں کے لیے یہی ایک بہترین سٹی ہے۔ نیا جیم آرٹس اور تصویر کشی کے پس منظر میں بیان کردہ بیننگ اور اس کے متعلق تحقیق آرٹ کی دنیا میں رہنے والوں کے لیے پیش قیمت ہے۔ آسکر ایوارڈ لینے والی پاکستانی خاتون پر مضمون خوب ہے۔ ناول نگار ارشد کی داستان روداد میں کسی گمراہ سے بد قسمتی سے منسوب نہیں کر سکتے۔ زرد آندھی منگولیا کے چرواہوں نے کس طرح فوجی جنگ جیتی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے دو تین سو سال تک بڑے اہم حکمرانوں کو تخت و تاج کیا اور انسانی سروں کے پتھر بنائے۔ 1258ء میں بغداد کی تباہی اور عباسی خلافت کا خاتمہ مسلم دنیا کے لیے ایک المیہ ہے کم نہیں تھا مگر اس کا پس منظر کیا تھا؟ اس سے کما حقہ پردہ نہیں اٹھایا جاتا۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔ اموی اور عباسی خلفاء کے مظالم پر نظر ڈالیں گے تو وجوہات ابھر کر سامنے آجائیں گی۔ زیادہ طوالت میں نہیں جاسکتا۔ بھگوان شکاری کا طریقہ تحریر پسند آیا۔ مسعود کھدر پوش صاحب بیوروکریٹ ہونے کے باوجود کس قدر طنسار اور مٹی ہوئی طبیعت کے مالک تھے۔ ایسے انسان دوست لوگ کم کم ملتے ہیں۔ دوسری زندگی اس پراسرار دنیا کے خفیہ امور کے بارے میں تیار کردہ قلموں اور کہانیوں میں بیان کردہ ڈر نکولا ٹاپ کہانی ہے۔ ٹوپی راما مضمون ہے سرگزشت نہیں۔ اگر اسے افسانوی انداز میں لکھا جاتا اور درمیان میں ٹوپی کی تاریخ اور ٹوپی راما کے احوال درج ہوتے تو زیادہ پُرکشش ہوتا۔ ہمت مرداں کے عنوان سے ایک بچے کے عزم اور دلوانے کا قصہ ہے۔ عکس ماضی کے عنوان سے دلچسپ بچہ بیانی ہے۔ بچہ یہ ہے کہ عیب جوتی لخت ہے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اگر کوئی راست روی اختیار کیے ہوئے ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے ورنہ ہر انسان عمل نہیں ہوتا۔ بزنس ایڈز بزنس کی کہانی لکھانے کا سودا نہیں۔ انسان کسی ذہنی شوکر سے سنبھل جائے تو خوب ہو جاتا ہے۔ خالد روشتا قاف کی ایک کہانی ہے۔ قدرت کیا کر رہی ہے، ہم کیا بھگت رہے ہیں، اجتماعی حالات پر نظر پڑتی ہے تو کانپ جاتے ہیں۔ سفید گڑا نوسر بازی کی کہانی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ سوچا دنگا کرنے کا لالچ دے کر سب کچھ لوٹ لے جاتے ہیں۔ بے اماں کے راوی کی قسمت اچھی تھی۔ خلیب و فراز تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ بھٹلی پر انکار و سبق آموز ہے۔ کسی بھی خاتون کو پسندیدگی کی صورت میں اپنی ہتھیلی پر انگارہ رکھنے کے بجائے صاف انکار کر دینا چاہیے، بہ صورت دیگر کسی شریف انسان کو خوار کرنا بھی کسی طرح مناسب نہیں ہے مگر ہمارے معاشرے میں تصادات ہیں دیم صاحب سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ کاش تصادات کا مجموعہ تھی۔ خاصی دلچسپ مگر کسی فلمی کہانی کا مغلوبہ نظر آئی۔ جدائی حب الوطنی کا درس دیتی ہے۔"

✉ رانا محمد سجاد کا خط، انوار شہر مظفر گڑھ سے۔ "وطن عزیز کی صورت حال خصوصاً عروس البلاد کے حالات سن کر تو پریشانی کی لہر دگ دپے میں دوڑ جاتی ہے۔ پھر سوچ پیدا ہوتی ہے کہ آخر ہالیان کراچی سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا ہے کہ جس کی سزا اب تک ختم نہیں ہوئی۔ وزیرستان، سوات اور دوسرے علاقے امن کی شاہراہ پر گامزن ہیں اور یہ شہر..... بس خدا کی بارگاہ میں ایک بار پھر رحم کی التجا ہے۔ کبھی وہ دن بھی خدا کو کھلائے کہ کراچی کی شاہراہوں اور فضائوں میں امن کا راج ہو اور بانی پاکستان کا یہ شہر تاریک تنگ جیسی لخت سے محفوظ ہو جائے (آمین) اور افاق پٹیتے ہوئے مشق کا نام نمبر کے اشتہار پر پہنچے، دیکھتے ہیں کب تک یہ شمارہ ہماری پہنچ سے دور رہتا ہے۔ معراج رسول صاحب کے خیالات سے سو فیصد متفق ہیں۔ جمہوریت مرام کے خیالات کا ذریعہ ہے لیکن اقتدار پر قابض لوگوں نے اپنی انفرادی و مقاصد اور اپنی خواہشات کو پرار کرنے کا نام دیا ہے گزشتہ مہینے جس مشہور زمانہ کس کا بڑا چرچا رہا، بالآخر عدالت عظمیٰ نے اس کی سماعت تو بہت سارے چہرے بے نقاب ہوئے اور ان کا حقیقی اور کردہ چہرہ قوم کے سامنے رونما ہوا اور پھر کرائے کے بجلی گھروں کا معاملہ تو سب کے سامنے ہے کہ کس طرح مرام کے سرمائے پر ڈاکا ڈالنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اور 2009ء میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کا اعلان بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ رہا حزب اختلاف کا معاملہ تو بقول شاعر کہ دل جلانے کی بات کرتے ہو، یہ سب ٹوپی ڈراما ہے جس طرح ڈرون حملوں پر ارباب اقتدار شور و غل کرتے ہیں، مرام کو خوش کرنے کے لیے اب یہی وتیرہ ان کا بن گیا ہے۔ اس پر ہوتا کچھ دکھ افسوس کا اظہار ہو کم ہے۔ اب سرگزشت کی طرف بڑھتے ہیں۔ غالب بنگالہ کے بارے میں اپنی لاطینی کا اعتراف ہے، پہلی بار آگاہی نصیب ہوئی۔ بہت شکر یہ اہل ادب کے لیے خصوصی تحفہ تھا۔ شہر خیال میں داخل ہوئے اپنا خط پاکر خوشی ہوئی۔ رانا شاہد صاحب، مبارک باد قبول کیجئے گا۔ مٹھائی اڈھا رہی۔ ناصر حسین رند صاحب اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ٹی کپور کے بارے میں جو آپ کا خیال ہے، وہی ہمارا ہے لیکن جس کی قسمت میں ہدایت ہو تو ملتی ہے۔ غلام نسیم نوناری غالب پہلی بار حاضر ہوئے ہیں۔ مہوش رفیق اب باقاعدگی کے ساتھ آئیے گا۔ احمد خان توحیدی صاحب مبر کا پھل بیٹھا ہوتا ہے۔ منظر علی خان کا تبصرہ بھی جاندار تھا۔ جام علی اکبر حیات آپ نے یہ کیا کہہ دیا کہ اس میں خصوصاً لوگوں کی اجارہ داری ہے۔ اگر ہوئی تو آپ کا تبصرہ شہر خیال میں نہ ہوتا۔ غضنفر علی خان کا تبصرہ مختصر لیکن اچھا لگا۔ غیر حاضر ساتھیوں کو یاد کرنے کا شکریہ۔ جو یہ قاضی اپنے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ عہد انخوری نسخ کے بارے میں ہم نے تو نہیں پڑھا تھا (بجلی باری سکی، پڑھو لیا) پر دین شاہ کے بارے میں کسی تحریر کا ہمیں بھی شدت سے انتظار ہے۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کا خوبصورت تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ معراج الدین کا مکتوب واقعی خاص تھا۔ ساتویں کلاس سے ہی اس معیاری رسالے کی رفاقت نصیب ہوئی، میڈیکل جیسی تعلیم کے باوجود آپ سرگزشت کے لیے وقت نکالے ہیں، لائق تحسین ہے، اس کو اپنے حلقہ یاران میں بھی متعارف کرائیں۔ طاہرہ، آپ نے آؤن مشنریوں کے بارے میں کہا اس سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ ادارہ نے جواب دیا ہے وہی ہمارا ہے۔ ملک جاوید خان بھی، ذرا جلدی خط لکھا کریں تاکہ فرنٹ بیٹ کا حشر اٹھائیں۔

صدائق حسین ساجد و شروکت، امید ہے خط لکھنے کا سلسلہ اب مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔ مل مٹل، لاہور، آپ کا مہم اہل ہوا اور صبر سیر کے لیے آپ نے جس بے چینی کا اظہار کیا ہے اسی میں ہم بھی جلا ہیں۔ خطوط کے آخر میں محترم یوسف بیل لکھا تھا کہ اگر ہم صبر سیر لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ پروردگار انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ "بارنی ڈول" کافی مرے بعد ہی اور اہل ادب کی لہر سے میں کوئی سرگزشت شائع ہوئی ہے، کافی پسند آئی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ نیا جیم، محمد عارف آزاد ایک دلچسپ مگر بے لکڑی لکھنے والا ہے۔ بارے میں اور اس کے خالق کے بارے میں کچھ معلومات پہلے سے تھیں اس لیے تحریر سے کافی لطف اٹھایا۔ میرے خیال میں تو یہ لکھنے والا اہل ادب کی توالی، فن، موسیقی پر ایک دلکش تحریر۔ تحریر اپنے موضوع کے اعتبار سے مختصر تھی لیکن بہر حال پسند آئی۔ بہتر ہوتا اگر مزید جہاں توال کے بارے میں اہل ادب کو شائع ہو جائے۔ واقعی، توالی میں جو وسعت ہے، وہ کم ہی کسی دوسری صنف موسیقی میں ہے۔ توال کے بارے میں جاننے کا شوق ہے اگر ہو۔ لکھنے والا وہ مہم پر بھی لکھوایا جائے۔ توالی کے شائقین کے لیے ایک تحفہ خاص ہوگا۔ عزم کی جگر شرین عبید چٹائے کے بارے میں تحریر تھی۔ سرگزشت لے لکھنے کی طرح اچھا قارئین کی پسند کا خیال کرتے ہوئے اس بار بھی بروقت تحریر دے کر سبھی کے دل جیت لیے۔ واقعی بہت بڑا اعزاز جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اہل ادب ایسے ملک میں جہاں فلمی صنعت تباہی کے آخری مراحل سے گزر رہی ہے، وہاں آسکر لین کمال ہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات یاد آ رہی ہے کہ وطن عزیز کے دو غالب علموں موسیقی و نواز اور حسین نے با ترتیب پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی، پچھلے ہی دنوں یورپ دالوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ زہانت کے اعتبار سے پاکستان پوری دنیا میں چوتھے نمبر پر ہے۔ کاش ارباب اقتدار بھی اس بات کو سمجھیں۔ موسیقی فیروز کو ابھی تک کسی حکومتی عہدے دار لے نہیں بلایا اور نہ اس کو خارج تحسین پیش کیا ہے (ہم کوشش کریں گے کہ ان ہونہاروں کے بارے میں تفصیلی مضمون جلد شائع کریں) ابن کبیر کی بد قسمت ایک جامعہ تحریر تھی۔ ارشد، ہینک دے عالمی ادب کا مسجر نام اس کا افسوس ناک انجام۔ شمارے کی بہترین تحریر دس میں سے ایک اور تحریر زرد آندھی، مرام کے خان کی ایک اور دلکش تحریر، منگولوں نے جس طرح ایک عالم کو جس جس کر دیا وہ انسانیت کی تاریخ کا ایک دردناک باب ہے اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے مرکز بغداد کو جس طرح برباد کیا وہ قابل عبرت ہے۔ بھگوان شکاری منفرد انداز کی کھا اختتام پذیر ہوئی۔ امید ہے اسی قسم کی تحریریں پیش کی جاتی رہیں گی۔ ہمدردی کی فطرت بھی بے نقاب ہوئی جو کہ ایک مسلمان کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے، ایک سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر انہوں نے ان کو دین اسلام کی طرف بائیں کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ ٹوپی راما ایک معلوماتی تحریر تھی۔ ہمت مرداں میں لیری کی ہمت واقعی قابل تحسین ہے اور ان لوگوں کے لیے قابل مثال ہے جو سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں کرتے۔ سراب اپنے مخصوص انداز میں جاری ہے۔ بچہ بیانیوں میں بزنس ایڈز بزنس، بے اماں، بانجھ، کاش پسند آئیں۔ آخر میں محترم آفاق صاحب کے لیے دعا، پروردگار انہیں جلد از جلد صحت یاب کرے، آمین۔"

✉ رانا حبیب الرحمن نے گوجرہ سے لکھا ہے "میں جب چوتھی کلاس میں تھا تو کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا، ایک دفعہ میرے کلاس فیلو کے بھائی کو سسٹن پڑھنے دیکھا تو اس سے مانگ کر پڑھا پھر کیا تھا بس سسٹن کے بعد جاسوسی اور اس کے بعد سرگزشت پڑھنا شروع کر دیا اور اسی کے ہو کر رہ گئے۔ 9 سال کی عمر میں بچے کو صحیح طرح اردو پڑھنا نہیں آتی، میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے لیے یہ بہت آسان تھا، مگر والدین کے روکنے کے باوجود میں چوری چھپے کمرے میں بند ہو کر پڑھنے بیٹھ جاتا، اب مسئلہ یہ ہے کہ میں تقریباً 6 ماہ سے سسٹن، جاسوسی میں خط لکھتا ہوں لیکن اتنی بے رشتی کے ساتھ اسے ردی کی نوکری میں پھینک دیا جاتا ہے اور بلیک لسٹ میں نام دے کر نوٹ خدایا جاتا ہے (آپ کی شکایت بجا ہے لیکن کبھی جگہ کی کے باعث خطوط شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں، سرگزشت میں خوش آمدید) اب ہر رسالے میں مشق کا نام نمبر کا اشتہار آ رہا ہے، جس کا تقریباً ہر قاری کو شدت سے انتظار ہے۔ غالب بنگالہ کی سرگزشت کے بعد شہر خیال میں پہنچے اور سب سے آخر میں سرگزشت کے لکھاری یوسف بیل کے انتقال کا سن کر بہت زیادہ افسوس ہوا، یوسف بیل صاحب ایک قابلِ فکر کہانی نویس تھے جن کی کہانیاں بہت ہی عمدہ ہوتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں جگہ دے اور لواحقین کو میر جیل عطا فرمائے، آمین۔ سب سے پہلے رانا محمد سجاد صاحب، اگر مشق کا نام نمبر کی تاریخ کا اعلان کر دیا جاتا تو جیسے اب قارئین کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہیں، ایسی تیز نکلیں ہوتی تھیں اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ اصل سسٹن اسی کا نام ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے کہ ساگر کوکر صاحب پہلے سسٹن اور جاسوسی میں بھی لکھتے ہیں، اب پانچویں سرگزشت کی سرحد میں کیسے داخل ہوئے؟ نا مہر صاحب، شکر ہے کہ آپ کو کچھ کے بارے میں معلوم ہو گیا ورنہ پتا نہیں آپ کیا سمجھنے لگے تھے۔ اس کے بعد مہوش رفیق اور جو یہ قاضی، سدرہ بانو ناگوری، معراج الدین، طاہرہ صوابی کے تبصرے جاندار تھے۔ باقی میری طرح بس ایویں تھے۔ اس کے بعد سفید سرزمین، زرد آندھی، ٹوپی راما بھی کہانیاں پڑھ کر مطبوعات کا خزانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس کے بعد سراب کا سلسلہ بہت اچھا جا رہا ہے اور کچھ بیانیوں میں خالد روشتا، سفید گڑا، بانجھ، کاش بہت ہی پسند آئیں۔ اس کے بعد بیت بازی بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔ اس میں اپنا شعر، پردین صبا، حانقا باد کے جواب پر لکھا تھا، چمپا دیکھا تو خوشی ہوئی۔"

اب آخر میں ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

سمندر خان، اکوڑہ خٹک، خاقان میرانی، پستی، خلیل خاں خلی، مہا نوالی، اکرم فیا، فیصل آباد، شہریار حسن ابدال، فیروز خان، پنجگور، لکھنؤ یاسین، سرگودھا، نادر قائم خانی، میر پور خاص، قائم شاہ، میر پور، شورو، شیخ ذوق، گوجرانوالہ، عبدالقدیر بشنو پور، عمران خان، لاہور، ارباز خان، پشاور۔



وہ خدا کے برگزیدہ بندے تھے مگر بادشاہ وقت کے قیدی تھے۔ نبوت کے حامل تھے مگر مجبور بنادیے گئے تھے۔ پیش گوئی میں ملکہ حاصل تھا مگر اپنی قسمت کا لکھا پڑہ نہیں پارے تھے۔ وقت سے پہلے نوشتہ دیوار پڑھ لیتے تھے۔ جو کہتے سچ ثابت ہوتا۔ آپ کی اسی خوبی نے آپ کو ممتاز بنایا۔ مگر حادثات تو گویا ان کے تعاقب میں رہتے تھے۔ ایسے ایسے عجیب و غریب سانحات درپیش آتے تھے کہ لوگ انگشت بدندان رہ جاتے تھے۔ آپ کی روداد زیست خود میں منفرد ہے۔

ایک مجرما پر گزیدہ ملک کا خیال غصیت کا تذکرہ خاص

بھینز بکریوں کی طرح ہنکا تا ہوا بابل کی طرف چل دیا۔
یرمیاہ علیہ السلام جس روز بد سے ڈرا رہے تھے، وہ آن پہنچا تھا۔ ہزار میل کا یہ سفر ان اسیروں کو پیدل طے کرایا جا رہا تھا۔ بیروں میں زنجیریں تھیں اور پیچھے پیچھے بابلوں کے گھوڑے تھے جو ان قیدیوں کو تیز دوڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی کزور مسافر کو شوکر لگتی تو بابل کے فوجیوں کے قہقہے گونجنے لگتے۔

”یہ جو ٹھوکریں کھاتے، گرتے، پڑتے چلے جا رہے ہیں، اپنے آپ کو انبیا کی اولاد کہتے ہیں۔ ان کی اللہ تعالیٰ نے کوئی مدد نہیں کی۔ ہمارے بادشاہ نے انہیں قتل بھی کیا اور اسیر بنا کر بھی لے جا رہا ہے۔“ بابل کا ایک فوجی اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

”جب انہوں نے گناہ کیے، قلم کیا اور حد سے بڑھ گئے تو ان پر ہمارے بادشاہ کو مسلط کر دیا گیا۔ تو مومن کے درمیان یہی ہوتا ہے۔“

”بخت نصر اب ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟“
”کیا خبر قل کرادے یا ان کو غلام بنا کر رکھے یا ہمیشہ قید میں پڑے رہیں، کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”ان میں تو میں معصوم، کم سن نوجوان بھی دیکھ رہا ہوں۔ یہ بھی بے موت مارے جائیں گے۔ ذرا اس نوجوان کی طرف دیکھو جس کی عمر یہ مشکل سترہ سال ہوگی۔ اس کے ماں باپ قتل کر دیے گئے ہوں گے اور اسے قید کر کے لے جایا جا رہا ہے۔ مجھے تو اس پر رحم آتا ہے۔“
”خبردار! ان لوگوں کے لیے ہمدردی کا کوئی لفظ زبان

بنی اسرائیل کی سرکشی اور شرارت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور ظلم و فساد کا بازار گرم ہے کہ خدا کی جانب سے اس زمانے کے پیغمبر یرمیاہ علیہ السلام پر وحی آتی ہے کہ بنی اسرائیل میں منادی کرو کہ وہ ان حرکات بد سے باز آ جائیں ورنہ گزشتہ قوموں کی طرح ان کو تباہ و برباد کرو یا جائے گا۔ یہ ساتویں صدی قبل مسیح کے نصف کا زمانہ ہے۔

یرمیاہ علیہ السلام نے خدا کا یہ پیغام جب بنی اسرائیل تک پہنچایا تو انہوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا بلکہ یرمیاہ علیہ السلام کا مذاق اڑاتے رہے۔ یرمیاہ علیہ السلام انہیں برابر آگاہ کرتے رہے کہ وہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھوں برباد ہوں گے اور وہ ان کو قید کر کے بابل لے جائے گا اور یروشلیم کو مٹا دیا جائے گا۔

لوگ اپنے نبی کی پیش گوئی کو مذاق میں اڑا رہے تھے، لیکن خدا کی عہد کے پورا ہونے کے اسباب بنتے جا رہے تھے۔ اسی زمانے میں بخت نصر کو بابل کی بادشاہت ملی تھی۔ اس نے اپنی قابرانہ اور جاہلانہ طاقت سے قرب و جوار کی تمام حکومتوں کو مسخر کر لیا تھا۔ ساحلی علاقوں کے بیش بہا خزانے بابل پہنچے تو جموں پڑیوں اور کچے گھروں کا یہ شہر دلکش عمارتوں میں تبدیل ہونے لگا۔

بخت نصر اس بات کو تشویش سے دیکھ رہا تھا کہ یروشلیم کا بادشاہ، مصریوں کا باج گزار بنا ہوا ہے۔ یہ یوہنیم یروشلیم پر حکومت کر رہا تھا کہ مصریوں کو بابل کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ بخت نصر نے جنوبی فلسطین کے اندر کافی دور تک پیش قدمی کر لی، خزانے لوٹ لیے اور ہزاروں بنی اسرائیل کو

”اے خواجہ سرا سن! میں چاہتا ہوں کہ ان امیروں سے
کچھ ایسے لوگ تلاش کرو جو عقل و دانش میں اور ظاہری حسن
میں ایسے ہوں جو میرے دربار میں کھڑے رہنے کے لائق
ہوں۔“

ہے رک جاتے ہیں۔“

لہانے سے رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے۔“

”ہمیں معلوم ہے۔ یہ وہ گوشت ہوگا جو دلوں کا دل کے

”پھر تو تم شراب پینے سے بھی انکار کرو گے؟“
 ”یقیناً۔ ہم تجھ سے درخواست کریں گے کہ تو ہمیں ان
 نونوں چیزوں سے معذور سمجھ۔ ہمیں تو معمولی سبزیاں کھلا اور
 پینے کے لیے پانی بہت ہے اور ہمیں بت پرستی پر بھی مجبور مت کر۔“

اسپرنے یہ سن کر سر پیٹ لیا "گوشت نہیں کھاؤ گے اور شراب نہیں پوئے گے تو تمہارے چہروں پر سرخی کس طرح آئے گی۔ بادشاہ تمہارے مرجھائے ہوئے چہرے دیکھے گا تو میری گردن اڑا دے گا کہ میں نے تم لوگوں کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی۔"

حضرت دانیال علیہ السلام نے اسے تسلی دی "تو ہماری فکر مت کر۔ دس دن کے بعد تو دیکھے گا کہ ہمارے چہرے اب سے بڑھ کر شگفتہ ہو چکے ہیں۔ تجھے بادشاہ کے سامنے شرمندگی نہیں ہوگی۔"

"یہ کس طرح ممکن ہے کہ شراب اور گوشت کے بغیر تمہارے چہرے تروتازہ ہو جائیں اور اگر بادشاہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں نے تمہیں گوشت کے بجائے سبزیاں کھلائی ہیں تو وہ تو یہی سمجھے گا کہ میں نے بے ایمانی کی ہے۔ بادشاہ اسے اپنی بے عزتی بھی تصور کرے گا۔"

"ہم تجھے یقین دلاتے ہیں کہ بادشاہ کو کچھ معلوم نہ ہو سکے گا۔ ہماری اچھی صحت دیکھ کر اسے اندازہ نہیں ہوگا۔ ہم بھی اس سے کچھ نہیں کہیں گے۔"

اسپرنے کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ انہیں بادشاہ کے حضور پیش کر چکا تھا اور اب ان کی جگہ دوسرے نوجوانوں کو منتخب نہیں کر سکتا تھا۔ بادشاہ سے بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ نوجوان اس کی حکم عدولی کر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسے حسین چہرے خاک و خون میں نہلائے جائیں۔ ان پر بادشاہ کا عذاب نازل ہو۔ بادل ناخواست اسے تیار ہونا پڑا کہ وہ انہیں کھانے کے لیے سبزیاں اور پینے کے لیے سادہ پانی فراہم کرے۔ وہ یہ اہتمام بھی کر رہا تھا کہ روز انہیں آکر دیکھ جایا کرتا تھا اور یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ان کے چہروں پر وہی رنگ چڑھ رہا تھا جو شراب اور گوشت کے استعمال سے چڑھتا ہے۔

جب دس دن گزر گئے اور اسپرنے دیکھا کہ دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے چہرے ان سے بھی زیادہ چمک رہے ہیں جو گوشت اور شراب استعمال کرتے ہیں تو اسے قدرے حیرانی ہوئی۔ وہ چند لوگوں کو ان کے پاس لایا تاکہ تصدیق ہو سکے۔

"دیکھو تو، ان کے چہرے کیسے چمک رہے ہیں۔"

اسپرنے ان لوگوں سے کہا۔

"چکیں گے کیوں نہیں۔" ان لوگوں نے کہا "آخر

گوشت کھا رہے ہیں اور شراب بھی پی رہے ہیں جو بادشاہوں کو نصیب ہوتی ہے۔"

اسپرنے کو یقین آ گیا کہ یہ اس کی نظروں کا دھوکا نہیں۔ اب وہ انہیں بے خوف و خطر بادشاہ کے سامنے پیش کر سکتا تھا۔ وہ انہیں بادشاہ کے پاس لے گیا کہ وہ ان کی صحت ملاحظہ کر لے۔ اس نے بادشاہ کو کچھ نہیں بتایا کہ وہ ان نوجوانوں کو گوشت نہیں سہاگ پات کھلا رہا ہے۔ بادشاہ ان کی صحت دیکھ کر بہت خوش ہوا، محض دس دن میں وہ اپنی عمر کے دوسرے نوجوانوں کے مقابلے میں زیادہ صحت مند نظر آ رہے ہیں۔ پھر اس نے اسپرنے کو حکم دیا کہ ان نوجوانوں کو کلدانی زبان سکھا اور ہر علم میں طاق کر دے اور میرے پاس تین سال بعد لے آ۔

اب اسپرنے کو یقین آ گیا کہ یہ اس کی نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ دانیال اور ان کے ساتھیوں کی صحت واقعی قابل رشک ہے۔ یہ بات البتہ اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ محض سبزیاں کھانے اور سادہ پانی پینے سے کسی کی صحت کیسے بحال رہ سکتی ہے؟

اب اسپرنے کو دوسرے منصوبے پر عمل پیرا ہونا تھا۔ اس نے ان نوجوانوں کے لیے شاعر مکان کا انتظام کیا اور انہیں اسی میں ٹھہرا دیا۔ بہترین اساتذہ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیے۔

تین سال کے عرصے میں انہوں نے کلدانی زبان میں خوب مہارت حاصل کی۔ دانیال خاص طور پر ان علوم میں خوب طاق ہو گئے۔ علم نجوم، حکمت و ریاضی اور تعبیر خواب بتانے میں انہیں خوب مہارت ہو گئی تھی۔ لوگ دور دور سے چل کر آتے تھے اور اپنی خواب بیان کر کے تعبیر پوچھا کرتے تھے۔ یہ باتیں بادشاہ کے علم میں بھی لائی جاتی رہتی تھیں بالآخر جب تین سال پورے ہو گئے تو بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ نوجوانوں کو میرے دربار میں پیش کیا جائے۔

اسپرنے مکان پر حاضر ہوا۔ اس وقت دانیال علیہ السلام کہیں گئے ہوئے تھے جبکہ اسپرنے کو انہیں دربار لے جانے کی جلدی تھی۔ ان کے ساتھیوں نے اسے بتایا کہ وہ قریبی جنگل میں ہوں گے۔ اللہ کی عبادت کرنے وہ جنگل میں چلے جاتے ہیں اور اکثر دن دن بھر وہیں گزار دیتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ وہیں ہوں گے۔ اسپرنے کو حیرت ہوئی کہ وہاں کون سا بت ہے جس کی وہ پرستش کرتے ہیں۔

"وہاں تو "بعل" کا کوئی بت نہیں ہے پھر وہ کس کی

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال بتائیں کیا

مگر ہم آپ کو بتائیں گے اور خوب بتائیں گے۔

جی ہاں ماہنامہ سرگزشت کا ایک اور معرکتہ الآرا خاص نمبر

عشق ناکا کا گمراہ

عشق جس میں مہر بھی ہے اور قہر بھی، وصل بھی ہے اور فراق بھی عشق، انسان سے کیا کچھ نہیں کراتا انہوں نے بھی اپنی شہرت و ناموری کو داؤ پر لگا دیا۔

مشہور و معروف ہستیوں، تاریخ ساز افراد کے ناکام عشق کی داستانیں دل پراثر کرنے والی سچ بیانیاں، ایسی دلچسپ سچی کہانیاں جو آپ کو چونکا دیں گی۔

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

جہت جلیلا آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

پرستش کرتے ہیں؟“
 ”دانیال علیہ السلام کسی بت کی نہیں، خدا کی عبادت کرتے ہیں۔“
 ”دربار سے وابستہ ہو جانے کے بعد اسے بت پرستی اختیار کرنی پڑے گی۔“
 ”ہم نے تجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں مذہب بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔“
 ”بادشاہ کے احسانات کا بدلہ یہ ہے کہ تم اس کے جوں کی پرستش کرو۔“
 ”یہ دانیال کا مسئلہ ہے۔ تم خود اس سے بات کر کے دیکھ لو۔“

”مکروہ ہے کہاں؟“
 ”ہم نے کہا تو ہے وہ جنگل میں ہوگا۔“
 اسپنر نے اسی وقت اپنے آدمی دوڑا دیے کہ دانیال جہاں کہیں ہوا سے تلاش کر کے لائیں۔ وہ روانہ ہوئے اور تھوڑی دیر میں دانیال علیہ السلام کو تلاش کر کے لے آئے۔ اسپنر نے بت پرستی کا تذکرہ اس سے بھی کیا۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا۔ جوان کے سامنے دے چکے تھے۔ اسپنر نے اس وقت بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور ان سے کہا، وہ دربار چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انہیں کلدانی لباس پہنایا اور شاہی بھی میں سوار کر کے بادشاہ کے محل پہنچ گیا۔

بادشاہ انہیں تین سال بعد دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، کیا یہ وہی تو جوان ہیں؟ کلدانی لباس میں لمبوس بالکل مقامی معلوم ہو رہے تھے۔ روانی سے مقامی زبان بول رہے ہیں۔ بادشاہ نے مختلف علوم کے اساتذہ کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ دانیال علیہ السلام کا امتحان لیں اور یہ جانیں کہ انہیں مختلف علوم پر کتنی دسترس حاصل ہوئی ہے۔

یہ اساتذہ ان کا امتحان لینے کے لیے حاضر ہوئے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی شاگردوں کی طرح ان کے سامنے بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔ بادشاہ نے دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو دیگر اساتذہ سے دس درجہ بہتر پایا۔ بادشاہ نے انہیں خدمت سونپی کہ وہ دربار میں اس کے مقابل کھڑے رہا کریں۔

یہ چاروں اپنی خدمات نہایت مستعدی سے انجام دینے لگے۔ بادشاہ ان کی قابلیت سے ایسا خوش تھا کہ اپنے قریب سے بیٹھنے دیتا تھا۔
 انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے بخت نصر

کی پوری سلطنت کو ہلا دیا۔ جتنے بڑے بڑے کاہن، نجومی اور اہل حکمت تھے جان کے خوف سے روپوش ہو گئے۔ عام آدمیوں کو بھی اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ بادشاہ اسے جلال میں تھا کہ نیک عام کا حکم بھی دے سکتا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ بادشاہ نے کوئی خواب دیکھا لیکن بیدار ہونے پر خواب اسے یاد نہ رہا۔ بس اتنا یاد تھا کہ یہ خواب نہایت بھیاںک تھا۔ ایسا بھیاںک کہ اس رات کے بعد وہ کسی رات نہ سو سکا۔ اس کے دربار میں اور حدود سلطنت میں نجومیوں اور خواب کی تعبیر بتانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے ان سب کو طلب کیا اور منادی کرادی کہ جو میرے خواب کی تعبیر بتائے گا، میں اسے انعام سے مالا مال کر دوں گا لیکن اگر انہوں نے میرے خواب کی تعبیر نہ بتائی تو میں ان کی گردنیں اڑا دوں گا اور ان کے گھروں کو سہار کر دوں گا۔

اسے علم پر نازاں اہل علم مغضی باندھے ان کے سامنے حاضر ہو گئے۔ بادشاہ کا چہرہ خوف اور خطرے کے اثر سے سفید ہو رہا تھا۔ وہ غصے میں تھا لیکن غصے کی سرخی چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے خوف نے سارا خون پھوڑ لیا ہو۔
 ”میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور اب اس خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔“
 ”اے بادشاہ تو ابد تک جیتا رہ۔“ تمام نجومیوں نے یہ ایک وقت کہا ”تو اپنا خواب ہم سے بیان کر۔ کیا مجال جو ہم اس کی تعبیر نہ بتا سکیں۔“

”وہ خواب میں بھول چکا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ خواب بھی تم بتاؤ اور اس کی تعبیر بھی بیان کر دو۔“

”اے بادشاہ تو ابد تک جیتا رہ۔ ایسا کون ہوگا جو بادشاہ کے دل کی بات بتا سکے اور ایسا سوال بھی کسی امیر یا حاکم نے کبھی کیا ہوگا؟ دیوتاؤں کے سوا کون ہوگا جو یہ بتا سکے؟“
 ”مجھے خوب معلوم ہے کہ تم حیلے بہانے کر رہے ہو جبکہ تم جانتے ہو کہ میں تم سب کے قتل کے احکام جاری کر چکا ہوں۔ اگر تم نے میرے خواب کی تعبیر نہیں بتائی تو میں تم سب کو ہلاک کر دوں گا۔“

”بادشاہ، ہم پر رحم کی نظر ڈالے۔ یہ ہمارے اختیار سے باہر ہے کہ ہم بھولے ہوئے خواب کو دہرا سکیں۔ ہاں اگر ہمیں خواب معلوم ہو جائے تو ہم ضرور تعبیر بتا سکتے ہیں۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم اب تک اپنے علم کا ڈھونگ رچاتے رہے ہو۔ تم میں اتنی اہلیت ہی نہیں، میں تمہیں دغیفہ دیتا رہا۔ اب امتحان کا وقت آیا تو تم سب بھاگ رہے ہو۔“

بادشاہ نے کہا ”میں تمہیں دو تین دن کی مہلت دیتا ہوں، اس کے بعد تم جاہے جاؤ گے۔“
 بادشاہ کے غضب سے ہر بدن کاپنے لگا۔ تمام حکیم خواب کی تعبیر بتانے سے قاصر تھے۔ اب تو وہ صرف یہی کر سکتے تھے کہ جنگلوں میں جا کر روپوش ہو جائیں کیونکہ تین دن گزر چکے تھے اور بادشاہ کی طرف سے قتل کے احکام جاری ہو چکے تھے۔

بابل کی سرزمین اہل علم سے اچانک خالی ہو گئی۔ جتنے اہل نجوم اور خواب داں تھے اس طرح غائب ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

بادشاہ کے سپاہی ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے کئی کئی محوم رہے تھے۔ انہیں دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی بھی تلاش تھی لیکن وہ روپوش نہیں ہوئے تھے۔ خدا نے انہیں سپاہیوں کی نظروں سے دور کر دیا تھا۔ اسپنر اور اس کے سپاہی کئی مرتبہ حضرت دانیال علیہ السلام کے مکان میں آ کر تلاشی لے چکے تھے لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کا یہ سمجھنا بجا تھا کہ دانیال علیہ السلام بھی کہیں روپوش ہو چکے ہیں۔

چند دن کے تک دوو کے بعد بھی کوئی حکیم قتل نہ کیا جا سکا تو بادشاہ کا قہر اپنے اہلکاروں پر برسنے لگا۔ اس نے احکام جاری کر دیے کہ اگر اب بھی تمام حکیم ہلاک نہیں کیے گئے تو وہ لوگ قتل کیے جائیں گے جو ان حکیموں کے قتل پر مامور کیے گئے ہیں۔

اسپنر کو دانیال علیہ السلام کی یاد آ رہی تھی۔ وہ تو جوان بہت دانش مند ہے۔ میں نے اس کی مدد بھی بہت کی ہے۔ کاش! وہ اپنی روپوشی ختم کر کے مجھے مل جائے اور کسی طرح بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتا دے تو میری جاں ہلاکت میں پڑنے سے بچ جائے پھر یہ ہوا کہ دانیال علیہ السلام اچانک اس کے سامنے آ گئے۔

”بادشاہ سے کہو، دانیال مل گیا ہے۔ اگر مجھے قتل کرنے سے اس کا غصہ کم ہو سکتا ہے تو میں حاضر ہوں۔“

”بادشاہ سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام تو میں خود بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے اسی کام پر متعین کیا گیا ہے مگر تمہیں قتل کر کے مجھے ہرگز خوشی نہیں ہوگی۔ بہتر ہے کہ تم کہیں روپوش ہو جاؤ۔“

”مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔ شاید میں اسے مطمئن کر سکوں۔“

”اس وقت وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ وہ قتل کے

احکام صادر کرنا چاہتے ہیں جس میں تم بھی شامل۔“
 ”اگر میرے قتل سے ہائی لوگوں کی ہائیاں اٹھیں گی۔“
 ”مجھے خوشی ہوگی۔“

”یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔“
 ”پھر میں خود بادشاہ کے پاس ہانا ہوں۔“

”ایسا غضب مت کرنا۔ بادشاہ کا عتاب ہم دونوں پر ہوگا۔ وہ کہے گا، میں تمہیں تلاش نہ کر سکا۔“

”تو پھر مجھے اپنے ساتھ لے کر چلو اور کہو کہ تم مجھے کلا کر لائے ہو۔“

اسپنر مجبور ہو گیا اور اس نے دانیال علیہ السلام کو بادشاہ کے دربار پیش کر دیا۔

”دانیال! تمہیں تو اپنے علم پر بڑا بھروسہ تھا مگر اب معلوم ہوا کہ تمہارا علم ادھورا ہے اس لیے تم میری نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔“

”مجھے اپنے علم پر کبھی بھروسہ نہیں رہا مجھے تو اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔ وہی مجھے حقیقت سے آگاہ کرے گا۔ مجھے اگر مہلت ملے تو میں بادشاہ کے حضور تعبیر بیان کروں گا۔“

”تم بھی وہی حیلے بہانے کر رہے ہو جو دوسروں نے کیے ہیں مگر یاد رکھو جس طرح اب پکڑے گئے ہو آئندہ بھی پکڑے جاؤ گے۔“

”میں کہیں بھاگنے والا نہیں۔ بس مجھے ایک رات اور ایک دن کی مہلت مل جائے۔“

”میں تجھے یہ مہلت دیتا ہوں۔“

دانیال علیہ السلام گھر پہنچے اور اپنے ساتھیوں کو تمام معاملات سے آگاہ کیا اور ان سے استدعا کی کہ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر خدا سے اس کی رحمت طلب کریں۔

یہ چاروں پاک نفوس اللہ کے حضور عبادت کے لیے کھڑے ہو گئے۔

”اے رب العزت! تو نے ہم پر کرم کیا ہے کہ ہمیں ایسی باعزت زندگی سے نوازا ہے۔ بادشاہ نے ہمیں اپنا مقرب کیا ہے لیکن اب اس کے تیور بدل گئے ہیں۔ وہ ہماری جان کے درپے ہے۔ ہمیں اس کے عتاب سے بچالے۔ وہ راز ہم پر آشکار کر دے جس کی وجہ سے وہ ہماری ہلاکت پر تلا ہوا ہے۔ اس نے جو خواب دیکھا ہے، وہ ہمیں دکھا دے اور اس کی تعبیر بھی بتا دے۔ ہمیں باقی حکیموں کے ساتھ ہلاک نہ کر۔“

یہ دعا مانگنے کے بعد آپ سونے کے لیے لیٹ گئے۔

حقیقت کی چاندنی ہر طرف بکھر گئی۔ نیند کی دنیا نے انہیں ایک محل میں پہنچا دیا۔ وہاں بخت نصر محو خواب تھا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، دانیال علیہ السلام کی آنکھوں پر بھی وہ سب ظاہر ہو گیا۔ بادشاہ جو خواب دیکھ رہا تھا، دانیال علیہ السلام بھی دیکھ رہے تھے۔

جب یہ خواب ختم ہوا تو اللہ نے اس کی تعبیر بھی آپ کو بتا دی اور آپ نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ آنکھ کھلی تو خواب اور تعبیر دونوں اچھی طرح یاد تھے۔ آپ ایک مرتبہ پھر خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔

خدا کا نام تابد مبارک ہو۔

کیونکہ حکمت اور قدرت اسی کی ہے۔

وہی وقتوں اور زمانوں کو تبدیل کرتا ہے۔

وہی بادشاہوں کو معزول اور قائم کرتا ہے۔

وہی حکیموں کو حکمت اور دانش مندوں کو دانش عطا کرتا ہے۔

وہی گہری اور پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے

اور جو کچھ اندھیرے میں ہے اسے جانتا ہے

اور نور اسی کے ساتھ ہے۔

میں تیرا شکر کرتا ہوں اور تیری ستائش کرتا ہوں،

اے میرے باپ دادا کے خدا!

جو کچھ ہم نے تجھ سے مانگا تو نے مجھ پر ظاہر کیا،

کیونکہ تو نے بادشاہ کا معاملہ ہم پر ظاہر کیا۔

دانیال علیہ السلام شاہی محل پہنچے تو بادشاہ کو بے تاب سے

ٹپٹے ہوئے پایا۔ اس کی نظر جیسے ہی دانیال علیہ السلام پر پڑی

اس کی زباں پر پہلا سوال یہی تھا کہ میرے خواب کی تعبیر کیا

ہو؟

”میں آپ کو خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں، لیکن پہلے ان

حکیموں کی معافی کا اعلان کریں جو آپ کے خوف سے روپوش

ہو چکے ہیں کیونکہ ان میں میرے کئی استاد بھی شامل ہیں۔“

”اس میں تیری کوئی چال تو نہیں کہ میں ان سب کو

معاف کر دوں اور پھر تو غائب ہو جائے؟“

”میرے خدا نے مجھ پر ہر راز آشکارا کر دیا ہے۔ اب

میں کہیں غائب ہونے والا نہیں۔“

”جب تک تو میرا خواب مجھے یاد نہیں دلا دیتا اور اس

خواب کی تعبیر نہیں بتا دیتا، میں تجھے محل سے نہیں جانے دوں

گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“

بادشاہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ دوسرے دن تمام کاہن اور نجوی جو روپوش ہو گئے تھے، بلوائے گئے۔ دانیال علیہ السلام کو بھی پیش کیا گیا۔

دانیال علیہ السلام نے کہنا شروع کیا ”وہ بعید جو بادشاہ

نے پوچھا، حکما اور نجوی اور جادوگر اور فال گیر بادشاہ کو نہیں

بتا سکتے مگر آسمان پر ایک خدا ہے جو راز کی باتیں آشکارا کرتا

ہے۔ اس نے خواب کے ذریعے تجھ پر ظاہر کیا ہے کہ آخری

”میں کیا وقوع میں آئے گا۔“

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ مجھے تو تو یہ بتا کہ میں نے

خواب کیا دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے تیرے بتانے سے مجھے یاد

آ جائے۔“

”اے بادشاہ! تو نے ایک بڑی صورت دیکھی۔ وہ بڑی

صورت تیرے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور اس کی صورت ہیبت

ناک تھی۔ اس صورت کا سر خالص سونے کا تھا۔ اس کا سینہ اور

اس کے بازو چاندی کے اس کا شکم اور اس کی رانیں تانبے کی

تھیں۔ اس کی ٹانگیں لوہے کی اور اس کے پاؤں کچھ لوہے

کے اور کچھ مٹی کے تھے۔ تو اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایک

پتھر ہاتھ لگائے بغیر ہی کاٹا گیا اور اس صورت کے پاؤں پر

جو لوہے اور مٹی کے تھے، لگا اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تب

لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے

اور ہوا ان کو اڑا کر لے لی یہاں تک کہ ان کو پتا نہ چلا اور وہ

پتھر جس نے اس صورت کو توڑا اور ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور

تمام زمین میں پھیل گیا۔“

بادشاہ حیرت سے ان کا منہ تکتا رہا اور پھر یکدم چیخ اٹھا

”تو نے سچ کہا۔ مجھے سب یاد آ گیا۔ یہ خواب اسی طرح تھا

جس طرح تو نے بیان کیا۔ اب تو مجھے اس کی تعبیر بتا۔“

”اے بادشاہ! اب تو اس کی تعبیر سن! اے بادشاہ!

تو وہ شہنشاہ ہے جس کو آسمان کے خدا نے بادشاہی قدرت

و شوکت بخشی ہے اور جہاں کہیں بنی آدم سکونت کرتے ہیں

اس نے میدان کے چرندے اور ہوا کے پرندے تیرے

حوالے کر کے تجھ کو ان سب کا حاکم بنایا ہے۔ وہ سونے کا سرو تو

ہی ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہوگی جو تجھ سے

چھوٹی ہوگی۔ اس کے بعد ایک اور سلطنت تانبے کی جو تمام

زمین پر حکومت کرے گی اور چوتھی سلطنت لوہے کے مانند

مضبوط ہوگی اور جس طرح لوہا توڑا جاتا ہے اور سب چیزوں

پر غالب آتا ہے۔ اسی طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کرے گی اور

پھل ڈالے گی۔ اور تو نے دیکھا کہ اس میں لوہا مٹی سے ملا ہوا

تھا اس میں لوہے کی مضبوطی ہوگی اور چونکہ پاؤں کی انگلیاں

کچھ لوہے کی اور کچھ مٹی کی تھیں اس لیے سلطنت کچھ قوی کچھ

ضعیف ہوگی اور جیسا تو نے دیکھا کہ لوہا مٹی سے ملا ہوا تھا وہ

بنی آدم سے آمیختہ ہوں گے لیکن جیسے لوہا مٹی سے میل نہیں

کھاتا ویسے ہی وہ بھی باہم میل نہیں کھائیں گے اور ان

بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے

گا جو تابد بر باد نہیں ہوگی اور اس کی حکومت کسی دوسری قوم

کے حوالے نہ کی جائے گی بلکہ وہ ان تمام مملکتوں کو ٹکڑے

ٹکڑے اور نیست کرے گی اور وہی ابد تک قائم رہے گی۔

جیسا تو نے دیکھا کہ وہ پتھر ہاتھ لگائے بغیر ہی پہاڑ سے کاٹا

گیا اور اس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو

ٹکڑے ٹکڑے کیا، خدا تعالیٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھایا جو آگے

ہونے والا ہے اور یہ خواب سچا ہے اور اس کی تعبیر یقینی

ہے۔“

خواب کی تعبیر سنی تو بادشاہ اپنی سند سے اُترا اور دانیال

علیہ السلام کو سجدہ کیا اور حکم دیا کہ دانیال علیہ السلام کو ہدیہ دیا

جائے اور ان کے سامنے بخور جلایا جائے۔ گویا بادشاہ انہیں

اپنا دیوتا قرار دے رہا تھا۔ بخور دیوتاؤں کے سامنے جلایا جاتا

تھا۔

بادشاہ نے بھرے دربار میں اعلان کیا ”تیرا خدا

موجودوں کا معبود اور بھیدوں کا کھولنے والا ہے۔ اسی لیے تو

اس راز کو کھول سکا جس سے تمام اہل نجوم عاجز تھے۔“

اس کے بعد بادشاہ نے دانیال علیہ السلام کو انعامات

سے سرفراز کیا۔ بائبل کے تمام حکیموں پر عکرائی عنایت کی اور

انہیں تمام حکیموں کا سربراہ بنا دیا۔

حضرت دانیال علیہ السلام کو ان اعزازات سے کوئی

دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے بادشاہ سے استدعا کی کہ ان کے

ساتھیوں کو صوبوں کا سربراہ بنا دیا جائے۔ وہ خود صوبوں کی

سربراہی کے بجائے حکیموں پر عکرائی سے خوش ہیں۔ بادشاہ

نے ان کی درخواست قبول کی۔

حضرت دانیال علیہ السلام کو یہ مناصب ملے تو بابلیوں کو

سخت ناگوار ہوا۔ وہ کب یہ گوارا کر سکتے تھے کہ ایک غلام ان پر

عکرائی کرے۔ دانیال علیہ السلام نے بائبل کے نجومیوں کو قتل

ہونے سے بچایا تھا۔ انہیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے تھا لیکن

وہ حسد کی آگ میں جلنے لگے اور بڑے پیمانے پر ان کی مخالفت

شروع کر دی تاکہ انہیں بادشاہ کی نظروں سے گرا دیا جائے۔

انہیں اور کوئی کمزوری تو ہاتھ نہیں آئی۔ بس یہی ایک کمزوری تھی

کہ وہ بتوں کی پرستش سے دور تھے۔ محض یہ کمزوری بھی انہیں

سزا نہیں دلواسکتی تھی کیونکہ بادشاہ نے یروشلیم سے آئے ہوئے

اسیروں کو مذہب تبدیل نہ کرنے کی ضمانت دے رکھی تھی۔ اب

ایک ہی صورت تھی کہ بادشاہ کو یہ کہہ کر بھڑکایا جائے کہ دانیال

علیہ السلام اور ان کے ساتھی بابلیوں کے دیوتاؤں کو برا بھلا کہتے

ہیں۔ بادشاہ کے قریب رہنے والوں نے بادشاہ کے کان بھرنے

شروع کر دیے۔

”جب ہم ان کے مذہب میں دخل نہیں دے رہے ہیں

تو وہ کون ہوتے ہیں ہمارے دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے والے۔

اگر یہی حالات رہے تو ہمارے لوگ ہمارے دین سے برگشتہ

ہو جائیں گے۔“

”اگر انہوں نے کسی جادو کے زور سے بادشاہ کے

خواب کی تعبیر بتا دی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمارے دین

کے خلاف بولنا شروع کر دیں۔“

”وہ یہاں رہ رہے ہیں تو ان پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ

ہمارا مذہب بھی قبول کریں۔ اس کے بعد ہی انہیں احساس

ہوگا کہ وہ غلام ہیں ہمارے آقا نہیں۔“

بادشاہ پر زور دیا جانے لگا کہ وہ ان کو دی ہوئی رعایت

سے ہاتھ اٹھالے۔ انہیں مجبور کرے کہ ہماری صورتوں کو سجدہ

کریں۔“

بادشاہ کو یہ باور کرا دیا گیا کہ عوام کی بے چینی بڑھتی

جاری ہے۔ یروشلیم سے آئے ہوئے یہودیوں کو مجبور کیا

جائے کہ وہ ہمارے بتوں کو سجدہ کریں اور یہ اسی وقت ہوگا

جب دانیال علیہ السلام اور ان کے تینوں ساتھی ایسا کریں گے۔

اس کے بعد عام یہودیوں کی ہمت بھی ٹوٹ جائے گی۔

بادشاہ کا رعب اسی وقت قائم ہوگا جب اس کے غلام اس کی

فرمانبرداری کریں گے۔

بادشاہ کو اتنا بھڑکایا کہ وہ کہہ اٹھا ”میں یہ برداشت نہیں

کروں گا کہ یروشلیم کے قیدی اور غلام ہمارے دیوتاؤں کو برا

بھلا کہیں۔ انہیں ان دیوتاؤں کی عزت کرنی ہوگی۔“

یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ بادشاہ کی برہمی کا ایک اور

موقع نکل آیا۔ بخت نصر نے سونے کی ایک صورت بنوائی تھی

جس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی چھ ہاتھ تھی اور اسے

دورا کے میدان صوبہ بائبل میں نصب کیا گیا تھا۔ جب اس کی

تعمیر ہو چکی تو بادشاہ نے یہ اعلان جاری کیا کہ تمام ناظم، حاکم،

سردار، قاضی، خزانچی، مشیر اور تمام صوبوں کے منصب دار اس

صورت کی تقدیس پر حاضر ہوں۔

اس اعلان کے جواب میں تمام عہدے دار اس کی تقدیس کے لیے اس مقام پر جمع ہو گئے جہاں اس مورتی کو نصب کیا گیا تھا۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے ساتھی، خنیاہ، یسایہ ایل اور عزریاہ بھی چونکہ منصب دار تھے، حاضر ہوئے۔ یروشلیم کے قیدیوں نے ان کی حاضری کو نفرت سے دیکھا کہ یہ لوگ بالکل ہی کلدانی بن گئے ہیں اور انہوں نے بابلیوں کا مذہب اختیار کر لیا ہے جو اس طرح مورت کی تقدیس کے لیے حاضر ہو گئے ہیں۔

اس مورتی کو شہر کے وسط میں نصب کیا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف حاکم، سردار، منصب دار، خزانچی مقرر بنائے گئے تھے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے ساتھی بھی ایک طرف کھڑے تھے کہ منادی کرنے والے نے منادی کی۔ ”اے لوگو! جتنے لوگ یہاں جمع ہیں ان کے لیے یہ حکم ہے کہ جس وقت قرنا اور نے اور ستار اور باب اور برہا اور چقناہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنو تو اس سونے کی مورت کے سامنے جس کو بخت نصر بادشاہ نے نصب کیا ہے، منہ کے بل گر کر سجدہ کرو اور جو کوئی سجدہ نہیں کرے گا اسی وقت آگ کی جلتی بجھنی میں ڈالا جائے گا۔“

اس اعلان کے ختم ہوتے ہی سازوں کی آواز گونجنے لگی اور وہاں موجود لوگ منہ کے بل زمین پر گر گئے۔ اس میدان میں صرف تین آدمی تھے، جو اپنی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تینوں حضرت دانیال کے ساتھی تھے۔ پہرے پر متعین سپاہیوں نے قہر آلود نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”تم سجدے میں کیوں نہیں گرے؟“
”اس لیے کہ ہم ان مورتیوں کی پرستش نہیں کرتے۔ ہمارا خدا آسمان پر ہے۔ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں۔“
”کیا تم یہ بات بادشاہ کے سامنے بھی کہہ سکتے ہو؟“
”ہمیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔“

ان تینوں کو اسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔ بائبل کے شہریوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ صوبہ داروں کو بادشاہ کی حکم عدولی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔

ان تینوں کو عام قیدیوں کی طرح رستوں میں جکڑ کر بادشاہ کے حضور پہنچا دیا گیا۔ سزا کا اعلان تو پہلے ہی ہو چکا تھا کہ جو سجدہ نہیں کرے گا، اسے آگ میں ڈالا جائے گا لیکن بادشاہ پھر بھی اتفاق کرنا نہیں چاہتا تھا کہ جو خبریں اس تک پہنچی ہیں وہ سچی ہیں یا نہیں؟

”کیا یہ سچ ہے کہ جو سونے کی مورت میں نے بنوائی تھی

تم نے اسے سجدہ نہیں کیا؟“

”یہ سچ ہے محترم بادشاہ!“

”کیا تم نے میرا اعلان نہیں سنا تھا؟“

”اعلان بھی سنا تھا۔“

”کیا تم اسے حکم عدولی نہیں سمجھتے؟“

”ایک بادشاہ تم سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے اس کا حکم مانا ہے۔“

”کیا تمہیں آگ میں ڈالے جانے سے خوف نہیں آتا؟“

”ہمارا خدا جس کی ہم عبادت کرتے ہیں اتنی قدرت رکھتا ہے کہ ہمیں اس آگ سے چھڑا لے گا۔“

”اب میں بھی دیکھتا ہوں کہ کون سا معبود تم کو میرے ہاتھ سے چھڑا لے گا۔“

بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک بڑا کنواں تیار کیا جائے اور اس میں کئی دن رات آگ کے بڑے بڑے لاؤروشن کیے جائیں۔ اس کی آگ معمول سے سات گنا زیادہ کریں۔ جب اس آگ کی چش دور تک محسوس کی جانے لگے کنویں کا فرش اور دیواریں پتے ہوئے لوہے کے مانند ہو جائیں تو مجھے خبر کی جائے۔

اس کنویں کی آگ سات دن تک دہکتی رہی۔ جب یہ خوب گرم ہو گیا تو بخت نصر کو خبر کی گئی ”بھٹی تیار ہے۔“ بخت نصر نے اپنے لشکر کے چند زور آور پہلوانوں کو طلب کر کے انہیں حکم دیا کہ ان تینوں کو جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیں۔ آگ کی چش اتنی زیادہ تھی کہ کوئی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا لیکن بادشاہ کا حکم ٹالا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ان پہلوانوں نے حضرت دانیال علیہ السلام کے تینوں ساتھیوں کو رستوں میں جکڑا کر آگ کے سنے ہوئے کنویں کی طرف چلے۔ آگ اتنی تیز تھی کہ یہ پہلوان کسی نہ کسی طرح وہاں تک پہنچے تو گئے۔ تینوں کو کنویں میں پھینک بھی دیا لیکن خود اتنی بُری طرح مجلس گئے کہ اسی وقت دم توڑ گئے۔

یہ تماشا دیکھنے کے لیے ایک خلعت جمع ہو گئی تھی۔ بھٹی میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور وہ تینوں اعدا تھے۔ دانیال علیہ السلام اچانک غائب ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے انہیں جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بعض لوگ یہ خیال کر رہے تھے کہ دانیال علیہ السلام اپنے ساتھیوں کو مشکل میں چھوڑ کر کہیں فرار ہو گئے ہیں جبکہ وہ خدا کے سامنے سربسجود تھے اور گڑگڑا کر دعا کر رہے تھے۔

خدا کا نام تاباں مبارک ہو
حکمت اور قدرت اسی کی ہے
تو ہی مارتا ہے اور تو ہی زعمہ کرتا ہے
تجھے آگ کو گلزار بنانا آتا ہے
تو انگاروں کو پھولوں میں بدل دے
پردیس میں ہماری عزت رکھ لے
اپنے دین کا نام اونچا کر
اور اس کا ذریعہ ہمیں بنا۔

☆☆☆

آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ شعلے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ آگ سے ہلے کنویں کی جانب سے ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں جیسے بارش کا دروازہ کھلا ہوا ہو۔ کسی کی اب بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کنویں کے قریب جائے۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے بادشاہ کے پاس پہنچے۔ وہ بھی مسند سے اٹھا اور وسط شہر میں پہنچا۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے تو وہ اپنے ارکان دولت کے ہمراہ کنویں پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ کنویں کے اندر چار آدمی آرام سے بٹل رہے ہیں۔ آگ انہیں جلانے سے پہلے خود جل گئی ہے۔ اسے یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ تین آدمی آگ میں ڈالے گئے تھے، یہ چار کیسے ہو گئے؟

اس نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے پوچھا ”ہم نے تین شخصوں کو بندھا کر آگ میں نہیں ڈلوا یا؟“ سب نے گواہی دی کہ آگ میں پھینکے جانے والے تین ہی تھے۔ ”پھر یہ چوتھا کون ہے؟“ بادشاہ نے کہا ”انہیں باہر نکالو تاکہ یہ معاملہ ہو۔ خود ہی بتائیں گے کہ چوتھا کون ہے؟“

انہیں باہر نکالا گیا تو یہ پھر تین تھے۔ چوتھا نہیں تھا اور یہ تینوں صحیح سلامت تھے۔ ان کے کپڑے تک نہیں جلتے تھے۔ آگ نے انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچایا تھا۔

بادشاہ نے ان سے پوچھا ”میں نے تمہارے ساتھ ایک چوتھے کو بھی دیکھا تھا۔ وہ کون تھا اور اب کہاں ہے؟ یہ کیا ماجرا ہے؟“

”اس چوتھے شخص کے بجائے یہ بھی تو پوچھو کہ آگ کا کام جلاتا ہے، اس نے ہمیں جلایا کیوں نہیں؟“

”مجھے یہ بھی پوچھتا ہے مگر چوتھے شخص کا احوال تو بتاؤ۔“
”اے بادشاہ! تو نے یہ کہہ کر ہمیں آگ میں بھیجا تھا کہ

دیکھتا ہوں کون سا معبود تمہیں میرے ہاتھوں سے ہلا کر دے گا۔“

”ہاں کہا تھا۔“

”اور ہم نے کہا تھا کہ وہ خدا جس کی ہم مہاراجہ لڑے ہیں، ہمیں اس آگ سے چھڑا لے گا۔“

”مجھے یہ بھی یاد ہے۔“

”ہمیں وہ چوتھا اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ تھا جس نے آگ کو گلزار بنادیا اور ہم جلنے سے محفوظ رہے۔ اب تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ وہی معبود عبادت کے لائق ہے جو اپنے بندوں کو مظالم سے رہائی دلاتا ہے۔“

بخت نصر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دل پر مہر لگی ہوئی تھی۔ خدا پر ایمان تو نہیں لاسکتا تھا لیکن اس نے اتنا کیا کہ اعلان کر دیا کہ دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کوئی نامناسب بات زبان پر نہ لائی جائے۔

”میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں کہ جو قوم یا امت بنی اسرائیل کے خدا کے حق میں کوئی نامناسب بات کہے گا تو اس کے گٹھڑے گٹھڑے کیے جائیں گے اور اس کے گھر مسمار کیے جائیں گے کیونکہ کوئی دوسرا معبود نہیں جو اس طرح رہائی دے سکے۔“

اس فرمان کے بعد اس نے ان تینوں کو دوبارہ اپنے مناصب پر فائز کر دیا۔

بادشاہ کی طرف سے صرف ان کی عزت افزائی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس واقعے کے بعد تمام اہل یروشلیم کو جو قید ہو کر آئے تھے، عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

بخت نصر کی فتوحات کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دنیا کی نامور قومیں اس کی برتری کو تسلیم کر رہی تھیں۔ اس نے مصر کے فرعون پر بھی غلبہ پالیا تھا۔ یروشلیم کو کھنڈر میں تبدیل کر چکا تھا۔ ہیکل سلیمانی کو جلا کر خاکستر بنا چکا تھا۔ اس نے دس ہزار مزید قیدی بنا لیے تھے جنہیں بابل کے اطراف میں آباد کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھا۔ اب اسے یہ فکر رہنے لگی تھی کہ اس کے بعد اس سلطنت کا کیا ہوگا؟

ایک روز یہ خیالات اس کے دل و دماغ پر بُری طرح حاوی ہو گئے۔ وہ کچھ دیر اپنے بچک پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا پھر اسے نیند آ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ زمین کے وسط میں ایک نہایت اونچا درخت ہے۔ وہ درخت بڑھا اور مضبوط ہوا اور اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی اور وہ زمین کی انتہا تک

دکھائی دینے لگا۔ اس کے پتے خوش نما تھے اور اس میں پھل لگے ہوئے تھے۔ میدان کے چرندے اس کے سائے میں اور ہوا کے پرندے اس کی شاخوں پر بسیرا کرتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ایک فرشتہ آسمان سے اُتر آیا۔ اس نے بلند آواز سے پکار کر یوں کہا کہ درخت کو کاٹو۔ اس کی شاخیں تراشو اور اس کے پتے جھاڑو اور اس کا پھل بکھیر دو۔ چرندے اس کے نیچے سے چلے جائیں اور پرندے اس کی شاخوں پر سے اڑ جائیں۔ جڑوں کا کندہ زمین میں باقی رہنے دو۔ ہاں لوہے اور تانبے کے بندھن سے بندھا ہوا میدان۔ ہری گھاس میں رہنے دو اور وہ آسمان کی شبیہ سے تر ہو اور اس کا حصہ زمین کی گھاس میں حیوانوں کے ساتھ ہو۔ اس کا دل انسان کا دل نہ رہے بلکہ اس کو حیوان کا دل دیا جائے اور اس پر سات دور گزر جائیں۔ یہ حکم نگہبانوں کے فیصلے سے ہے اور یہ امر قدسیوں کے کہنے کے مطابق ہے تاکہ سب ذی حیات پہچان لیں کہ حق تعالیٰ آدمیوں کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اسے دیتا ہے بلکہ آدمیوں میں سے ادنیٰ آدمی کو اس پر قائم کرتا ہے۔

آنکھ کھلی تو رات ختم ہونے کو تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ دوبارہ سو گیا تو دیکھے ہوئے خواب کی تفصیلات اس کے حافظے سے فراموش ہو جائیں گی۔ وہ پورے خواب کو اپنے ذہن میں دہرانے لگا۔ پھر بھی کچھ باتیں اس کے حافظے سے محو ہو گئی تھیں لیکن اسے یقین تھا کہ دانیال (علیہ السلام) اس خواب کے ٹکڑوں کو جوڑ کر اس کی تعبیر ضرور بتا دیں گے۔ اس نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور دانیال (علیہ السلام) کو اپنے حضور طلب کر لیا۔

”اے بیلطشضر (دانیال علیہ السلام) ساحروں کے سردار۔ میں جانتا ہوں کہ مقدس الہون کی روح تجھ میں ہے اور کوئی راز کی بات تیرے لیے مشکل نہیں۔ اس لیے جو خواب میں نے دیکھا ہے اور جتنا حصہ بھی یاد رہ گیا ہے اس کی کیفیت اور تعبیر بیان کر۔“ بادشاہ نے کہا اور اپنا خواب انہیں سنا دیا۔ خواب سن کر حضرت دانیال علیہ السلام کچھ پریشان نظر آنے لگے اور تعبیر بیان کرنے میں کچھ تاثر ہوا۔ تب بادشاہ نے انہیں حوصلہ دیا اور ان سے کہا کہ تعبیر کچھ بھی ہو وہ بیان کرنے میں پریشان نہ ہو۔ اگر تعبیر بادشاہ کے حق میں نہ ہوگی تو بھی اس کا عتاب دانیال علیہ السلام پر نہیں ہوگا۔

”اے بادشاہ....!“ دانیال (علیہ السلام) نے تعبیر بتاتے ہوئے کہا ”یہ خواب تجھ سے کینہ رکھنے والوں کے لیے

اور اس کی تعبیر تیرے دشمنوں کے لیے ہو۔ وہ درخت جو تو نے دیکھا کہ بڑھا اور مضبوط ہوا جس کی چوٹی آسمان تک پہنچی اور زمین کی انتہا تک دکھائی دیتا تھا۔ جس کے پتے خوش نما تھے اور میوہ فراوان تھے۔ جس میں سب کے لیے خوراک تھی۔ جس کے سائے میں میدان کے چرند اور شاخوں پر ہوا کے پرندے بسیرا کرتے تھے۔ اے بادشاہ، وہ تو ہی ہے جو بڑا اور مضبوط ہوا کیونکہ تیری بزرگی بڑھی اور آسمان تک پہنچی اور تیری سلطنت زمین کی انتہا تک۔ اور جو تو نے دیکھا کہ ایک نگہبان، ہاں ایک قدسی آسمان سے اُتر آیا اور کہنے لگا کہ درخت کو کاٹ ڈالو اور اسے برباد کر دو لیکن اس کی جڑوں کا کندہ زمین میں باقی رہنے دو کہ اسے لوہے اور تانبے کے بندھن سے بندھا ہوا میدان کی ہری گھاس میں رہنے دو کہ وہ آسمان کی شبیہ سے تر ہو اور جب تک اس پر سات دور نہ گزر جائیں، اس کا بخرہ زمین کے حیوانوں کے ساتھ ہو۔

اے بادشاہ! اس کی تعبیر اور حق تعالیٰ کا وہ حکم جو بادشاہ کے حق میں ہوا ہے یہی ہے کہ تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور تو نیک کی طرح گھاس کھائے گا اور آسمان کی شبیہ سے تر ہوگا اور تجھ پر سات دور گزر جائیں گے۔ تب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ انسان کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور اسے جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے اور یہ جو انہوں نے حکم کیا کہ درخت کی جڑوں کے کندے کو باقی رہنے دو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو معلوم کر چکے گا کہ بادشاہی کا اقتدار آسمان کی طرف سے ہے تو تو اپنی سلطنت پر پھر قائم ہو جائے گا۔ اس لیے اے بادشاہ، تیرے حضور میری صلاح قبول ہو اور تو اپنی خطاؤں کو صداقت سے اور اپنی بدکرداری کو مسکینوں پر رحم کرنے سے دور کر۔ ممکن ہے کہ اس سے تیرا اطمینان زیادہ ہو۔“

اس خواب کو ایک سال گزرا تھا۔ وہ بابل کے شاہی محل میں ٹہل رہا تھا اور اپنے کارناموں پر فخر کر رہا تھا۔ ”میں نے ایک چھوٹے سے گاؤں کو ایسا پر شکوہ اور شاندار دار السلطنت بنادیا کہ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ شہر کے گرد بڑی بڑی مضبوط فصیلیں، نہریں اور خندقیں شہر کے اندر دیوتاؤں اور دیویوں کے مندر۔ شاندار باغات جنہیں عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سب میری بدولت ہوئے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں تک کو میرا مہر ہون منت ہوتا چاہیے کہ میں نے ان کی مورتیاں بنوا کر شہر کے چوراہوں میں نصب کرائیں۔“

وہ ابھی بڑے بڑے بول، بول رہا تھا کہ آسمان سے آواز آئی۔ منادی کرنے والے نے منادی کر کے پکارا ”اے بادشاہ! تیرے حق میں یہ فتویٰ ہے کہ سلطنت تجھ سے جاتی رہے اور تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور نیک کی طرح گھاس کھائے گا اور سات دور تجھ پر گزریں گے جب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ آدمیوں کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور اسے جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔“

تاریخ میں ہے کہ اس آواز کے ختم ہوتے ہی وہ ایک مرض ”گرگ خولیا“ کا شکار ہو گیا۔ اس مرض کا مریض خود کو بھیڑیا سمجھنے لگتا ہے۔

وہ محل کی چھت سے اُترتا تو بالکل بھیڑیا بن چکا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ہر طرف کہتا پھرتا تھا کہ میں تم سب کا رب ہوں۔ وہ اتنا خوف ناک ہو چکا تھا کہ شاہی خاندان کے افراد اس کے قریب جانے سے ڈر رہے تھے۔ پہلے تو اس کے سپاہیوں نے یہ سوچا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے لیکن پھر یہ سوچا کہ اس طرح عوام کو یہ تاثر ملے گا کہ بغاوت ہو گئی ہے اور بادشاہ کو قید کر دیا گیا ہے۔ اس کا پاگل پن لوگ خود دیکھ لیں تو لوگوں کو یقین آ جائے گا کہ اب وہ حکومت کرنے کے قابل نہیں رہا۔

بادشاہ سب کو گالیاں بکتا ہوا ننگ دھڑنگ محل سے باہر نکل گیا۔ پہرے داروں نے اسے یہ آسانی جانے دیا۔ وہ بازار میں نکلا تو پہلے تو لوگوں کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ بخت نصر ہو سکتا ہے۔ رعب و جلال والا بادشاہ۔ اس کے جسم پر شاہی لباس تو کیا، عام لباس بھی نہیں۔

یہ سب اس کے تکبر کی سزا تھی جو اسے مل رہی تھی۔ دانیال علیہ السلام نے اس کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ وہ مسکینوں پر رحم کھائے لیکن خواب کی تعبیر کو بھی تو پورا ہونا تھا۔ اس نے اس سنجیدہ کو نظر انداز کیا اور تکبر کے ایسے الفاظ ادا کیے کہ خدا کے جلال کا سزا دار بن گیا۔

وہ بازار میں ایک جگہ رکا ہوا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ”مجھے بتاؤ کہ بلند آسمانوں میں کس کی حکومت ہے اگر میں اس سے واقف ہوں تو اسے قتل کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لوں گا کیونکہ زمین والوں سے تو میں قاریغ ہو چکا ہوں۔“ اس کے اس دعوے پر انفسوس کرنے کے سوا لوگ اور کیا کر سکتے تھے۔ بڑی عمر کے لوگ تو اس کی حالت کو عبرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے لیکن بچوں کے ہاتھ تماشا لگ گیا تھا۔

وہ جس طرف جاتا، بچوں کی ٹولی اس کا نامہ بولی وہ بخت نصر جس کے سامنے دلیاے مارے، بادشاہ اٹھ اٹھالے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ بچے اس کی ٹالی اڑاتے مہر پہ تھے۔ بادشاہ ان بچوں کی طرف دیکھ کر لپکا تو وہ سنہ ہوا ہو جاتے اور ادھر ادھر سے آ کر پھر جمع ہو جاتے۔ پھر انہوں نے ایک نیا شغل ڈھونڈ نکالا۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں مٹیوں میں بھر لیں۔ اسے دیکھتے ہی اس کا نشانہ لیتے۔ وہ دور سے چلاتا اور بچے تھپتھپ لگاتے۔

”بے وقوف! میں تمہارا رب ہوں اور تم مجھے پتھر مارتے ہو۔ میں آسمان پر حکومت کرنے جا رہا ہوں اور تم مجھ سے ڈرتے تک نہیں۔“ وہ ان کی طرف دوڑتا اور بچے دور بھاگ جاتے۔

یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ بادشاہ نے یردھلم کو اجاڑا ہے اور انبیازادوں کو قتل کیا ہے۔ مصوم بچوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں۔ یہ سب اسی کی سزا ہے۔ یردھلم سے قید کر کے لائے ہوئے لوگوں کے لیے یہ خوش کاموچ تھا کہ ان کا دشمن اس حال کو پہنچ گیا ہے۔ یہ اسیر اب بوڑھے ہو چکے تھے لیکن اسے ستانے میں بچوں کے ساتھ بچے بچے نظر آتے تھے۔

شاہی محل میں اخرا تفری پگنی ہوئی تھی۔ اس کے وزراء جاچے تھے کہ کسی کو اس کی جگہ بادشاہ بنا دیا جائے۔ اب عوام کی طرف سے مخالفت بھی متوجع نہیں تھی لیکن دانیال علیہ السلام پیش گوئی کر چکے تھے کہ سات سال کے بعد بادشاہ کی عقل واپس آ جائے گی اس لیے اس کے تخت پر بیٹھتا ہوا ہر کوئی ڈرتا تھا کہ اگر بخت نصر کی عقل واپس آگئی تو وہ تخت پر بیٹھنے والے سے سخت انتقام لے گا۔ پھر یہی طے ہوا کہ کوئی تخت پر نہ بیٹھے بلکہ سب مل کر امور مملکت چلاتے رہیں اور بادشاہ بخت نصر کی صحت یابی کا انتظار کریں۔

شاہی محل میں یہ مشورے ہو رہے تھے ادھر بادشاہ کے خواب کی تعبیر کے الفاظ پورے ہو رہے تھے۔ دانیال علیہ السلام نے تعبیر بتاتے ہوئے کہا تھا ”اے بادشاہ! تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور نیک کی طرح گھاس کھائے گا۔“

اس بات کو بابل کے بچے پورا کر رہے تھے۔ انہوں نے پتھر مار مار کر بادشاہ کو اتنا تنگ کیا کہ وہ شہر سے نکل کر جنگل میں گھس گیا ہو گیا۔ جب کئی دن گزر گئے اور وہ باہر نہ آیا تو لوگ اس کا حال دیکھنے کے لیے جنگل میں گئے اور یہ دیکھ کر

حیرت زدہ رہ گئے کہ اس کے جسم پر بڑے بڑے بال نمودار ہو گئے ہیں۔ اس کے ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں کہ کسی وحشی درندے کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے جانوروں کی طرح کھڑا ہوا ہے اور گھاس چر رہا ہے۔ جنگل کے دوسرے جانور بھی اس کے ارد گرد گھوم پھر رہے ہیں۔ گویا وہ جانور اسے بھی اپنی طرح کا جانور سمجھ رہے ہیں۔ یہ عبرت ناک حالت دیکھ کر لوگ دور ہی سے لوٹ آئے۔

اس کی یہ حالت بائبل میں اتنی مشہور ہوئی کہ لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لیے جنگل میں جانے لگے اور ہر مرتبہ اس کی حالت خراب سے خراب تر ہی دیکھی۔ وہ انسان نہیں کوئی جنگلی جانور نظر آتا تھا جس کا پورا بدن بانوں سے چھپ گیا تھا۔

عرصہ دراز تک لوگ اس کا تماشا دیکھنے جنگل میں جاتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس تعداد میں کمی آنے لگی۔ بہت سوں کو تو یاد بھی نہیں رہا کہ بخت نصر کبھی ان کا بادشاہ تھا۔ لوگ اسے بھولنے لگے تھے لیکن دانیال علیہ السلام کو اپنی بتائی ہوئی تعبیر پر پورا یقین تھا۔ وہ انتظار میں تھے کہ کب سات سال پورے ہوں اور اللہ کے وعدے کے مطابق بخت نصر کی عقل واپس آئے۔

☆☆☆

اس دن دھڑاکے کی بارش ہو رہی تھی۔ جنگل جل تھل ہو گیا تھا۔ جنگل کے جانور بھینکتے بھینکتے تھک چکے تھے۔ اب وہ بارش سے بچنے کے لیے گئے درخت ڈھونڈ رہے تھے لیکن بارش اتنی موسلا دھار تھی کہ ہر درخت چھلنی بنا ہوا تھا۔ بخت نصر بھی جانوروں کے ساتھ جانور بنا ڈھرا ڈھر بھاگتا پھر رہا تھا بالآخر تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ دن میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ وقفے وقفے سے بجلی کڑکتی تھی تو روشنی کا جھپکا ہو جاتا تھا۔ بادل گرجے تھے تو تمام جانور بے اختیار آسمان کی طرف منہ اٹھاتے تھے۔ بخت نصر بھی ان کی پیروی کر رہا تھا۔ بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ جو نظر اٹھا تو نظریں جم کر رہ گئیں۔ خدا کی ہیبت انکی دل پر طاری ہوئی کہ بے اختیار کہہ اٹھا ”وہی ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس کی سلطنت ابدی ہے۔ اسی کی مملکت پشت در پشت ہے۔ زمین کے تمام باشندے تاجزے گئے جاتے ہیں اور وہ آسمانی لشکر اور اہل زمین کے ساتھ جو کچھ چاہتا ہے، کرتا ہے اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا اس سے کہے کہ تو کیا

کرتا ہے۔“

ان خیالات کے ساتھ ہی اس کی کھوئی ہوئی عقل واپس آ گئی۔ عقل کی واپسی کے ساتھ ہی اس نے اپنی حالت پر غور کیا تو شرمندگی نے اس کا سر جھکا دیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ بخت نصر ہے، بائبل کا بادشاہ۔ اور اب ننگ بیٹھا ہے۔ جانوروں پر نظر پڑی تو خوف کی ایک لہر بدن میں دوڑ گئی۔ ان جانوروں کے درمیان سات سال گزار دیے تھے۔ عقل آتے ہی جان کا خوف دامن گیر ہوا۔ جس بیڑ کے نیچے بیٹھا تھا، گھبرا کر اسی بیڑ پر چڑھ گیا۔ حواس درست ہوئے تو اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ دانیال علیہ السلام کا نام یاد آیا۔ ان کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔ انہوں نے کہا تھا، تجھ پر سات دور گزر جائیں گے۔ تب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ انسان کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔ جب تو معلوم کر چکے گا کہ بادشاہی کا اقتدار آسمان کی طرف سے ہے تو تو اپنی سلطنت پر پھر قائم ہو جائے گا۔ تو کیا سات دور گزر گئے؟ شاید ایسا ہی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آسمان پر رہنے والا خدا ہی اصل بادشاہ ہے۔ وہ بڑی دیر تک اپنی حالت پر اسوس کرتا رہا اور حق تعالیٰ سے معافی مانگتا رہا۔

اب اسے یہ فکر تھی کہ اس حالت میں کس طرح جنگل سے نکل کر شہر میں داخل ہو۔ اتنے عرصے میں نہ جانے کون تخت پر بیٹھ چکا ہو۔ کاش! دانیال کو یاد آ جائے کہ سات دور گزر چکے ہیں۔ کاش! کوئی آئے اور مجھے یہاں سے لے جائے۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا جا رہا تھا اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں اس بھیا تک جنگل میں رات کیسے کاٹوں گا؟ وہی جنگل جو سات سال سے اس کا مسکن بنا ہوا تھا۔ اب اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

بارش ختم ہو چکی تھی لیکن اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ کچھ بادلوں کا اندھیرا، کچھ رات کی سیاہی۔ بھیا تک جانوروں کی آوازوں نے جنگل سر پر اٹھایا ہوا تھا اور وہ درخت پر بیٹھا تھا کہ دن گزرے تو شاید خدا کی قدرت کا ظہور ہو۔ کوئی اس کی مدد کو پہنچے۔

دانیال علیہ السلام انگلیوں پر حساب مگن رہے تھے۔ وہ بائبل کے لوگوں کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کا خدا جو وعدہ کرتا ہے اسے پورا ضرور کرتا ہے چنانچہ جیسے ہی سات سال پورے ہوئے، انہوں نے بادشاہ کے وزیروں اور مشیروں کو مجبور کیا کہ وہ جنگل میں جائیں اور بخت نصر کو تلاش کریں۔

تمام وزیر، مشیر اور شاہی خاندان کے افراد لشکر کے چند سرداروں کے ہمراہ کنواروں اور تیروں سے مسلح ہو کر جنگل میں داخل ہوئے۔ بائبل کے شہری جنگل کے آس پاس جمع ہو گئے تھے کہ دیکھیں بادشاہ کس حال میں واپس آتا ہے۔ آتا بھی ہے یا مرکب چکا؟

بادشاہ کو تلاش کرنے والے جنگل میں ادھر ادھر پھیل گئے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ بادشاہ ہے کہاں؟ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دوپہر ہو گئی تو سرداروں کو حضرت دانیال علیہ السلام پر غصہ آنے لگا کہ انہوں نے خواہ مخواہ ہمیں مشقت میں ڈالا۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ اب تک تو بادشاہ خونخوار جانوروں کی غذا بن چکا ہوگا۔ اب وہ کہاں جو ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ سب ایک جگہ جمع ہو گئے اور مایوس ہو کر واپس ہونے کا ارادہ کر رہے تھے کہ اچانک ایک درخت سے آواز آئی۔

”اریوک!“ بادشاہ اپنے ایک سردار کو نام لے کر پکار رہا تھا ”میں یہاں ہوں۔ اس درخت کے نیچے جہاں تم گھڑے ہو لیکن میں برہنہ ہوں۔ میرے پاس کپڑے نہیں ہیں۔“

”ہمیں معلوم تھا کہ اگر پوشاک تمہارے بدن پر ہوگی بھی تو بہت میل ہو چکی ہوگی۔ ہم اپنے ساتھ کپڑے لے کر آئے ہیں۔“

”اس پوشاک کو درخت کے نیچے رکھ دو اور خود کچھ دیر کے لیے ادھر ادھر ہو جاؤ۔ میں نیچے آ کر کپڑے پہن لوں گا۔“

اریوک نے کپڑے درخت کے نیچے رکھ دیے اور سب لوگوں کو لے کر درخت سے دور چلا گیا۔ بادشاہ نیچے اُترا اور کپڑے پہن لیے۔ پھر اس نے اریوک کو آواز دی کہ اب وہ لوگ آ سکتے ہیں۔

کپڑوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ اس کی برہنگی ختم ہو گئی تھی درندہ علیے سے وہ اب بھی انسان نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ہال اس کے کامدھوں سے نیچے لٹک رہے تھے۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے پر جاہ جاکل کی تہ چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی اس قابل نہیں تھا کہ دنیا کو اپنا چہرہ دکھاسکے۔ اس کے وزیروں نے ایک بڑا کپڑا اس پر ڈال دیا اور گھوڑے پر اٹھا کر جنگل سے باہر لے آئے۔ ہزاروں افراد کا مجمع جنگل کے باہر کھڑا تھا۔ لوگوں نے بس اتنا دیکھا کہ کوئی گھوڑے پر اٹھا ہے جس پر ایک بڑی سی چادر پڑی ہوئی ہے۔

بادشاہ کے وزیر اسے محل میں لے کر آئے، اٹھا اور حکیم جمع تھے۔

بادشاہ کے بال تراشے گئے۔ بڑھے ہوئے ناخن کا لے گئے۔ حکیموں نے علاج شروع کر دیا۔ کئی مہینے صاحب فراش رہنے کے بعد اس نے تخت سنبھالا۔ تخت سنبھالتے ہی اس نے سرکاری اعلامیہ جاری کیا۔

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ آسمانی لشکر اور زمین کے باشندوں میں حق تعالیٰ ہی قادر مطلق ہے۔ میں اس کی تعظیم و تکریم اور ستائش کرتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ آسمان کا بادشاہ اپنے سب کاموں میں راست اور اپنی سب راہوں میں عادل ہے اور مغروروں کو ذلیل کر سکتا ہے۔“

اب اسے خدا کی حقانیت کا یقین آ گیا تھا۔ یہ دانیال علیہ السلام کی بڑی فتح تھی کہ بخت نصر ایک خدا کا پرستار بن گیا تھا۔ اسرائیلی غلاموں کی بھی یہ بڑی کامیابی تھی کہ ان کو حج کرنے والا خود ان کا مفتوح بن گیا۔

بادشاہ ان کے مذہب کا حلقہ بکوش ہوا تو بائبل کے لوگوں میں بھی اسرائیلیوں کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ بخت نصر کا یہ آخری دور اسرائیلیوں کے لیے سہرا دور تھا۔

☆☆☆

بخت نصر کی حکومت کا 43 سالہ عالی شان دور (563 ق م) میں اس کی موت کے ساتھ ختم ہو گیا۔ پھر یہ سلطنت مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی بعل فضر کے ہاتھ میں آئی۔ یہ بخت نصر کا بیٹا تھا۔ بعض محققین نے اسے بخت نصر کا نواسہ لکھا ہے۔ بعض کا خیال ہے وہ بادشاہ نہیں بلکہ نبولی دس نامی بادشاہ کا نائب تھا۔ تو ریت نے اسے بادشاہ ہی لکھا ہے۔

بعل فضر تک آتے آتے بخت نصر کی خدا پرستی کے احکام ذہنوں سے فراموش ہو چکے تھے۔ بت پرستی زوروں پر تھی اور یرشلیم کے اسرائیلیوں کے خدا کو کھلے عام بُرا کہا جا رہا تھا اور اسرائیلیوں کی تذلیل کی جا رہی تھی۔ حضرت دانیال علیہ السلام ادران کے ساتھیوں کے مراتب میں بھی فرق آ گیا تھا۔ بائبل کی شان و شوکت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ فارس کی طرف سے ابھرنے والی قومیں بائبل کو ہڑپ کرنے کی فکر میں تھیں۔ ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے حضرت دانیال علیہ السلام نے دربار جانا موقوف کر دیا تھا۔ اب ان کا زیادہ تر وقت عبادت الہی میں گزر رہا تھا۔

بعل فضر کی حکومت کا پہلا سال تھا کہ حضرت دانیال

علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا۔ خواب اتنا بامعنی تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو سنائے بغیر نہ رہ سکے۔

”کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان کی چاروں ہوائیں سمندر پر زور سے چلیں اور سمندر سے چار بڑے حیوان جو ایک دوسرے سے مختلف تھے، نکلے۔ پہلا شیر ہیر کی مانند تھا اور عقاب کے سے بازو رکھتا تھا اور میں دیکھتا رہا جب تک اس کے پراکھاڑے گئے اور وہ زمین سے اٹھایا گیا اور آدمی کی طرح پاؤں پر کھڑا کیا گیا اور انسان کا دل اسے دیا گیا۔

اور کیا دیکھتا ہوں کہ دوسرا حیوان ریت کی مانند ہے اور وہ ایک طرف سیدھا کھڑا ہوا ہے، اس کے منہ میں اس کے دانوں کے درمیان تین پھلیاں تھیں۔ اس سے کہا کہ اٹھ اور کثرت سے گوشت کھا۔

پھر میں نے نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اور حیوان تین دو کے مانند اٹھا جس کی پیٹھ پر پردے کے سے چار بازو تھے اور اس حیوان کے چار سر تھے اور سلطنت اسے دی گئی۔

پھر میں نے مشاہدہ کیا کہ چوتھا حیوان نہایت ہیبت ناک ہے اور اس کے دانت لوہے کے تھے۔ وہ نکل جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے کرتا تھا اور جو کچھ باقی بچتا، اس کو پاؤں سے لٹاڑتا تھا۔

میرے دیکھتے دیکھتے تخت لگائے گئے اور ایک پراسرار ہستی اس پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کا لباس برف سا سفید تھا اور اس کے سر کے بال خالص اون کے مانند تھے۔ عدالت لگی اور اس چوتھے حیوان کو ہلاک کر کے آگ میں ڈالا گیا۔ باقی حیوانوں کی سلطنت بھی ان سے لے لی گئی۔ پھر ایک شخص آدم زاد کے مانند آسمان کے بادلوں کے ساتھ آیا اور سلطنت اسے دی گئی۔

”دانیال، یہ خواب تو نہایت عجیبہ اور دلچسپ ہے۔“ حضرت دانیال علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا ”کیا تم نے غور کیا، اس کی تعبیر کیا نکلتی ہے؟“

”مجھے غور کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ خواب ہی میں مجھے اس کا مطلب بھی سمجھا دیا گیا۔ میں نے خواب ہی میں دیکھا کہ ایک شخص میرے قریب کھڑا ہے۔ میں اس کے نزدیک گیا اور اس سے ان سب باتوں کی حقیقت دریافت کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ چار بڑے حیوان چار بادشاہ ہیں جو زمین پر برپا ہوں گے لیکن حق تعالیٰ کے مقدس لوگ سلطنت لے لیں گے اور اب تک اس سلطنت کے مالک رہیں

گے۔ میں نے چاہا کہ چوتھے حیوان کی حقیقت سمجھوں جو ان سب سے مختلف اور نہایت ہولناک تھا۔

اس شخص نے مجھے مطلب سمجھایا کہ چوتھا حیوان دنیا کی چوتھی سلطنت ہے جو تمام سلطنتوں سے مختلف ہے اور تمام زمین کو نکل جائے گی اور اسے لٹاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی اور اس کے سر کے دس سینک دس بادشاہ ہیں جو اس سلطنت میں برپا ہوں گے اور ان کے بعد ایک اور برپا ہوگا اور وہ پہلوں سے مختلف ہوگا اور تین بادشاہوں کو زیر کرے گا اور وہ حق تعالیٰ کے مقدسوں کو تنگ کرے گا اور شریعت کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ پھر عدالت لگے گی اور اس کی سلطنت اس سے لے لیں گے اور حق تعالیٰ کے مقدس لوگوں کو بخش دی جائے گی۔

حضرت دانیال علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اس خواب کی تعبیر سے بہت پریشان تھے۔ خواب نے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بائبل میں کیا ہونے والا ہے لیکن انہوں نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ یوں بھی سلطنت کے کاموں سے دور تھے۔ کہتے تو کس سے کہتے۔

بعل شحر بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں حضرت دانیال علیہ السلام کو ایک اور خواب دکھایا گیا۔ حضرت دانیال علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ ایک دریا کے کنارے کھڑے ہیں۔ دریا کے پاس ہی ایک مینڈھا کھڑا ہے۔ اس کے دو سینک ہیں اور ایک دوسرے سے بڑا ہے اور بڑا دوسرے کے بعد نکلا تھا۔ یہ مینڈھا چاروں سمتوں میں اپنے سینک گھما رہا ہے۔ ایک بکرا مغرب کی طرف سے نمایاں ہوا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب سینک تھا۔ یہ بکرا اس مینڈھے پر حملہ آور ہوا اور اس کے دونوں سینک توڑ ڈالے۔ مینڈھے میں اس سے مقابلے کی تاب نہ لائی اور کوئی نہ تھا کہ مینڈھے کو اس سے چمڑا سکے۔ پھر بکرے کا بڑا سینک ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار عجیب سینک آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے اور ان میں سے ایک چھوٹا سینک نکلا اور وہ بڑھ کر اجرام فلک تک جا پہنچا۔ پھر انہوں نے دوفرشتوں کی گفتگو سنی۔ ایک نے پوچھا مقدس اجرام کب تک پامال ہوتے رہیں گے؟ دوسرے نے کہا، 2300 دنوں تک۔

حضرت دانیال علیہ السلام اس خواب کو دیکھنے کے بعد اس کی تعبیر جاننے کی فکر میں غلطاں تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام انسانی صورت میں ان کے سامنے آئے اور خواب کی

تعبیر کرنے لگے۔

”اے آدم زاد! یہ رویا آخری ایام کے لیے ہے۔ دو سینکوں والا مینڈھا مادی اور فارس کے بادشاہ ہیں (مادی، شمال مغربی ایران کا قدیم نام۔ یہ علاقہ موجودہ آذربائیجان کے صوبے اور فارسی کردستان کے کچھ حصے پر مشتمل تھا، یہاں کے باشندے ”مادی“ کہلاتے تھے۔ خورس یہاں حکومت کرتا تھا)

اور جو تو نے بکرا دیکھا وہ یونان کا بادشاہ ہے اور اس کی آنکھوں کے درمیان کا بڑا سینک پہلا بادشاہ ہے اور اس کے ٹوٹ جانے کے بعد جو چار اور نکلے وہ چار سلطنتیں ہیں جو اس کی قوم میں قائم ہوں گی لیکن ان کا اقتدار اس کا ساتھ ہوگا اور ان کی سلطنت کے آخری ایام میں جب خطا کار لوگ حد تک پہنچ جائیں گے تو ایک بادشاہ برپا ہوگا جس کا چہرہ بت تراش ہوگا۔ وہ مقدس لوگوں کو ہلاک کرنے کے لیے بڑی طاقت استعمال کرے گا اور لشکروں کے بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا لیکن بغیر انسانی ہاتھ لگائے اچانک کاٹ ڈالا جائے گا۔

یہ خواب ہی ایسا تھا کہ بائبل کا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ مادی اور فارس کے بادشاہ اس مملکت پر قابض ہونے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ آپ اتنے پریشان ہوئے کہ بیمار پڑ گئے۔ ذرا طبیعت بحال ہوئی تو پھر انہی خیالات سے پریشان رہنے لگے۔ وہ اپنے اندیشوں سے دوسروں کو آگاہ کرتے رہے۔ ارکان سلطنت کے ذریعے بعل شحر تک پیغام پہنچاتے رہے کہ وہ اپنے معاملات درست کر لے۔ انتظام مکمل کر لے۔ جو مصیبت آنے والی ہے اس کے لیے تیاری کر لے۔ دیوتاؤں کی پرستش سے توبہ کر کے خدا کی طرف راغب ہو جائے۔ خدا کا پرستار بن جائے کیونکہ یہ مصیبت خدا کی طرف سے ہے، وہی اس کو نال سکتا ہے۔

بعل شحر تک یہ پیغامات برابر پہنچ رہے تھے لیکن وہ لکھ رہے تھے کہ بچائے بچائے لگا رہا تھا۔ اس کا ایک ہی نعرہ تھا ”بائبل ناقابلِ تفسیر ہے۔“

وہ بھی کہتا نظر آتا تھا ”دانیال سے کہنا، جب وہ قیدی بنا کر یروشلم سے یہاں لایا جا رہا تھا تو اس کے خدا نے اس کی مدد کیوں نہیں کی اور اس کا خدا اسے یروشلم واپس لے جانے سے اب تک کیوں غافل ہے؟“

وقت گزرتا رہا اور پھر اس نے ناقابلِ تفسیر بائبل کا جشن ملانے کے لیے ایک ہزار امرا اور ان کی بیگمات کی ضیافت کی۔ شامی محل کا وسیع و عریض باغ پرستان کا منظر پیش کر رہا

تھا۔ تازنیاں پری بجال کے جھرمٹ، اداؤں کے پھول نچاؤں کر رہے تھے۔ رقص ہو رہے تھے، تماشا کی ایک ایک ادا برہمن کھڑے تھے۔ موسیقی کی مدھرتائیں کالوں میں رس گھول رہی تھیں۔ خرافات کے ڈور کھلے تھے، ساغر چمک رہے تھے، قدم بہک رہے تھے۔

محفل اپنے عروج پر تھی کہ بعل شحر کو ایک انوکھی بات سوجھی۔ اس نے خدام کو حکم دیا کہ وہ تمام ظروف جو بخت نصر کیل سلیمانی سے نکال لایا تھا اور مال خانے میں پڑے تھے، ان ظروف کو وہاں سے نکال کر محفل میں لایا جائے۔

”ان ظروف کو نہ جانے کس دن کے لیے رکھا گیا ہے؟ ان کا بہترین مصرف تو یہ ہے کہ ان میں شراب پی جائے۔ بخت نصر کی روح کتنی خوش ہوگی، یہ جشن فتح میں بدل جائے گا۔“

کسی نے یاد بھی دلا یا کہ وہ مقدس ظروف ہیں۔ بیکل سلیمانی سے لائے گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان ظروف میں شراب پینے سے دیوتا اور آسمان پر رہنے والا خدا ناراض ہو جائے لیکن بعل شحر نشے کی ترنگ میں کب کسی کی سننے والا تھا۔ برتن حاضر کر دیے گئے۔

بادشاہ اور اس کے امرانے ان سونے چاندی کے ظروف میں شراب پی۔ یہ نشہ ہی کچھ اور تھا۔ سب ایسے بدمست ہوئے کہ بے ہودگی کی ہر حد پار کر گئے۔ یہ پاک برتن ناپاک لیوں کی گرفت میں تھے۔

”دیکھو، خدا کے پرستار آج کتنے ذلیل ہوئے ہیں۔ جو کام میرا ہاپ نہ کر سکا، میں کر رہا ہوں۔ ہمارے دیوتا سر بلند رہیں کہ ان کی مہربانی سے یروشلم کی تباہی کی یاد آج پھر تازہ ہوگئی۔ سے کوئی جو ان مقدس برتنوں میں شراب پینے سے مجھے روک سکے؟“

وہ نشے کی ترنگ میں اٹھ کر ناپنے لگا تھا۔ پھر وہ تھک کر اپنی مسند پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا۔ یہ ہاتھ شمع دان کے مقابل محل کی دیوار کو توڑ کر اندر آیا تھا۔ بعل شحر دل ہی دل میں جسنے لگا۔ شراب کتنی تیز ہے، اس نے سوچا۔ بھلا کوئی انسانی ہاتھ کس طرح دیوار کو بھاڑ سکتا ہے؟ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنی دونوں آنکھوں کو گڑا۔ اس ہاتھ کی انگلیاں دیوار پر کچھ لکھنے میں مشغول تھیں۔ ان انگلیوں نے صرف چار لفظ لکھے اور ہاتھ غائب ہو گیا۔ دیوار پھر اپنی جگہ آگئی۔ بعل شحر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دیوار کے قریب گیا اور اس عبارت کو پڑھنے کی کوشش

کرنے لگا جو اس ہاتھ نے تحریر کی تھی۔ دیوار پر جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ تھے ”میں نے تبدیل فرسین۔“

ان الفاظ میں نہ جانے کیا تھا کہ اس کی کمر کے جوڑ ڈھیلے ہو گئے۔ ناٹھیں اس طرح کاچنے لگیں کہ گھٹنے ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ جام شراب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے ایک وزیر نے اسے بچتے ہوئے دیکھ لیا تھا یا اس کی یہ حالت اس کینز نے دیکھی تھی جو اس کے ساغر میں شراب اٹھیلنے کے لیے اس کے قریب آگئی تھی۔ اس کا وزیر یہی سمجھا کہ بادشاہ کو نشہ ہو گیا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اس کے پاؤں قابو میں نہیں تھے اور آنکھیں دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ غالباً ابھی تک کسی کو اصل واقعے کا علم نہیں تھا۔ کسی نے دیوار سے ہاتھ کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

بعل شحر نے ہاتھ کے اشارے سے سب کی توجہ دیوار کی طرف مبذول کرانی۔ پھر سب نے اس عبارت کی طرف دیکھا لیکن کوئی بھی اس عبارت کا مفہوم نہ سمجھ سکا البتہ حیرت سب کو ہو رہی تھی کہ یہ عبارت دیوار پر کیسے آگئی؟ بادشاہ نے چیخ کر کہا ”نجومیوں اور فال گیروں کو بلاؤ۔“

زبان بٹنے کی دیر تھی کہ مطلوبہ افراد حاضر ہو گئے۔ محفل کا رنگ پیکا پڑ گیا تھا۔ ظروف شراب اوندھے منہ پڑے تھے۔ جو جہاں تھا وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔ بادشاہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ خیانت سے لطف اندوز ہوا جاتا۔

بادشاہ نے تمام صورت حال ان نجومیوں کو بتائی اور اعلان کیا ”جو کوئی اس نوشیہ دیوار کو پڑھے اور اس کا مطلب مجھ سے بیان کرے، اور غوانی خلعت پائے گا اور اس کی گردن میں زریں طوق پہنایا جائے گا اور وہ مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم ہوگا۔“

ان نجومیوں نے باری باری اس عبارت کو پڑھا اور سر جھٹک کر رہ گئے۔ کوئی بھی اس کے مطلب کو نہ پہنچ سکا۔ ایک نجومی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ دنیا کی ستر زبانیں جانتا ہے لیکن یہ الفاظ کی زبان کے نہیں ہیں۔ جب میں نہیں پڑھ سکا تو دنیا کا کوئی انسان اسے نہیں پڑھ سکتا۔

بادشاہ نے مایوس ہو کر جشن کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور خود اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

شاہی محل میں ایک مرتبہ پھر سوگاری کی وہی فضا قائم ہو گئی جو اس وقت دیکھی گئی تھی جب بخت نصر پر جنون طاری

ہوا تھا اور وہ محل چھوڑ کر جنگل میں چلا گیا تھا۔

ایک دن اور ایک رات اسی عالم میں گزر گئے تھے کہ بادشاہ کی والدہ، اس کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گئی۔ وہاں موجود پہرے داروں کو غم تھا کہ کوئی بھی ہوا سے باہر ہی روک لیا جائے۔

”بعل شحر سے کہنا تمہاری والدہ آئی ہیں اور ایک ایسے شخص کا پتہ بتانے آئی ہیں جو تمہاری مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔“

پہرے داروں نے اجازت طلب کی اور بعل شحر کی والدہ کو خواب گاہ میں جانے کی اجازت مل گئی۔ بادشاہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مایوسی کا دکھ اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میں تمہاری ماں ہو کر ایسی اجنبی ہو گئی کہ پہرے دار مجھے دروازے پر روکتے ہیں۔“

”ماں، اگر تم یہ نہ کہتیں کہ تم مجھے کسی کا پتہ بتانے آئی ہو تو میں اب بھی تمہیں اندر نہ آنے دیتا۔ اب میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا ہے۔ بجز اس کے کہ میں ”نوشیہ دیوار“ کا مفہوم جان سکوں۔ مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”وہی بتانے تو آئی ہوں۔ بستر پر لیٹے لیٹے کیا عبارت پڑھ لی جائے گی؟“

”بابل کے ہر حکیم کو میں نے طلب کیا۔ ان میں سے کوئی بھی اس عبارت کو پڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور میں کیا کر سکتا تھا۔ میں عظیم بابل کا عظیم بادشاہ اور اتنا بے بس کہ چار لفظوں کا مطلب کوئی مجھے نہیں سمجھا سکتا۔“

”تم نے سب کو آزما کر دیکھ لیا مگر دانیال کو بھول گئے جس کے لیے تمہارا باپ کہا کرتا تھا کہ اس کے اندر مقدس الہواں کی روح ہے۔ جسے تمہارے باپ نے تمام نجومیوں کا سردار بنایا تھا۔ اسے بلاؤ، وہ اس عبارت کو ضرور پڑھ لے گا۔ اس کے لیے تو مشہور ہے کہ وہ قدسیوں کی زبان جانتا ہے۔“

”وہ دانیال۔ اسرائیلی غلام جو ہمارے دیوتاؤں کو بُرا کہتا ہے اور کچھ دنوں سے یہ دھمکیاں دیتا پھرتا ہے کہ بابل کی عظمت کا چراغ بجھنے والا ہے۔ فارس کے رہنے والے اجڈ گنوار، بابل پر قبضہ کرنے بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ میں اس دانیال کو بلاؤں جسے میں خود سے دور کر چکا۔“

”پھر کیا پونجی کمرے میں بند رہو گے۔ امور سلطنت کیسے چلیں گے؟ دشمن منہ کھولے کھڑے ہیں۔ کیا تم یہ چاہتے

ہو کہ سلطنت برباد ہو جائے؟“

”کس کی مجال ہے جو بابل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ پھر بھی تمہارے کہنے سے دانیال کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔“

بادشاہ کے آدمی حضرت دانیال علیہ السلام کی تلاش میں لگے اور انہیں لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

”دانیال، کیا تو نے نہیں سنا تھا کہ میں نے تمام نجومیوں کو اپنے پاس طلب کیا ہے۔ پھر تو دربار میں کیوں حاضر نہ ہوا؟“

”میں بابل کے مضافات میں تھا۔ آج ہی یہاں آیا ہوں اور نہ شاید آج بھی یہاں نہ ہوتا۔“

”میرا باپ کہا کرتا تھا کہ مقدس الہوں کی روح تمہ میں ہے اور تو قدسیوں کی زبان بھی جانتا ہے۔“

”یہ سب میرے خدا کی رحمت ہے جو مجھ پر ہے۔“

”میں نے ایک غیبی ہاتھ کو محل کی دیوار پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر تو اس نوشیہ دیوار کو پڑھے اور اس کا مطلب مجھ سے بیان کرے تو اور غوانی خلعت پائے گا اور تیری گردن میں زریں طوق پہنایا جائے گا اور تو مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم ہوگا۔“

”مجھے اس انعام سے کوئی غرض نہیں۔ تو مجھے اس دیوار کے پاس لے چل جہاں وہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔ میرے خدا نے چاہا تو میں اس کو ضرور پڑھوں گا اور اس کا مطلب بیان کروں گا۔“

بادشاہ انہیں اس دیوار کے پاس لے گیا۔ آپ نے اس عبارت کی طرف دیکھا اور بادشاہ سے مخاطب ہوئے۔

”اے بادشاہ! تیرے باپ بخت نصر کو خدا تعالیٰ نے سلطنت اور شان و شوکت بخشی۔ اس نے جس کو چاہا ہلاک کیا اور جس کو چاہا زندہ رکھا۔ جس کو چاہا سرفراز کیا اور جس کو چاہا ذلیل کیا لیکن جب اس کی طبیعت میں گھمنڈ سایا اور اس کا دل سخت ہو گیا تو وہ سلطنت سے اتار دیا گیا اور اس کی حشمت جاتی رہی اور اسے بنی آدم سے ہانک کر نکال دیا گیا۔ وہ اس وقت تک بیلوں کی طرح گھاس کھاتا رہا جب تک اس نے معلوم نہیں کر لیا کہ خدا تعالیٰ انسانی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس پر قائم کرتا ہے۔“

”مگر زری ہوئی باتیں اس وقت مجھے کیوں سنارہا ہے؟“

بعل شحر نے کہا۔

”اس لیے کہ تو ان سب باتوں سے واقف تھا پھر بھی

تو نے اپنے دل سے عاجزی نہ کی بلکہ آسمان کے خداوند کے حضور اپنے آپ کو بلند کیا اور اس کی پیکل کے ظروف میں مے نوشی کی اور پتھر کے جوں کی حمد کی جو نہ دیکھتے، نہ سنتے، نہ جانتے ہیں۔ پس اس خدا کی طرف سے یہ ہاتھ بھیجا گیا اور یہ نوشیہ لکھ گیا۔ نوشیہ میں یہ لکھا گیا ہے ”میں نے تبدیل فرسین“ یعنی خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا۔ تبدیل یعنی تو ترازو میں تولایا گیا اور کم نکلا۔ فرسین یعنی تیری مملکت تقسیم ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دی گئی۔

بادشاہ اس عبارت کے اس مفہوم کو جھٹلا بھی سکتا تھا لیکن جانتا تھا کہ حضرت دانیال علیہ السلام نے اس سے پہلے بھی جو پیش گوئیاں کیں وہ سچ نکلیں اس لیے خوف سے اس کا بُرا حال تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ سلطنت اس کے ہاتھ سے گئی۔ اس کے باوجود امید دلا سادے رہی تھی کہ شاید یہ مفہوم غلط ہو۔ وعدے کے مطابق حضرت دانیال کو اور غوانی خلعت عطا کیا گیا، ان کے گلے میں زریں طوق ڈالا گیا اور مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم بنایا گیا۔

جس وقت دانیال علیہ السلام عبارت کا مطلب سمجھا رہے تھے، اس عبارت کا مفہوم پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ایران کا فاتح خورس اعظم اپنی فوجیں لے کر بابل کی حدود میں پہنچ چکا تھا چنانچہ دانیال علیہ السلام جو نبی شای محل سے نکلے اور اپنے مکان تک پہنچے خود اس کی طرف سے متعین کردہ ایک سردار دارامادی بغیر کسی خون خرابے کے اپنی فوجوں کے ساتھ شاہی محل میں صحر آ یا۔ بعل شحر کو قتل کر دیا گیا اور بابل کی سلطنت پر عبارت کے مفہوم کے مطابق مادیوں اور فارسیوں کا قبضہ ہو گیا۔

خورس خود فتح کے جلوس کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور نئے سال کا تہوار منانے تک یہیں مقیم رہا۔ اس کے بعد اس نے دارا کو یہاں کا حاکم بنایا اور خود واپس لوٹ گیا۔ کلدانیوں کی شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا اور دارامادی نے حکومت کا علم و نسب سنبھال لیا۔ دارامادی قوم سے تھا لیکن فارس کے خورس کے تحت کام کرتا تھا، لہذا اس نے مادی اور فارسی قوانین کے تحت کام کرنے کا آغاز کیا۔

دارا نے جب تمام انتظامات سنبھال لیے تو مملکت چلانے کے لیے پورے ملک میں باعظم مقرر کیے اور ان کی نگرانی کے لیے تین وزیر مقرر کیے۔ ان میں ایک دانیال بھی تھے۔

حضرت دانیال علیہ السلام عقل و دانش میں ایسے پختہ

تھے کہ بہت جلد باقی وزیروں پر سبقت لے گئے۔ دارا ان سے ایسا خوش ہوا کہ انہیں تمام ملک پر مختار ٹھہرانے کا ارادہ کر لیا۔ باقی دو وزیران کی قدر افزائی پر ہاتھ مل رہے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح دارا کو ان کی طرف سے بدظن کر دیا جائے لیکن موقع نہ ملتا تھا۔ ان کے حریف ان کے سرکاری امور اور کاموں میں کوئی بے قاعدگی یا خالی تلاش کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے ایک سازش کے تانے بانے بنے۔ ایک ایسا منصوبہ بنایا جس کے ذریعے حضرت دانیال علیہ السلام کو قصور وار ثابت کیا جائے۔ ان وزیروں نے تمام ناظموں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ یہ تمام لوگ بادشاہ کے حضور جمع ہوئے اور اسے باتوں کے شے میں اتارنے کی کوشش کی۔

”اے بادشاہ، تو اب تک جیتا رہ۔ ہم نے تیری ہیبت اور رعب قائم کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا ہے اور اس میں تیری مملکت کے تمام ناظم، وزیر اور مشیر شامل ہیں۔ بس تیری اجازت کی ضرورت ہے۔“

”کیا تم لوگ سمجھتے ہو، میرے رعب میں کوئی کمی ہے۔“

”یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو تیرے احکامات کو دل سے نہیں مانتے۔ تو یہ بھی دیکھ لے گا کہ کون تیرے ساتھ دل سے ہے کون نہیں۔ انہیں بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ تو ان کی طرف سے غافل نہیں۔“

”میں نے امور مملکت تم لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیے ہیں جس طرح چاہو چلاؤ۔“

”آپ کی اجازت کے بغیر ہم ناکارہ لوگ کیا کہہ سکتے ہیں۔“

”تم مجھے بتاؤ کیا منصوبہ تیار کیا ہے؟“

”اے بادشاہ! مملکت کے تمام وزیروں اور حاکموں اور ناظموں اور مشیروں اور سرداروں نے باہم مشورت کی ہے کہ ایک خسرانہ آئین مقرر کریں اور ایک امتامی فرمان جاری کریں جس کے مطابق تیس روز تک جو کوئی تیرے سوا کسی معبود یا آدی سے درخواست کرے، اسے شیروں کے آگے ڈالا جائے گا۔“

ان لوگوں نے ان احکامات کو تحریر کیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ اس فرمان کو قائم کرے اور اس پر دستخط کر دے تاکہ اس میں تبدیلی کا امکان نہ رہے۔ بادشاہ نے اس نوشتہ پر دستخط کر دیے۔

حضرت دانیال علیہ السلام کے حریف جانتے تھے کہ یہی

ایک ایسی بات ہے جس پر دانیال علیہ السلام عمل نہیں کر سکیں گے اسی لیے انہوں نے یہ منصوبہ پیش کیا تھا۔

جب فرمان پر دستخط ہو چکے اور منادی کرادی گئی تو دارا کے جاسوس ادھر ادھر پھیل گئے کہ دیکھیں کون اس پر عمل نہیں کر رہا ہے۔ دانیال علیہ السلام کے حریفوں نے جاسوسوں کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ دانیال علیہ السلام کی عمرانی میں لگے رہیں۔ ان جاسوسوں نے دانیال علیہ السلام کے مکان کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی کٹھری کا درپچہ بروشل کی طرف کھلا ہوا ہے۔ وہ اس درپچے کی طرف منہ کر کے گھٹنوں کے نکل جھک گئے اور خدا کے حضور دعا اور اس کی شکر گزاری کرنے لگے۔ ان جاسوسوں نے دیکھا کہ وہ دن میں تین مرتبہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے کئی دن تک انہیں عبادت کرتے دیکھا اور پھر ان کی شکایت لے کر دارا کے پاس پہنچ گئے۔

”اے بادشاہ! کیا تو نے اس فرمان پر دستخط نہیں کیے کہ تیس روز تک جو کوئی تیرے سوا کسی معبود یا آدی سے کوئی درخواست کرے شیروں کی مانند میں ڈال دیا جائے گا؟“

”مادیوں اور فارسیوں کے آئین بھی تبدیل نہیں ہوتے، یہ بات بالکل سچ ہے۔“

”تو پھر سن، بائبل میں کم از کم ایک شخص ایسا ضرور ہے جو نہ تیری پروا کرتا ہے نہ تیرے حکم کی۔ دن میں تین بار اُن دیکھے معبود کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہے اور دعا کرتا ہے۔“

”کون ہے وہ سرکش؟“

”وہی جسے تو بہت عزیز رکھتا ہے۔ یہوداہ کے امیروں میں سے ایک شخص دانیال!“

”کیا وہ میرے سامنے آ کر اقرار کر سکتا ہے؟“

”وہ اقرار نہ بھی کرے تو بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔“

”تم اس کی دشمنی میں اس پر الزام بھی لگا سکتے ہو۔ وہ جب تک خود اقرار نہ کر لے، قصور ثابت نہیں ہوگا۔“

دارا دل سے چاہتا تھا کہ دانیال علیہ السلام سزا سے بچے رہیں اس لیے اس نے یہ شرط رکھی۔ اسے یقین تھا کہ دانیال علیہ السلام بھی اقرار نہیں کریں گے۔

دانیال علیہ السلام بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے اور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے جان کے خوف سے انکار نہیں کیا بلکہ اقرار کیا کہ وہ خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

انہوں نے نہایت بے خوفی سے کہا ”تمام انسانوں پر

خدا کی حکمرانی ہے۔ وہی قادر مطلق ہے، جس کو چاہتا ہے، بادشاہ بناتا ہے جس کو چاہتا ہے تخت سے نیچے اتار دیتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم اس کی شکر گزاری کرتے رہیں۔“

”کیا تو نے میرا حکم نہیں سنا تھا؟“

”اے بادشاہ! میں نے آج تک تیرا حکم نہیں ٹالا لیکن کوئی حکم مجھے اپنے معبود کی عبادت سے نہیں روک سکتا۔ ہاں تیرے حکم کی اتنی پاسداری کر سکتا ہوں کہ چپ کر عبادت کرتا رہوں۔“

”اب چونکہ میرے جاسوسوں نے تجھے عبادت کرتے دیکھ لیا ہے اس لیے تجھے بھوکے شیروں کی مانند میں تو ڈالنا پڑے گا۔“

”اے بادشاہ! تو اپنا کام کر۔ جس معبود کی میں عبادت کرتا ہوں، وہ میری حفاظت کرے گا۔“

”کاش! ایسا ہی ہو۔“ بادشاہ نے کہا ”میں تیری ہلاکت نہیں چاہتا مگر کیا کروں۔ آئین کی پاسداری تو کرنی ہے۔“

بادشاہ اب بھی نہیں چاہتا تھا کہ دانیال علیہ السلام کو سزا ملے۔ اس نے حیلے بہانوں سے پورا دن گزار دیا لیکن سورج غروب ہونے کو تھا کہ اس کے وزیر پھر اس کے پاس آئے اور اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔

”اے بادشاہ! تو سمجھ لے کہ مادیوں اور فارسیوں کا آئین یوں ہے کہ جو فرمان اور قانون بادشاہ مقرر کرے بھی نہیں بدلتا۔ اب تو اپنا وعدہ پورا کر۔“

بادشاہ اب کوئی بہانہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے حکم کے مطابق حضرت دانیال علیہ السلام کو اس اندھے کنویں کے پاس لے جایا گیا جس میں دھوکے شیر پہلے سے موجود تھے۔ دانیال علیہ السلام کو اس کنویں میں پھینک کر اوپر سے پتھر رکھ دیا گیا۔ بادشاہ کی مہر اس پتھر پر ثبت کر دی گئی تاکہ کوئی اس پتھر کو ہٹا کر دانیال علیہ السلام کو بچانہ لے۔

کئی بوڑھے لوگوں کو وہ زمانہ یاد آ گیا ہوگا جب بخت اصر کے زمانے میں حضرت دانیال علیہ السلام کے ساتھیوں کو جلتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا تھا اور قدرت خداوندی سے وہ زندہ سلامت نکل آئے تھے۔ بعض لوگ اب بھی یہی کہہ رہے تھے کہ دانیال علیہ السلام کا معبود انہیں زندہ نکال لے گا لیکن بیشتر یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اتفاقات روز روز نہیں ہوتے۔ شیر کسی انسان کا دوست نہیں ہوتا۔ رات بھر میں دانیال علیہ السلام کی ہڈیاں بھی باقی نہیں بچیں گی۔

بادشاہ اسے محل میں واپس آیا تو سخت رنجیدہ تھا۔ وہ کہہ تو چکا تھا کہ دانیال علیہ السلام کو اس کا معبود بچالے گا لیکن دل پر صدمہ ایسا تھا کہ بھوک پیاس جانی رہی۔ کنیروں نے دسترخوان سجایا تو دارا نے معذرت کرنی۔ وہ رات کو سونے سے پہلے موسیقی سننے کا عادی تھا۔ اس رات سازندے حاضر ہوئے تو اس نے انہیں بھی واپس کر دیا۔ اسے رہ رہ کر دانیال علیہ السلام کا خیال آ رہا تھا۔ شیروں نے اب تک تو اس کی ہڈیاں بھی چبا لی ہوں گی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے دانیال علیہ السلام جیسے نیک اور دانش مند کو شیروں کے سامنے کیوں ڈال دیا؟

دارا نے یہ رات کرب و اذیت میں گزاری اور صبح ہوتے ہی اس کنویں کے پاس پہنچا اور کنویں کے اوپر رکھے پتھر کو ہٹا کر اندر جھانکا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ دونوں شیر آپ کے قریب بیٹھے ہیں اور آپ کے تلوے چاٹ رہے ہیں۔

”اے خداوند خدا کے بندے! کیا تیرا خدا جس کی تو ہمیشہ عبادت کرتا ہے، قادر ہوا کہ تجھے شیروں سے چھڑائے؟“ بادشاہ نے آواز دے کر پوچھا۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے جواب دیا ”اے بادشاہ، اب تک جیتا رہ۔ میرے خدا نے اپنے فرشتے کو بھیجا اور شیروں کے منہ بند کر دیے اور انہوں نے مجھے ضرر نہیں پہنچایا کیونکہ میں اس کے حضور بے گناہ ثابت ہوا اور تیرے حضور بھی۔ اے بادشاہ، میں نے خطا نہیں کی۔“

انہیں زندہ دیکھ کر بادشاہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے فوری حکم دیا کہ دانیال علیہ السلام کو ماند سے نکالیں۔ بادشاہ کے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں نے حیرت سے یہ حکم سنا اور سوچا کہ بادشاہ کس دانیال علیہ السلام کو نکالنے کی بات کر رہا ہے۔ اب تک وہ زندہ ہی کہاں بچا ہوگا؟ انہوں نے کنویں میں جھانک کر دیکھا تو وہ بھی وہی منظر دیکھ رہے تھے جو بادشاہ دیکھ چکا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ شیروں کی موجودگی میں حضرت دانیال علیہ السلام کو نکالا کیسے جائے؟ پھر بڑی ہمت کر کے کنویں میں سیرھیاں لگائی گئیں۔ ان سیرھیوں کے ذریعے دانیال علیہ السلام کنویں سے باہر آ گئے۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دانیال علیہ السلام کو شیروں نے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا کیونکہ انہوں نے اپنے خدا پر توکل کیا تھا۔

بادشاہ نے ایک اور حکم جاری کیا جس کے تحت ان شخصوں کو جنہوں نے دانیال علیہ السلام کی شکایت کی تھی لائے اور ان کے بچوں اور بیویوں سمیت ان کو شیروں کی ماند میں ڈال دیا اور شیران پر غالب آئے اور اس سے بچتر کہ ماند کی نہ تک پہنچیں شیروں نے ان کی سب ہڈیاں توڑ ڈالیں۔

بادشاہ نے اس واقعے سے متاثر ہو کر قوم کے نام یہ پیغام جاری کیا۔

”تمہاری سلامتی افزوں ہو۔ میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانیال علیہ السلام کے خدا کے حضور ترسان و لرزاں ہوں کیونکہ وہی زندہ خدا ہے اور ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال اور اس کی مملکت ابد تک رہے گی۔ وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہی نشان اور عجائب دکھاتا ہے۔ اسی نے دانیال کو شیروں کے بچوں سے چھڑایا ہے۔“

ایک راوی ابن ابی الدنیاء نے عبد اللہ بن ابی ہذیل سے منقول کیا ہے کہ یہ واقعہ بخت کے دور میں پیش آیا۔ بخت نصر کے ہاتھوں دو شیر لگے تو بخت نصر نے دونوں کو ایک اندھے کنویں میں پھنکوا دیا پھر حضرت دانیال علیہ السلام کو بھی ان کے ساتھ ڈال دیا لیکن شیروں نے آپ کے ساتھ کوئی بُرا رویہ اختیار نہیں کیا۔ پھر جب تک اللہ نے چاہا آپ اس کنویں میں رہے اور جو انسانوں کو بھوک پیاس لگتی ہے، آپ کو بھی لگی تو اس کا بندوبست اللہ نے یوں کیا کہ یہاں سے کھوں دور بیت المقدس میں حضرت ارمیاہ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ کھانا وغیرہ تیار کر دتا کہ حضرت دانیال علیہ السلام کو کھلایا جائے۔ حضرت ارمیاہ علیہ السلام نے عرض کیا، اے پروردگار میں یہاں ارض مقدسہ میں ہوں اور کہاں وہ ارض بابل سرزمین عراق میں۔ فرمایا جو ہم نے تم کو حکم دیا ہے وہ کرو۔ ہم تمہارے لیے سواری کا بندوبست کریں گے لہذا آپ نے کھانا تیار کر لیا اور اللہ نے سواری بھی مہیا فرمادی حتیٰ کہ آپ نے دیکھا کہ آپ اس کنویں کے کنارے کھڑے ہیں جہاں حضرت دانیال علیہ السلام شیروں کے ساتھ تھے۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے آواز دے کر پوچھا کون ہے؟ فرمایا، میں ارمیاہ ہوں۔ پوچھا، کیا چیز آپ کو یہاں لائی؟ فرمایا مجھے آپ کے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا، کیا میرے رب نے مجھے یاد فرمایا ہے؟ فرمایا، ہاں تو حضرت دانیال علیہ السلام نے

فرمایا، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو اپنے یاد کرنے والے کو کبھی نہیں بھولتا۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو اپنے امیدوار کو اس کی بات کا جواب دیتا ہے۔

یہ روایت اپنی جگہ لیکن لگتا یہی ہے کہ یہ واقعہ دارا کے زمانے میں پیش آیا اور اسی نے پہلی مرتبہ آپ کو زندہ سلامت دیکھا اور کنویں سے باہر نکالا، یہی تو ریت (عہد قدیم) میں بیان کیا گیا ہے۔

دارا کا جھکاؤ اچانک خدا کی طرف ہوا اور اس نے فرمان جاری کیا کہ تمام لوگ خدا سے ڈریں۔ اس خدا سے جس نے دانیال علیہ السلام کو شیروں کے سامنے زندہ رہنے دیا تو حضرت دانیال علیہ السلام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان واقعات کی میرے لوگوں کے لیے کیا اہمیت ہے؟ ارمیاہ علیہ السلام کی نبوتیں پڑھتے ہوئے انہیں یاد آیا کہ ستر سالہ اسیری کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ انہیں یہ بھی یاد آیا کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا، خورس وہ چرواہا ہے جسے خداوند اپنی قوم کو چھڑانے اور یروشلیم کو واپس لانے کے لیے استعمال کرے گا۔ کیا یہ ممکن ہوگا کہ اب یہودیوں کو وطن واپس جانے کی اجازت مل جائے گی؟

حساب لگایا تو ستر سال پورے ہونے کو تھے۔ اب خدا سے مناجات اور گریہ و زاری کا وقت تھا۔ حضرت دانیال علیہ السلام نے روزہ رکھا اور ٹاٹ اوڑھ کر خدا سے دعا کی اور اقرار کیا۔

”اے خداوند عظیم تو اپنے فرماں بردار محبت رکھنے والوں کے لیے اپنے عہد و رحم کو قائم رکھتا ہے۔ ہم نے گناہ کیا۔ ہم برگشتہ ہوئے۔ ہم نے شرارت کی۔ ہم نے بغاوت کی بلکہ ہم نے تیرے احکام و آئین کو ترک کیا اور ہم تیرے خدمت گزار نبیوں کے طرف دار نہیں ہوئے جنہوں نے تیرا نام لے کر ہمارے بادشاہوں اور امرا سے اور ہمارے باپ دادا اور ملک کے سب لوگوں سے کلام کیا۔ اے خداوند! صداقت تیرے لیے ہے اور رسوائی ہمارے لیے جیسے اب یہوداہ کے لوگوں اور یروشلیم کے باشندوں اور دور و نزدیک کے تمام بنی اسرائیل کے لیے ہے جن کو تو نے تمام ممالک میں ہانک دیا کیونکہ انہوں نے تیرے خلاف گناہ کیا۔“

خداوند خدا تو رحیم و غفور ہے اگرچہ ہم نے اس سے بغاوت کی اس لیے وہ لعنت اور قسم جو خدا کے خادم موسیٰ کی توریت میں مرقوم ہے ہم پر پوری ہوئی کیونکہ ہم اس کے گنہ گار ہوئے اور اس نے جو کچھ ہمارے اور ہمارے قاضیوں

کے خلاف جو ہماری عدالت کرتے تھے، فرمایا تھا ہم پر بلائے عظیم لا کر ثابت کر دکھایا کیونکہ جو کچھ یروشلیم سے کیا گیا وہ تمام جہان میں کہیں نہیں ہوا۔

اے خداوند! میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو اپنی تمام صداقت کے مطابق اپنے قہر و غضب کو اپنے شہر یروشلیم یعنی اپنے کوہ مقدس سے موقوف کر کیونکہ ہمارے گناہوں اور ہمارے باپ دادا کی بدکرداری کے سبب سے یروشلیم اور میرے لوگ اپنے سب آس پاس والوں کے نزدیک ملامت کے لائق ہوئے۔ پس اب اے ہمارے خدا، اپنے خادم کی دعا اور التماس سن اور اپنے ارض چہرے کو اپنی ہی خاطر اپنے مقدس پر جو دیران ہے، جلوہ گر فرما۔

اے خداوند سن، اے خدا اپنے نام کی خاطر دیر نہ کر کیونکہ تیرا شہر اور تیرے لوگ تیرے ہی نام سے کہلاتے ہیں۔

حضرت دانیال علیہ السلام ابھی مناجات سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ شام کی قربانی گزارنے کا وقت آ گیا اور اسی وقت حضرت جبرائیل حاضر ہو گئے۔ انہوں نے خوش فہری دی۔

”تیری دعا قبول ہوئی۔ تیرے لوگوں اور تیرے مقدس شہر کے لیے ستر ہفتے مقرر کیے گئے کہ خطا کاری اور گناہ کا عاقبہ ہو جائے۔ بدکرداری کا کفارہ دیا جائے۔ پس تو سمجھ لے کہ یروشلیم کی بحالی اور تعمیر کا حکم صادر ہونے سے مہینہ (جسے سج کیا گیا، پاک کیا گیا، مراد خورس بادشاہ) فرمانروا تک سات ہفتے اور ہاتھ ہفتے ہوں گے۔ تب پھر بازار تعمیر کیے جائیں گے اور فیصل بنائی جائے گی مگر مصیبت کے ایام میں اور ہاتھ ہفتوں کے بعد وہ مسوح قتل کیا جائے گا اور اس کا کچھ نہ رہے گا اور ایک بادشاہ آئے گا جس کے لوگ شہر اور مقدس کو سہاڑ کریں گے اور اس کا انجام گویا طوفان کے ساتھ ہوگا اور آخر تک لڑائی رہے گی۔ اور وہ ایک ہفتے کے لیے تلوں سے عہد قائم کرے گا اور نصف ہفتے میں ذبیحہ اور بدیہ موقوف کرے گا اور فیصلوں پر اجازت دے والی مکروہات رکھی جائیں گی یہاں تک کہ بربادی کمال کو پہنچ جائے گی۔“

انہی دنوں حضرت دانیال علیہ السلام دجلہ کے کنارے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا جو کتائی پیرا ہن پہنے اور خالص لے کا پٹکا کمر پر باندھے کھڑا تھا۔ اس کا بدن زبرد کے ۱۱ اور اس کا چہرہ بچی سا تھا اور اس کی آنکھیں چراغوں کے ۱۱ تھیں۔ اس کے بازو اور پاؤں چمکتے ہوئے پتھل سے تھے

اور اس کی آواز انبوہ کے شور کے مانند تھی۔ یہ ایسا پراسرار منظر تھا کہ دانیال علیہ السلام پر وحی طاری ہو گئی اور آپ زمین پر اوندھے منہ گر پڑے۔ پھر ایک ہاتھ نے آپ کو اٹھایا۔

”اے دانیال عزیز مرد، جو باتیں میں تجھ سے کہتا ہوں سمجھ لے اور سیدھا کھڑا ہو جا کیونکہ اب میں تیرے پاس بھیجا گیا ہوں۔“

اس آواز پر دانیال علیہ السلام کھڑے ہو گئے۔ تب اس نے آپ سے کہا ”اے دانیال، خوف نہ کر کیونکہ جس روز سے تو نے دل لگایا۔۔۔ اور اپنے خدا کے حضور عاجزی کی۔۔۔ تیری باتیں سنی گئیں اور تیری باتوں کے سبب سے میں آیا ہوں پر فارس کی مملکت کے موکل نے اکیس دن تک میرا مقابلہ کیا۔ پھر میکاں جو مقرب فرشتوں میں سے ہے میری مدد کو پہنچا اور میں شاہان فارس کے پاس رکا رہا۔ پر اب میں اس لیے آیا ہوں کہ جو کچھ تیرے لوگوں پر آخری ایام میں آنے کو ہے تجھے اس کی خبر دوں۔“

وہ یہ باتیں کر رہا تھا اور حضرت دانیال علیہ السلام سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کھڑے کیا تھے بولنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ بار بار کوشش کرتے تھے لیکن آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اسی وقت ایک اور شخص نے جو آدم زاد کے مانند تھا، ان کے ہونٹوں کو چھوا اور آپ بولنے کے لائق ہوئے۔

”اے خداوند اس رویا کے سبب سے مجھ پر غم کا جہوم ہے اور میں ناتواں ہو گیا ہوں۔ پس یہ خادم اپنے خداوند سے کیوں کہہ سکے گا؟“

تب آنے والے نے کلام کیا ”کیا تو جانتا ہے کہ میں تیرے پاس کس لیے آیا ہوں؟ اب میں فارس کے موکل سے لڑنے کے لیے واپس جاتا ہوں اور میرے جاتے ہی یونان کا موکل آئے گا لیکن جو کچھ تنجائی کی کتاب میں لکھا ہے، تجھے بتاتا ہوں اور تمہارے موکل میکاں کے سوا اس میں میرا کوئی مددگار نہیں۔“

اس کے بعد اس شخص نے دانیال علیہ السلام کو اس شخص نے کتاب صداقت کی باتیں بتائیں۔

”فارس میں ابھی تین بادشاہ اور برپا ہوں گے اور چوتھا ان سب سے زیادہ دولت مند ہوگا اور جب وہ اپنی دولت سے تقویت پائے گا تو سب کو یونان کی سلطنت کے خلاف اُبھارے گا۔ لیکن ایک زبردست بادشاہ برپا ہوگا۔ وہ جو

چاہے گا کرے گا مگر اچانک کاٹ ڈالا جائے گا اور اس کی سلطنت چار حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اس کا کوئی حصہ بھی اس کی نسل کو نہیں ملے گا بلکہ یہ غیروں کے لیے ہوگی۔

اس کے بعد شاہ جنوب زور پکڑے گا اور اس کے امرا میں سے ایک اس سے زیادہ اقتدار حاصل کرے گا اور اس کی سلطنت بہت بڑی ہوگی اور چند سال کے بعد وہ آپس میں میل کریں گے کیونکہ شاہ جنوب کی بیٹی شاہ شمال کے پاس آئے گی تاکہ اتحاد قائم ہو لیکن اس میں قوت بازو قائم نہ رہے گی اور نہ وہ بادشاہ قائم رہے گا۔ ایک شخص اس کی جگہ پر پا ہوگا۔ وہ سہ سال رہے گا اور شاہ شمال کے قلعے میں داخل ہوگا اور ان پر حملہ کرے گا اور غالب آئے گا۔ اس کے بعد شاہ شمال اور جنوب کے بادشاہ کے درمیان زبردست جنگ ہوتی رہے گی۔

اس کے بعد ایک بد طینت اور کینہ پرور شخص برپا ہوگا جو سلطنت کی عزت کا حق دار نہ ہوگا لیکن وہ ناگہاں آئے گا اور چالپوری کر کے مملکت پر قابض ہو جائے گا اور وہ سیلاب افواج کو اپنے سامنے رکھ دے گا اور شکست دے گا اور امیر عہد کو بھی نہ چھوڑے گا اور جب اس کے ساتھ عہد و پیمان ہو جائے گا تو دغا بازی کرے گا کیونکہ وہ بڑے گا اور ایک گلیل جماعت کی مدد سے اقتدار حاصل کرے گا اور ایام امن میں ملک کے زرخیز مقامات میں داخل ہوگا اور جو کچھ اس کے باپ دادا سے نہ ہوا تھا، کر دے گا۔ بڑی فوج کے ساتھ شاہ جنوب پر حملہ کرے گا۔ شاہ جنوب بڑا لشکر لے کر نکلے گا لیکن اس کے مقابل نہ ٹھہرے گا۔ اس کی فوج پراگندہ ہوگی۔ تب وہ مال غنیمت لے کر اپنے ملک کو واپس جائے گا اور اس کا دل عہد مقدس کے خلاف ہوگا۔

مقررہ وقت پر وہ پھر جنوب کی طرف خروج کرے گا اور عہد مقدس پر اس کا غضب بھڑکے گا اور وہ اس کے مطابق عمل کرے گا۔ وہ اپنے باپ دادا کے مجبوروں کی پروا نہ کرے گا اور نہ کسی اور مجبور کو مانے گا بلکہ اپنے آپ ہی کو سب سے بالا جانے گا۔ وہ بیگانہ مجبور کی مدد سے محکم قلعوں پر حملہ کرے گا۔ جو اس کو قبول کریں گے ان کو بڑی عزت بخشے گا اور بہتوں پر حاکم بنائے گا اور رشوت میں ملک تقسیم کرے گا۔ کچھ عرصے تک اس کا تسلط حبشہ اور لیبیا تک پھیل جائے گا لیکن پھر شاہ جنوب اس پر حملہ آور ہوگا اور شاہ شمال رتھ اور سوار اور بہت سے جہاز لے کر گردبار کے مانند اس پر چڑھ آئے گا اور ممالک میں داخل ہو کر سیلاب کے مانند گزرے گا لیکن اہل اہل

موآب اور بنی عمون کے خاص لوگ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیے جائیں گے۔

وہ دیگر ممالک پر بھی ہاتھ چلائے گا اور ملک مصر بھی بچ نہ سکے گا۔ وہ سونے چاندی کے خزانوں اور مصر کی تمام نفیس چیزوں پر قابض ہوگا لیکن مشرقی اور شمالی اطراف سے افواہیں اسے پریشان کریں گی اور وہ بڑے غضب سے نکلے گا کہ بہتوں کو نیست و نابود کرے اور وہ شاعر مقدس پہاڑ اور سمندر کے درمیان شاہی خیمے لگائے گا لیکن اس کا خاتمہ ہو جائے گا اور کوئی اس کا مددگار نہ ہوگا۔

دانیال علیہ السلام کے لوگوں کا کیا ہوگا؟

اور اس وقت میکائیل مقرب فرشتہ جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لیے کھڑا ہے، اٹھے گا اور وہ ایسی تکلیف کا وقت ہوگا کہ ابتدائی اقوام سے اس وقت تک کبھی نہ ہوا ہوگا اور اس وقت تیرے لوگوں میں سے ہو ایک جس کا نام کتاب میں لکھا ہوگا رہائی پائے گا اور جو خاک میں سو رہے ہیں ان میں سے بہترے جاگ اٹھیں گے۔ بعض حیات ابدی کے لیے اور بعض رسوائی اور ذلت ابدی کے لیے۔ اور اہل دانش نور فلک کے مانند چکیں گے۔

اب دانیال علیہ السلام کو یقین دلایا جاتا ہے کہ جو لوگ دانا اور خیم ہیں اور راست بازی کی طرف رجوع ہوتے ہیں وہ خدا سے برکتیں پائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی دانیال علیہ السلام کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس رویا کو بند کر کے رکھ لیں۔ آخری زمانے میں بہت سے لوگ اس رویا کو پڑھیں گے اور ان کی دانش میں افزائش ہوگی۔

لیکن تو اسے دانیال ان باتوں کو بند رکھ اور کتاب پر آخری زمانے تک مہر لگا دے۔ بہترے اس کی تفتیش و تحقیق کریں گے اور دانش افزوں ہوگی۔“

(توریت)

حضرت دانیال علیہ السلام کو اس موقع پر دو شخص اور کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دریا کے اس کنارے پر دوسرا دوسرے کنارے پر۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ ان عجائب کے انجام تک کتنی مدت ہے؟ حضرت دانیال علیہ السلام نے جواب دینے والے کی آواز سنی۔

”حی القیوم کی قسم!“ جواب دینے والا دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہہ رہا تھا ”یہ عجائب ساڑھے تین دور کے بعد پورے ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی مقدس لوگوں کا اقتدار بھی ختم ہو جائے گا۔“

حضرت دانیال علیہ السلام سن ضرور رہے تھے لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ پوچھتے ہیں، میرے خداوند، ان کا اہم کیا ہوگا تب اس شخص نے حضرت دانیال علیہ السلام کو پپ رہنے کی ہدایت کی۔

”اے دانیال، تو اپنی راہ لے کیونکہ یہ باتیں آخری وقت تک کے لیے سر یہ مہر کردی گئی ہیں اور ہیں گی اور بہت سے لوگ پاک کیے جائیں گے اور صاف و براق ہوں گے لیکن شریر شرارت کرتے رہیں گے اور شریروں میں سے کوئی نہ سمجھے گا پرداش و رستمیں گے اور جس وقت سے دانگی قربانی موقوف کی جائے گی اور وہ اُجاڑنے والی مکروہ چیز نصب کی جائے گی، ایک ہزار دو سو نوے دن ہوں گے۔ مبارک ہے وہ جو ایک ہزار تین سو چونتیس روز تک انتظار کرے۔ اب تو اپنی راہ لے۔ جب تک کہ مدت پوری نہ ہو کیونکہ تو آرام کرے گا اور ایام کے اختتام پر اپنی میراث میں اٹھ کھڑا ہوگا۔“

حضرت دانیال علیہ السلام کو اس شخص امید دہانی اور اس یقین دہانی کے بعد کہ تیرے لوگ آخر کار فتح مند ہوں گے، ہدایت کی جاتی ہے کہ کتاب کو سر یہ مہر کر دے۔

☆☆☆

بابل میں خورس کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اس کی فوجوں نے بابل پر قبضہ کیا تھا لیکن لوگ اس کے خلاف نہیں تھے بلکہ اسے نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ خورس نے یہاں کے دیوتا مردوک کو اپنا دیوتا مان کر اہل بابل کے دل جیت لیے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اسی دیوتا نے مجھے بابل کے تخت پر بٹھایا ہے اور اس نے نئے سال کا تہوار منانے کی خاطر کئی ماہ تک بابل میں ہی قیام کیا۔ اس میں ایک سیاسی مصلحت بھی تھی کہ اس طرح اسے عام لوگوں کی حمایت کی امید تھی کیونکہ اب اسے بابل کی نہایت وسیع سلطنت کا انتظام و انصرام کرنا تھا جو آرام سے لے کر فلسطین تک اور مصر کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسور اور بابل اس بات کے لیے مشہور تھے کہ وہ مفتوح لوگوں کو دوسرے ملکوں میں لے جاتے تھے۔ خورس نے اس کے برخلاف عمل کیا بلکہ جو لوگ بابل میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے، ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنے وطن کو لوٹ جائیں، ان جلاوطنوں میں یروشلیم کے یہودی بھی تھے۔

خورس نے اعلان کیا ”خدا نے مجھے فارغ بنایا اور طاقت دی اور ہدایت کی کہ میں یروشلیم میں اس کے لیے مسکن بناؤں۔ پس بابل میں جو کوئی یروشلیم سے تعلق نہیں رکھتا ہو وہ اہل واپس جائے اور وہاں اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے۔“

یہودیوں کو بابل میں رہتے ہوئے ستر سال ہو گئے تھے۔ ایک نسل تو ختم ہوئی چکی تھی جو یہاں پیدا ہوئے تھے انہیں یروشلیم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، لہذا وہ جانے پر تیار نہیں تھے۔ خورس نے ان لوگوں کو یہ کہہ کر ابھارا کہ یروشلیم میں بیکل کی دوبارہ تعمیر کے لیے سونا، چاندی اور دیگر چیزوں کے نذرانے دیں۔ حضرت دانیال علیہ السلام کو رویا میں جو کچھ دکھایا گیا تھا، وہ پورا پورا ہوا تھا۔

خورس کے فرمان کے جواب میں ہزاروں جلاوطن اپنے ملک میں واپس جانے کو تیار ہو گئے۔ خورس نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ بخت نصر جو ظروف یروشلیم سے لایا تھا، وہ واپس کیے جائیں۔

ساری قوموں کے درمیان یہودی اس بات میں یکتا تھے کہ ان کے خدا کا کوئی بت نہیں تھا جسے واپس یا بحال کیا جاتا حالانکہ خورس کے فرمان میں اس کا بندوبست بھی موجود تھا بلکہ وہ تو اسی بات پر فخر کرتا تھا کہ میں نے غیر قوموں کے دیوتاؤں کو ان کی عبادت گاہوں میں بحال کیا۔

جلاوطن یہودی یروشلیم کے طویل اور پرخطر سفر پر روانہ ہوئے اور اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے کہ بیکل کو دوبارہ تعمیر کریں گے۔ اگرچہ اس واپسی کی صحیح تاریخ نہیں دی گئی مگر قرین قیاس ہے کہ یہ واپسی 538 ق م میں عمل میں آئی ہوگی۔

کہا جاتا ہے واپس آنے والوں کی تعداد پچاس ہزار تھی اور ان کے گیارہ لیڈر تھے۔ زیاریل اور یثوع نام کے لیڈر زیادہ سرگرم تھے۔ انہوں نے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کی اور ان کی اخراجی ختم کر کے ترتیب اور نظم و ضبط قائم کیا۔

واپسی کے سال کے ساتویں مہینے تک لوگ یروشلیم کے گرد و نواح میں کافی بس گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سب جماعتی طور پر اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے اسرائیل کے خدا کی قربان گاہ بنائی اور موسیٰ علیہ السلام کی بتائی ہوئی سوختی قربانیاں چڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ اسی مہینے کی پندرہ تاریخ کو انہوں نے لکھے ہوئے شرعی احکام کے مطابق عید خیام بھی منائی۔ ان پر تاثرات تقریبات کے ساتھ یروشلیم میں خدا کی عبادت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

خورس کا انتقال ہو گیا۔ ادھر سامریہ کے بغض و حسد نے رکاوٹیں ڈالیں اور یروشلیم کی تعمیر کا کام رک گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سے ہم فلسطین میں آباد ہوئے ہیں، ہم بھی اسی خدا کی پرستش اور عبادت کرتے آ رہے ہیں۔ اس بنیاد پر انہوں



استنبول کا مشق

ابن کبیر

وہ یگانہ روزگار تھا۔ شہرتِ آفاقی کا حامل تھا۔ اس کی خیال آفرینی کا سکہ کئی ممالک میں جاری و ساری تھا۔ اس نے قوتِ قلم سے خزانہٴ ادب ترک کنو مالاً مال کر دیا تھا پھر بھی اس پر انگلیاں اٹھانے والے کم نہ تھے جو یک زبان ہو کر اس پر سررقہ کا الزام عائد کرتے تھے مگر یورپ والے اس کلک گہر بار کے مجنون تھے۔ ایک کے بعد ایک پذیرائی کا سلسلہ دراز تھا۔

ایک نابغہ روزگار ادیب کے سکتے چبکتے شب و روز کا احوال



جائے گا، لیکن چاہا بھی بہت جائے گا۔ غیر اسے سر پر بٹھائیں گے۔ تمہارا پوتا، تمہارا اس ملک کا نام روشن کرے گا۔“
سایہ دار درخت تلے، پانسہ پھینک کر مستقبل کی پیشگوئی کرنے والے نبوی کی زمانہ شناس آنکھیں چمک رہی تھیں۔

جون 1957ء، استنبول:

”پوری دنیا میں اس کے نام کا ڈنکا بجے گا۔ جو اس سے سنا کر رہے ہیں، وہ بھلا دیے جائیں گے اور جو اس کے بعد آئیں گے، وہ اپنا سراسر احراراً جھکا دیں گے۔ یہ فتازہ ٹھہرایا

ماہنامہ سرگزشت

قریب ہے) فتح کیا تو ہم نے ہر حراں بادشاہ کے بہت المال میں ایک تخت پایا جس پر ایک شخص کی میت رکھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے ساتھ ایک مصحف (کتاب اللہ) تھا۔ ہم نے مصحف اٹھا کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچایا۔ آپ نے حضرت کعب کو طلب فرمایا۔ انہوں نے اس مصحف کو عربی زبان میں منتقل کیا۔

ابی خالد بن دینار راوی کہتے ہیں، پھر میں نے پوچھا آپ لوگوں نے اس میت کا کیا کیا؟ فرمایا، ہم نے دن کے وقت حیرہ قبر میں متفرق جگہوں پر کھودیں پھر رات کو اس شخص کو ایک قبر میں دفن کیا اور تمام قبروں کو اسی طرح قبر بنا دیا تاکہ لوگوں کو اس کا پتا نہ چلے اور اس کو نہ کھودے۔

ابی خالد نے پوچھا ”آپ اس شخص کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں کہ وہ کون تھا؟ فرمایا، اس کو دانیال کہا جاتا تھا۔ اشعث الاحمری نے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے تسر علاقہ فتح کر لیا تو حضرت دانیال علیہ السلام کو ایک تابوت میں پایا جن کی رئیس اور مسام اپنی حالت پر صحیح برقرار تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو دانیال علیہ السلام کا پتا بتائے گا تو تم اس کو جنت کی خوش خبری دے دینا لہذا جس شخص نے ان کے متعلق اطلاع دی اس کا نام حقوق تھا، تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو پیغام بھیجا تو آپ نے جواب دیا: بھیجا کہ حضرت دانیال علیہ السلام کو دفن کر دو اور حقوق کو میرے پاس بھیج دو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ آپ نے چار قیدیوں کو حکم فرمایا تو انہوں نے ایک نہر کے پانی کو روکا اور کوئی بند لگا کر نہر کے بیچ قبر کھودی اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے وہاں حضرت دانیال علیہ السلام کو دفن کر دیا۔ جب یہ چاروں قیدی واپس آئے تو ان کی گردن اڑادی۔ (یعنی جاردن کافروں سے جنگ کے نتیجے میں قید ہوئے تھے اس لیے ان کا قتل کرنا صحیح تھا) اس طرح یہ عظیم راز صرف ابو موسیٰ اشعریؓ کے سینے میں دفن ہو گیا۔

آج کوئی نہیں جانتا کہ حضرت دانیال علیہ السلام کہاں دفن ہیں؟

ماخذات: توریت، قصص الانبیاء، عہد عشق کا تاریخی سفر۔

نے ذرا باطل اور دوسرے لیڈروں سے درخواست کی کہ تعمیر کے کام میں ہمیں بھی شامل کیا جائے۔ ان کی درخواست رد کر دی گئی تو وہ اعلانیہ مخالفت اور دشمنی برآ کر آئے۔ وہ خورس کے جانشینوں کے دور میں پیکل کی تعمیر کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت دانیال علیہ السلام ابھی زندہ تھے اور پیکل کی تعمیر دوبارہ شروع کرانے کے لیے کوشاں تھے۔ انہوں نے سرکاری محافظ خانوں میں اس فرمان کی تلاش شروع کر دی جو خورس کی طرف سے جاری ہوا تھا تاکہ اس دعوے کو بج ثابت کیا جائے کہ خورس نے یہوداہ کو پیکل تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔ بالآخر حضرت دانیال علیہ السلام اس فرمان کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس پر خورس کا فرمان اراہی زبان میں درج تھا۔ اس میں لکھا تھا ”پیکل سلیمانی کے کام میں دست اندازی نہ کرو ہاں شاہی مال سے تعمیر کرنے والوں کو بلا توقف خرچ دیا جائے۔“

دارا نے نہ صرف اس فرمان کی تصدیق کی بلکہ شام کے باج گزار حاکم کو سخت احکام بھیجے کہ یہودیوں کے کام میں کسی طرح کی مداخلت نہ کریں۔ اس کے علاوہ حکم دیا کہ شام (ارام) کے صوبے کے خراج کی آمدنی سے یہودیوں کو تعمیراتی پروگرام کے لیے دافر خرچ مہیا کیا جائے۔ یہ ہدایات بھی جاری کیں کہ یروشلم کے کابھوں کو روزانہ قربانوں کے لیے کافی تعداد میں جانور مہیا کریں تاکہ وہ شاہ فارس کی فلاح و بہبود کے لیے خدا سے مناجات کریں۔

ان ہدایات کے بعد یہودیوں کو نہ صرف دارا سے سیاسی حمایت حاصل ہوئی بلکہ ساتھ کے صوبے کے حاکموں سے اپنے منصوبے کے لیے مادی امداد بھی ملنے لگی۔

کام نہ ور شور سے شروع ہو گیا اور پیکل کی عمارت باج سال میں مکمل ہو گئی۔ اگرچہ یہ پیکل بھی پہلی جگہ تعمیر کی گئی مگر خوبصورتی اور کاریگری میں سلیمان علیہ السلام کی پیکل کے پاسنگ بھی نہیں تھی لیکن جن لوگوں نے پہلے کی پیکل نہیں دیکھی تھی، ان کے لیے یہ خوبصورتی کا شاہکار تھی۔

☆☆☆

اشعث الاحمری سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے پروردگار عزوجل سے دعا کی تھی کہ ان کو امت محمدیہ میں دفنایا جائے۔

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ جب ہم نے تسر شہر (جو بصرہ کے

اُس کے تجربے کار، ضعیف ہاتھوں میں ایک معصوم بچے کا ہاتھ تھا جس کے پہلو میں ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں مسرت اور تجسس دونوں ہی کیفیات سمٹ آئی تھیں۔
بوڑھے کی بیوی بھی وہاں موجود تھی۔ وہ خاموشی سے مٹی میں بند آنکھوں کو دھیرے دھیرے ہلارہی تھی جو نجوی کو بطور معاوضہ ادا کیے جاتے تھے۔

یہ استنبول کے ایک سرسبز پارک کا منظر تھا جہاں بوڑھا روز اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کے لیے آتا تھا۔ اس پارک میں ایک گھنے درخت کے نیچے بوڑھا نجوی بیٹھتا تھا جو قرب و جوار میں اپنی پیشگوئی کے لیے خاصا مشہور تھا۔

آج بوڑھا اپنے پوتے کو بھی ساتھ لے آیا۔ نہ جانے کیا سوچ کر نجوی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اب نجوی بڑے ہی دلکش پیرائے میں اس کے پوتے کے درختوں مستقبل کی پیشگوئی کر رہا تھا جس نے بوڑھے کو خوشی سے بھر دیا تھا۔

نجوی کے چپ ہونے پر اُس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا ”تو کیا یہ ترکی کا سب سے بڑا تاجر ہے گا؟“

”تاجر؟“ نجوی مسکرایا۔ اس کی نظریں اب بھی بچے کی ہتھیلیوں پر تکی تھیں۔ ”ہاں تاجر، لیکن اشیائے ضروریہ کا تاجر نہیں... یہ تو لفظوں کی تجارت کرے گا۔ الفاظ کا فسوں گر کہلائے گا!“

بوڑھے کی آنکھوں میں دہکتی مسرت کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ ان میں حقارت سمٹ آئی۔ اس نے اپنے پوتا کا ہاتھ نجوی کے تجربے کار ہاتھوں کی نرم گرفت سے آزاد کرواتے ہوئے ترش لہجے میں کہا ”اس کا دادا شہر کا سب سے بڑا تاجر، اس کا باپ تاجر اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ مستقبل میں ایک نیکام چور شخص ثابت ہوگا؟ اویب بنے گا ہند!“

اس نے تیزی سے بچے کو گود میں اٹھایا اور چل دیا۔ اُس کی بیوی نے ناگواری سے سکے نجوی کے سامنے پھینکتے ہوئے ایک ناپسندیدہ نگاہ اُس کے جتنے پر ڈالی اور اپنے شوہر کے پیچھے چل دی۔

نجوی خاموش رہا اور انہیں اُس گھنے درخت سے دور جاتے دیکھتا رہا، جہاں وہ بیٹھتا تھا۔ دفعتاً معصوم بچے نے مزکر نجوی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں مسکرائے۔

”یہ لکھا جا چکا ہے... یہی اس کی قسمت ہے... ایسا ہی ہوگا!“ نجوی خودکلامی کے عمل سے گزر رہا تھا۔

☆☆☆

7 دسمبر 2006ء سوئڈن:

”اسٹوک ہولم“ کی مشہور زمانہ سویڈش اکیڈمی کا ہال

حاضرین سے کچھ اچھ بھرا ہوا تھا۔ روشنی اور رنگوں کے درمیان کئی نادر روزگار شخصیات موجود تھیں۔ حاضرین بھی بے حد مسرور تھے، اس تاریخی تقریب کا حصہ بننا وہ اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔

جن چندہ افراد کو آج اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا، وہ اگلی صفوں پر براجمان تھے جن میں سے ایک جو دراز قد تھا اور عینک لگا ہوا تھا، خاص دعام کی توجہ کا مرکز بننا ہوا تھا۔

بالآخر تالیوں کی گونج میں اُس کا نام پکارا گیا۔ حاضرین کی آنکھوں میں اشتیاق سمٹ آیا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

وہ کھڑا ہوا۔ کوٹ درست کیا۔ عاداتاً تالیوں میں ہاتھ پھیرا اور اسٹیج کی جانب بڑھنے لگا۔

تالیوں کی گونج میں وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا زینہ عبور کر رہا تھا۔ ہاتھ میں ”ابا کا سوٹ کس“ کے عنوان سے تحریر کردہ مضمون تھا، جسے وہ آج کی شام پڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ تالیوں کا سلسلہ اس وقت تک نہیں ختمے گا جب تک وہ مائیک پر نہیں پہنچ جاتا۔

”بے شک یہ ایک قیمتی لمحہ ہے، جو ہر ایک کا نصیب نہیں بنتا!“ اُس نے خود سے کہا تاہم زبان سے ادا ہونے والے الفاظ ذہن کو یکسو نہیں کر پائے، جو ماضی میں بھٹک رہا تھا۔ اور یہ قابل فہم ہے، کیونکہ دنیائے ادب کے مستند ترین اعزاز کے لیے منتخب کیے جانے کے بعد لگی اوٹ پناہگ خیالات ذہن پر یلغار کر سکتے تھے۔

اور پھر اُس کے پاس تو سوچنے کے لیے کئی موضوعات تھے۔ وہ ان نام نہاد خیر خواہوں کی بابت سوچ سکتا تھا جنہوں نے اُسے متعدد بار ملک چھوڑنے کا مشورہ دیا... شدید ترین تنقید اور ٹیلی فون پر ملنے والی دھمکیوں سے جڑے خیالات بھی اُسے گھیر سکتے تھے جن کا وہ گزشتہ چند برس سے شکار تھا... مگر اُس خاص لمحے اُس کے ذہن میں فقط وہ تلخ اور مشکل ترین چار برس تھے، جب اُسے اپنے پہلے ناول کی اشاعت کے لیے سینکڑوں پبلشروں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑے، بھاگ دوڑ کرنا پڑی، نا کامیوں کا منہ دیکھنا پڑا!

وہ مائیک تک پہنچ گیا۔ کاغذات کا پلندہ سامنے رکھا۔ ایک نظر حاضرین پر ڈالی۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ اب ہال میں ترکی سے تعلق رکھنے والے فرید اور خان پاکم کی آواز گونج رہی تھی جس کے جنون کو تسلیم کرتے ہوئے اُسے

2006ء کے نوبل انعام برائے ادب سے نوازا گیا تھا۔ وہ نوبل پرائز کی سو سالہ تاریخ میں مسلم دنیا سے تعلق رکھنے والا

دوسرا ادیب تھا، جو اس ایوارڈ کا حق دار ٹھہرا!

☆☆☆

جس برس کمال اتاترک کے ترکی نے ”نیٹو“ میں شمولیت اختیار کی اُسی برس اور خان نے استنبول کے ایک امیر کبیر گھرانے میں آنکھ کھولی۔

اُس زمانے کا استنبول آج کے استنبول سے یکسر مختلف تھا۔ مرکز میں دھول مٹی سے آئی تھیں۔ بلند و بالا عمارتیں خال خال ہی نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں کھنڈر بھی ملتے تھے۔ ٹریفک بھی خاصا کم تھا۔ ہاں، ایک شے ایسی ضرور تھی جو آج کے استنبول میں بھی پورے جاہ و جلال کے ساتھ موجود ہے۔ اور وہ تھے چوراہوں پر نصب کمال اتاترک کے مجسمے!

ایسے ہی ایک چوراہے سے چند فرلانگ کے فاصلے پر شہر کا متول ترین علاقہ تھا، جہاں امراء کی کوٹھیاں تھیں۔ وہیں اور خان کے دادا نے بڑی امیدوں کے ساتھ اپنے سپنوں کا محل تعمیر کیا تھا جو چند برسوں بعد وقت کے طوفانوں کی نذر ہونے والا تھا۔

اُس کا دادا ظفر پاکم اپنے زمانے کا مشہور سول انجینئر اور کامیاب کاروباری شخصیت تھا۔ اس کا استنبول میں کافی اثر و رسوخ تھا۔

جب دای کی نے اُس بوڑھے لیکن زندگی سے بھرپور شخص کو اطلاع دی کہ خدا نے اُسے ایک اور پوتے سے نوازا ہے، وہ سوٹ میں ملبوس اپنے کمرے کی کمر کی کے پاس بیٹھا سگریٹ پل رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، تم جاؤ!“ اس نے دای کی جانب دیکھے بغیر اپنی کمر درمی آواز میں کہا۔

چند ساعت وہ خاموش بیٹھا رہا۔ دراصل وہ اپنے بیٹوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، جنہوں نے اس کے نقش پا کا تعاقب کرتے ہوئے کاروباری دنیا میں قدم ضرور رکھا لیکن پیسے بنانے کے بجائے پیسے گناتے رہے۔

”یہ وقت اس طرح کے خیالات کے لیے مناسب نہیں۔“ بالآخر اس نے سر جھٹکتے ہوئے خود سے کہا۔ اگرچہ وہ دیگر ترکوں کے مانند خود کو مغربی اور سیکولر سوچ کا حامل ظاہر کرتا تھا لیکن اندر سے وہ ایک مذہبی شخص تھا سو اس نے چند ساعت آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کرنے کا ارادہ باندھا لیکن عملاً ایسا کر نہیں سکا کیونکہ فوراً ہی اُس کا بیٹا سامنے آن کھڑا ہوا جس کی گود میں نومولود تھا۔

”بابا، آپ کا پوتا!“

بوڑھا آگے بڑھا۔ نومولود کو گود میں لیا جس کے معصوم ہرے میں اسے اپنی شباهت نظر آئی۔ پوتے کا ماتھا چومے

ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ وہ جذبات کی شدت سے لرز رہا ہے۔
”آپ ٹھیک تو ہیں بابا؟“ بیٹے نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
”ہاں!“ اُس نے دھیرے سے کہا۔ ”جشن کا انتظام کرو!“

☆☆☆

کونسی کی راہداریوں میں دن بھر یڈیو کی آواز گونجتی تھی۔ ریڈیو سیٹ بوڑھے کے کمرے میں رکھا تھا جس کی نشریات گھر کے تمام افراد یکساں دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔

بوڑھا صبح بیدار ہوتے ہی سگریٹ سلگا لیتا، ریڈیو آن کر دیتا اور اُس وقت تک بند نہیں کرتا جب تک نشریات تمام نہیں ہو جاتیں۔

نشا اور خان بھی اپنے بڑے بھائی سوکید کا ہاتھ پکڑے ”دے دے، دے دے“ (دادا) پکارتا بوڑھے کے کمرے میں چلا جاتا جہاں کبھی کبھار چند میٹھی گولیاں اُس کے ہاتھ لگ جاتیں۔

بڑے ہونے کے بعد اور خان نے اکثر خود سے یہ سوال

ماہنامہ سوری ڈائجسٹ



مئی 2012ء کی کہانیاں
نئی ہفت روزہ

ریگ و سنگ

پروہ سیمپن تھس کرتی، گاتی اور رنگ بکھیرتی پستلیوں کے پیچھے
کلاسز، ٹیوشن، دہشت سیس جی سہ راشد کی ایجوکیشن

مغرب کے نرالی انداز

مغربی دنیا کی تیزی اور ماحول کی عکاسی اور محبت کی پُر درد تائید لکھنؤ کی کہانیاں

نگر داب

پہلے چاہئے نکل کے اپنی منزل کی جانب گامزن لسمائل دی کی سلسلے دار کہانی

لنگار

طاہر جلیوینمفل کے جلاہر قلم کی ایک جھلک فنڈ دلاں لاہور کے سنگ

سرواق کی کہانیاں

حبیبہ احسانات میں پیل مپ اپنے والی سڑق کی سنسنی
خیز کہانیاں جو ٹاڈر آپ کو نصیر سیں نہیں گی

آپ کے تہمت...
مشوے... تختیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا نہیں

چنی
نکتہ
چنی

1960ء ترکی کی تاریخ کا اہم ترین سال تھا تاہم
اورخان کو اس وقت تک اس کا ادراک نہیں ہوا جب تک وہ
خود آزادی کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرنے کے قابل نہیں
ہو گیا۔ ہاں، اس کے فہم کے مطابق اس برس ایک اہم واقعہ
ضرور رونما ہوا تھا!

قصد کچھ یوں ہے کہ ایک سرمدج ساتھی طالب علم نے
اس کے کان میں سرگوشی کی ”کیا تمہارے بابا آج تمہیں ہالی
ووڈ کی فلم دکھانے لے جائیں گے؟“

”ہالی ووڈ فلم؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس
وقت وہ آبی رنگوں کو کاغذ پر بکھرتے ہوئے ایک تصویر بنا رہا
تھا۔

”ہاں، تمہیں یہ بھی نہیں پتا؟ اب سینما میں انگریزی
فلمیں بھی چلائی جائیں گی۔“

شام میں کھانے کی میز پر اس نے اپنے بابا سے پوچھا
”آپ مجھے ہالی ووڈ فلمیں دکھائیں گے؟“

”ہالی ووڈ فلم؟“ بابا کے لہجے میں حیرت تھی۔
”ہاں، ہمیں بھی فلم دیکھنی ہے!“ میز پر موجود دیگر بچوں
نے ضد شروع کر دی جن میں سوکید اور حمیرا پیش پیش تھے۔ ان
کی آنکھوں میں جھٹس دمک رہا تھا۔

”دکھائیں گے بھی ضرور دکھائیں!“ یاسر پاکم مسکرا دیا
اگرچہ اندر سے وہ خوفزدہ تھا جس کی وجہ ملک کے بگڑتے
ہوئے سیاسی حالات تھے جنہوں نے استنبول کو اندیشوں میں
جلا کر دیا تھا۔

دراصل 1922ء میں اتحادی فوج کو مصطفیٰ کمال کی
قیادت میں پسپا کرنے کے بعد جب ترک فوج نے جدید ترکی
کی بنیاد رکھی تو مذہب کو سیاست سے علیحدہ کرتے ہوئے
سیکولرازم کے انعقاد کے لیے کئی بدنام زمانہ اصلاحات کی
گئیں۔ عربی رسم الخط کو متروک قرار دینے جیسے آمرانہ فیصلے
ہوئے، جنہوں نے عوام کو خدشات میں مبتلا کر دیا، وہ سڑکوں پر
نکل آئے۔ خاصا خون خرابہ ہوا لیکن فوج نے یزور طاقت
مسائل پر قابو پایا۔ آنے والے دنوں میں مصطفیٰ کمال نے
اتاترک (ترکوں کا باپ) کا خطاب حاصل کر لیا۔ 1938ء
میں اس کے انتقال کے بعد عصمت انونو ملک کا صدر بنا جس
نے فوج کی بھرپور پشت پناہی کے ساتھ اتاترک کی
اصلاحات جاری رکھیں۔

جن برسوں میں اورخان شعور کی منازل طے کر رہا تھا،
ہٹان میندریس کرسی صدارت پر براجمان تھا جسے بوڑھا اکثر
اپنی گفتگو میں ”نیک روح“ قرار دیا کرتا تھا۔

پنگ پنگ پر جائیں گے!“
اور گھر کے چھوٹے بڑے بچوں وچر اس کے احکامات
قبول کر لیتے۔
نئے، شرمیلے اورخان کو اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔
اسے لوگوں میں رہنا، خاموشی سے ان کی گفتگو سننا بہت پسند
تھا۔ رات جب وہ بستر پر دراز ہوتا تو اپنی خوش قسمتی پر رشک
کرتا کہ اسے ایک اچھا، پڑھا لکھا خاندان میسر ہے۔ اسے
قطعی اندازہ نہیں تھا کہ گردشِ ایام ایک روز سب کچھ بدل
دے گی!

☆☆☆

”ننھا اورخان ہر معاملے میں سوکید کی تقلید کرتا ہے!“
ایک روز یاسر پاکم نے اپنی خوب رویہ کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا۔

”سوکید بھی اپنے چھوٹے بھائی سے بہت پیار کرتا
ہے۔“ ہوئی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”وہ قدم قدم پر اس
کی رہنمائی کرتا ہے، اس کی غلطیاں اپنے سر لے لیتا ہے،
اسے مفید مشورے دیتا ہے۔“

سوکید ہی کی دیکھا دیکھی اورخان کے سر میں پتنگ بازی
کا سودا سہا لیکن جلد ہی اس سے اکتا گیا۔ پھر کیو تر بازی کا
شوق چرایا لیکن یہاں بھی بات نہیں بنی۔ پھر ایک روز اس نے
دیکھا، سوکید رنگ رنگ کی پینسلیں لیے بڑے سے سفید کاغذ پر
مختلف اشکال بنا رہا ہے۔ اس عمل سے وہ مبہوت رہ گیا۔

اسی روز اس کی رنگوں سے دوستی ہو گئی۔ اب وہ بھی اکثر
سفید ورق پر رنگیں پینسلیں گھستا نظر آتا۔

”میرا بیٹا بڑا ہو کر مصور بنے گا۔“ اس کی شفقت ماں اکثر
کہا کرتی تھی۔ اور اگر بھی یہ جملہ اس کی وادی سن لیتی تو فوراً
اپنی بہو کو ڈانٹ دیتی۔ ”کو چلا اس کی چال اپنی بھی بھول
گیا۔ اس کا دادا تاجر، باپ تاجر، یہ بھی تاجر ہی بنے گا،
سمجھیں!“

”جی!“ بھوپ ہو جاتی۔

مصوری کی جانب وہ سوکید کی وجہ سے آیا لیکن جلد ہی بڑا
بھائی اس فن سے الگ ہو گیا البتہ ننھا اورخان رنگوں سے کھیلتا
رہا۔

رشتے کی بہن حمیرا سے بھی اس کی گہری دوستی تھی۔ اس
رشتے میں اورخان سوکید کا کردار ادا کرتا اور حمیرا اورخان بن
جاتی۔ یعنی وہ اورخان کی تقلید کرنے کی کوشش کرتی اور اورخان
اس کی رہنمائی کرتا۔

☆☆☆

”کیا“ دے دے اتنی دلچسپی سے ریڈیو کیوں سنتے تھے۔ وہ تو
پوری طرح حکومت کے کنٹرول میں تھا۔ یکطرفہ خبریں، ایک
جیسے ڈرامے، حکومت کی شان میں قصیدہ گوئی، بس!“
خبر یہ سوال تو باشعور ہونے کے بعد اس کے ذہن میں
کوندا۔ بچپن میں تو وہ بھی گھر کے دیگر بچوں کی طرح ریڈیو کی
نشریات بڑے شوق سے سنا کرتا تھا۔ ہر شام آدھے گھنٹے کے
اشتہارات نشر ہوتے۔ آٹھ بجے مغربی موسیقی کا پروگرام شروع
ہوتا جسے استنبول میں بہت دلچسپی سے سنا جاتا۔ اس پروگرام
میں عوام کی فرمائشوں پر گانے چلائے جاتے تھے۔

ایک دن نہ جانے کیا سوچ کر ننھے اورخان نے پروگرام
کے میزبان کی جانب سے بتایا جانے والا نمبر ڈائل کر دیا اور
اپنی فرمائش نوٹ کر وادی۔ اگلے مہینے جب بل میں یہ کال لگ
کر آئی بوڑھا آگ بگولا ہو گیا۔

”یہ کس کی حرکت ہے؟“ لہجے میں غصہ تھا۔ سب جپ
رہے۔ ”چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ۔ میں یہ برداشت نہیں
کروں گا۔“

رات میں اس نے ڈرتے ڈرتے سوکید کو مطلع کیا کہ یہ
حرکت اس کی تھی۔

”کیوں کھری کھری سننا چاہتے ہو؟“ اس کے چہرے
پر نفکرات تھے۔ ”مصیبت پوچھ کر نہیں آتی۔ ہوش کے ناخن لو،
آئندہ یہ حرکت نہیں کرنا۔“

اس نے نصیحت گروہ سے باندھ لی اور پھر یہ غلطی نہیں کی۔
ریڈیو سے رات کو بجے خبر نامہ نشر ہوتا تھا جو بوریٹ سے
بھرپور ہوتا۔ فقط فوج کا موقف پیش کیا جاتا جس کے اعلیٰ
افسران ہر رات عوام کو یہ پیغام دیتے کہ وہی اتاترک کی
ریاست کی اصل محافظ ہیں۔ اکثر خبر نامہ سن کر بوڑھے کے
ذہن میں جھوٹیاں سی رینگنے لگتی ”قدرت کی لامٹی بے آواز
ہے!“ وہ بڑبڑاتا۔

☆☆☆

بھراؤد اگمرانہ، بنیادی سہولیات سے آراستہ گھر، جہاں
اس کے چچا، تایا کے علاوہ دیگر رشتے دار بھی مقیم تھے۔ اور گھر
کا سربراہ اس کا دے دے، جو پہلی ہی نظر میں ایک سخت مزاج
آدی معلوم ہوتا تھا۔

اس کا حکم تھا ”سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے!“ اور
ایسا ہی ہوتا۔ سب وقت مقررہ میز کے گرد جمع ہو جاتے۔
تہوار منانے کے طریقے بھی وہی وضع کرتا ”اس بار یوم
آزادی پر سبز جھنڈیوں سے گھر سجے گا... اس سال اتاترک کی
سالگرہ پر کوئی دعوت نہیں ہوگی... اس بار عید کے روز ہم سب

تھے "مگر میں خوشی ہے کہ بلی کو اگر کوئی گرل فرینڈ مل رہی ہے تو وہ تم ہو۔"

ان خطوط سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ سارہ کا یہ کردار جینفر کے لیے اور اس کے کیریئر کے لیے کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اس سیریز کی اہم بات یہ بھی ہے کہ جینفر کا یہ کردار آگے چل کر ایسا رخ اختیار کر لیتا ہے کہ وہ کم عمری میں حاملہ ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا کیریئر آگے کی ہی طرف بڑھ رہا تھا۔ پارٹی آف فائو میں جینفر کا پہلا سیزن اس کے لیے بہت بڑی کامیابی تھا۔ اس کے کردار کی مقبولیت اور جینفر کی اداکاری کو پسند کیے جانے کے باعث یہ کردار مسلسل اور مستقل کر دیا گیا۔ اب نوجوان ناظرین اس سیریز کے بجائے جینفر کے سحر میں گرفتار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لوگ اس کے چہرے، نام اور کام سے واقف بھی ہو رہے تھے اور متاثر بھی ہونے لگے تھے۔ یہ بات اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔ اس کی محنت رنگ لارہی تھی۔ اس سیریز سے اس کی تمام امیدیں پوری ہو رہی تھیں اور اب یہ طور اداکارہ اس کا نوکس لیا جانے لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جو خواب دیکھتی آئی ہے ان کی تعبیر ملنے کا وقت آگیا تھا۔

گزشتہ چند ہفتوں میں جینفر نے اپنی استعداد سے زیادہ کام کیا تھا۔ وہ بڑی طرح تھک چکی تھی مگر پھر بھی آرام کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ گرمیوں کے ابتدائی دنوں کے لیے "پارٹی آف فائو" معطل کر دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ریکارڈنگ کی جانب سے فراغت بھی مگر لو سکون سے گھر بیٹھنے والی نہیں تھی۔ اب تو وقت آیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرتی اور اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی۔ وہ ایک بہترین گلوکارہ تھی۔ باکمال رقاصہ بھی اور اتنی اچھی اور کامیاب اداکارہ بھی ثابت ہو رہی تھی۔ پارٹی آف فائو کی ریکارڈنگ منسوخ ہو گئی تو اس کی ماں نے کہا "اب کیا کرنے کا پروگرام ہے لو؟"

لو نے چونک کر کہا "اب میں ایک نیا البم تیار کروں گی؟"

"البم! کیا بچھلے البم سے سبق نہیں سیکھا؟" بیٹ ہیوٹ نے تشویش زدہ ہو کر کہا۔

"اوہ! مام! وہ میری غلطی تھوڑی تھی۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ میری کارکردگی بہت عمدہ تھی، مگر البم کو پہلنی کی ضرورت تھی۔ اب میں خاصی مشہور ہوں۔ مجھے یقین ہے میرا البم ہاٹ ایک کی طرح فروخت ہوگا۔"

اگلے ہی دن سے لو نے نئے البم کی تیاری شروع کر دی اور پھر تین چار دن بعد ہی اچانک اسے دو فلمیں مل گئیں۔ پہلی کا نام ہاؤس اریسٹ (HOUSE ARREST) تھا۔ اس فلم میں جیمس لی کرٹس مرکزی کردار کر رہی تھی۔ ہالی وڈ کی فلموں سے دلچسپی رکھنے والے جیمس لی کرٹس کو بھولے نہیں ہوں گے۔ جیمس لی کرٹس وہی اداکارہ ہے جس نے ایکشن کامیڈی فلم "ٹرولائز" میں آر نلڈ شیوارز نیگری بیوی کا کردار ادا کر کے بے پناہ شہرت حاصل کی تھی۔

ادھر لو کا البم زور و شور سے تیار ہو رہا تھا اور ادھر ہاؤس اریسٹ کا کام شروع ہو گیا۔ البم کو سال کے آخر میں ایک سادہ سے عنوان "جینفر لو ہیوٹ" کے تحت ریلیز کیا جانا تھا۔ اب وہ بے پناہ مصروف ہو گئی تھی۔ اس کے پاس سونے کے لیے بھی وقت نہیں بچا تھا۔ اس کا شیڈول بے حد تھکا دینے والا تھا۔ وہ ہاؤس اریسٹ کے سیٹ پر کام ختم کر کے بجائے گھر جانے کے ریکارڈنگ اسٹوڈیو چلی جاتی، جہاں البم کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ راستے میں آنکھیں بند کر کے گاڑی میں لیٹ جاتی اور اس طرح اپنی نیند پوری کر لیتی۔

ہاؤس اریسٹ اس کے لیے بہت اہم تھی۔ وہ جیمس لی کرٹس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ جس کو وہ بہت زیادہ پسند کرتی تھی۔ پہلے دن سیٹ پر جب اس نے جیمس لی کرٹس کو دیکھا تو بے اختیار اس کے حلق سے چیخ نکل گئی، وہ اپنی ماں کا ہاتھ چمڑا کر دوڑتی ہوئی گئی اور جیمس لی کرٹس کے گلے سے جھول گئی۔

جیمس اس کی یہ دیوانگی اور وارفتگی دیکھ کر بوکھلا گئی، لو نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا "اوہ! گاڈ! مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ مہ میرا مطلب ہے آپ میرے سامنے کھڑی ہیں؟"

جیمس لی کرٹس خاموشی سے کھڑی بچوں جیسی حرکت کرنے والی اس بھرپور لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کا پارٹی آف فائو دیکھتی رہی تھی، پھر اس نے کہا "تم تو خود اتنی مقبول اشار ہو کہ لوگ تمہیں دیکھنے کے لیے پھلتے رہتے ہیں۔"

لو نے کہا "پھلتے ہوں گے، مگر میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ میں اب تک بے شمار لوگوں سے مل چکی ہوں مگر آپ جیسی پیاری اور بہترین خاتون کوئی اور نہیں۔"

جیمس لی کرٹس مسکراتے لگی، اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم بھی تو بہت پیاری اور اپنی عمر کی لڑکیوں میں بہترین ہو"

تم جینفر لو ہیوٹ ہی ہونا؟"

لو پر جوش انداز میں سر ملانے لگی، یہ اس کے لیے اعزاز کی بات تھی کہ جیمس لی کرٹس جیسی عورت اس سے واقف تھی۔ اسے اس کا نام تک یاد تھا۔ اس وقت لو کو جو خوشی محسوس ہوئی تھی، اس کا تاثر ابھی تک لو کے ذہن پر تازہ ہے۔ وہ کہتی ہے "جب میں سیٹس پر شوٹنگ سے فارغ ہو کر پڑھنے بیٹھتی تھی تو وہ میرے پاس آتی تھیں، میں پیار کرتی اور ٹافیاں دیتی تھیں۔ وہ بہت سچی اور بہادر خاتون ہیں۔ میرے ساتھ تو ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔"

ہاؤس اریسٹ کا کردار جینفر لو کو آسانی سے نہیں مل گیا تھا۔ جب اس کردار کے لیے اس کا نام زیر غور آیا تو اسی وقت یہ بحث چمڑ گئی تھی کہ کہیں اس کا انتخاب غلط تو نہیں ہو رہا۔ پروڈیوسر نے تو جینفر سے پہلی ملاقات پر ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تم اچھی اداکارہ ہو، مگر اس فلم میں تمہارا انتخاب ناممکن بھی ہو سکتا ہے۔

جینفر نے چونک کر کہا "یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ میں نے آڈیشن دیا ہے اور میں اس میں کامیاب ہوئی ہوں۔"

"مگر تم عمر میں بڑی محسوس ہوتی ہو، تمہارا جسم ایسا ہو گیا ہے کہ کوئی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ تم تیرہ برس کی ہو۔ جبکہ فلم میں جس کردار کے لیے تم زیر غور ہو، وہ تیرہ برس کی نو عمر لڑکی ہے۔ تم اب نو عمر نہیں نو خیز ہو گئی ہو۔ نو خیز کا مطلب سمجھتی ہو نا۔"

جینفر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پر مایوسی طاری ہو گئی تھی۔ پروڈیوسر کا خیال درست تھا، وہ گھرواپس آئی۔ آئینے میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو دیکھ کر خود بھی حیران رہ گئی، وہ ایسی بھری بھری اور پھل دار ہو گئی تھی اور اسے احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔

مگر وہ بہت ہارنے والی تھی۔ اگلے دن وہ ایک بار پھر پہنچ گئی، اب اس نے اپنے حلقے میں تھوڑی تبدیلی کر لی تھی۔ میک اپ کے بغیر۔ اور بالوں کو گھونگھریلا کر لینے کے بعد وہ اپنی عمر سے کم دکھائی دے رہی تھی۔ کپڑے بھی عام سے پن رکھتے تھے۔ اس کی دوسری کوشش ناکام نہیں ہوئی اور اسے فائل کر لیا گیا۔ اب وہ ہاؤس اریسٹ کی کاسٹ میں شامل تھی، جیمس لی کرٹس کے ساتھ کام کرنے جا رہی تھی۔ کرٹس کے ساتھ کسی فلم میں کام کرنا اس کے لیے بہت اہم بات تھی۔ وہ بہت مجاہد اور خوش نظر آنے لگی تھی۔ اس کا جوش دیکھ کر کرٹس بھی مجاہد ہو رہی تھی۔ جب فلم کی عکس

بندی مکمل ہو گئی تو کئی دنوں بعد کرٹس نے کرٹس کے موقع پر اسے فون کیا اور کرٹس کی مبارک باد دیتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ لو تو پھولے نہیں سائی۔ وہ اس کی زندگی کا یادگار کرٹس بن گیا۔ جس کا تذکرہ وہ کئی میمنوں تک کرتی رہی۔ اس فلم میں اس کے ساتھ جیمس لی کرٹس ہی نہیں بلکہ جینفر ٹیلی بھی کام کر رہی تھی۔ جینفر لو اس کی بیٹی کا کردار کر رہی تھی۔ اس کو صرف ایک ہی پریشانی تھی کہ اس فلم میں اسے اپنی فلمی ماں (جینفر ٹیلی) کی وجہ سے خاصی شرمندگی کا سامنا کرنا تھا لیکن جینفر لو کے پیش نظر صرف ایک ہی بات تھی کہ اس کی فلمی ماں آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئی ہے۔

یہ ایک دلچسپ فلم تھی، اس کی کہانی کئی اعتبار سے منفرد اور انوکھی تھی۔ چودہ سال کی عمر کے گرور بین ڈورف (ادا کار کائل ہاورڈ) اس کی چھوٹی بہن اسٹینی اور ان کے والدین (جیمس لی کرٹس اور کیون پولاک) کے گرو گھومتی ہے۔ دونوں بچوں کے والدین میں اختلافات جنم لیتے ہیں اور شادی کی اٹھارویں سالگرہ پر دونوں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ انہیں علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ وہ یہ بات اپنے نو عمر بچوں کو بتا دیتے ہیں، بچے عجیب پریشانی میں مبتلا ہو کر اپنے دوستوں سے مشورہ کرتے ہیں۔ گرور کا دوست میٹ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ کیوں نہ تم اپنے ماں باپ کو کسی الماری میں بند کر دو، وہ ساتھ رہیں گے اور مجبور ہوں گے تو طلاق کا فیصلہ تبدیل کر لیں گے۔ گرور کو یہ تجویز بہت پسند آئی، مگر اس نے اس سے بھی ایک قدم آگے کا فیصلہ کیا، انہوں نے اپنے والدین کی اٹھارویں سالگرہ کے انتظامات گھر کے خاندان میں کیے اور پھر سالگرہ کے بعد انہیں خاندان میں بند کر دیا۔ اس سے پہلے دونوں بچوں نے خاندان کی ساری کھڑکیاں بند کر کے ان کے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔

دوسرے دن جب یہ دونوں بچے اسکول گئے تو انہوں نے اپنے دوستوں کو اس کارنامے کے بارے میں بتایا۔ اسکول میں ایک بد معاش لڑکا "ٹی بی" بھی تھا۔ اس نے گرور کی زندگی عذاب کر دی تھی۔ اس نے یہ ساری باتیں سن لیں۔ وہ اس کارروائی سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے اس خاندان پر نیا دروازہ بھی لگوا دیا اور پھر وہ میٹ کے والدین کو بھی اغوا کر کے اسی خاندان میں پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اس کے والدین کی ازدواجی زندگی بھی تباہی کے دہانے پر تھی اور ان میں بھی علیحدگی ہونے والی تھی۔

گرودور نے تو اپنے والدین کے ساتھ یہ حرکت محض اس لیے کی تھی کہ شاید اس طرح اس کی ازدواجی زندگی بربادی سے بچ جائے اور وہ علیحدہ ہونے کا خیال دل سے نکال دیں۔ اس مقصد کے لیے وہ تحقیق بھی کرتا ہے۔ یہ کردار جینفر لو ہیٹ کر رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی وجہ سے پریشان تھی جو اپنے آپ کو عمر رسیدہ سمجھنے کے بجائے اپنی بیٹی جیسی حرکتیں کرتی اور اس جیسی نظر آنے کی کوشش کرتی تھی اصل میں وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر ہی تیار نہیں تھی کہ وہ ایک جوان لڑکی کی ماں ہے۔ اسے بھی اسی خانے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد سارے بچے ایک وڈیو کیمرے کے ذریعے اپنے والدین پر نظر رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ مائیکروفون کے ذریعے ان سے بات کرتے ہیں۔ بچوں نے وہ کام ہاتھ میں لے لیے تھے جو دراصل بڑوں کے کرنے کے تھے شروع میں تو بچوں کو بہت مشکل پیش آئی مگر پھر رفتہ رفتہ مزہ آنے لگا لیکن معاملات بڑوں کی برداشت سے باہر ہو گئے تھے انہوں نے لائڈری کی کھڑکی سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ کڑس اس کھڑکی کے ذریعے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے مگر سامنے بچے ہوتے ہیں۔ وہ واپس خانے میں لڑھک جاتی ہے۔ علیحدگی پر آمادہ میاں بیوی جب خانے میں بند ہو کر ایک ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے تو وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کا علیحدگی کا فیصلہ مناسب نہیں تھا۔ ابھی انہوں نے اس موضوع پر کھل کر بات بھی نہیں کی تھی کہ مسز بین ڈورف کا وکیل طلاق کا نوٹس لے کر آگیا۔ یہ نوٹس بیوی کی جانب سے شوہر کے لیے تھا۔ تب بچوں کو یہ بات پتا چلی کہ ان کا باپ اپنی بیوی یعنی ان کی ماں کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا بلکہ ان کی ماں اپنے شوہر سے طلاق لینے کی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ اور علیحدگی پر آمادہ میاں بیوی میں محبت اور چاہت کی تجدید ہو رہی تھی تو دوسری طرف ان کا بیٹا گرودور اور اس کی دوست بروک (جینفر لو ہیٹ) ایک دوسرے کی محبت میں جلا ہو رہے تھے بروک نہ صرف اسے پسند کرنے لگی بلکہ اس کا احترام بھی کرنے لگی تھی۔

خانے میں موجود دونوں مرد اب بھی اس قید سے فرار کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ دونوں مرد بے پناہ کوششوں کے بعد ایک کھڑکی کے سامنے لگی اینٹیں اکھیرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میٹ کا باپ اس کھڑکی سے باہر نکلنے کی کوشش میں آدھا باہر اور آدھا اندر تھا کہ بچوں نے دیکھ

لیا۔ وہ اسے واپس اندر کی طرف دھکیلنے میں جت گئے جبکہ خانے میں موجود دونوں عورتیں اور ایک مرد اسے باہر دھکیل رہے تھے۔

یہ تمام کارروائی گلی کے اس حصے میں ہو رہی تھی جہاں ایک پولیس اہلکار رہتا تھا۔ اس نے یہ سارا منظر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پولیس اسٹیشن کو اس واقعے کی رپورٹ کر دی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس پہنچ گئی۔ اب ان بچوں کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس طرح ان کے علیحدگی پسند والدین نے خانے سے آزادی حاصل کر لی۔ تاہم قید میں رہنے سے ان کے ذہنوں پر خاصا مثبت اثر پڑا۔ میٹ کا باپ اور اس کی ماں طلاق کے فیصلے سے تائب ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر پر آمادہ ہو گئے پھر وہ ایک نئے نئے بچے کے بھی والدین بن جاتے ہیں۔ بروک کی ماں کے دل سے جوانی کا نشہ اُتر گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو جوان اور خود کو عمر رسیدہ سمجھنے پر آمادہ ہو گئی۔ گرودور کے والدین کے معاملات بھی درست ہو گئے۔ اس واقعے سے سارے بچے اسکول میں شہرت حاصل کر گئے۔ گرودور کو اپنی پسند کی لڑکی بروک (جینفر لو ہیٹ) مل گئی اور پھر سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

ہاؤس اریسٹ نوجوانوں کے لیے ایک بھرپور تقریبی قلم ثابت ہوئی۔ ایک ایسی مزے دار قلم جس میں بچوں کو بڑوں سے زیادہ ہوشیار، چالاک اور سمجھ دار دکھایا گیا تھا۔ ایک مشکل موضوع پر بننے والی ہلکی پھلکی قلم کو توقعات سے زیادہ پسندیدگی حاصل ہوئی۔ کہانی میں دکھایا گیا تھا کہ والدین کے درمیان ہونے والی علیحدگی کے باعث بچے خود کو بے دست و پا ہوتا محسوس کر رہے تھے۔ لہذا بچوں نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑوں کے فیصلوں کو تبدیل کر دیا۔ اس تبدیلی کو سب نے ہی بہت پسند کیا۔ بنیادی طور پر یہ ایک کامیڈی قلم تھی اور شائقین قلم کو ہنسنے ہنسانے کے لیے تیار کی گئی تھی مگر اس قلم میں لوگوں کے لیے بہت عمدہ پیغام بھی جگہ جگہ موجود تھا۔ قلم کی کہانی لوگوں کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے قلم کے ایک منظر میں جب تمام بچے رات کے کھانے کے لیے بیٹھے ہیں تو پہلی مرتبہ بڑوں کی طرح شیمپین پینے کی بھی کوشش کرتے ہیں مگر اس کا ذائقہ انہیں پسند نہیں آتا اور وہ شیمپین منہ سے اگل دیتے ہیں۔ قلم کا بنیادی پیغام یہی تھا کہ بعض اوقات اپنے ذاتی اختلافات کی بنیاد پر نہایت آسانی سے بغیر کچھ سوچے سمجھے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے

کامزات، شکوے، شکایات کو دور کرنے کے بجائے آسان راستہ اختیار کرتے ہوئے مسائل سے فرار حاصل کر لیتے ہیں مگر اس طرح ان کے حساس تجویز پر قیامت گزر جاتی ہے۔

اس قلم میں لو کا کردار بہت اہم تھا۔ وہ ایک طرف تمام بچوں کے لیے گویا ماں بنی ہوئی تھی تو دوسری طرف اپنی زندگی کے پہلے عشق کی دھیمی آنچ سے بھی پھل رہی تھی۔ اس کا کردار مرکزی تو نہیں تھا البتہ معاون ضرور کہا جاسکتا ہے اور جینفر اس عمر میں مرکزی کردار کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس قلم کو سائن کرتے وقت اس کی ماں بیٹ ہیوٹ نے اعتراض کیا تھا کہ ”تمہیں خود کو سپورٹنگ کرداروں میں شائع نہیں کرنا چاہیے۔“

جینفر نے کم سن دانشوروں کی طرح جواب دیا تھا ”میں ابھی ایسے ہی کردار کرنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن لو اگر تم ثانوی کردار کرو گی تو مرکزی کردار کب کرو گی؟“

”جب میں اٹھارہ برس کی ہو جاؤں گی۔ مرکزی کردار بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پوری قلم کا دباؤ مرکزی کرداروں پر ہوتا ہے“ ابھی میں ایسے ہی کردار کرنا چاہتی ہوں تاکہ اداکاری کو ہر زاویے سے دیکھ سکوں۔ مرکزی کردار ابھی میرے بس کی بات نہیں ہے، قلم کی پوری کہانی مرکزی کردار کے گرد گھومتی ہے اور میں اتنی جلدی اتنا دباؤ برداشت نہیں کر سکتی۔“

اس کی ماں چپ ہو گئی، ”لو کم عمری میں بھی بیویوں کی طرح باتیں کرنے اور بیویوں کی طرح فیصلے کرنے لگی تھی۔“

ہاؤس اریسٹ کے ساتھ ساتھ اس کے سنے الہم ”جینفر لو ہیٹ“ کی تیاریاں بھی زور و شور سے جاری تھیں۔ یہ نیا الہم وہ اٹلانٹک والوں کے لیے تیار کر رہی تھی۔ اس الہم کو گزشتہ الہم سے ذرا مختلف انداز میں تیار کیا جا رہا تھا سنے الہم کے منیجر کو آرڈی نیٹر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس الہم میں جینفر لو کی بھرائی ہوئی اور قدرے روکھی آواز کی مناسبت سے سر اور نال دالے ہلکے پھلکے گیت شامل کرے گا۔

لو اس الہم کے حوالے سے بہت پرجوش تھی۔ اس میں وہ ٹینک جیسا کوئی گیت تھا اور نہ ہی بلند آہنگ موسیقی اور فور شراب۔ ہاؤس اریسٹ اور یہ الہم ایک ہی وقت میں شروع ہوئے تھے۔ جینفر کا ایک گیت جو اس نے ہاؤس اریسٹ میں گایا تھا۔ اس الہم میں بونس کے طور پر شامل کر لیا گیا تھا۔

الہم میں اس گیت کو سب سے آخر میں رکھا گیا تھا۔ ”اٹل گڈ ٹو نو آئی ایم لائیو (IT IS GOOD TO KNOW I AM A LIVE) الہم میں شامل بقیہ گیارہ گیتوں سے بالکل مختلف تھا۔ خود جینفر کا کہنا ہے کہ الہم گیارہ گیت رات کی پرسکون خاموشی میں اور تنہائی میں سنے جانے کے قابل ہیں اور یہ آخری گیت ایسا ہے جو دل میں گد گدیاں پیدا کر دیتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ یہ گیت آخر میں رکھے جانے کا فیصلہ انتہائی دانش مندانہ تھا۔“

اس الہم کی تیاری کے دوران لو نے کئی پروڈیوسروں کے ساتھ کام کیا۔ وہ نہ صرف پروڈیوسر تھے بلکہ ان میں سے کئی تو اس الہم کے گیت نگار بھی تھے البتہ ویری ڈیوس الہم کے تمام گیتوں اور وڈیوز کی مستقل رکن تھی۔ لو کے تمام گیتوں کے پس منظر میں اس کی آواز سب سے نمایاں تھیں۔

الہم کی تیاری کے دوران ہی وہ جینفر لو کی بہترین دوست بن گئی۔ ”جینفر لو ہیٹ“ نامی اس الہم میں سنے گیتوں کے علاوہ کچھ پُرانے گیت بھی تھے جنہیں جینفر نے از سر نو گایا تھا۔ مثلاً ”آئی وانٹ اے لو آئی کین سی“ ساٹھ کی دہائی میں مقبول عام کی سند حاصل کرنے والا وہ شاہکار گیت تھا جو اسموکی رابن سن نے مراکل (MIRACALS) نامی ایک میوزک بیڈ کے ساتھ اشتراک کے بعد گایا تھا۔ اس طرح اتنی (80s) کی دہائی میں منظر عام پر آنے والی کیٹلاگ سے ”آئی ورز اکویر یور گرل“ بھی جینفر نے دوبارہ گایا۔ اسی کیٹلاگ کا ایک گیت ”اور لوڈنٹ تھرواٹ آل اوے“ جو ستر کی دہائی کا ایک مقبول ترین گیت تھا اور جس کو پہلی مرتبہ مشہور گلوکار آنجیانی اینڈی کب نے گایا تھا۔ اس کو بھی جینفر نے اس الہم میں پیش کیا۔

جینفر کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ گلوکاری اور اداکاری کے درمیان سینڈوچ بنی چلی جا رہی تھی۔ اداکاری کی بڑھتی ہوئی مسلسل مصروفیات کے باعث وہ گلوکاری پر بھرپور توجہ نہیں دے پاری تھی لیکن اس کے باوجود اسے گلوکاری سے عشق تھا۔ وہ اپنے عشق کو مناسب وقت نہ دینے کے باعث ذہنی طور پر اُلجھتی جا رہی تھی۔ ان باتوں کا اثر اس کے الہم پر بھی پڑا۔ اس الہم میں وہ اپنے اندر کی گلوکارہ کو ٹھیک طور پر سامنے لانے میں ناکام رہی۔ الہم کا پہلا گیت ”کول ددھ یو“ ایک بیجان خیز اور کسی حد تک بلکہ بہت حد تک بے باک تھا۔ بے باک اور بیجان انگیز تو خیر پورا الہم ہی تھا مگر یہ گیت کچھ زیادہ ہی جذباتی کر دینے والا تھا۔ نیم کلاسیکی موسیقی کے حامل اس گیت میں جینفر کی آواز۔۔۔

بے ہوش اور کھری کھری محسوس ہوتی ہے۔ سننے والا اس کی آواز کے رچاؤ اور زبردستی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ اس گیت کے بارے میں یو ایس ٹوڈے میگزین نے لکھا تھا کہ جینیفر اس گیت میں ماریا کیری سے زیادہ ٹونی برکس محسوس ہوتی ہے۔ اس گیت کو سننے والے واضح طور پر اندازہ لگا رہے تھے کہ ”لیٹس گو بیگ“ جیسا گیت گانے والی لڑکی اب مکمل اور بھرپور عورت بن چکی ہے۔ یہ خاصا رومانوی گیت تھا۔

الہم کا دوسرا گیت بھی رومان کی چاشنی سے لبریز تھا۔ دھیمی موسیقی اور دل کو چھو لینے والے سُروں میں یہ گیت کسی حد تک پورے الہم کا نچوڑ تھا۔ لو اگر اس گیت پر ذرا مزید توجہ دیتی تو شاید یہ بے پناہ مقبول ہوتا۔ صرف اس گیت کی وجہ سے ایک اخبار میں جینیفر کا انٹرویو شائع ہوا اس انٹرویو میں جینیفر نے صاف صاف کہہ دیا کہ ”ہاں! یہ گیت میں نے بہت جلدی میں گایا تھا“ اس گیت میں کسی قسم کا اضافہ کرنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا، میری بد قسمتی ہے کہ یہ گیت ضائع ہو گیا۔“

اب وہ ٹیلی ویژن اور فلم کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل کر چکی تھی، اس کا نتیجہ حسبِ مشاغل اور نیا الہم، گزشتہ الہم کے مقابلے میں زیادہ فروخت ہوا لیکن جینیفر کو اس پر بھی مایوسی ہوئی، اسے اس الہم سے بہت زیادہ توقعات تھیں۔ محض جزوی کامیابی نے اس کی ساری امیدیں خاک میں ملا دیں۔ اٹلانٹک والوں نے بھی وہی حماقت کی جو گزشتہ الہم کے وقت ہوئی تھی۔ اس الہم کی مارکیٹنگ درست انداز میں نہیں کی گئی تھی، ڈی وی پر تھیوری پروگرام نہیں دکھائے گئے۔ تھیوری پروگرام تیار تو ہوا مگر کسی بھی چینل پر پیش نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ”جینیفر لو ہیوٹ“ نای یہ الہم ”لیٹس گو بیگ“ سے زیادہ تعداد میں تو فروخت ہوا، مگر ریکارڈ ساز کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

یہ الہم زیادہ تر انہی لوگوں نے خریدا جنہیں اپنے دوستوں کے ذریعے یا پارٹی آف فائو کی ویب سائٹ یا پھر جینیفر لو ہیوٹ سے متعلق ویب سائٹس سے اس کی اطلاع ملی تھی۔ جینیفر لو ہیوٹ سے متعلق بہت سی ویب سائٹس ”پارٹی آف فائو“ میں اس کے پہلے سیزن کے بعد سے ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ان میں جینیفر کی ذاتی، آئیٹل ویب سائٹ ایک بھی نہیں تھی۔ تاہم ”پارٹی آف فائو“ کے پہلے سیزن میں اس کی آمد کے ساتھ ہی انٹرنیٹ پر اس کی ویب سائٹ بننے کی ہر شروع ہو گئی تھی اور پھر اگلے دو برسوں

میں اس کے نام سے اتنی تعداد میں ویب سائٹس بن چکی تھیں کہ وہ انٹرنیٹ پر دنیا کی پانچویں مقبول ترین اداکارہ بن گئی۔

پارٹی آف فائو کے ذریعے اس نے ہزاروں لاکھوں نوجوانوں کو اپنا دیوانہ بنالیا تھا، انہی دیوانوں نے اس کا الہم بھی خریدا۔ تاہم اس الہم کی جزوی کامیابی یا جزوی ناکامی کے بعد اس نے ایک پریس کانفرنس میں صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے فی الحال میوزک کو ایک طرف رکھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اس وقت اپنی پوری توجہ صرف اور صرف اداکاری کو دے رہی ہوں اور اس شعبے میں سو فیصد نتائج حاصل کرنا چاہتی ہوں۔

قلم اور پھر الہم کے مسلسل کام نے جینیفر کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد اسے ایک اور فلم کی آفر ہو گئی۔ اس فلم کا اسکرپٹ بہترین تھا۔ فلم نوجوانوں کے لیے بنائی جا رہی تھی۔ قلم کا نام نوجوان وار تھا، مگر یہ ”ریکیوی“ کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی۔

نوجوان وار نامی یہ فلم جینیفر کے لیے اس لیے بھی بہت اہم تھی کہ اس میں وہ نوجوان ہیرو کا کردار ادا کر رہا تھا جو اس کے دل میں پھانس کی طرح چبھ کر رہ گیا تھا اور اب تک مسلسل ادھوری محبت کی کک کے طور پر اس کے دل و دماغ میں زندہ تھا۔ وہی نوجوان دل فریڈل! جس کے ساتھ جینیفر نے پہلی مرتبہ خلوت میں کچھ وقت گزارا تھا اور پھر جینیفر نے کئی مرتبہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے دوبارہ بھی اس سے نہ تو رابطہ کیا اور نہ کوئی بات کی تھی۔ جینیفر کی پہلی محبت تھا۔ بعد میں جینیفر نے جوائے لارنس کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا، مگر دل فریڈل اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اسے بھلانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ دل فریڈل نے اس کے ساتھ کچھ خاص لمحے گزارنے کے بعد گھاس بھی نہیں ڈالی تھی۔ اب جینیفر کی زندگی میں جوائے لارنس آگیا تھا مگر محبت کی یہ کہانی زیادہ آگے بڑھنے میں ناکام رہی تھی، دونوں کی محبت کے چرچے تو عام تھے۔ اخبارات اور رسائل میں ان کی مشترکہ تصویریں اور کئی میٹھی خبریں بھی چھپ رہی تھیں مگر جینیفر جانتی تھی کہ ان کے درمیان اب پہلے جیسی بات رہی نہیں ہے۔ ان کے تعلقات کا خاتمہ ہونے والا تھا، دونوں کی ایک دوسرے سے ہزار ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ حالانکہ جینیفر نے جوائے کی محبت میں وہ تمام تقاضے پورے

کئے تھے جو مغربی نوجوانوں کی محبت کے لیے بے حد ضروری ہوتے ہیں۔ وہ اسے جہاں بلانا چاہتا، صرف ایک فون کر دیتا اور وہ دوڑی دوڑی چلی جاتی۔ اس دوران اس نے جوائے کے کئی روپ دیکھے تھے، اور جوائے اسے ہر حالت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ جوائے کی پانچوں میں انجوائے کر رہی تھی، بہت اچھا وقت گزار رہی تھی، مگر دل فریڈل اسے دیتا تھا کہ یہ محض تعلق ہے ایک جذباتی تعلق۔ اس تعلق کو وہ کسی بھی طرح محبت کا نام دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ دل فریڈل کے لیے اس کے دل میں اب بھی محبت کی چنگاریاں موجود تھیں، جینیفر نے علیحدہ رہ کر اس نے بھی اداکاری میں طبع آزمائی کی تھی اور نہایت تیزی سے اپنا مقام بنا رہا تھا۔ جلد ہی وہ ”بوائے بیس ورلڈ“ نامی سیریز میں کام کر کے پورے امریکا میں مقبولیت حاصل کر چکا تھا اور ایک اشارے کے طور پر ہر جگہ پہچانا جاتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر بیس برس تھی اور جینیفر نو عمر میں اس سے تین برس چھوٹی تھی۔ اس نے میٹرک کے بعد نیویارک میں رہائش اختیار کر لی تھی، ایک اچھا میجرل جانے کے باعث وہ جلد ہی مشہور ہو گیا، اور بڑے بڑے کام کرنے لگا تھا۔

نوجوان وار کی کہانی جینیفر لو اور دل فریڈل کی ذاتی لو اسٹوری میں خاصی مماثلت تھی۔ ایک جریدے نے تو یہ تک لکھ دیا تھا کہ ”نوجوان وار“ دراصل جینیفر لو اور دل فریڈل کی حقیقی داستان محبت پر تیار کی گئی ہے۔

نوجوان وار میں دل فریڈل نے بریڈ نامی ایک نوجوان طالب علم کا کردار کیا جو سینئر گریڈ میں پڑھتا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ گریجویشن کرنے والا تھا۔ یعنی اس کی تعلیم کے آخری دن چل رہے تھے، اسی اسکول میں پڑھنے والی خوب صورت ترین، سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی بروک کے ساتھ رہتا تھا، لیکن اس قدر کم ہمت تھا کہ باوجود کوشش کے اس لڑکی کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے میں ناکام ہو جاتا تھا۔ بروک نامی وہ خوب صورت لڑکی اسکول کی فٹ بال ٹیم کی دیوانی تھی، وہ جیسی لڈز بن گئی۔ جب وہ دونوں اسکول میں انیولوی کا سال مکمل کر لیتے ہیں تو آخری دن لیبارٹری میں انکول کا ایک استاد ایک جار میں قصداً ایک کنڈوم چھوڑ جاتا ہے۔ استاد جانتا ہے کہ کسی طالب علم کو اگر اس کی ضرورت ہے تو وہ اسے نکالے۔ بریڈ (دل فریڈل) کو کنڈوم جار میں ڈالنے کا موقع ملتا ہے، مگر اس نے اسے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اس کے استعمال کا موقع نہیں ملے گا۔ بریڈ کو کو اس قلم میں ایسا بے وقوف اور چغ

دکھایا گیا تھا کہ جو پیش قدمی کی کوشش نہیں کرتا تھا، حالانکہ مغربی معاشرے کے مطابق لڑکی کی طرف سے کسی قسم کے انکار کا امکان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بے وقوف اپنا سارا وقت اپنے فضول دوستوں کے ساتھ گپ شپ کر کے گزار رہا تھا۔ اس کے دوستوں میں نام بوائے ٹائپ کی ایک لڑکی لیہ (جینیفر لو ہیوٹ) بھی شامل تھی۔ وہ لڑکوں کی طرح حلیہ بنا کر رہتی تھی، اس کے دل میں بریڈ کے لیے محبت کے جذبات تھے (بالکل ان کی حقیقی زندگی کی طرح) مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ بروک کسی لڑکی میں کیسی خصوصیات دیکھنا پسند کرتا ہے۔

بریڈ اپنی دوست لیہ کی طرف جھکنے کے بجائے اپنے خوابوں کی شہزادی بروک کے سینوں میں کھویا رہتا تھا، مگر اپنے جذبات اس تک پہنچانے کی ہمت اس میں نہیں تھی، پھر بروک نے اسے ایک دن فرمائش کی کہ وہ اس کے گھر آکر اسے بائیولوجی پڑھا دیا کرے۔

بریڈ کو اپنے خواب سچ ہوتے دکھائی دیے۔ اب اسے اپنی شہزادی کے ساتھ پوری شام ایک کمرے میں تنہا گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس کے دوست اس پر رشک کرتے ہیں، مگر لیہ کو اس کی دیوانگی پر رحم آتا ہے، پھر ایک روز اس نے لیہ سے فرمائش کی کہ وہ بریڈ سے کچھ جذباتی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ کیا تم ان مکالموں کی مشق میں میرے ساتھ تعاون کرو گی؟“

یہ درخواست لیہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کا دل وکھی ہو گیا مگر اس نے بریڈ کی تیاری کروادی، جمعہ کی شام وہ بروک کو پڑھانے جا رہا تھا۔ یہ شام اس کے لیے اچانک خوشگوار ہو گئی جب اس کے والد نے اسے اجازت دے دی کہ وہ جاتے وقت 1972 ماڈل کی بیگوار XKE لے جاسکا ہے۔ وہ اس شان دار گاڑی میں بیٹھ کر بروک کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہو گیا، کیونکہ بروک اپنی خواب گاہ میں اپنے بوائے فریڈل کائل کے ساتھ موجود تھی۔ بروک کے پہنچنے پر اس نے کائل کو روانہ کر دیا اور بریڈ کو لے کر اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ خواب گاہ میں داخل ہونے کے کچھ دیر بعد بریڈ پر انکشاف ہوا کہ وہ بائیولوجی پڑھنا نہیں چاہتی بلکہ بائیولوجی کے اسباق کا عملی تجربہ کرنے کی خواہش مند ہے مگر مشکل یہ تھی کہ بریڈ کے پاس کہ نہیں تھا۔ اس نے باہر کی طرف دوڑتے ہوئے بروک سے وعدہ کیا کہ میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔“

وہ اس کے گھر سے باہر نکل گیا، مگر ہر جاتے ہی سب گڑ بڑ ہو گئی۔ معاملات اس کے ہاتھ سے نکلنے چلے گئے۔ وہ پہلے گروسری اسٹور پہنچا، وہاں سے کچھ کینڈی، پھول کھانے پینے کی دیگر چیزیں اور کنڈوم خرید کر پارکنگ کی طرف دوڑتے ہوئے آیا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ اس کے والد کی قیمتی ترین گاڑی اپنی جگہ سے غائب بھی ہو گئی اس کی گاڑی چڑا کر لے گیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح شہر پہنچا۔ پولیس اسٹیشن میں جا کر گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کرائی۔ بروک نے اس کی ہتھیلی پر اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ کر دیا تھا اور اس نے نمبر مٹ جانے کے خوف سے چار دن تک ہاتھ نہیں دھوئے تھے، پولیس اسٹیشن سے باہر آکر اس نے بروک کو فون کرنا چاہا تو پتا چلا کہ اس کی ہتھیلی پر سے ٹیلی فون نمبر مٹ چکا ہے۔ آخر مجبوراً اس نے اپنی دوست لید (جینیفر لو ہیوٹ) کو فون کیا کہ وہ اپنی گاڑی میں آکر اسے ایک اسٹاپ سے اٹھالے اور بروک کے گھر چھوڑ دے۔ اب اس اسٹاپ تک پہنچنے کے لیے اسے بس میں سوار ہونا تھا۔ وہ ایک بس میں سوار ہو گیا، مگر بد قسمتیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس کے پاس رقم بالکل ختم ہو چکی تھی۔ بس کا ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نہیں بچے تھے۔ (یہ وہی بس تھی جو مشہور عالم قلم "اسپیڈ" میں بھی استعمال ہوئی تھی) بس کا ڈرائیور ایک پاگل اور جنونی شخص تھا۔ ٹکٹ کے پیسے نہ ہونے پر اس نے بریڈ کو ویران سڑک پر اتار دیا۔ بے چارے بریڈ نے پیدل ہی چلنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ایک بار نظر آیا۔ وہ فون کی تلاش میں اس بار میں داخل ہوا تو ایک اور مصیبت کھڑی تھی۔ کم عمری کے باعث اسے بار میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی مگر اس نے چپ زبانی سے کام لے کر بار میں موجود لوگوں کو یہ کہہ کر احمق بنانے میں کامیابی حاصل کر لی کہ وہ مشہور ٹی وی سیریز "بے واچ" کا ہیرو ڈیوڈ ہیوز ہوف ہے۔ اس بار میں چھٹی کھانے کے ایک مقابلے میں اس نے سو ڈالر بیت لیے اور پھر ہاتھ روم کی کھڑکی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ایک بار پھر وہ سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک گاڑی اپنی طرف آتی دکھائی دی تو وہ بڑی طرح چونک گیا، وہ اسی کی گاڑی تھی جو گروسری اسٹور کے پارکنگ سے چوری ہو گئی تھی۔ کار کی حالت خستہ ہو گئی تھی اور اس میں مین بد معاش سوار تھا۔ یہ وہی بد معاش تھے جنہوں نے ایک بدلتے نکل اس کے اسکول کی دیوار پر اپنے گروہ کا علامتی نشان بٹایا تھا۔ انہیں جب بریڈ کے ذریعے یہ بات پتا چلی کہ ان کا

نشان بریڈ نے ہی اسکول کی دیوار سے مٹایا تھا تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بریڈ کو گھینٹے ہوئے اس کے اسکول تک لے کر گئے اور اسے اپنا نشان چنٹ کرنے کا حکم دیا۔ جب مجبوراً بریڈ نے یہ کام کر دیا تو انہوں نے بے چارے بریڈ کو تو وہیں چھوڑ دیا اور ایک بار پھر اس کے والد کی گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ اس کے پاس موجود سارا سامان بھی ضائع ہو گیا تھا مگر اسے صرف کنڈوم کی ضرورت تھی اور اسے یاد تھا کہ وہ اسکول میں ہی بائیولوجی کی کلاس کے ایک جارج میں رکھا ہوا ہے، وہ اسکول میں داخل ہوا اور کنڈوم حاصل کر لیا مگر بد قسمتی سے اس کی ڈبھیڑ اسکول کے تہذیب و اخلاق اور انڈسٹری کے چوکیدار سے ہو گئی۔ اس نے اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کر ڈالی اور اسکول کی بیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیا۔ وہ وہاں سے پریشانی فرار ہوا تو وہ شخص اس کے پیچھے لگ گیا جسے اس نے چٹنی کھانے کے مقابلے میں شکست دی تھی۔ اتفاقاً اسے رستے میں اپنی دوست لید (جینیفر لو ہیوٹ) مل گئی۔ وہ جذبات میں اندھ سی ہو رہی تھی اور بریڈ کو اپنا دل کھول کر دکھانا چاہتی تھی مگر اظہار محبت میں ناکام ہو گئی اور اسے اپنی کار میں بٹھا کر بروک کے گھر کے پاس اتار دیا۔ مگر ابھی بریڈ کی مشکلات ختم نہیں ہوئی تھیں۔ وہ بڑی طرح بھگ چکا تھا، اس نے بروک کے گھر کی اطلاعی کھنٹی بجائی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کھڑکی کے ذریعے گھر میں کھنسنے کی کوشش کی تو کنڈوم کیس کھو گیا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد اسے بروک کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک پرچہ ملا کہ میں بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد ایک پارٹی میں شرکت کرنے جارہی ہوں۔ بریڈ پر مایوسی طاری ہو گئی، عین اسی وقت پولیس نے اس گھر کو گھیرے میں لے لیا مگر بریڈ کسی نہ کسی طرح اس گھر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ اس نے پولیس کو جل دے دیا، مگر ایک کتا اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ ایک کٹری کلب میں گھس گیا، وہاں اس کے والدین رقص کرنے میں مصروف تھے، کتابدستور اس کے پیچھے تھا اس نے ایک گولف کارت چرائی اور وہاں سے نکل کر سڑک پر ایک راہ گیر سے کپڑے تبدیل کر لیے، اب اسے ایک کنڈوم کی تلاش تھی۔ اپنی جیب میں بچی کچھی رقم سے اس نے کنڈوم کا ایک پکٹ خرید لیا مگر انہیں استعمال کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔ وہ انہی اسٹور میں ہی تھا کہ وہی بد معاش جنہوں نے اس کی کار چھوٹی تھی اس اسٹور میں گھس آئے اور انہوں نے اسٹور لوٹ لیا۔ اسی انہیں اسٹور کے باہر پولیس پہنچ گئی بد معاشوں نے

بریڈ کو برغمال بنالیا اور اس کے والد کی گاڑی میں ہی فرار ہو گئے، پولیس ان کے تعاقب میں تھی۔ آخر کار وہ گرفتار ہو گئے ان کے ساتھ بریڈ بھی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کے مالات جان کر اور ساری کمائی سن کر ایک پولیس اہلکار کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے بریڈ کو ایک کنڈوم دے دیا۔ بریڈ نے خوشی خوشی اپنی دوست لید (جینیفر لو ہیوٹ) کو فون کیا مگر اب لید ایک نئے انداز سے اس کے سامنے آئی۔ وہ مردانہ کپڑوں اور لڑکوں جیسے انداز سے نجات حاصل کر چکی تھی۔ اس نے نہایت جاذب نظر لباس پہن رکھا تھا، اس کا پرکشش بدن اور نسوانی خدو خال نمایاں تھے۔ وہ اس وقت اسی تقریب میں شریک تھی جہاں بریڈ کی محبوبہ بروک بھی آئی ہوئی تھی۔ لید نے بریڈ کو پارٹی میں چھوڑا اور واپس جانے لگی تو اس کی گاڑی پارکنگ میں پھنس گئی۔ وہ وہیں رکنے پر مجبور ہو گئی۔

دوسری طرف بریڈ اپنی محبوبہ بروک کے پاس پہنچ گیا، وہ اسے لے کر عمارت کے اوپری کمروں کی طرف بڑھی اب اسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے والی تھی۔ مگر عین وقت پر بریڈ کا دماغ تبدیل ہو گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ جس بغیر محبت کے بیکار ہے۔ وہ کسی ایسی لڑکی کے ساتھ بستر نہیں جاسکتا جس سے اسے حقیقی محبت نہیں ہے۔ وہ بروک کو کمرے میں ہی چھوڑ کر باہر آ گیا۔ اب اسے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو اس کے لیے بے حد اہم ہو۔ اور بلاشبہ وہ لڑکی لید کے ملاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ پارکنگ میں لید کے پہنچا، پہلے تو وہ یقین نہیں کیا، مگر بریڈ (دل فریڈل) کے طویل اور پرجوش بوسے نے اسے یقین کرنے پر مجبور کر دیا پھر سب ٹھیک ہوتا چلا گیا۔

جینیفر لو کی زندگی کا وہ بوسہ تھا جس نے اسے یقین دلا دیا کہ دل فریڈل کو اس نے اپنے خوابوں کا شہزادہ بنا کر غلطی نہیں کی ہے۔ جب اس بوسے کا منظر عکس بند کیا جا رہا تھا تو جینیفر کی ٹانگیں بڑی طرح کانپ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بوسوں کی سماعت تقسیم کر چکی تھی مگر اس بوسے نے اس کے نظریات اور خیالات تک کو تبدیل کر دیا۔ جس محبوب سے ملنے کے لیے وہ تڑپتی رہی تھی وہ اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر اس کے لیون کا سارا شہد حاصل کر چکا تھا۔ اس روز جینیفر کی حالت عجیب ہو گئی تھی، شوگن ختم ہونے کے بعد دل فریڈل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے چونک کر

جینیفر لو کی طرف دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، لو اپنے دل کی بات زبان پر لے آئی اور بولی "دا" کیا تم مجھے اپنے ساتھ ذرا باہر لے جاؤ گے، میں کب سے اس وقت کا انتظار کر رہی تھی اب مجھ سے ہواشت نہیں ہوتا۔"

دل فریڈل نے کندھے اچکائے اور فوراً آمادہ ہو گیا۔ آگ دوسری طرف بھی دیکھ چکی تھی۔ دونوں ایک ہو کر کے پرسکون گوشے میں جا کر بیٹھ گئے، کافی پینے تک ساتھ بیٹھنے مرنے کے تمام عہد و پیمان بھی ہو گئے اور محبت کی گاڑی پہری پر آ گئی۔

محض ایک بوسے کی وجہ سے یہ قلم جینیفر لو کے لیے بہت اہم ہو گئی تھی۔ اس قلم میں بھی اور قلم سے باہر بھی اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا تھا اور وہ اپنے محبوب کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئی تھی اس کے لیے دل سے بہتر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ٹریوین وار ایک عمدہ اور خاصی دلچسپ قلم تھی۔ اس قلم میں یہ پیغام دیا گیا تھا کہ جس سے زیادہ محبت کی اہمیت ہوتی ہے۔ شائقین کو بھی لو اور دل کے درمیان پروان چڑھنے والی محبت اور ان کی نا آسودہ داستان محبت کا علم رسائل و جرائد سے ہوتا رہا تھا۔ لہذا اسکرین پر ان دونوں کے درمیان پل پل بدلنے والی کیمسٹری کا نظارہ ان کے لیے دلچسپی کا باعث ثابت ہوا۔ اگرچہ یہ دل کی قلم تھی مگر جینیفر نے ہر وہ منظر چڑا لیا جس میں وہ اسکرین پر نمودار ہوئی۔ اس نے ہر منظر میں اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلایا اور دل کے بعد قلم کی سب سے بہترین اداکارہ اسے ہی قرار دیا گیا۔

اس قلم کے لیے اس نے پوری گرمیوں میں شوٹنگ کرائی تھی، مگر اب بھی بے حد مصروف تھی۔ پارٹی آف فائو میں اب سارہ کا کردار بے پناہ مقبولیت حاصل کرنا جا رہا تھا۔ ٹی وی میگزین کے ہر شمارے میں اب جینیفر لو ہیوٹ کی نازہ ترین تصویریں، انٹرویوز اور چٹ پٹی خبریں شائع ہونے لگی تھیں۔ وہ ایسی لڑکی بن گئی تھی جو امریکی معاشرے کی نوجوان لڑکیوں کے لیے رول ماڈل ہوتی ہے۔

جینیفر کے کردار اور اس کی شخصیت کی مقبولیت سے قائم اٹھانے کے لیے سیریز (SEARS) اور سیونٹین میگزین نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان دونوں جرائد کی نمائندگی کرے اور ملک کے چھ مختلف شہروں میں واقع شاہک سینٹروں کا دورہ کرے، لوگوں سے گفتگو کرے، لوگوں کے سوالوں کے جواب دے۔

جینیفر نے فوراً ہاں بھری۔ وہ اپنی مقبولیت سے جی بھر کر

انجوائے کرنا چاہتی تھی، اس کی رضامندی حاصل ہوتے ہی فوراً سارا پروگرام ترتیب دیا جانے لگا۔ اس دورے کے دوران ملے کیا گیا تھا کہ وہ ان شاپنگ سینٹروں پر نہ صرف لوگوں سے باتیں کرے گی بلکہ اسے اور بھی بہت سے کام کرنا ہوں گے۔ مثلاً وہ اپنے نئے الیم میں سے چند گانے بھی گائے گی۔ لوگوں کو نصیحتیں کرے گی، انہیں فوری ٹوکنے بتائے گی اور چند آٹوگراف بھی دے گی۔

یہ چند آٹوگراف والا معاملہ بہت طویل پکڑ گیا۔ اس سے آٹوگراف لینے والوں کی لائن لگ گئی۔ دستخط کرتے کرتے اس کے ہاتھوں میں درد ہونے لگا مگر وہ خوش خوشی یہ سارے کام کر رہی تھی وہ بچپن سے ایسی ہی زندگی کی تمنا کرتی آئی تھی۔ اسی دوران دونوں رسائل نے ”سالانہ پیک پر فارمنس“ مقابلوں کا بھی اعلان کر دیا۔ ان مقابلوں کی ترجمان بھی جینیفر لو ہیوٹ کو ہی منتخب کیا گیا۔ اس مقابلے میں جیتنے والوں کو تعلیمی اسکالرشپ دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مقابلے میں صرف تیرہ برس سے آئیس برس کی لڑکیاں حصہ لے سکتی تھیں۔

اس مقابلے کی ترجمان کے لیے اس سے درخواست کی گئی تو وہ بھونچکی رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے اس قدر اہمیت دی جائے گی، چند لمحوں تک تو اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا، درخواست لانے والی خاتون نے کہا ”اگر آپ کو مقابلے کی ترجمان بننا قبول نہیں تو ہم کچھ اور سوچیں گے بہر طور ہم آپ کو اپنے اس پورے سیشن میں شامل رکھنا چاہتے ہیں۔“

جینیفر لو نے مسرت بھرے لہجے میں کہا ”نہیں۔ نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو اس قدر عزت ملنے پر گنگ ہو کر رہ گئی ہوں، اود خدا۔ یہ۔ یہ تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔“

”لیکن مادام! اس پروگرام کا شیڈول بہت سخت ہے“ آپ اچھی طرح غور کر لیں، آپ کو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ آپ کا پروگرام پارٹی آف فائو پورے ملک میں۔ بلکہ کئی ملکوں میں دیکھا جاتا ہے، آپ کو لاس اینجلس سے باہر نکل کر لڑکیوں سے ملنے کا موقع ملے گا۔ آپ کو یہ جاننے کا موقع ملے گا کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔“

جینیفر نے فوری طور پر معاہدے پر دستخط کر دیے۔ وہ اس قدر عمدہ موقع گنونا نہیں چاہتی تھی اور پھر شاپنگ سینٹروں میں جا کر پر فارمنس دینا فنکاروں کے لیے کوئی نئی بات

نہیں تھی۔

اسی کی وہائی میں مشہور گلوکارہ ٹیفن نے اپنا کیریئر شاپنگ سینٹروں میں گیت گا کر ہی شروع کیا تھا۔ شاپنگ سینٹروں میں گا گا کروہ جلد ہی بہت بڑی اشار بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ ”بیک اسٹریٹ بوائز“ نے بھی اپنے ابتدائی دنوں میں شاپنگ مال، ہائی اسکول اور جہاں جہاں انہیں مدعو کیا جاتا، وہاں جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہاں البتہ فرق یہ تھا کہ اس سے قبل کسی مقبول اشار نے ایسا نہیں کیا تھا۔ جینیفر لو ہیوٹ بہت مقبول اشار بن چکی تھی۔ لہذا وہ پہلی مقبول اشار تھی جو شاپنگ سینٹر میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے جا رہی تھی۔

اس سے قبل وہ تقریباً ساری دنیا گھوم چکی تھی مگر یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے وطن کا دورہ کرنے والی تھی۔ پہلے پروگرام کی تاریخ 3 نومبر مقرر ہوئی اور ملے پایا کہ وہ پہلی پر فارمنس لاس اینجلس کے سن سیٹ بنے دار میں ہاؤس اور بلیو میں دے گی۔ وہ آرام کے وقفے کے بغیر ہی اس ٹور کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ یہ اس کی زندگی کا یادگار موقع تھا۔ یہ دیکھ کر اسے خوش گوار حیرت ہوئی کہ پارٹی آف فائو کے توسط سے اس کے پرستار پورے امریکا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے چاہنے والوں کی تعداد بے تحاشا تھی۔ لوگوں کے جتنے کے جتنے اس سے آکر مل رہے تھے۔ ہر جگہ اس کا استقبال انتہائی گرم جوشی سے کیا گیا اور وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی رہی۔

پارٹی آف فائو کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کو تیسرے یزن میں بھی مسلسل جاری رکھا گیا۔ جینیفر اس کے تیسرے یزن میں بھی شامل تھی۔ تیسرے یزن کی اقساط میں جینیفر لو ہیوٹ کا کردار خاصی اہمیت اختیار کر گیا۔ تیسرے یزن کی پہلی قسط ٹی وی پر اگست 1996ء میں آن ایر ہو گئی۔ (ان دنوں نئے یزن کی ابتدا روایتی طور پر ستمبر یا اکتوبر میں ہوا کرتی تھی) اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ اس دوران دیگر چینل پر پڑانے پروگرام چل رہے ہوتے اور یوں تیسرے یزن کے دوران ناظرین کی تعداد میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔ اب پارٹی آف فائو ٹیلی ویژن دیکھنے والے لاکھوں اور کروڑوں ناظرین میں اپنی جگہ بنا چکا تھا، اس کے ناظرین میں اٹھارہ سے چونتیس سال کی عمر کے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس موقع پر فوکس ٹی وی والوں نے سوچا کہ اس پروگرام کی بنیادیں وسیع کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ

1997ء میں ڈاکٹر پیپر اور ایکسپریس کلا تھنگ اسٹورز کے ساتھ پندرہ ملین ڈالر کی تھیری میم کا معاہدہ کیا گیا۔ یہ اس نیٹ ورک کا اب تک کا سب سے بڑا معاہدہ تھا۔ جو اس پروگرام کے ذریعے ملے پایا تھا جسے ابتدا میں بے دلی سے شروع کیا گیا تھا، مگر سارہ (جینیفر لو ہیوٹ) کے کردار کی مقبولیت نے مرتے ہوئے پروگرام کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ اس تھیری میم کے تحت رسالوں، اخبارات، ٹیلی ویژن ہر جگہ اشتہارات چلائے گئے، پارٹی آف فائو کے نام سے انعامی پروگرام بھی منعقد کیے گئے۔ اس پروگرام کے نام پارٹی آف فائو کی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر ایڈیا کے سولی چینل نے بھی ”ہم پانچ“ نامی مقبول ترین پروگرام پیش کیا تھا۔

تھیری میم کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اگلے ایک برس کے دوران پہلے سے کہیں زیادہ لوگوں نے اس پروگرام کو دیکھا۔ لوگ اس کے کرداروں اور خاص طور پر سارہ (جینیفر لو ہیوٹ) کے دیوانے ہوتے چلے گئے۔ ہر ہفتے بے چینی سے ”پارٹی آف فائو“ کا انتظار کیا جانے لگا اور یزن کے اختتام تک ٹیلیسن درجہ بندی میں پارٹی آف کا نمبر تراسی واں ہو گیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی جس نے فوکس ٹی وی والوں کو مزید پرجوش کر دیا اور انہوں نے فنکاروں کے معاوضے میں دگنا اضافہ کر دیا۔ یہ پروگرام فوکس ٹی وی کی جانب سے مقبول ترین پروگرام ثابت ہو رہا تھا، یہ معمولی کامیابی نہیں تھی، خاص طور پر ایسے پروگرام کے لیے جسے چند برس قبل قلعی طور پر منسوخ کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

پارٹی آف فائو کی مقبولیت میں اداکاروں کی پر فارمنس، بہترین اسکرپٹ، نہایت مضبوط اور حقیقت سے قریب کہانی کا بڑا دخل تھا۔ چند اداکاروں کے باعث بھی پروگرام کو ملنے والی تھیری میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، مثلاً نیوی سمیل۔ اس کی وجہ سے بھی پارٹی آف فائو کو بہت مقبولیت ملی۔ اس نے دوسرے اور تیسرے یزن کے دوران ”اسکریم“ (SCREAM) نامی معرکتہ الارا خوفناک فلم میں کام کیا تھا۔ یہ فلم قلم کار کیون ولیم کے زور قلم کا نتیجہ تھی، جس نے بعد میں ٹیلی ویژن کے لیے ایک مقبول ترین سیریز ”ڈالسن کریک“ کے علاوہ سینما کی تاریخ کی مقبول ترین خوفناک فلم ”آئی نو واٹ یوڈ لاسٹ سمر (DID LAST SUMMER) بھی لکھی تھیں۔

اسکریم نامی خوفناک فلم چھوٹے بجٹ سے تیار کی گئی تھی اور کسی کو بھی اس کی کامیابی کی امید نہیں تھی مگر ریلیز

کے بعد یہ فلم نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئی اور باکس آفس ہٹ قرار پائی۔ اس کے ساتھ ساتھ سال میں سب سے زیادہ بزنس کرسنے کا بھی اعزاز حاصل کر لیا۔ اس فلم میں کام کرنے سے نیوی سمیل مکمل طور پر اشار بن گئی۔ اس کے بعد اس نے ”سٹریٹ ٹائٹ لائیو“ نامی ٹی وی پروگرام کی میزبانی بھی کی اور یوں اس کا قلمی کیریئر کامیابی سے شروع ہو گیا۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ یہ مقبول اشار نیوی سمیل بھی ”پارٹی آف فائو“ میں کام کر رہی ہے تو یہ پروگرام ایک دم ان لوگوں کی دلچسپی کا بھی مرکز بن گیا۔ جنہوں نے ”پارٹی آف فائو“ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس دوران جینیفر لو ہیوٹ نے بھی ٹیلی ویژن پر اپنے پڑ پھیلانا شروع کر دیے تھے۔ پارٹی آف فائو میں سارہ کے کردار کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ایم ٹی وی والوں نے اسے پیشکش کی کہ وہ ”ٹریڈل آف ٹین ٹراپ“ کی میزبانی قبول کرے۔ ایم ٹی وی والے جانتے تھے کہ جینیفر خود بھی جوان ہے، پُرکشش اور سیکسی ہے، لہذا نوجوانوں کی توجہ اپنی جانب تیزی سے مبذول کر سکتی ہے۔ جینیفر نے یہ پروگرام نہایت کامیابی سے پیش کیا۔ اس کے بعد اسے فوکس ٹیلی ویژن کے ان چند بڑے فنکاروں میں بھی شامل کر لیا گیا جو ”ہالودن اسٹیشن“ کے پروگراموں کی میزبانی کرتے ہیں مگر اس پروگرام سے اس کی ایک تلخ یاد وابستہ ہے جسے بھلانا جینیفر کے لیے ممکن نہیں۔

وہ فلوریڈا میں فوکس کے ہالودن اسٹیشن پروگرام میں اپنی پر فارمنس پیش کر رہی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس نے جو چٹلون پین رکھی ہے۔ اس کے پچھلے حصے میں دانستہ طور پر ایسے سوراخ چھوڑے گئے ہیں جن سے اس کا بدن چھلک رہا تھا۔ وہ اس واقعے سے بے خبر رہی تھی۔ لوگ یہ بات دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ کسی نے اس کی نشان دہی نہیں کی اور جب جینیفر لو کو خود اچانک چٹلون کی اس خالی کا احساس ہوا تو وہ بڑی طرح کھول کر رہ گئی۔ اسے اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا مگر وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ ہالودن پر اس قسم کے مذاق عام طور پر کیے جاتے ہیں۔

نئے یزن میں پارٹی آف فائو کی کہانی نقطہ معروج پر پہنچ گئی۔ سارہ (جینیفر لو ہیوٹ) جس لڑکے (ٹیلی) سے محبت کرتی ہے وہ کسی اور کے بستر میں پناہ ڈھونڈ لیتا ہے اور پھر احساس جرم کے زہر اثر اگر شراب نوشی کرتے لگتا ہے۔ پروگرام کی ہر قسط کے ساتھ سارہ اور دیگر کرداروں پر جرائد

میں اس طرح بحث چھیڑ جاتی تھی جیسے وہ ڈرامے کے کردار نہ ہوں، حقیقی زندگی کے کردار ہوں اور یہی بات اس پروگرام کی بے پناہ مقبولیت کا مبینہ ثبوت ہے۔ اس سیزن کے دوران بلی اور سارہ کے تعلقات کو جس انداز سے ٹریٹمنٹ دیا گیا تھا، جینیفر اس سے بہت خوش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بلی اور سارہ کے درمیان دکھائے گئے تعلقات حقیقت سے قریب ترین۔

ڈرامے کی مسلسل کہانی نے جینیفر کو بھی زندگی اور محبت کے بارے میں بہت کچھ سوچنے کا مواد فراہم کر دیا تھا۔ پارٹی آف فائیو کے سیزن کا اختتام کئی اعتبار سے جینیفر لو کے لیے اہم ثابت ہوا۔ فروری 1997ء میں وہ اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی اور سرکاری طور پر بالغ قرار دی جا چکی تھی۔ اٹھارہ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے تک وہ قانونی پابندیوں کا شکار تھی اور قانون کے مطابق دن بھر میں ساڑھے دس گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ جب شام کو اسے بتایا جاتا کہ اس کے ساڑھے دس گھنٹے پورے ہو گئے ہیں تو وہ ایک لحظہ مایوسی کا شکار ہو جاتی تھی کیونکہ ابھی اس کو تصدیق بھی نہیں ہوتی تھی اور گھر جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا ہوتا تھا لیکن قانون کی پاسداری ضروری تھی اسے وقت مقررہ کے بعد سیٹ پر نہ آنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اٹھارہ سال کی ہو جانے کے بعد اب وہ بھی چوہ یا سولہ گھنٹے سیٹ پر گزارنے کے لیے آزاد تھی۔ اب کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں رہی تھی۔

اسی دوران اس نے ہائی اسکول سے گریجویٹ بھی کر لیا۔ اگرچہ وہ کیلی فورنیا میں اپنی فلموں اور ڈراموں کے میسنس پر پڑھتی تھی مگر اس کا ہوم ورک ایک اسکول میں جانا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہائی اسکول کی اس جماعت کی غیر حاضر طالبہ تھی۔ جس نے اس سال گریجویشن کر لیا تھا مگر وہ اپنے اسکول کے کسی بھی طالب علم سے واقف نہیں تھی۔ جب گریجویشن کی اسناد تقسیم کرنے کی تقریب کا انعقاد ہوا تو پپیل (PEOPEL) میگزین نے اس تقریب کی خاص طور پر کوریج کی۔ یہ اس ہائی اسکول کے لیے بھی اعزاز کی بات تھی۔ پپیل میگزین نے اس سے مل کر ہائی اسکول کی تقریب کو ایسی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس قدر شہرت یافتہ ہو چکی تھی کہ پپیل میگزین نے اس تقریب کو بھی اہمیت دی جس میں وہ اپنی ڈگری لینے کے لیے شریک تھی۔

جینیفر لو کے گریجویشن نے اسے اپنے پسندیدہ اشار

جانی ڈیپ سے متعارف ہونے کا موقع فراہم کیا۔ وہ اسٹا اداکار جانی ڈیپ کی دیوانی تھی۔ جب اس نے جانی ڈیپ کا قلم ”ڈون جو آن ڈی مارکو“ دیکھی تھی تو اسے جانی کی اداکاری اس قدر پسند آئی کہ یہ قلم اس کی پسندیدہ ترین بن گئی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی ایک بی کا نام بھی ڈون جو آن رکھ دیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے پسندیدہ اداکار سے اس کا تعارف ہو جائے گا مگر جو ہوتا ہوتا ہے وہ ہر کر رہتا ہے۔ یہ اتفاق بھی ہوتا تھا لہذا ہو گیا۔

لو نے ایک ڈرائیور ملازم رکھا ہوا تھا جو اسے گھر سے پارٹی آف فائیو کے سیٹ پر لے جاتا تھا اور پھر وہاں سے واپس گھر لاتا تھا۔ ایک روز جب ڈرائیور نے اسے بتایا کہ جانی ڈیپ کو لینے اتر پورٹ جا رہا ہے تو جینیفر بڑی طرح چونک گئی اور پرجوش گیسے میں بولی ”کیا واقعی تم جانی کو لینے جا رہے ہو۔“

”جی ہاں!“ ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا۔
”ٹھیک ہے، تم جانی کو میری طرف سے ہیلو کہہ دینا۔“
ڈرائیور نے جینیفر کا ہیلو جانی تک پہنچا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ اب گریجویشن کر چکی ہے اور آج ڈگری حاصل کرنے کے لیے تقریب میں شرکت کے لیے جانے والی ہے۔ جینیفر گھر آئی تو ٹیلی فون ریکارڈ کرنے والی مشین پر کسی لڑکی کا پیغام ریکارڈ تھا۔ جینیفر نے مشین آن کی تو آواز ابھری ”میرا بھائی تمہیں پھول بھیجنا چاہتا ہے۔ فون کر کے اپنا پتہ نوٹ کراؤ۔“

جینیفر چونک گئی یہ پھول بھیجنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اس نے مشین میں ریکارڈ شدہ نمبر پر فون کیا دوسری طرف وہی لڑکی تھی۔ جینیفر لو نے پوچھا ”تمہارا بھائی کون ہے اور مجھے پھول کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟“

دوسری طرف سے جواب آیا ”جانی ڈیپ! وہ تمہاری گریجویشن پر پھول بھیجنا چاہتا ہے۔“
جینیفر یہ جواب سن کر ششدر رہ گئی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کا پسندیدہ اداکار اسے پھول بھیج سکتا ہے۔ اس نے جلدی جلدی اپنا پتہ نوٹ کرا دیا۔

اسی روز وعدے کے مطابق جانی ڈیپ نے اس کو گریجویشن کی مبارک باد دیتے ہوئے اسے پھولوں کی ٹوکری بھجوادی۔ جانی ڈیپ کی دیوانی پھولوں کے ساتھ منسلک کام دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوئے بچی کا رڈ پر لکھا تھا۔

”میں تمہاری جدوجہد سے واقف ہوں۔ تم نے

لس میں جو کچھ حاصل کیا ہے وہ بہت مشکل کام ہے۔ ماری کامیابیوں پر میری طرف سے مبارکباد! مجھے تم پر ناز ہے۔ میرا پیار۔ جانی۔“

یہی واقعہ بعد میں جانی ڈیپ سے اس کی ملاقات کا سبب بن گیا۔ پارٹی آف فائیو کا ایک لاسٹ مین جانی کا واقف کار تھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ لو جانی کی دیوانی ہے۔ اس نے جانی کو ملاقات کا بندوبست کر دیا۔ یہ لو کے لیے ایک بہت سراسر اتر تھا۔ وہ اس شخص سے اچانک مل رہی تھی اس کی بے حد دیوانی تھی اور جس نے اسے پھولوں کا تحفہ بھیجنا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب جینیفر لو عام سے کپڑوں میں سیٹ پر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر میک اپ بھی نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ اسے میک اپ کی مہارت ہی نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ بغیر میک اپ کے خود کو آئینے میں دیکھتی تھی تو صاف کہہ دیتی تھی کہ وہ ات خوفناک دکھائی دے رہی ہے۔ اس وقت میک اپ کرنے والی لڑکی جا چکی تھی اور جینیفر ٹرالر میں اکیلی تھی۔ وٹ مین نے اندر داخل ہو کر کہا ”لو تم جانتی ہو جس شخص کی تم دیوانی ہو اور جس نے تمہیں پھول بھیجے تھے وہ اس بات کہاں ہے؟“

جینیفر لو اچھل پڑی ”جانی ڈیپ! الگ۔ کہاں ہے؟“
”وہ اس وقت ٹرالر کے باہر کھڑا ہے۔ تم سے ملنے آیا ہے اور تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

جینیفر کی سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ اسے لاسٹ مین کی اہل پر یقین نہیں آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور ٹرالر میں سے نکل کر دیکھا۔ واقعی جانی ڈیپ باہر کھڑا تھا۔ جینیفر لو اسلمائی انداز میں چیخنے لگی ”اوہ خدا! اس حالت میں۔۔۔ نہیں میں اس سے نہیں مل سکتی۔ میں اس سے نہیں مل سکتی۔“ یہ کہہ کر وہ چیخ چلائی ہوئی ٹرالر میں سے نکلی اور اترے ہوئے جانی ڈیپ کے قریب سے گزر کر اس ٹرالر میں گھر گئی جہاں میک اپ کرنے والی لڑکی موجود تھی۔

جینیفر اور جانی ڈیپ کی پہلی ملاقات تھی۔ دوسرے الر میں پناہ لینے کے بعد وہ کافی دیر تک خود کو پُر سکون رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس اثنا میں جانی ڈیپ چلا گیا۔ تب وہ اٹھ کھڑا محسوس کرنے لگی۔ اس نے اپنے محبوب اشار سے اشارے اٹھاتا اچھا موقع گنوا دیا تھا۔ جس شخص سے ملنے کی تمنا اس کے دل میں رہی تھی وہ شخص اس سے۔ خاص سے اسی سے ملنے آیا تھا اور اس نے بچوں جیسی حرکت

کر کے اسے ناراض کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ جانی ڈیپ سے اس کی آخری ملاقات ہوتی مگر قدرت نے اسے تجدید ملاقات کا ایک اور موقع دیا۔

جانی ڈیپ کی نئی قلم ”ڈوانی براسکو“ کا ریس شو تھا۔ اس کے ٹکٹ جینیفر کو بھی بھیجے گئے وہ تھیں مگر قلم دیکھنے نہیں بلکہ صرف اور صرف جانی ڈیپ کو قریب سے دیکھنے اور اس سے ملنے کی کوشش کرنے کے لیے گئی تھی۔ وہ اس کو دیکھنے کے اشتیاق میں دیر تک تھیر کے باہر کھڑی رہی اور کافی دیر تک اس کا انتظار کیا۔ اس دوران میں تھیر بھر گیا اس کی مخصوص نشست بھی خالی رہنے کی وجہ سے کسی کو دے دی گئی مگر جینیفر لو کو ان چیزوں کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو اپنے محبوب اشار کو دیکھنے کے لیے دیوانی ہو رہی تھی اور پھر جب جانی ڈیپ آیا تو ملنے چلا کر اسے مخاطب کیا اس نے چونک کر لو کی طرف دیکھا اور پہچان کر ہاتھ ہلایا وہ اس پر نہال ہو گئی۔ اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جانی سے ملاقات کر کے ہی جائے گی۔ جب قلم ختم ہو گئی تو وہ تھیر کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں قلم کے اختتام پر پر تھیر پارٹی منعقد کی گئی تھی مگر سیکورٹی گارڈ اسے اندر نہیں جانے دے رہا تھا۔ اس کے پاس صرف قلم کا ٹکٹ تھا۔ تقریب کا کارڈ نہیں تھا پھر سیکورٹی گارڈ اسے پہچانتا بھی نہیں تھا نہ وہ ٹی وی دیکھتا تھا اور نہ ہی اس نے پارٹی آف فائیو دیکھا تھا مگر لو نے اس سے چکنی چپڑی باتیں شروع کر دیں اور آخر کار اسے شیشے میں آمار کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

جانی ڈیپ خود بھی اس سے ملنے کا خواہاں تھا۔ وہ اپنے ہیرو سے ملنے میں کامیاب ہو گئی ایک بھر پور بوسے کے بعد جانی ڈیپ نے اس کے کان میں سرگوشی کی ”تم بہت اچھی لڑکی ہو بہت عمدہ اداکارہ ہو۔ تم نے میرے بارے میں جو پیاری پیاری باتیں کہیں۔ اس کا بہت شکریہ تمہارے اس بوسے کا واقعہ تا دیر میرے ہونٹوں پر رہے گا۔“

جینیفر کے لیے یہ واقعہ ایسا تھا کہ وہ اسے ساری زندگی یاد رکھ سکتی تھی۔ چند ہی دنوں بعد پارٹی آف فائیو کے سیٹ پر جانی ڈیپ نے اسے فون کیا اس کی خیریت دریافت کی اور اٹھل بار نیویارک آنے پر اسے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت بھی دی۔

جینیفر ان واقعات کے بعد ہواؤں میں اُڑنے لگی تھی۔ اب پارٹی آف فائیو کا سیزن بھی ختم ہو چکا تھا۔ جینیفر کو چھٹیاں گزارنے اور آرام کرنے کا اچھا موقع مل گیا تھا مگر وہ آرام کرنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ ایک برس

قبل نبوی کیمیل نے خوفناک فلم "اسکریم" میں کام کیا تھا جو بے حد کامیاب رہی تھی۔ اب نبوی کیمیل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی ایک ہارر فلم میں کام کرنے کی ہائی بھلی تھی۔ اب وہ اٹھارہ برس سے زائد ہو چکی تھی اور جسمانی طور پر ایسی بھرپور ہو گئی تھی کہ کسی بھی فلم میں مرکزی کردار بھی کر سکتی تھی۔ اس نے کیون ولیم کی تحریر کردہ ایک فلم "آئی نوواٹ یوڈا لاسٹ سر" (LAST SUMMER I KNOW WHAT YOU DID) سائن کر لی تھی۔ کیون ولیم نے اس سے پہلے "اسکریم" لکھی تھی جو بے حد کامیاب ثابت ہوئی تھی اور اب ایک بار پھر وہ کامیابی کے دور اسے پر دستک دے چکا تھا۔ پہلے اس نے اپنی فلم سے نبوی کیمیل کو اشارہ بنایا تھا۔ اب اس کی نئی فلم فی وی کی بڑی اشارہ جینیفر لو ہیوٹ کو سینما کی بڑی اشارہ بنانے والی تھی۔

جینیفر لو کو ہارر (خوفناک) فلمیں پسند نہیں تھیں۔ وہ صرف کامیڈی (طریہ) یا پھر رومانس کی چاشنی سے لبریز فلمیں شوق سے دیکھتی تھی۔ اس کے لیے آئی نوواٹ یوڈا لاسٹ سر کا معاہدہ اس کی ماں نے کیا تھا۔ جب لو کو یہ بات پتا چلی تو وہ تنگ کر بولی "ہارر مووی! اوہ ماما! کیا میں ہارر مووی میں اچھی لگوں گی۔ میں تو ہارر مووی دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی ہوں۔"

اس کی ماں نے جواب دیا "ایک اداکارہ کو ہر قسم کی فلموں میں کام کرنا چاہیے" فنکار کسی خاص موڈ کی فلموں کے لیے مخصوص نہیں ہوتا۔ یہ ایک اچھی فلم ہوگی، تمہارے فیچر نے مجھے اس کی کہانی سنائی ہے اور پھر یہ بھی تو دیکھو پارٹی فائو میں تمہارے ساتھ کام کرنے والی نبوی کیمیل ایک ہارر مووی سے ہی اشارہ رہی ہے۔"

"ضروری تو نہیں کہ اگر نبوی ہارر مووی سے اشارہ بن گئی تو میرے لیے بھی یہی راہ سود مند ثابت ہوگی۔ مجھے ہارر فلموں میں دلچسپی پیدا کرنا ہوگی اور یہ مشکل کام ہے۔" "کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ تم دو چار ہارر مووی دیکھ لو، مجھے یقین ہے تمہیں بہت مزہ آئے گا پھر آئی نوواٹ یوڈا لاسٹ سر کی کہانی بہت عمدہ ہے" اسے اسکریم کے ہی رائٹر نے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ فلم تمہیں بڑی اسکرین پر بھی اشارہ دے گی۔"

جینیفر کے پاس اپنی ماما کی بات تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسرے دن سے اس نے تیاری شروع

کر دی۔ اس نے لگا تار چار پانچ خوفناک فلمیں دیکھ ڈالیں۔ ان میں ایک خوفناک فلم "شائنگ" بھی شامل تھی۔ یہ ساری فلمیں بہت زیادہ دہشت زدہ کر دینے والی تھیں۔ انہیں دیکھ کر جینیفر لوچ جج خوف زدہ ہو گئی۔ اس کی نیند اڑ گئی، ڈر کے مارے وہ کئی راتوں تک سو بھی نہیں سکی، لیکن اب اسے خوفناک فلم میں کام کرنا تھا، لہذا خود کو ان چیزوں کا عادی بنانا اشد ضروری تھا۔ کیونکہ وہ سیٹ پر اب ایسی ہی خوفناک چیزیں دیکھنے والی تھی۔ وہ ویڈیو سینٹر گئی اور وہاں سے خوفناک فلموں کی سرتاج فلم "اے ٹائٹ میٹر آن ایلر اسٹریٹ" لے آئی۔ اس فلم کو لانے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں اس کے محبوب اداکار جانی ڈیپ نے بھی کام کیا تھا۔ اس کے بعد تمام خوفناک فلمیں، مثلاً "اوین" "اسکریم" اور ان دی ماؤتھ آف میڈن جیسی ہارر فلمیں ویڈیو پر لا کر دیکھتی رہی، وہ اپنے اندر کے فطری خوف کو دور کر دیتا چاہتی تھی۔ ان فلموں کو دیکھ کر اس کی حالت خراب ہو جاتی تھی، مگر وہ جانتی تھی کہ انہیں دیکھے بغیر وہ "آئی نوواٹ یوڈا لاسٹ سر" کی جولی جیمس کے کردار کو بہتر طور پر نہیں ادا کر سکے گی۔

اسی دوران ایک انٹرویو میں اس سے پوچھا گیا کہ وہ خوفناک فلمیں دیکھ کر خود کو کیوں ڈرا رہی ہے؟ جینیفر نے جواب دیا "یہ فلمیں دیکھ کر میں خود کو ان خوفناک مناظر کا حصہ سمجھ کر اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

اس سلسلے میں نبوی کیمیل نے بھی اس کی خاصی مدد کی۔ اسے خوفناک فلم میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ اس روز وہ دونوں "پارٹی آف فائو" کے سیٹ پر بیٹھی اسکرپٹ پڑھ رہی تھیں، نبوی کیمیل کے ہاتھ میں "پارٹی آف فائو" کا اسکرپٹ تھا۔ جبکہ جینیفر لو، آئی نوواٹ یوڈا لاسٹ سر کا اسکرپٹ پڑھ رہی تھی۔ نبوی کیمیل اپنا اسکرپٹ پڑھتے چوک گئی، جینیفر کو مخاطب کر کے بولی "اوہ! لو! یہ تم کیا پڑھ رہی ہو۔ یہ پارٹی آف فائو کا اسکرپٹ تو نہیں ہے۔"

"میں دوسرا اسکرپٹ پڑھ رہی ہوں، ماما نے ایک فلم کے لیے معاہدہ کر لیا ہے۔ اسی کا اسکرپٹ ہے، کیون ولیم نے لکھا ہے اسے!" "کیون ولیم نے! اوہ گاڈ! یہ تو بہت سنسنی خیز مصنف ہے۔"

لو نے حیرت سے پوچھا "کیا تم اسے جانتی ہو؟" نبوی کیمیل نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "ہاں! میں اس

سے واقف ہوں، اکثر اس کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔" گما یہ کسی ہارر مووی کا اسکرپٹ ہے؟" "ہاں! مگر تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟" لو نے اسکرپٹ سمیٹ کر حیرت سے پوچھا۔

"ایسے کہ کیون ولیم یا کمال ہارر رائٹر ہے، میری فلم "اسکریم" اسی نے لکھی تھی۔ اگر تمہیں کسی ہارر فلم میں کام کرنے کا موقع مل رہا ہے تو اسے ہاتھ سے مت گنونا۔ ہارر فلمیں پوری دنیا میں شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ میں دوسرے سے بہتر ہوں، ساری زندگی فلموں میں کام کر کے تمہیں اتنا مزہ نہیں آئے گا جتنا مزہ ایک ہارر فلم میں کام کر کے آتا ہے۔ ہارر فلم میں کام کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی شوٹنگ کے دوران زیادہ تھکن بھی نہیں ہوتی اور بوریت کا بھی احساس نہیں ہوتا۔"

نبوی کیمیل کی یہ بات لو کے ذہن سے چپک کر رہ گئی، پھر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران لو کو واقعی بہت مزہ آیا، وہ دن اس کی زندگی کے یادگار ترین دن ثابت ہوئے۔ آئی نوواٹ یوڈا لاسٹ سر میں لو کے ساتھ ایک نیا اداکار فریڈی پرنز جو نیر کام کر رہا تھا۔ وہ مشہور اداکار آنجنہانی فریڈی پرنز کا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ کاسٹ میں سارہ مشیل جیلر بھی شامل تھی۔ یہ وہی اداکارہ تھی جو فی وی کی مشہور سیریز "فی وی ویسٹ" میں کام کر کے پورے ملک میں منی کے نام سے فہرست حاصل کر چکی تھی۔ جس ہفتے "فی وی ویسٹ" کا پریمر لی دی پر پیش ہوا تھا، لو کو یہ فلم اسی ہفتے ملی تھی۔ اس کی طس بندی نارتھ کیرولینا میں ہو رہی تھی، گویا لو کو بھی عکس بندی کے لیے وہیں جانا تھا۔ وہاں کے ایک چھوٹے سے قصبے میں شوٹنگ شیڈول ترتیب دیا گیا تھا۔

آئی نوواٹ یوڈا لاسٹ سر کی کہانی لوٹس لوٹس کے اول سے ماخوذ تھی، ناول کا بھی یہی نام تھا۔ یہ کہانی ہر سال ہار جولا کی کو پیش آنے والے واقعات پر مشتمل تھی۔ جولی لوٹس (جینیفر لو ہیوٹ) اور ہیلن شیورز (سارہ مشیل کیل) دو بہترین ہسپلیاں تھیں۔ دونوں نے شمالی کیرولینا میں واقع اسی گھروں کے ایک قصبے "ساؤتھ پورٹ" سے ایک ساتھ گریجویشن کیا تھا۔ جولی کافی ذہین تھی، اس نے بوشن کے ایک کالج میں تعلیم جاری رکھنے کے لیے اسکالرشپ حاصل کر لی تھی اور اب بوشن جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں ہیلن کافی خوب صورت تھی۔ وہ مقابلہ حسن میں بہت چمکی تھی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ نیویارک جا کر

ادا کارہ بن جائے گی۔ مقابلہ حسن کے اختتام پر دونوں لڑکیاں اپنے فوجوان دوست لڑکوں (جنہیں محبوب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا) کے ساتھ ساحل پر کچھ خوشگوار اور ذاتی سا وقت گزارنے چلی گئیں، ہیلن کے ساتھ ایک دل پیچنگ قسم کا امیر زادہ تھا، جبکہ جولی (جینیفر لو) ایک حساس لڑکے رے بردنسن (فریڈی پرنز جو نیر) کے ساتھ تھی۔ انہوں نے ساحل پر بہت اچھا وقت گزارا۔ واپسی میں ہیری کوکس (ریان فلپس) اتنی شراب پی چکا تھا کہ اس سے گاڑی بھی ٹھیک طرح سے نہیں چل رہی تھی۔ اس اثنا میں اس کی چھپاتی لی ایم ڈبلو سے کوئی راہ گیر کچل گیا، جو اصل میں خود کشی کی نیت سے پہاڑی پر سے گرا تھا اور اس کی گاڑی سے آکر لیا تھا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ رے نے جھنجھلا کر اس سے گاڑی کی چابی چھین لی، اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ گاڑی چلائے گا۔ انہیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان کی گاڑی سے ٹکرانے والا ماہی گیر ہلاک ہو گیا ہے۔ ہیری ماہی گیر کے بجائے اپنی گاڑی کے نقصان پر پریشان تھا۔ دیگر تینوں ساتھیوں کا اصرار تھا کہ انہیں فوراً پولیس کے پاس جا کر اس واقعے کی اطلاع دینی چاہیے لیکن ہیری نے سختی سے انکار کر دیا پھر اس کے کہنے پر ان چاروں نے ماہی گیر کی لاش اٹھائی، کار کی ڈکی میں ڈالی اور بیٹھی پر لے جا کر پانی میں پھینک دی۔ جس وقت وہ لاش پانی میں پھینک رہے تھے، اسی وقت لاش میں ایسی حرکت ہوئی جیسے وہ زندہ ہے۔ اس کے جسم میں زندگی کی رمت باقی تھی لیکن اب تو وہ اسے سمندر میں پھینک چکے تھے، گویا وہ چاروں قتل کے مجرم بن گئے تھے۔ اس وقت چاروں قسم کھاتے ہیں کہ اس واقعے کا ذکر زندگی میں کسی سے بھی نہیں کریں گے۔

اس واقعے کے ٹھیک ایک سال بعد جولی (جینیفر لو ہیوٹ) ساؤتھ پورٹ واپس آ گئی، اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے گریڈ میں اضافے کے لیے سر اسکول میں داخلہ لے کر مزید پڑھائی کرے گی۔ ساؤتھ پورٹ میں ایک ٹوٹ (رقعہ) اس کا فحش تھا۔ اس پر نہ تو ڈاک خانے کی ہر تھی، نہ ٹکٹ اور نہ واپسی کا پتا، اس رقعے پر صرف ایک جملہ تحریر تھا "مجھے علم ہے تم نے گزشتہ گرمیوں میں کیا کیا تھا؟"

WHAT YOU DID LAST SUMMER)

(I KNOW

رقعہ دیکھتے ہی جولی کی حالت خراب ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس واقعے کی اطلاع اپنے دیگر دوستوں کو دے گی۔ وہ سیدھی شیورز ڈیپارٹمنٹل اسٹور گئی اور ہیلن کی بہن

ایسا سے بیلن کا نیو یارک کا ٹیلی فون نمبر طلب کیا، مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ بیلن اسی اسٹور پر موجود تھی۔ نیو یارک جانے کا اس کا خواب اُدھورا رہ گیا تھا۔ جولی یہ بات نہیں جانتی تھی کیونکہ گزشتہ موسم گرما کے بعد سے وہ کسی سے بھی رابطہ نہیں رکھ سکی تھی۔ جولی اور بیلن 'ہیری' سے ملنے جاتے ہیں وہ ابھی تک ویسے کا ویسا 'دل پھینک' شرابی اور عاشق مزاج ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی وہ بھی قصبہ رے سے باہر نہیں جاسکا تھا اور وہیں ایک خشک بوٹ پر کام کرتا تھا۔ وہ سب فکر مند ہو گئے اور پھر جب ہیری کی وی بی لی ایم ڈبلیو جس سے حادثہ ہوا تھا کسی نے چوری کر لی تو ان کے خدشات نے حقیقت کا روپ دھار لیا پھر اسی کار کے ذریعے رے کو کچلنے کی کوشش کی گئی، مگر وہ بچ نکلا۔ البتہ وہ کار کے ڈرائیور کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو گیا، اس نے ماہی گیروں جیسا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک آہنی ہک بھی تھا۔

جولی کو شدت کے ساتھ احساس جرم ہونے لگا۔ انہوں نے ذرا سی تنگ و دو کے بعد معلوم کر لیا کہ ان کی کار سے جو شخص ہلاک ہوا تھا اس کا نام "ڈیوڈ ایگن" تھا اور اس کی منگیت اس کی موت سے ایک سال قبل مر گئی تھی۔ جولی کو یقین ہو گیا کہ ڈیوڈ کا کوئی دوست جو سارے واقعات سے واقف ہے انہیں خوف زدہ کر رہا ہے۔ جولی اور بیلن ڈیوڈ کا گھر تلاش کرتے ہوئے اس کی بہن مسی (این جی) کے پاس پہنچ گئیں۔

ان چاروں کو علم تھا کہ ان پر حملے کرنے والا شخص وہیں کہیں ہے، مگر یہ بات کسی کو بھی نہیں معلوم تھی کہ وہ کون ہے پھر چار جولائی کی صبح بیلن نے جولی کو فون کیا۔ وہ بہت خوف زدہ تھی کیونکہ گزشتہ رات کوئی اس کے گھر میں کھس گیا تھا اور اس کے حسین بال کاٹ کر چلا گیا تھا۔ جبکہ آج اسے مقابلہ حسن میں بطور سابقہ ملکہ حسن کے شرکت کرنی تھی۔

جولی فون سنتے ہی بیلن کے گھر کی طرف چل دی، مگر راستے میں اسے محسوس ہوا کہ اس کی گاڑی میں سے عجیب و غریب آوازیں آرہی ہیں۔ اس نے گاڑی سے اتر کر ڈکی کھولی تو اس میں میکس کی لاش تھی۔ میکس ان کا دوست تھا اور انہوں نے گزشتہ سال چار جولائی کو حادثے کے بعد اپنی گاڑی میں میکس کو اس کے گھر تک لٹا دی تھی۔ جولی کی چیخیں نکل گئیں وہ دوڑتی ہوئی بیلن کے گھر میں گئی اور جب جولی بیلن اور ہیری دوڑتے ہوئے کار کے پاس

واپس آئے تو ڈکی میں سے میکس کی لاش غائب تھی اور ہیری سے حالات نے عجیب و غریب رخ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ بیلن خوف زدہ تھی مگر پھر بھی اسے مقابلہ حسن کی ریڈ میں حصہ لینا تھا۔ وہ ریڈ میں موجود تھی کہ اسے وہاں ماہی گیر کے مخصوص لباس میں وہ پراسرار شخص نظر آیا۔ وہ اسے ہنزاوے ہیری کو تلاش کرنے لگی۔ مگر وہ کسی اور پری کے پیچھے چلا گیا۔ پھر مقابلہ حسن کے دوران میں ہیری اس کی حفاظت کے پیش نظر بالکونی میں کھڑا ہو گیا اور بیلن نے اسے دیکھا کہ اسی مشکوک ماہی گیر نے بالکونی میں ہیری کو گالے سے دیوچ لیا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ حلق چاڑ کر چیختی ہوئی اسٹیج سے دوڑی مگر جب وہ ایک پولیس اہل کار کے ساتھ بالکونی میں پہنچی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ وہاں ہیری تھا اور نہ ہی مشکوک ماہی گیر۔

معاملہ اُلجھ گیا تھا۔ ان دونوں کا کچھ پتا نہیں تھا، پولیس اہلکار بیلن کو اس کے گھر چھوڑنے چلا تو راستے میں ایک جگہ کار کا حادثہ دیکھ کر انہیں رکنا پڑا۔ وہاں قاتل پھیرا موجود تھا۔ اس نے پولیس اہلکار کو آہنی ہک کے ذریعے ہلاک کر دیا اور پھر بیلن کو قابو کرنے کے لیے اس کے پیچھے لپکا۔ بیلن بے تحاشا دوڑی، قاتل اس کے تعاقب میں اس کے ڈپارٹمنٹل اسٹور تک پہنچ گیا۔ وہاں بیلن کی بہن ایلینا اس کے بھر کی آمدنی کا حساب کتاب کر رہی تھی۔ قاتل پھیرے سے اسے بے وردی سے قتل کر دیا اور پھر مقابلہ حسن کی ریڈ کے مقام سے محض چند گز دور گلی میں وہ بیلن پر بھی قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔

اسی دوران میں جولی (جینیفر لو ہیوٹ) معلومات جمع کرتی پھر رہی تھی۔ انہوں نے ممکنہ قاتل کے ہاتھ پر ایک افنا "سوزی" کھدا ہوا دیکھ لیا تھا۔ سوزی، ڈیوڈ کی مرحومہ منگیت کا نام تھا مگر ڈیوڈ کی بہن مسی نے انہیں بتایا کہ ڈیوڈ کے ہاتھ پر کوئی ٹیڈ (کھدا ہوا نام یا نشان) نہیں تھا۔ مسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے مرحوم بھائی ڈیوڈ کا دوست "بلی بلو" قصبہ میں آیا ہوا ہے۔ مگر کوشش کے باوجود جولی اس نام کے کسی شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ قاتل پھیرا کہیں سوزی کا باپ بنجامن ویلس تو نہیں ہے؟ اسی دوران میں اسے کھاڑی میں رے دکھائی دیا۔ مگر وہ اس کی کشتی کا نام یاد نہ کر خوف زدہ ہو گئی اور چلائی ہوئی واپس بھاگی، کشتی کا نام "بلیو" تھا، رے کی نظر بھی جولی پر پڑ گئی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے گیا مگر اسی اثنا میں ایک شخص نے اس پر حملہ کر دیا۔

وہ شخص جولی کی حفاظت کی خاطر اسے کشتی میں لے آیا۔ جولی اس کے جھانسنے میں آگئی اور خود کو مطمئن محسوس کرنے لگی۔ مگر کشتی پر پہنچنے کے بعد جولی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس وقت اسی جنونی قاتل پھیرے کے سامنے ہے۔ اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور وہ چڑیا کی طرح قاتل کے شکنجے میں آگئی تھی۔ اسی دوران میں رے ہوش میں آگیا۔ جولی اپنی جان بچا کر خشک بوٹ کے آگس روم کی طرف بھاگی۔ پھیرا اس کے تعاقب میں تھا۔ آگس روم (برف خانے) میں جولی کا سامنا بیلن اور ہیری کی سرو لاشوں سے ہوا تو وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ قاتل پھیرے کا نام ویلس تھا، اس نے ایک بار پھر رے پر حملہ کر دیا۔ مگر رے نے اس کا حملہ روک کر اس پر جوابی وار کیا۔ اب یہ ظاہر ہے اور جولی محفوظ ہو گئے تھے مگر ابھی ان کی کم بختی دور نہیں ہوئی تھی، قاتل پھیرا ہوش میں آگیا تھا۔ وہ ایک بار پھر ملے کے ارادے سے ان کی طرف دوڑا مگر اس کا آہنی ہک کشتی میں موجود مچھلیاں پکڑنے والے جال میں پھنس گیا۔ رے نے موقع غیبت جان کر فوراً لیور تھما دیا۔ قاتل پھیرا ایک جھٹکے سے فضا میں بلند ہوا اور اس کا وہ ہاتھ جس میں ہک تھا، اس کے تن سے جدا ہو گیا۔ اور باقی جسم بے جان ہو کر سمندر میں گر گیا۔ اب انہیں خطرناک اور جنونی قاتل سے نجات مل گئی تھی۔

گریموں کے موسم میں جولی اسکول گئی اور ڈین کے بہترین طلباء کی فہرست میں اپنا نام شامل کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ وہاں سے غسل کی نیت سے وہ اپنے گھر چلی گئی اور پھر۔۔۔ پھر ایک بار پھر۔۔۔ بغیر کسی سچے کے ایک رقعہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی شئی گم ہو گئی۔ مگر وہ کسی تقریب کا دعوت نامہ تھا۔ جولی کی جان میں جان آئی۔ وہ غسل خانے میں گئی تو اچھل پڑی۔ غسل خانے کے شیشے کے دروازے پر باہر کی جانب لپ اسٹک سے ایک جملہ لکھا تھا "آئی اسٹل نو" واٹ یو اڈا لاسٹ سر؟" (میں اب بھی جانتا ہوں کہ گزشتہ موسم سرما میں تم نے کیا کیا؟) اس کے ساتھ ہی شیشہ چٹکنا چور ہو گیا۔ یہ فلم کا آخری منظر تھا اور اس بات کا اعلان بھی کہ اس فلم کا دوسرا حصہ بھی بنایا جائے گا۔

فلم کی کہانی بہت عمدہ، پر تجسس اور تھریل سے بھرپور ہے۔ عکس بندی کے لیے فلم کی کاسٹ اور تمام ٹیکنیکل عملے نے ٹالی کیرو لینا میں ساؤتھ پورٹ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ (یہ لوکیشن بعد میں ٹی وی کی مشہور ترین سیریز "ڈاؤ سنز کریک" کے لیے

بھی منتخب کی گئی تھی۔ اتفاق سے اس سیریز کا مصنف بھی کیون ولیم ہی تھا۔ اس سیریز کی عکس بندی بھی اس دوران میں شروع ہو گئی تھی جب "آئی نو واٹ یو اڈا لاسٹ سر" کی عکس بندی ہو رہی تھی)

ساؤتھ پورٹ کا یہ علاقہ لاس اینجلس کے پُور شور ماحول سے دور ایک بے حد پُر سکون اور خوب صورت مقام تھا۔ مگر مقامی لوگ ان سب کی توقعات کے برخلاف قطعی طور پر مسمان نواز ثابت نہیں ہوئے وہ قلم والوں کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہالی ووڈ کے یہ لوگ محض اپنی اور قلم بینوں کی تفریح کے لیے ان کے علاقے کا حسن اور سکون برباد کرنے آگئے ہیں۔

پہلے دن جینیفر کو یہ دیکھ کر شدید ذہنی جھٹکا پہنچا کہ انہیں دیکھ کر لوگ اپنے ہوٹل اور ریسٹوران تک بند کر لیتے تھے۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھی۔ ہدایت کار جم گلیسی کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ اس کے لیے بے حد یادگار ثابت ہو رہا تھا۔ اس فلم کی عکس بندی کے بعد جینیفر نے ایک جریدے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا "میں نے اب تک جتنے بھی ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا ہے، ان میں جم گلیسی سب سے بہترین اور سب سے عمدہ ہدایت کار ہے۔ اس کا رویہ پورے عملے کے ساتھ نہایت حیرت انگیز تھا۔ ہم دن میں سترہ گھنٹے مسلسل کام کرتے تھے۔ مگر وہ کسی بھی لمحے نہ تو پریشان ہوتا تھا اور نہ ہی عملے پر چیختا چلاتا تھا۔ بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہمارے کام کی تعریف کرتا رہتا تھا۔"

فلم کی عکس بندی شروع ہوئی تو ہر گزرتے دن کے ساتھ جینیفر لو کی خوشیاں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک روز جم گلیسی اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور بولا "میں اس فلم میں تمہارے کردار پر تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں؟"

"تمہارے علاوہ کون مشورہ دے سکتا ہے۔ یہ کردار تم کر رہی ہو، تم زیادہ احساس کر سکتی ہو کہ کون سا مکالمہ کس طرح ادا ہونا چاہیے؟ بعض جملے بھی تمہاری مرضی سے تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔"

جینیفر کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی۔ خوش ہو کر بولی "کون سے مکالمے؟"

وہ اسے تفصیل سے بتانے لگا۔ اس کے بعد جینیفر نے جو جملے ترتیب دیے وہ یہ تھے۔

"میں بعد میں رولوں گی۔۔۔ ابھی نہیں رونا۔۔۔ بعد میں۔۔۔ مجھے مضبوط بنانا ہے اور میری حیات مجھے اس صورت حال

سے نکلے میں مدد دیں گی اور اگر یہ شخص میرے نزدیک بھی آیا تو میں اس لعنتی کا سر پھاڑ کر اس کا مغز باہر نکال دوں گی۔"

اس قسم کے اور بھی کئی مکالمے تھے جو جینینفر کے مشورے سے تبدیل کیے گئے۔ وہ بہت مسرور تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اس قلم میں روایتی طور پر کمزور لڑکی کا کردار نہیں کر رہی تھی، اسے معلوم تھا کہ اس کا کردار بہت عمدہ ہے۔ وہ خود بتاتی ہے کہ میں اس قلم میں ایسی لڑکی نہیں تھی جو کسی سے خوف زدہ ہو کر بیٹھ جاتی اور محض عورت ہونے کی بنا پر خوف کے باعث سٹ سٹا کر ایک کونے میں ٹپٹی تھر تھر کاپتی رہتی اور روتی رہتی کہ کوئی مرد آئے جو معاملات سدھارے۔"

اس قلم میں ہدایت کار جم گلیسی، جینینفر کو ایک بہادر اور نڈر لڑکی کے روپ میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے بدمقابل کی پشت پر ٹھوکر مار کے اسے خود سے دور کر دے۔ ایسے حالات میں جبکہ کوئی مرد اس کے قریب موجود ہو یا نہ ہو وہ کسی بھی طرح کمزوری کا مظاہرہ نہ کرے۔ اس قلم میں جینینفر کو سب سے زیادہ یہی بات پسند آئی کہ اس نے خطروں کا مقابلہ بھی کیا اور ان پر فتح بھی پائی۔ جینینفر کو اس بات پر شدید حیرت تھی کہ ہارر (خوفناک) قلم کا سیٹ ہونے کے باوجود وہاں دور دور تک خوف کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے پارٹی آف فائیو کے سیٹ پر ہوتا تھا، کمرے کے سامنے انہیں اسکرپٹ کے مطابق جذباتی اداکاری کرنا ہوتی تھی مگر اس تناؤ سے چھٹکارا پانے کے لیے ہر اداکار مسخروہن کر گھومتا، ہنستا اور ہنساتا تھا۔

آئی نوواٹ یو ڈیلاسٹ سر کے سیٹ پر بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ کیمرا اشارت ہوتا، لائٹس آن ہوتیں، ہدایت کار ایکشن کہتا اور جینینفر لاش دیکھ کر چیخیں مارنا شروع کر دیتی۔ پورے سیٹ پر خوف کی لہری دوڑ جاتی مگر جو نئی ہدایت کار "گٹ" کہتا، جینینفر مسکراتی ہوئی لاش کے قریب جاتی اور اس کے گالوں پر پیار کر کے کہتی "تم بہت خوب صورت ہو۔"

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ رات گئے تک عکس بندی میں حصہ لینے کے بعد کشتی پر ہی ناچتا اور "راک وی بوٹ بے ٹی" گانا شروع کر دیتے اور پھر صبح چار بجے تک ان کے گالے اور بے ہنگم شور کی آوازیں گونجتی رہتیں۔ وہ قطعاً بھول جاتے کہ اس وقت ایک ہارر قلم کے سیٹ پر موجود ہیں۔

یہ نہیں کہ خوفناک قلم کی عکس بندی کا ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کئی ایسے واقعات پیش آئے جن سے جینینفر بڑی طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔ جینینفر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قلم میں کام کرنے والا پاگل مایہ گیر اندھیرے میں اس کے ارد گرد پکراتا پکراتا ہے۔

ایک رات جینینفر لو، عکس بندی کے بعد سیٹ سے اس مقام پر واپس جا رہی تھی جہاں وہ مقیم تھی، راستے میں اچانک اس کی چیخیں نکل گئیں۔ سڑک کے ایک طرف ویسے ہی لباس میں ایک مایہ گیر کھڑا تھا جیسا کہ قلم میں دکھایا جا رہا تھا۔ جینینفر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ دل ہی دل میں یسوع مسیح کو یاد کرتے اور خدا سے دعا میں مانگتے ہوئے انتہائی تیز رفتاری سے مقررہ مقام پر پہنچی۔ اس رات اسے ایک لمحے کو بھی نیند نہیں آئی۔ وہ ساری رات خوف زدہ حالت میں آنکھیں بند کیے بستر لیٹی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مایہ گیر کا ہیولا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے لہراتا ہوا محسوس ہوتا۔

دوسرے دن جب وہ عکس بندی کے مقام پر جا رہی تھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ مایہ گیر اب بھی اسی مقام پر کھڑا ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے قریب پہنچی اور یہ دیکھ کر اس کی ہنسی نکل گئی کہ وہ گتے کا بنا ہوا ایک ٹکلی پتلا تھا۔ جو وہاں استاد کر دیا گیا تھا۔ وہ اصل میں مچھلی کے کسی رستوران کا تھیسیری بورڈ تھا۔

جینینفر بتاتی ہے، "ان دنوں میری حالت پاگلوں کے جیسی ہو گئی تھی۔ اس قلم نے میری نفسیات پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اگر میں نے عکس بندی سے پہلے کچھ خوفناک فلمیں دیکھ کر اپنا دل مضبوط نہ کر لیا ہوتا تو شاید میں اس قلم کی عکس بندی کے بعد جیج پاگل ہو چکی ہوتی۔"

ایک روز ہدایت کار نے جینینفر کو بتایا کہ اسے آج جیج کے دو مناظر عکس بند کرانے ہیں۔ مگر یہ جیج بتاؤنی نہیں ہوتی چاہیے۔ تمہیں اپنے چہرے پر بے پناہ خوف اور وحشت کا تاثر لانا پوری شدت کے ساتھ چھیننا ہو گا۔"

جینینفر نے بات سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے مناظر میں بتاؤنی جیج سے کام نہیں چلے گا۔ وہ بولی "آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کی توقعات پر پوری اتروں گی۔"

"یہ بات ذہن میں رکھنا کہ تمہیں پوری قوت کے ساتھ چھیننا ہے اور حلق بھی درست رکھنا ہے، کہیں ایسا نہ ہو تمہارا گلا بیٹھ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو بڑی مگر بڑا ہو جائے گی۔"

میں اس وقت تک انتظار کرتا ہوں گا جب تک کہ تمہارا گلا لپک نہیں ہو جائے گا۔"

جینینفر کی سمجھ میں اس وقت یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ ظہر عکس بند کیا جائے گا۔ وہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ چیخی۔ اس کے علاوہ چلانے کے بھی دو مناظر تھے۔ دونوں منظر بڑی عکس بند کر لیے گئے مگر جب اگلے روز وہ سیٹ پر پہنچی تو اس کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ ہدایت کار نے سر پکڑ لیا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی، اس نے پس منظر میں ایکسٹرا اداکاروں کی تعداد بڑھا دی اور پھر اگلا منظر، جس میں جینینفر کو چھیننا تھا، اس طرح فلمایا گیا کہ باقی لوگ جیج رہے تھے اور وہ صرف چیخنے کی اداکاری کر رہی تھی۔

اس قلم میں سب سے اہم اور خاص بات جینینفر لو بوٹ کا بھرپور اور نوجیز سینہ تھا۔ اس وقت تک اس کا سینہ بے حد گداز اور ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو چکا تھا۔ ہدایت کار نے بھی شاید یہ بات محسوس کر لی تھی لہذا قلم میں اس کے گداز سینے سے بہت کام لیا گیا۔ پوری قلم میں اسے ایسے لباس پہننے کو دیے گئے تھے جن میں اس کے سینے کی گولائیاں اور انجمار ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو رہے تھے۔ جب پہلی مرتبہ وہ یہ لباس پہن کر ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو خود کو بہت معیوب خیال کر رہی تھی۔ ہدایت کار جم نے اس کے چہرے پر ناگواری محسوس کر لی۔ وہ اس کے قریب پہنچا اور بولا "لگتا ہے تم بے اطمینانی محسوس کر رہی ہو؟"

"ہاں! یہ لباس۔ مجھے مناسب محسوس نہیں ہو رہا، اس میں میرے جسم کے بعض حصے غیر ضروری طور پر نمایاں ہو رہے ہیں اور۔"

جم گلیسی نے کہا "بچوں جیسی باتیں مت کرو! تم فوٹو بس میں ہو، شو بزنس کا مطلب ہے، دکھانے کا کاروبار۔ اگر تم کچھ دکھاؤ گی نہیں تو تمہیں کون دیکھنے آئے گا؟"

"مگر کیا یہ سب بہت ضروری ہے؟"

"ہاں! بہت ضروری۔ ہم یہ قلم نوجوانوں کے لیے مار رہے ہیں۔ نوجوان لڑکے صرف ایسی لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ گھٹکر ہو، ایسی اداکاراؤں کی فلمیں دیکھنے آتے ہیں جو بے باکی سے اپنے "ٹائٹل" کی نمائش کر لیں۔"

اس قسم کی باتیں لو اور صرف جم گلیسی کے درمیان ہی تھیں، جب وہ کسی بات پر الجھتی تو جم اسے سمجھانے لگتا اور اس انداز میں سمجھاتا کہ اس کے پاس کوئی جواب

نہ رہتا۔ قلم کی ریلیز کے بعد ٹیکس کے حوالے سے ایک انٹرویو میں لو نے کہا "میں بہت جلد اس حقیقت کو سمجھ گئی تھی کہ انٹر ٹینمنٹ انڈسٹری میں ایسی بہت سی چیزیں دکھائی پڑتی ہیں جنہیں عام طور پر عام زندگی میں چھپا دیا جاتا ہے۔ یہاں کا انداز مختلف ہے۔ ایسی لڑکی کی قلم کوئی دیکھنا پسند نہیں کرے گا جس میں گھٹکر نہ ہو۔ اور جسے بغیر میک اپ کے اسکرین پر پیش کیا جائے۔ جس کے چہرے پر والے یا مہاسے ہوں۔ بال چہرے ہوئے ہوں اور وہ سینے میں شرابور ہو۔ دیکھنے والی آنکھیں مسالا اور رنگینی دیکھنے آتی ہیں۔ ایسے مناظر، جس میں کچھ دکھایا جانا ضروری نہ ہو، اس میں بھی کچھ نہ کچھ لوازمات رکھنا ہوتے ہیں تاکہ لوگ غور سے ان مناظر کو دیکھیں اور کمرشل قلم میں تو ایسے مناظر کی لازمی ضرورت ہوتی ہے جو قلم بیٹوں کو تھیرنگ لانے پر مجبور کر سکیں۔ اگر آئی نوواٹ یو ڈیلاسٹ سر میں میرے لباس کی وجہ سے نوجوان تھیرنگ آئے پر مجبور ہوئے تو میرے نزدیک یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں لڑکوں کی آنکھوں کی چاشنی اور من کی طلب بننے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی۔ میں خود کو آئینے میں اس زاویے سے کبھی نہیں دیکھتی، لیکن اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں دیکھنے کی چیز ہوں تو ایسے مناظر فلمانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بلکہ ہمارے پروفیشن کے مطابق یہ بہت اچھی بات ہے۔ ایسے پُرکشش مناظر عکس بند کرانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں، البتہ میں یہ بات طے کر چکی ہوں کہ کسی منظر میں مکمل برہنہ نظر نہیں آؤں گی اور بے لباس مناظر عکس بند کرانے پر کبھی آمادہ نہیں ہوں گی۔ ایسے مناظر غیر ضروری اور بہت حد تک مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ البتہ منظر اور کردار کی ضرورت کے مطابق ایسے لباس پہننے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں جن سے نوجوان لڑکوں کے جذبات برا بیگنہ ہوتے ہوں۔"

اس قلم میں دونوں لڑکیوں کے گداز اور اچھلتے کودتے سینے نے ہنسنے کا خاصا سامان مہیا کر دیا تھا۔ شوٹنگ کے دوران میں سیٹ پر ایک لطیفہ گردش کرنے لگا تھا کہ اس قلم کا نام تبدیل کر کے "آئی نوواٹ یو ڈیلاسٹ سر" رکھ دینا چاہیے۔ کیونکہ اس قلم کے ہر منظر میں زنانہ چھاتیوں کا ایک جوڑا اچھل کود کرتا نظر آتا تھا۔ یہ جوڑا یا تو جینینفر کا ہوتا تھا یا پھر سارہ کا۔ قلم کی تکمیل کے بعد جب جینینفر نے تھیرنگ میں یہ قلم دیکھی تو اپنے آپ کو دیکھ کر اور اپنے بے قابو سینے کو دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ قلم ختم ہوتے ہی وہ سیدھی گھر گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اچھی طرح اپنے اوپری بدن

کا معائنہ کیا تو بقول جینیفر خود مجھے بھی شرم آگئی۔
حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ نہ تو عکس بندی کے دوران میں اور نہ ہی اب۔۔۔ جینیفر نے اپنے آپ کو کبھی مکمل طور پر "بیب" سمجھا۔ بیب فلمی اصطلاح میں ایسی اداکارہ کو کہتے ہیں جس کی اداکاری سے زیادہ اس کا سینہ نمایاں ہوتا ہے۔ آسانی کے لیے یوں سمجھ لیں کہ مشہور ٹی وی سیریز بے وایج کی سابقہ ہیروئن پامیلا اینڈرسن کو سب سے نمایاں "بیب" کہا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ نمایاں اور گدازینے والی کوئی اداکارہ اب تک اتنی مقبولیت حاصل نہیں کرپائی ہے۔

جینیفر خود کو ایک عام سی لڑکی تصور کرتی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ کبھی کبھی جاذبِ نظر اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ تاہم اس کا کہنا ہے کہ وہ خوب صورتی اور دلکشی کے معاملے میں اوسط درجے کی لڑکی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی اداکارہ اپنے جسم کی جاذبیت اور کشش کو پڑھانے پر توجہ نہ دے تاہم جینیفر اس معاملے میں بہت زیادہ حساس نہیں تھی۔ وہ خود پر اور اپنے بدن پر کم ہی دھیان دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر تمام ہی لڑکیاں مکمل 'خوبصورت اور صاف و شفاف جلد کی مالک و کھائی و سینے لگیں گی تو یہ بات ناظرین کے لیے بورت اور بے زاریت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

اس کے باوجود وہ ایک ذاتی ریز کے ساتھ باقاعدگی سے ورزش کرتی تھی۔ نہ صرف اپنے جسم کو قابو میں رکھنے کے لیے بلکہ اس توانائی کے حصول کے لیے بھی جس کی اسے اداکاری کے وقت ضرورت پیش آتی تھی۔

آئی نوواٹ یو ڈا لاسٹ سمر کی عکس بندی دس ہفتوں تک مسلسل جاری رہی تھی۔ اس دوران میں وہ ایک سیریز (پارٹی آف فائو) میں بھی کام کرتی رہی جو ہر ہفتے ٹی وی پر دکھائی جارہی تھی۔ لہذا فلم کے لیے صحت برقرار رکھنا اور مکمل طور پر جسم کو فٹ رکھنا اس کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ خود پر قلمائے جانے والے خطرناک مناظر اور اسٹنٹ (STUNT) وہ خود کرے گی اسٹنٹ دوسن کو اس سلسلے میں زحمت نہیں دے گی اور نہ ہی ڈبلی کیٹ کا سارا لے گی۔ یہ فیصلہ اگرچہ ٹھیک تو تھا مگر یہ صورت خود اس کے لیے بھی بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی 'شوٹنگ کے دوران میں وہ متعدد بار زخمی ہوئی اور اپنے جسم پر لگنے والی خراشوں اور زخموں کے علاج کے لیے اسے سیٹ پر موجود نرس کے پاس بار بار جانا پڑا۔ اس فلم کی پوری شوٹنگ کے دوران میں اس کے نازک بدن پر مجموعی طور پر اڑتیس خراشیں آئیں اور اس کی آنکھ کی پتلی بھی ایک بار پھٹ گئی۔

شوٹنگ کے دوران میں وہ ایک رنگ آلو لوہے کے ٹکڑے پر منہ کے ٹل کر گئی تھی۔ اس کے علاوہ مزید کوئی خطرناک واقعہ تو پیش نہیں آیا۔ تاہم فلم بندی کے دوران میں زخموں اور خراشوں کے باعث اسے کافی تکلیفیں سہنا پڑیں۔

پھر اس کی سب سے بڑی پریشانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس فلم کی عکس بندی کے دوران میں وہ اپنے محبوب ول فریڈل سے دور تھی۔ عکس بندی ایسٹ کوسٹ پر ہو رہی تھی۔ اور وہ دوسری جگہ اپنی عکس بندی میں مصروف تھا۔ ان کے تعلقات میں پچھلی آچکی تھی مگر دونوں اپنی مصروفیات کے باعث ایک دوسرے کے ساتھ جی بھر کر وقت نہیں گزارا رہے تھے۔ تاہم انہیں جب بھی موقع ملتا 'وہ اس موقع کو خاص بنالینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ انہیں تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی تو اس کے لیے ول فریڈل کا ذاتی اپارٹمنٹ موجود تھا۔ جو لو کے گھر سے ذرا فاصلے پر ہی تھا۔ ول وہاں تنہا رہتا تھا۔ جینیفر لو اس کی تنہائی دور کرنے اکثر وہاں پہنچ جاتی اور پھر کچھ سنگین وقت رنگین کرنے کے بعد دونوں مسکند و نل ضرور جاتے۔ الا بلا کھانا دونوں کو ہی بے حد مرغوب تھا۔ جینیفر لو بتاتی ہے کہ وہ ہمیشہ مسکند ا نل کی نرس دو ویلو کی چیزیں منگواتے۔ جس میں ہم دونوں کو ایک ایک چیز بھر کر ملتا۔ کوک میں ہم دونوں جیسے واری کرتے اور اس دوران میں تلے ہوئے سارے آلو بھی کھا جاتی تھی۔

آئی نوواٹ یو ڈا لاسٹ سمر بے پناہ کامیاب ہوئی 'اسکریم۔ اور پھر اسکریم ٹو کی طرح کیون ولیم سن نے اس فلم کے لیے ایسا اسکرپٹ تحریر کیا تھا جس میں حالات و واقعات انتہائی تیزی سے تبدیل ہوتے تھے۔ دیگر ہارر فلموں کے برخلاف اس فلم کے کردار حقیقت سے بہت حد تک قریب تر تھے۔ اس کے علاوہ اس فلم میں دونوں جوان لڑکیوں کو کمزور اور بے بس دکھانے کے بجائے خاصی بہادر اور باہمت دکھایا گیا تھا۔ مثلاً جولی (جینیفر لو ہیوٹ) اپنا کمپیوٹر اور داغ استعمال کر کے جلد ہی پتالگالیتی ہے کہ قاتل پچھرا اصل میں کون ہے؟ ہیلن بھی خاصا مقابلہ کرتی ہے۔ پھر ولیم سن نے لطیفوں کے ذریعے فلم میں بہت حد تک مزاح بھی پیدا کر دیا تھا۔ خود جینیفر بھی یہ سمجھتی ہے کہ فلم میں بہت سی چیزیں بلا جواز تھیں۔ مگر ناظرین کی نظرسنیمائی اسکرین پر مسلسل جمائے رکھنے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جینیفر اور سارہ شیل کے سینے نے یہ کام بھرپور انداز میں کیا۔

وجہ کچھ بھی رہی ہو 'قلم بے حد کامیاب رہی۔ ریلیز

ہوتے ہی اسکریم کی طرح اس فلم کے بھی چرچے ہونے لگے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ خود اسکریم کی کامیابی نے بہت سوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ لوگوں اور ناقدین کا خیال تھا کہ اب نوجوانوں کی ہارر فلموں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ مگر ذہانت سے تیار ہونے والی ہارر فلم "اسکریم" ایک اچھا تجربہ ثابت ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد "آئی نوواٹ یو ڈا لاسٹ سمر" نے بھی باکس آفس پر اکثر ملین ڈالر سے زیادہ برنس کر کے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ اچھی کہانی پر مشتمل فلمیں خواہ وہ نوجوان اداکاروں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہوں ضرور کامیاب ہوتی ہیں۔

اس فلم کے حوالے سے پپیل میگزین نے اپنے تبصرے میں لکھا "یہ ایک اچھی فلم ہے مگر اتنی خوف ناگ نہیں کہ ہارر فلمیں ناپسند کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ البتہ ٹی وی کی "بیب" جینیفر لو ہیوٹ اور سارہ شیل گیلر نے ان مناظر میں لاجواب اداکاری کی جب آہنی بک ان کے تعاقب میں ہوتا اور وہ دیوانہ وار بھاگ رہی ہوتی تھیں۔"

ورائٹی میگزین نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ "کہانی کے مرکزی کرداروں نے اپنی حرکات و سکنات سے ایسے افراد کی بھرپور ترجمانی کی جنہیں غیر محفوظ ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ احساس جرم پر بھی پریشانی ہے۔ خاص طور پر جینیفر لو ہیوٹ اور پرزنی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔"

میگزین نے یہ رائے بھی دی کہ یہ فلم عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔ اداکاروں نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور فلم میں جا بجا تکنیکی مہارت بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس فلم نے جینیفر لو ہیوٹ کو راتوں رات فلم انڈسٹری کی سپر اسٹار بنا دیا تھا۔ اس سے قبل تک وہ اپنی منزل کی جانب کچھوے کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کے دامن میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامیاں اور تکلیف دہ مایوسیاں نظر آتی تھیں۔ اس فلم سے پہلے تک وہ عرف عام میں پارٹی آف فائو کے حوالے سے بلی کی محبوبہ سارہ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ مگر اس فلم کے بعد اسے ایک بالکل نیا مقام اور نام مل گیا۔ لے کین کے ساتھ ساتھ پوری فلم انڈسٹری نے واضح طور پر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کر لیا تھا۔ لوگوں کو اس کی صلاحیتوں کا واضح طور پر ادراک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تو ہالی وڈ انڈسٹری میں ایک لہر سی اٹھی اور کئی نوجوان اشار سانسے آنے لگے۔ گویا جینیفر

ٹریڈ سائز اداکارہ بن گئی تھی۔ اب شائقین فلم نے جانے بیچانے بڑے ناموں کے بجائے نوجوان چہروں اور نئے ناموں کو بھی عزت دینی شروع کر دی تھی۔

لو نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا "میری وجہ سے فلم انڈسٹری میں نوجوان اداکاروں کو متعارف کرانے کی ایک نئی رسم کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے اسی کی دہائی میں جان ہک کی ہی ایسی فلمیں آتی تھیں جو نوجوانوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ یہ فلمیں مجھے بے حد پسند تھیں۔ ان فلموں میں زیادہ تر مرکزی کردار مولی رنگ والڈ ادا کرتی تھی مگر اب کلیر ڈنر ' لیونا رڈوڈی کیپریو جیسے فنکار راتوں رات اشار بننے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح ہالی وڈ انڈسٹری میں نیا خون شامل ہو رہا ہے۔ اور ان میں سے ہی ہمیں مستقبل کے ہیرن فوراً مل جائیں ' ممکن ہے میں مستقبل کی جوڈی فوسٹر ثابت ہو جاؤں۔"

بلاشبہ ان تمام نوجوان فنکاروں میں جینیفر لو ہیوٹ سب سے آگے اور سب سے نمایاں تھی۔ وہ جوڈی فوسٹر تو نہیں ہے۔ مگر اس کی اپنی علیحدہ پہچان ضرور بن گئی تھی۔ 1997ء میں ہالی وڈ رپورٹر نے اسے "پارٹی آف فائو" میں عمدہ ترین کارکردگی کے باعث بہترین نوجوان اشار کا خطاب دیا۔ اس کے فوراً بعد 1998ء میں اس نے نئی اداکارہ کے طور پر بلاک بچسٹرانٹر سینٹ ایوارڈ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد جی کیو (Q.Q) میگزین نے اسے "سکین بیب" (BABE SLAMIN'S) کا خطاب دیا۔ جب اپنے متعلق یہ رائے جینیفر نے پڑھی تو وہ دیوانی ہو گئی اور پورے گھر میں اوجھڑے اُدھر دوڑتے ہوئے چلانے لگی تھی۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ جینیفر لو ہیوٹ نے نئی منزلیں سر کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔ جس مقام کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ناکامیوں اور مایوسیوں سے لڑتی آئی تھی وہ مقام حاصل کر لیا تھا۔

خوف و دہشت سے بھرپور موسم گرما اور ایک زبردست سپر ہٹ فلم کے بعد جینیفر لو ہیوٹ ایک بار پھر پارٹی آف فائو کے اگلے سیزن کے لیے تیار تھی۔ یہ سیزن بھی حسب معمول بے انتہا کامیاب رہا۔ گزشتہ برس کے مقابلے میں اس کی درجہ بندی میں تیس فیصد کا اضافہ ہو گیا۔ ابتدائی برسوں کے ٹیپ و فراس سے گزرنے کے بعد اس سیریز کے فنکار اور دیگر ٹیکنیکل عملہ اب سیریز کی کامیابی پر بہت زیادہ مطمئن ہو گیا تھا۔ انہوں نے کئی سالوں سے اس سیریز کے

لے اپنی ساری کشتیاں جلا رکھی تھیں، اپنا سب کچھ اس سیرز میں جھونک رکھا تھا۔ تاہم سیرز کے وفادار شائقین بھی اب سوچنے لگے تھے کہ سیرز کے چوتھے سیزن میں جذباتی ڈراما حد سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ بات ٹھیک بھی تھی، سیرز کا تقریباً ہر کردار کسی نہ کسی جذباتی بحران کا سامنا کر رہا تھا۔ لہذا اس سیزن کی آخری قسط کو ذرا مختلف دکھانے کا فیصلہ کیا گیا۔

اصولی طور پر یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس سیزن میں سارہ ریوز (جینیفر لو ہیوٹ) کو اسکرین پر زیادہ سے زیادہ مناظر میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے جینیفر اس سیرز میں اپنے کردار کی وجہ سے باہر شہرت سمیٹ رہی تھی اور فلموں میں کام حاصل کرنے کے لیے اس سیرز کے کردار کو تریپ کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ اب یہی سیرز، فلموں میں اس کی زبردست کامیابی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مگن تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ اور پھر اس دوران میں جینیفر کو دو نئی فلمیں مزید مل گئیں۔ اسے ”پارٹی آف فائو“ کے ساتھ ساتھ اب ان فلموں کی عکس بندی بھی کرانا تھی۔ اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا کہ وہ پارٹی آف فائو کو پورا وقت دے، مگر اس سیرز سے اس کی وابستگی ایسی تھی کہ وہ فلم کی عکس بندی کے فوراً بعد نیند پوری کیے بغیر ہی سیدھی پارٹی آف فائو کے سیٹ پر پہنچ جاتی تھی۔ اب وہ اپنے آپ پر جبر کر رہی تھی اور آرام کے بغیر کام میں جتی ہوئی تھی۔ اس کی نئی فلم ”کانٹ ہارڈلی ویٹ“ کی عکس بندی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ ابتدا میں اس فلم کا نام ”دی پارٹی“ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری فلم ”ٹیلنگ یو“ کی عکس بندی بھی شروع ہو گئی۔ یہ وہی فلم تھی جس کی کہانی سے متاثر ہو کر پڑوسی ملک بھارت میں اداکارہ پریتی زینا اور سیف علی خان کو لے کر بے مثال فلم ”تم سے کہنا تھا“ تیار کی گئی۔ اس فلم میں پریتی زینا کی اداکاری نے بڑے بڑے ناقدین کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

دونوں فلموں کی شو ٹنگز اور پھر پارٹی آف فائو کی مسلسل ریکارڈنگ نے جینیفر کو بڑی طرح تھکادیا۔ آخر کار وہ زچ آگئی اور موقع ملنے ہی دو ہفتے کی چھٹیوں پر جزیرہ ہوائی میں آرام کرنے چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کوئی اداکارہ ہے اور اپنے کام سے فرار ہو کر یہاں آئی ہے۔ اس تفریحی دورے پر اس کا محبوب بھی چپکے سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس تفریحی دورے کے بعد جینیفر لو واپس چلی تو اسے بی سی ٹیلی ویژن نیٹ ورک کا نمائندہ اس کے گھر پر موجود تھا۔ ”میڈم“ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اسے بی سی ٹی وی کے

ایک خصوصی پروگرام ”دی سینٹر بوم“ کی میزبانی کریں۔“ جینیفر کے پاس ہائی بھرے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پیش کش اتنی عمدہ اور پُرکشش تھی کہ وہ انکار نہ کر سکی۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ نوجوانوں کے دل کی دھڑکن اور ایک زبردست شخصیت بن چکی ہے۔

”دی سینٹر بوم“ کے ساتھ ہی ”پارٹی آف فائو“ کا اعلان سیزن شروع ہو گیا۔ گزشتہ سیزن اس کے لیے بے حد تھکادینے والا ثابت ہوا تھا۔ اس کا شیڈول اس قدر سخت تھا کہ اس کے دوران میں مزید کسی مصروفیت کی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ اس سیزن کے دوران میں اسے بہت زیادہ جذباتی اداکاری کرنا پڑی تھی۔ جس میں ظاہر سے زیادہ توانائیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب بارہ اور چودہ گھنٹوں تک مسلسل کام کرنے والے اس سیزن کا اختتام ہوا تو جینیفر لو نے سکون کا سانس لیا۔ فوکس نیٹ ورک کے اس پروگرام کی درجہ بندی میں ہر ہفتے ہی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس بات سے سب کے ہی حوصلے بلند ہو رہے تھے۔ انہیں اپنی محنت کا صلہ ملنے لگا تھا۔ مگر اس کے ناظرین میں اب رفتہ رفتہ ہر عمر کے لوگ شامل ہوتے جا رہے تھے۔ اب وہ لوگ بھی ”پارٹی آف فائو“ کے نام سے واقف ہو چکے تھے جنہیں یہ پروگرام دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اس کا مطلب تھا، پروگرام کی تمام کاسٹ (فکاروں) نے بھی اپنی شناخت بنالی تھی۔

اب ایسی مشکلات کا آغاز ہو گیا تھا جو صرف اور صرف شہرت کی وجہ سے ہی نصیب میں آتی ہیں۔ اس کے لیے باہر لکھنا، شاپنگ مال اور سکڈ انڈ تک جانا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ لوگ اسے پہچان کر روک لیتے تھے۔ آؤگراف لینے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتے تھے۔ مگر جینیفر لو ان کی کسی بات کا بڑا نہیں مانتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اپنے چاہنے والوں اور شائقین کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انہیں وقت دینا، آؤگراف دینا اور ان کے ساتھ دوستی کرنا اس پر قرض ہے۔

شہرت کی قیمت بھی چکانا پڑتی ہے۔ اب وہ جس کسی کے ساتھ بھی کھڑی نظر آجاتی، اس کے اگلے دن اس کے ساتھ اس کے خفیہ تعلقات یا محبت کی خبریں شائع ہونا شروع ہو جاتیں۔ ایک اخبار نے اس کی ایک ایسی تصویر شائع کی جس میں وہ مٹی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا ”جینیفر لو کو یہ اسکرٹ بہت عزیز ہے۔ مگر کسی اچھے کردار کے حصول کے لیے اس اسکرٹ کی اہمیت بے معنی

ہو جاتی ہے۔“

یہ سب کچھ کروہ گھنٹوں روتی رہی۔ اس کی ماں سیٹ ہوٹ اسے تسلیاں دیتی اور سمجھاتی رہی ”روئے کی کوئی بات نہیں ہے لو! یہ فلم انڈسٹری ہے۔ یہاں اس قسم کے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

”مگر میں نے ایسا کیا کیا ہے کہ ایسی گھٹیا باتیں مجھ سے منسوب کی جا رہی ہیں؟“

”تم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مگر جب تم اپنی فلم کے لیے اپنے شائقین کے لیے بہت سی چیزوں پر سمجھوتا کرتی ہو، ان کو خوش کرنے کے لیے ہر دفعہ کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش کرتی ہو تو تمہارے لیے یہ جانتا بہت آسان ہو گا کہ اخبارات اور رسائل بھی اپنے پڑھنے والوں کے لیے نیا مسالا پیش کرتے ہیں۔ وہ اسی طرح اپنا کام چلاتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسی باتیں معمولی ہستیوں کے بارے میں کبھی نہیں لکھی جاتیں۔“

جینیفر لو نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا ”اس کا مطلب ہے میں معمولی ہستی نہیں ہوں؟“

”ہاں!“ اس کی ماں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا ”غیر معمولی اور بڑے لوگ ہی خبروں کا موضوع بنتے ہیں۔ اب تم بڑی اسٹار بن گئی ہو، ایسی چھوٹی باتیں تمہیں نظر انداز کرنا ہوں گی۔“

بات جینیفر لو کی سمجھ میں آگئی، اس دن کے بعد سے اس نے پریس کے ریمارکس اور چٹ پی خبروں پر رونا اور پریشان ہونا چھوڑ دیا۔ اخبارات بھی خاموش ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی زندگی میں کوئی دھماکا خیز اسکینڈل نہیں تھا۔ وہ ایک وقت میں ایک محبت کی قائل تھی۔ اس کی محبت اور جنون صرف اور صرف ول فریڈل تھا۔ اور یہ بات کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ وہ لاس اینجلس کی سڑکوں پر اور کونوں کھدروں میں بھی گھسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کسی نے اسے بار میں شراب پی کر مدہوش ہوتے اور سب کے سامنے کپڑے اتارتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دیگر مردوں سے بھی حتی الامکان طور پر دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی زندگی اس کے کام، گھر اور ول فریڈل کے گرد گھوم رہی تھی۔ وہ جتنا کام کرتی، اتنا ہی کام اسے مزید مل جاتا۔ اور کام اس کے لیے نشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا اور نیند۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی محض شوق بن گئی تھی۔ وہ اپنا یہ شوق آسانی سے پورا کر لیتی تھی۔ کبھی اپنے گھر میں اور کبھی ول فریڈل

کے اپارٹمنٹ میں۔

پارٹی آف فائو کے اگلے سیزن کی ریکارڈنگ شروع ہوئی تو اس کی اگلی فلم ”کانٹ ہارڈلی ویٹ“ (WAIT CAN'T HARDLY) کی شو ٹنگز بھی شروع ہو گئیں۔

اب اس کے پاس ایک سیکنڈ کا بھی وقت نہیں بچا تھا۔ ایک بار اس کا وہی معمول شروع ہو گیا۔ پارٹی آف فائو کے سیٹ سے کانٹ ہارڈلی ویٹ کے سیٹ تک وہ کار میں ہی اپنی نیند پوری کرنے لگی۔ وہ سردست کسی نئی فلم میں کام نہیں کرنا چاہتی تھی مگر کانٹ ہارڈلی ویٹ میں اس کو دیا جانے والا امانڈا کا کردار ایسا جاندار تھا کہ وہ انکار نہ کر سکی۔ اس فلم

میں وہ مکمل طور پر ایک چیئر لیڈر (LEADER) تھی۔ یہ فلم بنیادی طور پر جان بکس کی فلموں سے متاثر ہو کر بنائی جا رہی تھی۔ جینیفر کو تو جان بکس کی فلمیں شروع سے ہی پسند تھیں، لہذا اس نے فوراً... ہائی بھری اس کا کہنا ہے کہ اس دور میں رومانوی فلموں کی تعداد کم ہونے لگی تھی اور اس فلم میں پیش کی جانے والی محبت اس قدر مسور کن اور تاثر انگیز تھی کہ مجھے کہانی فوراً پسند آگئی۔“

بے پناہ مصروفیت کے باعث اسے متعدد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ فلم اس کے لیے بہترین تجربہ ثابت ہوئی۔ وہ ایک ایسی لڑکی کا کردار کر رہی تھی جو خود اس کے خوابوں میں بسنے والی شہزادی تھی۔ بے عیب میک اپ، بہترین لباس، وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں تھی اور جینیفر کوئی ایسا کردار ہمیشہ سے کرنے کی خواہش مند تھی جس میں وہ عام سی امریکن لڑکی سے ذرا مختلف نظر آئے۔

پہلے اس فلم کا نام ”دی پارٹی“ تھا۔ اس کی کہانی ڈیورا کیلان اور ہیری ایل فونٹ نے لکھی تھی۔ اور ہدایت کار بھی وہی تھے۔ اس سے پہلے وہ دونوں ایک فلم ”اے ویری بڑی سیکوئل“ لکھ چکے تھے۔ اس فلم کا مرکزی خیال بھی اسی کی دہائی فلموں سے لیا گیا تھا۔

اس فلم کے ذریعے جینیفر نے وہ تجربہ بھی حاصل کیا جس سے وہ محروم تھی۔ یعنی ہائی اسکول کی پارٹیوں میں شرکت کا تجربہ، وہ اپنی مصروفیات کے سبب اپنے اسکول کی کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ یہ تقریبات دراصل تعلیم کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان کے ذریعے ہائی اسکول کے طلباء طالبات کو سماجی تربیت دی جاتی ہے۔

”کانٹ ہارڈلی ویٹ“ کی کہانی میں ایک انوکھا پن تھا۔

کہانی کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ پینکٹن ہائی اسکول کی کلاس نے جو نئی گریجویشن کیا۔ ہر شخص چند اہم کاموں میں مصروف ہو گیا۔ سب کے لیے وہ تقریباً بہت اہم تھی جو چار سالہ تعلیم کے بعد رات کو منعقد کی جارہی تھی۔ امانڈا پینکٹ (جینیفر لوہیوٹ) کے لیے اس تقریب میں مزے داری اور لطف کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ گریجویشن کے فوراً بعد اس کے محبوب مائیک نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس واقعہ نے اسکول کے ہر لڑکے اور لڑکی کو حیرت زدہ کر دیا۔ کچھ لوگوں کو اس علیحدگی سے خوشی بھی ہوئی، اس کا محبوب مائیک دراصل صرف ایک عورت کی محبت سے آزاد ہو کر کالج کی ہر لڑکی سے عشق کرنا چاہتا تھا اور پھر امانڈا کے کزن رون نے مائیک کو سمجھایا کہ حقیقت اس کے تصور سے مختلف ہے اور کالج کی لڑکیاں اسے گھاس بھی نہیں ڈالیں گی۔

اسی اسکول میں پریسٹن نامی ایک شرمیلا سا لڑکا بھی پڑھتا تھا۔ وہ ایک لکھاری بھی تھا اور شروع دن سے امانڈا کی محبت میں گرفتار تھا۔ مگر اس کی یہ محبت قطعی طور پر یک طرفہ تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کے سامنے اپنے دل کا حال بیان کر سکتا۔ تقریب کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے اپنی محبوبہ سے جدا ہونے والا تھا۔ آج رات آخری موقع تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی محبوبہ کے سامنے دل کھول کر رکھ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے امانڈا کے نام ایک خط لکھا اور وہ امانڈا کے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس وقت امانڈا ایک شدید جذباتی بحران سے گزر رہی تھی۔ وہ دنیا میں صرف اور صرف مائیک سے ہی محبت کرتی تھی۔ مگر اب وہ اس سے علیحدہ ہو کر لوگوں کے درمیان تنہا کھڑی تھی۔

امانڈا اور شرمیلا پریسٹن ایک دوسرے کی ضد تھے۔ وہ ایک شرمیلا لڑکا تھا۔ جبکہ امانڈا شمع محفل اور نوجوان لڑکیوں کی ملکہ، ان دونوں کا ملاپ مشکل تھا مگر کہانی کار نے ان دونوں کو ہی کہانی کا مرکز بنایا تھا۔ امانڈا کسی اور سے محبت کرتی تھی وہ سچی محبت کی طلب گار تھی جبکہ پریسٹن اس پر دل دجان سے فدا تھا۔ کسی کو بھی ان کی جوڑی مناسب محسوس نہیں ہوتی۔ مگر فلم کی کہانی آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آتے چلے گئے۔ اور جلد ہی امانڈا کو بھی ادراک ہو گیا کہ سراب کے پیچھے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سائے بھی ہاتھ نہیں آتے۔

جوان لڑکے، لڑکیوں کے لیے اس فلم میں پیش کیے واقعات نئے نہیں تھے۔ کہانی ضرور انوکھی تھی مگر واقعات پرانے لہذا فلم جزوی طور پر کامیاب کہلائی۔ البتہ جینیفر لوہیوٹ کو سب نے ہی پسند کیا۔ اس فلم میں وہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت اور پُرکشش دکھائی دی اور یہی جینیفر چاہتی تھی۔ اپنے پہلے ہی بچنے میں کانٹ ہارڈی دیتے باکس آفس پر آٹھ ملین ڈالر کمائے جبکہ فلم پر مجموعی طور پر دس ملین ڈالر لاگت آئی تھی۔ دو ماہ کے دوران میں اس فلم نے مجموعی طور پر چوبیس ملین ڈالر کمائے۔

ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ "پارٹی آف فائو" کی ریکارڈنگ کے دوران میں ہی ایک فلم مکمل کر لینے کے بعد جینیفر لوہیوٹ تھوڑا وقفہ لیتی اور خود کو کچھ آرام کرنے پر آمادہ کر لیتی۔ مگر اب یہ نہ اس کی قسمت میں تھا اور نہ کوئی اسے ایسا موقع دینے پر تیار تھا۔ اب وہ شہرت کی بلندیوں پر تھی اس کی ڈیمانڈ میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا اور اس پر اس انداز میں آفرز کی بھرمار ہو رہی تھی جیسے شدید بارش میں پانی کے قطرے تواتر سے زمین پر گرتے ہیں۔

اس کی اگلی فلم "ٹیلنگ یو" کی عکس بندی شروع ہو گئی۔ ساتھ ساتھ پارٹی آف فائو کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ فلم کی عکس بندی مکمل ہوئی تو کرس کے موقع پر اسے چند دنوں کا وقفہ ملا۔ موقع غنیمت جان کر وہ چھٹیاں گزارنے جزیرہ ہوائی چلی گئی اور جیسے ہی چھٹیاں گزار کر واپس آئی ایک بار پھر "پارٹی آف فائو" اور ایک نئی فلم کے گمن چکر میں گھومنے لگی۔ ٹیلنگ یو 1998ء کے موسم گرما میں نمائش کے لیے پیش ہونا تھی۔

کام کا ایسا شدید دباؤ اچھے اچھوں کی مٹی گم کر دیتا ہے۔ جسمانی طور پر تو زچھوڑ کر رکھ دیتا ہے مگر لوہیوٹ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ اسی وقت کے لیے تو وہ ایسی زبردست جدوجہد کرتی آئی تھی۔ اب ایک اور چیز اس کے ذہن میں کھلبلائے لگی تھی۔ وہ اپنے پیسے سے ایک فلم پروڈیوس کرنے کا سوچ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک زبردست کہانی گردش کرنے لگی تھی۔ اس نے اس فلم کا نام بھی رکھ لیا تھا۔ "کیو پڈز لو" اس فلم کی کہانی اس کے ایک خواب پر مشتمل تھی۔

ایک صبح وہ پرسکون نیند کے بعد بیدار ہوئی تو وہ ایک حسین پسندیدہ چکی تھی۔ چند لمحوں تک تو اسے خواب یاد نہ آیا مگر جب تھوڑی دیر میں رفتہ رفتہ خواب کے خدوخال

واضح ہونے لگے تو وہ اچھل پڑی اور چلا کر بولی "اوہ! میرے خدا۔ یہ تو مکمل کہانی ہے۔ اس پر تو شاندار فلم بن سکتی ہے۔"

اس روز وہ جہاز میں سفر کے دوران میں اس خواب پر مشتمل کہانی کو حتمی شکل دے رہی تھی۔ جہاز میں سفر کے دوران میں ہی اس نے فلم کا نام "کیو پڈز لو" (LOVE CUPID'S) طے کر لیا۔

یہ ایک جوان عورت کی کہانی تھی جو شادیاں کرانے کا کام کرتی تھی۔ اس نے ایک نوجوان کی شادی طے کرائی تو خود ہی اس کی محبت میں بھی مبتلا ہو گئی۔

دوسرے دن گھر پہنچتے ہی وہ اپنی ماں کے گلے لگ گئی۔ اس کا بھائی ٹوڈیوٹ بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے ان کے پاس آچکا تھا۔ جینیفر نے اپنی کہانی انہیں سنا ڈالی۔ دونوں بہت خوش ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ اس کہانی پر فلم ضرور بنائیں گے۔

اگلے ہی دن جینیفر نے اپنی کہانی کا آئیڈیا اور عنوان "رائٹرز گلڈ" میں رجسٹر کرایا تاکہ کوئی اسے چُرا نہ سکے۔ چند دنوں بعد لوکی ملاقات اپنے چند ایسے دوستوں سے ہوئی جن کا تعلق بھی شو بزنس سے تھا۔ وہ ایک فلم بنانے کا سوچ رہے تھے اور کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھے۔ جینیفر لوہیوٹ نے ان سے پُر جوش لہجے میں کہا "کیسی شاندار بات ہے کہ میرے ذہن میں ایک بالکل نئی کہانی آئی ہے۔ کیا آپ لوگ پسند کریں گے کہ میں یہ کہانی آپ کو سناؤں؟"

وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے "کیا واقعی؟"

"ہاں! اگرچہ مجھے کہانی لکھنے یا فلم بنانے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ میں اس کام میں ابھی اتاری ہوں اس بات سے بھی ناواقف ہوں کہ اچھی کہانی کیا ہوتی ہے؟ اور آیا کہ میری کہانی پر فلم بن سکتی ہے یا نہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ میری کہانی سن لیں اور مجھے بتائیں کہ یہ آپ کو پسند آئی ہے یا نہیں؟"

وہ بولے "ٹھیک ہے" اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تم ہمیں کہانی سناؤ، ممکن ہے ہم تمہیں کوئی بہتر مشورہ دینے میں کامیاب ہو جائیں۔"

جینیفر نے گلا کھنکارا اور اپنی کہانی سنانا شروع کر دی۔ وہ سب خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے اور حیرت سے اس کی کہانی سننے رہے۔ جب جینیفر خاموش ہوئی تو وہ بے ساختہ بولے "بہت خوب۔ یہ تو بہت عمدہ کہانی ہے، ہم اس پر فلم بنانے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

اس طرح "کیو پڈز لو" کے منصوبے کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ مگر زیادہ تر ڈسے داریاں جینیفر لوہیوٹ کے ہی ڈسے تھیں۔ اسٹوڈیوز وغیرہ سے بھی اسے ہی بات کرنا تھی کیونکہ وہ اس فلم کی نہ صرف مصنفہ تھی بلکہ فلم ساز بھی تھی اور یقینی طور پر مرکزی اداکارہ بھی اسی کو ہونا تھا۔

فلم سازی کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کا انداز تبدیل ہو گیا۔ اس نے فلم ساز کا روپ دھارنے کا فیصلہ کیا تو بہترین تراش خراش کا سوٹ زیب تن کیا اور آنکھوں پر ایسی بینک بھی لگائی جس سے وہ کسی حد تک سنجیدہ نظر آسکتی تھی حالانکہ اس کام کے لیے عینک کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

ایک جریدے کی صحافی نے عینک لگانے اور وضع قطع تبدیل کرنے کے بارے میں پوچھا تو جینیفر لوہیوٹ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں ایک اداکارہ ہوں اور یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ کس کردار میں کس قسم کا گیٹ اپ ہونا چاہیے اور کس قسم کا رویہ اپنانا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسٹوڈیوز کے لوگ مجھے سنجیدگی سے لیں اور اس لیے میں سنجیدہ دکھائی دینا چاہتی ہوں۔"

جینیفر نے اپنے نئے کام کے لیے بے پناہ محنت کی اس کام میں اس کا خاصا وقت صرف ہوا اس کے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ مگر اس کی جدوجہد رنگ لائی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے کافی رقم حاصل کر لی۔ نیو لائن سینما کے ادارے نے فلم کی ٹرٹمنٹ کے لیے اسے پانچ لاکھ ڈالر ادا کر دیے۔ اس فلم میں اداکاری کرنے کا معاوضہ اسے علیحدہ ملنا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ 1998ء کے موسم گرما میں اس فلم کی شوٹنگ شروع ہوگی اور فلم کے کریڈٹ پر بہ طور پروڈیوسر اس کا نام بھی جائے گا۔

فلم سازی کی طرف توجہ مبذول ہونے کے باعث جرائد و رسائل میں اس طرح کی باتیں شائع ہونے لگیں کہ جینیفر اب اداکاری سے تھک کر بے زار ہو گئی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی دراصل وہ اپنے آپ کو اپنی ذات کو کھوج رہی تھی۔ اس طرح وہ ساتھ ساتھ نئی منزلیں بھی سر کرتی جا رہی تھی۔ جب پارٹی آف فائو کا نیا سیزن ختم ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور سپر ہٹ فلم آگئی۔ وہ گزشتہ ہٹ فلم "آئی نوواٹ یو ڈا لاسٹ سر" کا دوسرا حصہ تھی اور اس کا نام یقینی طور پر "آئی اسٹل نوواٹ یو ڈا لاسٹ سر" رکھا گیا تھا۔ باکس آفس پر ایک اور بڑی ہٹ فلم جس کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ وہ ایک بڑی اشار کے طور پر اپنا آپ منوا چکی ہے۔

”آئی اسٹل نوڈاٹ یوڈاٹ سٹ سر“ کی عکس بندی کا کام 20 اپریل 1998ء میں شروع ہوا۔ جینیفر لو اس فلم میں پہلی فلم کی طرح جونی کا ہی کردار ادا کر رہی تھی۔ جبکہ اس کے علاوہ گزشتہ فلم کے اداکاروں میں سے صرف ایک اور اداکار فریڈی پرنز جو نر کو لیا گیا تھا۔ اسے رے کا کردار ادا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ٹی وی کے ہٹ پروگرام ”مونٹا“ کے اداکار براڈی کو بھی نئی فلم میں شامل کیا گیا تھا۔ البتہ اس فلم کا مصنف اب کیون ولیم سن نہ تھا۔ کیون ولیم سن اب مصروف ترین کہانی نویس بن گیا تھا۔ وہ بہ یک وقت چالیس دوسری فلمیں لکھ رہا تھا۔ تاہم دوسرے حصے کا بھی مرکزی خیال اس نے ہی لکھا تھا۔ جب پہلا حصہ مکمل ہوا تھا تو اسی وقت کیون ولیم سن نے دوسرے حصے کی ٹرینمنٹ لکھ ڈالی تھی۔

آئی اسٹل نوڈاٹ یوڈاٹ سٹ سر کے زیادہ تر واقعات کا تعلق جزائر بہماز سے تھا۔ مگر اخراجات میں بچت کی خاطر فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام تر عکس بندی بہماز کے بجائے میکسیکو میں ہی کی جائے گی۔ جینیفر کو یہ فلم پہلے حصے سے یکسر مختلف محسوس ہوئی۔ یہ بے حد خوف زدہ کر دینے والی فلم تھی۔ اس کا اسکرپٹ بھی پہلے سے کہیں زیادہ بھانک تھا۔ جب جینیفر لو نے اسکرپٹ پڑھا تو وہ اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ اس رات اپنی ماں بیٹ بیوٹ کے ساتھ اس کے بستر پر سوئی۔

جینیفر لو نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس فلم میں پہلی کی جیسی دکھائی نہ دے۔ اب اس کے کردار کی عمر بھی نسبتاً زیادہ ہو چکی تھی۔ اس فلم کا آغاز وہیں سے ہوا تھا جہاں پہلی فلم ختم ہوئی تھی۔ فلم کی شوٹنگ بھی پہلے حصے کی طرح ثابت ہوئی۔ جینیفر لو جب گھرواپس آئی تو اکثر ویڈیو اس کے جسم پر خراشیں اور ناخنوں میں غلی خون بھرا ہوا تھا۔

آئی اسٹل نوڈاٹ یوڈاٹ سٹ سر بھی خاصی ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ باکس آفس پر اس فلم نے تھلکہ مچا دیا اور اس کے ساتھ ہی ہالی وڈ میں خوف ناک فلمیں مسلسل بننے کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اب بھی یہ بھیڑچال رکنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔

جینیفر لو بیوٹ نے اس کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگرچہ اس کی کئی فلمیں ناکام ہو گئیں مگر وہ اب اشارز میں شامل ہو گئی تھی اور دو چار فلموں کی ناکامی سے کسی اشار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حال ہی میں جینیفر لو بیوٹ کی بالکل نئی فلم ”فکسڈ“ (TUXEDO) منظر عام پر آئی ہے۔ اس فلم میں وہ کسٹنٹو

کنگ اور ایکشن کامیڈی کے بادشاہ جیکی جن کے ساتھ کرائے لڑتی اور ایکشن بکھیرتی نظر آ رہی ہے۔ اس فلم کی ابتدائی رپورٹ بہت اچھی ہے۔ فکسڈ کی خاص بات یہ ہے کہ اس فلم میں جیکی جن نے پہلی مرتبہ کسی فلم میں باقاعدہ طور پر رقص بھی کیا ہے اور یہ رقص اسے جینیفر لو بیوٹ نے ہی سکھایا ہے۔ وہ بہت عمدہ اور باکمال رقاصہ ہے۔ اس کے بدلے میں جیکی جن نے اسے ایکشن کی تربیت دی ہے۔ کرائے اور مارشل آرٹس کے ابتدائی ایکشن سکھائے ہیں۔ جب جینیفر لو بیوٹ کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی نئی فلم ”فکسڈ“ میں ایکشن کنگ جیکی جن کے ساتھ مارشل آرٹس کے مظاہرے کرتی اور لڑتی بھڑتی نظر آئے گی تو اس نے فوری طور پر کرائے کی تربیت لینے کے لیے ماہرین سے رجوع کر لیا اور جلد ہی ابتدائی مشقوں کے بعد وہ اس قابل ہو گئی کہ ایکشن مناظر آسانی سے عکس بند کرا سکتی تھی۔ کرائے کی ابتدائی مشقیں سیکھ لیتا اس کے لیے آسان یوں بھی ثابت ہوا کہ وہ باکمال رقاصہ ہے اور اس کے جسم میں موجود چمک کرائے ٹخنے میں اس کے بہت کام آئی۔

جینیفر بتاتی ہے ”فکسڈ میری حیرت انگیز فلم ہے۔ اس فلم میں میں نے جیکی جن کے ساتھ جتنے بھی ایکشن مناظر عکس بند کرائے ہیں اس کی باقاعدہ عملی مشق کرتی تھی اور اس مشق میں جیکی جن میری بہت مدد کرتا تھا۔ اگر جیکی جن میری اتنی مدد نہ کرتا تو شاید میں ماروہاڑ کے تکنیکی مناظر اتنی آسانی سے مکمل نہ کر پاتی۔ میرے لیے یہ سب کچھ بہت انوکھا اور پرجوش کوسینے والا تھا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں کسی دن جیکی جن کے ساتھ بھی کام کروں گی اور اداکاری کے بجائے ٹائٹس چلاتی نظر آؤں گی۔ جیکی جن ہمیشہ سے ہی میرا پسندیدہ ہیرو رہا ہے۔ ہوس ٹی کے بعد جیکی جن سے بڑا مارشل آرٹ ہیرو فلمی دنیا کو نصیب نہیں ہوا۔ میں ہوس ٹی اور جیکی جن کی فلمیں دیکھتے ہوئے بڑی ہوئی ہوں اور ایکشن کے لحاظ سے جیکی جن میرا پسندیدہ ترین ہیرو ہے۔“

”جیکی جن کے ساتھ کسی فلم میں کام کرنا میرے لیے ایسا ہی تجربہ ثابت ہوا جیسے کسی چار سالہ بچی کو یہ موقع مل جائے کہ وہ اپنے سپر ہیرو کے ساتھ کچھ دن بیٹے کھیلتے بھاگتے دوڑتے گزرتے۔ یہ میری پہلی فلم ہے جس میں مجھے جیکی جن کی طرح پہلی مرتبہ لڑنے بھڑنے اور بھاگنے دوڑنے کا موقع ملا ہے۔ میں بہت زیادہ پرجوش ہونے کے ساتھ ساتھ خوف زدہ بھی تھی اور خود کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی کہ

مجھے جیکی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

فکسڈ میں جیکی جن ایک شیفر کے کردار میں سامنے آ رہا ہے۔ جی ٹونگ نام کا شیفر جو ایک پلے بوائے قسم کے کوڑی پتی کے پاس ملازم ہو جاتا ہے۔ کوڑی پتی پلے بوائے کھارک ڈیولن (جیمسن آنزک) ایک ایسی فکسڈ (جیکٹ) کا مالک ہے جس کو پہنتے ہی اس کو عجیب و غریب قسم کی پراسرار قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ ایک دن ڈیولن پر حملہ ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ ہلاک ہو جاتا عین اسی موقع پر ٹونگ (جیکی جن) میدان عمل میں آیا۔ وہ ایک ایسی خوف ناک دنیا میں گھر گیا تھا جہاں ہاتھیوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ایسے میں اس کی ملاقات ایک بے حد حسین و جمیل اور جاذب نظر لڑکی ڈیلی بلینسی (جینیفر لو بیوٹ) سے ہو گئی۔ وہ ایک قسم کی جاسوس تھی اور ٹونگ (جیکی جن) کے مقابلے میں ہر طرح سے بہت زیادہ نا تجربہ کار اور اس کے بعد پوری فلم میں جیکی جن کی مخصوص فلموں کی طرح ماروہاڑ اور ہنگامے شروع ہو گئے۔

جینیفر لو بیوٹ کے لیے یہ فلم انوکھا تجربہ ثابت ہوئی۔ شوٹنگ کے دوران میں وہ اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے گویا چمک پر آئے ہوئے ہوں، تھمتے، شرارتیں، فتنے، ٹھنسنے۔ سب ہی کچھ تو تھا سیٹ پر۔ جیکی جن اس کے ایکشن مناظر میں اس کی مدد کر رہا تھا تو وہ رقص کے مناظر میں جیکی جن کو بہت کچھ سکھار رہی تھی۔ ایکشن مناظر کی عکس بندی کے دوران میں جینیفر لو کو کئی مرتبہ پھسل گئی، متعدد بار بلندی سے نیچے گر گئی لیکن اس کی چٹنگی تربیت نے اس کے نازک بدن کو خطرناک زخموں اور ٹوٹ پھوٹ سے بچالیا۔

ایک روز جیکی جن اور جینیفر کے درمیان لڑائی کا منظر عکس بند ہو رہا تھا۔ جینیفر بہت عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور پھر ایکشن اشارے کے انداز سے کی ڈرامائی غلطی ہوئی تو جینیفر کی تیز رفتار راؤنڈ کنگ جیکی جن کی ناک پر لگ گئی۔ جیکی کی ناک سے خون بہ نکلا، جینیفر بڑی طرح گھبرا گئی۔ مگر جیکی کے لیے یہ عام سی بات تھی۔ وہ اپنی فلموں کی شوٹنگز کے دوران میں متعدد بار سنگین حادثات سے دوچار ہوتا رہا تھا۔ جینیفر کی لگ سے اس کا کیا بگڑنے والا تھا۔ اس فلم کی عکس بندی کے دوران میں بھی اس نے اپنے زخم زخم بدن پر کئی نئے گھاؤ لگا لیے تھے۔

ایکشن فلموں میں زخمی ہو جانا معمول کا حصہ گردانا جاتا ہے۔ جینیفر لو خوف ناک فلموں میں بھی زخمی ہوتی چلی آئی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ جیکی جن کے ساتھ ایکشن فلم میں

﴿﴿ نازنین تہجدوں ﴳ﴾﴾

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبویؐ آپ کے دینی معجزات میں اضماعانے اور تہذیب کے لیے نفاذ کی جاتی ہیں ان کا احتیاطی و پابندی میں پڑھنا ہمارے منہجات پر ہوت اور کادیت دینے میں ان کو صحیح، سلاطین طریقے کے مطابق بنے حرم سے محفوظ رکھیں۔

کام کر رہی ہو اور اس کا خوب صورت جسم زخموں سے بچ جائے۔ وہ کئی زخموں کا شکار ہوئی، ایک منظر کی عکس بندی کے دوران میں حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے وہ دیوانی ہو گئی تھی اور بڑھ چڑھ کر حملہ آوروں پر وار کر رہی تھی۔ پھر ایک حملہ آور نے جوانی وار کیا۔ جینیفر نے اس کا وار ہاتھ پر روکا، حملہ آور نے لکڑی ماری، جینیفر نے بوکھلا کر دو سرا ہاتھ آگے کر دیا۔ لکڑی اس کی انگلی پر لگی، ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور جینیفر کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کی درمیانی انگلی ٹوٹ گئی تھی مگر اس نے برداشت کر لینے میں عافیت جانی۔ شرمندگی کے مارے اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی اور خود پر جبر کرتی رہی، انگلی میں درد کی سیس اٹھ رہی تھیں، وہ برداشت کرتی رہی۔ مگر کب تک۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے، درد اس کی برداشت سے باہر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بہر طور لڑکی تھی، لہذا اس نے یکثرت نازک اندام لڑکیوں کی طرح چلاتا اور رونا شروع کر دیا۔ تب اس کی انگلی پر پٹی باندھی گئی۔ ایکسرے کرایا گیا اور ایک ہفتے تک مسلسل علاج ہوتا رہا۔

جب وہ واپس آئی تو اس واقعے کو بھول چکی تھی مگر بد قسمتی اسے بھولنے پر آمادہ نہیں تھی، اس روز شوٹنگ کے دوران میں ایک فائٹر نے غلطی سے اس کے چہرے پر زبردست ضرب لگا دی۔ اس کی کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ شکر ہے چوٹ زیادہ نہیں لگی تھی۔

یہ سنسنی خیز اور ایکشن سے بھرپور فلم ان دنوں دنیا بھر میں سینماؤں پر دکھائی جا رہی ہے اور کئی مقامات پر شان دار بزنس بھی کر رہی ہے۔

آئی اسٹل نوڈاٹ یوڈاٹ سٹ سر اور فکسڈ کے درمیان جینیفر نے اتنا زیادہ کام کیا کہ دوسری اداکارائیں دس سال میں بھی اتنا کام حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔ جب بھی اس کی کوئی فلم ریلیز ہوتی ہے، ہالی وڈ میں شوں کے اڈوں پر بڑی بڑی شریں لگ جاتی ہیں۔ اکثر کا خیال یہی ہوتا ہے کہ جینیفر کی یہ فلم زبردست کامیابی سے ہم کنار ہوگی۔

خطرناک مہم

ڈاکٹر عبدالرب بلشی

انسان کبھی کبھی جوش جنوں میں کچھ ایسا کر جاتا ہے جو ناقابل یقین سا لگتا ہے۔ اس نے بھی ایسا ہی کارنامہ انجام دیا تھا۔ یورپ کی تاریخ میں اسے ایک افسانوی کردار جیسی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے لاتعداد کارناموں میں سے ایک کارنامہ۔



دوران جنگ اس نے ہاری ہوئی ہادی آلٹ دی تھی

کے بعد ہی مجھے کمپ کی طرف جانے کا حکم ملا جہاں ہماری فوج ہمارے آف کفلاس موجود تھی۔

مجھے یقین ہے آپ نے سارا گوسا کے مشہور و معروف محاصرے کے حالات پڑھے ہوں گے، ایسی مشکل مہم شاید ہی کسی جرنیل کو پیش آئی ہوگی جیسی مارشل لینئر کو پیش آئی تھی لیکن ان مصائب کا تذکرہ کرنے سے پہلے میں اس شہر کا احوال سناؤں۔ یہ عظیم شہر اسپین کے باشندوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سپاہی بھی تھے، کسان بھی اور مذہبی ٹھیکے دار بھی، گویا ہر قسم کے لوگ موجود تھے اور سب کے دلوں میں ہم فرانسیسیوں کے لیے نفرت و حقارت، بغض و عناد کی آگ

میں نے گھڑ سوار دستے میں جو نیر کپتان کی حیثیت سے ملازمت کر لی تھی۔ اس وقت میری عمر پچیس برس تھی۔ جرنیل کی جنگ ختم ہو چکی تھی مگر اسپین میں معرکہ آرائی جاری تھی۔ شہنشاہ نیپولین اعظم نے اسپین کی فوج کو مدد دینے کے لیے میرا تبادلہ سینٹر کپتان کی حیثیت سے لڑاکا فوج میں کر دیا جو اس وقت مارشل لینئر کے زیر قیادت تھی۔ برلن سے اسپین تک یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ میری یہ نئی رجمنٹ بھی اس بڑی فوج کا ایک حصہ بنی ہوئی تھی جس سے مارشل لینئر اسپین کے ایک بڑے شہر سارا گوسا کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ ایک ہفتہ یا اس سے کچھ زیادہ مجھے فرانسیسی ہیڈ کوارٹر میں ٹھہرنا پڑا۔ اس

آج وہ جس مقام پر ہے اس مقام تک اسے پارٹی آف فائیو کی سارہ ریوز کھینچ کر لائی ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی خوبی ایک میگزین کے مطابق یہ ہے کہ وہ بوس و کنار کے مناظر میں آج تک منظر عام پر آنے والی تمام جوان لڑکیوں سے بہتر پرکار مر ہے۔ نوجوان کی تو دیکھنا چاہتے ہیں۔

کئی لڑکیوں نے اسے یہ بتایا کہ اس کے کردار سارہ ریوز کی وجہ سے انہوں نے اپنے پیدائشی سرٹیفکیٹس پر اپنے نام تبدیل کر دیا کہ سارہ ریوز لکھو ادھیے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسکرین پر اور اسکرین سے باہر نوجوان امریکی لڑکیوں کے لیے ایک مثال بن چکی ہے۔ اس بنا پر وہ اس قدر حساس ہو چکی ہے کہ اس نے آج تک اسکرین پر ایک بھی ایسا کردار قبول نہیں کیا جس میں وہ فٹے کی عادی لڑکی یا شرافت سے عاری نظر آئی ہو۔ اسے معلوم ہے کہ فلمی کردار عام انسانوں کی زندگی پر بہت بڑی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

فلمی زندگی سے باہر وہ بالکل عام لڑکیوں کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔ عام امریکی لڑکی کی طرح ویڈیو اسٹور پر جاکر ویڈیو ریکس کرائے پر حاصل کرتی ہے۔ عام سے لباس میں میکڈانلڈ پر جاکر برگر کھاتی ہے۔ اپنی عمر کی دوسری عام لڑکیوں کی طرح۔ محبت کر کے خوش ہوتی ہے۔ بے پناہ کامیابیوں اور بے مثال مقبولیت کے باوجود اس کی گردن میں سختی نہیں آئی، مزاج میں رعونت پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی نظریں بے شک آسمان پر مگر پیر زمین پر ہی ہیں۔ وہ ایک سیدھی سادی اور پیاری سی لڑکی ہے۔ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھتی ہے جس کی توقع دوسروں سے اپنے لیے کرتی ہے۔ کیا ایسے فرد کے حصے میں کامیابیاں نہیں آتی ہیں؟

اس نے بچپن سے لے کر اب تک جو زبردست جدوجہد کی ہے جس طرح ناکامیوں۔ اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری وہ ایک نہ بھلا دینے والی کمائی ہے۔ عزم و ہمت اور جدوجہد مسلسل کی ایسی کمائیاں تاریخ میں اپنا مقام بنالیتی ہیں اور لکھے ہوئے صفحات میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔

جینیفر لو ہیوٹ کا سفر ابھی جاری ہے۔ اسے بہت سے آسمان سر کرنے ہیں وہ جولیا رابرٹس، شیرون اسٹون یا پامیلا اینڈرمن بننے کے خواب نہیں دیکھتی بلکہ ایسی اداکارہ بننا چاہتی ہے کہ کل آنے والی نوآموز اداکارائیں جینیفر لو ہیوٹ بننے کے خواب دیکھیں۔



مئی 2012ء

1999ء میں اس نوجوان اور خوب اداکارہ نے اپنی ذاتی فلم اینڈنی وی پروڈکشن کمپنی قائم کر لی۔ یہ واحد موضوع ہے جس کے بارے میں وہ کہیں بات کرتی نظر نہیں آتی۔ اس کی پروڈکشن کمپنی کے زیر تحت بننے والی پہلی سیریز "ٹائم آف یور لائف" بہت زیادہ کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکی۔ حالانکہ فلمی ہڈتوں کا خیال تھا کہ یہ سیریز "پارٹی آف فائیو" کی طرح یادگار ترین ثابت ہوگی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ٹائم آف یور لائف کامیاب تو ثابت ہوئی مگر ایسی نہیں جیسی کی توقعات تھیں۔

اس کے بعد جینیفر نے اپنی پروڈکشن کے تحت "دی آڈرے ہیسپ برن اسٹوری" میں کام کیا اور اس فلم نے ثابت کر دیا کہ وہ بالکمال بن گئی ہے۔ یہ فلم نہ صرف سینما پر سپر ہٹ ثابت ہوئی بلکہ جہاں جہاں بھی مقابلوں میں بھیجی گئی وہاں سے تعریفی اسناد لے کر واپس آئی۔

2001ء میں جینیفر لو ہیوٹ نے ایک بار پھر باکس آفس پر اپنا جادو جگایا۔ اور ماں بیٹی کے تعلقات، مسائل اور جذباتی وابستگی پر مشتمل فلم "ہرٹ بریکر" کے ذریعے تھلکے بچا دیا۔ اس فلم میں وہ ہالی ووڈ کی بالکمال اداکارہ سیکورنی ویورز جین ہاکین کے سامنے جم کر لڑا اداکاری پیش کرنے میں کامیاب رہی۔

اس کے بعد ہدایت کار ایلین بالڈون (ALIC BALDWIN) کی فلم "ڈیول اینڈ ڈینٹل ویلسٹر" میں اسے شیطان کے کردار میں کاسٹ کیا گیا تو تب بھی اسکا ایوارڈ یافتہ اداکار انتھونی ہاپکینز کے سامنے اس نے ایسی بے ساختہ اداکاری کا مظاہرہ کیا کہ سرانتھونی ہاپکینز نے بے اختیار اسے گلے سے لگالیا اور باصلاحیت بنی کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ جینیفر کہتی ہے کہ سرانتھونی ہاپکینز کے منہ سے ادا ہونے والے یہ الفاظ میرے لیے اعزاز ہیں۔

اب وہ بے حد معروف، معروف اور باصلاحیت ہو چکی ہے۔ اس کے پاس اتنا کام ہے کہ وہ اب اپنے آپ کو بھی وقت نہیں دے سکتی۔ اگر فرصت مل جائے تو اتنا ہی کام اور مل سکتا ہے۔ حتیٰ کہ دوستوں کے ساتھ گزارنے کے لیے ایک شام تو کجا اس کے پاس آرام اور اپنے محبوب کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ اسی وقت کے لیے وہ گزشتہ بیس برسوں سے رات دن محنت کرتی آئی ہے۔ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی ڈیمانڈ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ ہر کام کرنا چاہتی ہے۔

122

ماہنامہ سرگزشت

تھی۔ معلوم ہوتا تھا، بچے اور بوڑھے سب نے سوچ رکھا تھا کہ کٹ کر فنا ہو جانا، مغلوب ہونے سے بہتر ہے۔ شہر میں اتنی (80) ہزار آدمی تھے اور محاصرین کل تیس ہزار تھے مگر ہمارے پاس توپ خانہ تھا اور ہوشیارانہ نینتر تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جہاں قلعہ بندی ٹوٹی شہر مطیع ہو گیا۔ مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ قلعہ بندی ٹوٹنے کے بعد اصل جنگ شروع ہوئی تھی، ہر مکان قلعہ تھا۔ ہر سڑک میدان کارزار بنی ہوئی تھی۔ ہم ہر روز بہ مشکل تھوڑا تھوڑا انہیں پیچھے دھکیلتے، بارودی سرنگیں بچھا کر مکانات گراتے جاتے اور فوجی ٹھکانے برباد کرتے جاتے۔ اسی طرح آدھے سے زیادہ شہر برباد ہو چکا تھا مگر ابھی آدھا باقی تھا اور یہ پہلے سے زیادہ دلیری اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ گرجا اور خانقاہیں باقی رہ گئی تھیں۔ ان کی دیواریں ہمارے راستے میں حائل تھیں جو سنگ و آہن کا مرکب تھیں اور انہیں ہٹانا آسان کام نہ تھا۔ میں ان حالات میں وہاں داخل ہوا۔ میں آپ کی یہ بات مانتا ہوں کہ رسالہ محاصرے میں زیادہ کارآمد نہیں ہوتا مگر میں نے یہ خیال باطل کر دکھایا۔ ہماری فوج کا کمپ شہر کے جنوب میں تھا، اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ آگے کی طرف رہنے والے ہتھی سپاہیوں کو اور آگے بھیج کر یہ معلوم کرائے کہ کوئی اور ہتھی سپاہ تو کسی طرف سے ان پر چڑھائی نہیں کر رہی ہے؟ رجسٹ کا کرٹل سپاہیانہ ذوق کا آدمی نہ تھا اس لیے رجسٹ کی پوزیشن اس وقت کچھ بہتر نہ تھی مگر بعد میں اس نے خوب نام پایا۔ اس روز شام کو میں نے وہاں کے جو حالات دیکھے۔ ان سے بڑا افسوس ہوا کیونکہ کچھ بھی ہو فکر و خیال کے اعتبار سے میں ان سب سے اعلیٰ شخص تھا۔ کمپ کی بے ترتیبی، لاغر، میلے اور ست رفتار گھوڑے دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس رات میں نے چھبیس ہم سر نو جوانوں کے ساتھ کھانا کھایا اور یہ خیال کر کے دل میں پچھتا تا رہا تھا کہ کیوں میں نے جوش میں آکر ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ جرمنی کے محاذ پر تو ہم نے بہت بہتر انتظام کیا تھا مگر یہاں کا انتظام بہت ناقص ہے۔ میرے اس اعتراض کے بعد میں میں خاموش طاری ہو گئی تھی۔ ان کی ترچھی نظروں سے میں نے محسوس کر لیا کہ یہ میری عاقبت نااندیشی کا نتیجہ ہے، خاص طور پر کرٹل نے اس بات کو محسوس کیا۔ ایک بڑا میجر جس کا نام اولیویر تھا اور جو رجسٹ میں آگ بگولا مشہور تھا۔ وہ میرے مقابل بیٹھا ہوا اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو ٹل دے رہا تھا اور میری طرف ایسے گھور رہا تھا گویا وہ مجھے کھائے بغیر نہ چھوڑے

کا مگر میں نے اس کا یہ رویہ زیادہ محسوس نہ کیا کیونکہ میں اپنی بے وقوفی پر خود تادم تھا اور یہ خیال کر رہا تھا کہ اگر کسی افسر سے آج پہلے ہی دن کی شام کو جھگڑا ہو گیا تو بہت بُرا ہوگا اور اس کا اثر صرف میری ذات پر پڑے گا۔

آخر کار ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غلطی سراسر میری ہی تھی کہ جو بات نہ کہنے کی تھی وہ کیوں کہہ دی۔ جب کھانا کھا چکے تو کرٹل صاحب اور دیگر افسران کمرے سے باہر چلے گئے۔ اس میس کی جگہ پہلے کسی زمیندار کا فارم ہوگا۔ اب کمرے میں ایک درجن سے کم آدمی رہ گئے تھے۔ اپنی شراب سے بھری ہوئی ایک مشک کمرے میں لائی گئی، اسے دیکھ کر ہم لوگ بہت خوش ہوئے، خوب مست ہوئے، اسی اثنا میں میجر اولیویر نے مجھ سے جرمنی کی فوج کے متعلق کچھ سوالات کیے اور میں نے اس معرکے میں جو غیر معمولی خدمات انجام دی تھیں ان کے متعلق دریافت کیا۔ جب شراب کا نشہ ذرا رنگ لایا تو میں نے بھی قصے میں قصہ جوڑنا شروع کر دیا۔ عزیز من! یہ کوئی غیر فطری چیز نہ تھی۔ میں اپنے سن و سال کے اعتبار سے فوج میں ہر ایک افسر کے لیے نمونہ تھا۔ میں بہترین شمشیر زن تھا، شہسوار تھا تقریباً ایک سو معرکوں کا ہیرو تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے اپنے آپ کو غیر معروف ہی نہیں بلکہ تالائق محسوس کیا۔ کیا یہ غیر فطری چیز نہ تھی۔

انہیں یہ بتادینا ضروری تھا کہ ان کے درمیان کسی لیاقت اور قابلیت کا آدمی آیا ہوا ہے؟ میں ان کی ہر سرت اور خوشی پر واہ واہ کہتا اور ان کے ہر نعرہ تحسین کی داد دے رہا تھا۔ یہی میرے لیے مناسب تھا۔ ان پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آج کی شب جو شخص ان میں شامل ہوا ہے وہ ایک اونچے مزاج کا آدمی ہے جس کا نام جیرارڈ ہے، لائسن کا ہیرو، جیتا کا قانع، یہی وہ شخص ہے جس نے آسٹریلیا کا چودہ توڑا تھا۔ یہ سب تو وہاں دُہرائے فصول تھا مگر میں نے کم از کم وہ مشہور واقعات بیان کر دیے ضروری سمجھے جن کے ذریعے میں نامور شخص سمجھا جاسکتا تھا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، میں کہتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے دریائے ڈینیوب میں اپنی فوج کو ایک خاص ترکیب سے دریا کے پار اتارنے میں اس کی رہبری کی تھی۔ میں یہ واقعہ ابھی سنائی رہا تھا کہ اچانک ان سب نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں اچھل پڑا، حیران ہو گیا۔ میں شرم اور غصے سے مرجھا کر اپنے بیروں کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا میں ان کی نظروں میں محض ایک جتنی خور اور جھوٹا آدمی تھا۔

کچھ توقف کے بعد میجر نے کپتان پلٹین سے دریافت کیا "کیوں..... کپتان، کیا آپ کو معلوم ہے مارشل لیننبر ابھی تک فوج میں موجود ہیں؟"

"ہاں جناب! وہ ابھی موجود ہیں۔"

دوسرے نے کہا "میرے خیال میں کپتان جیرارڈ کے آجانے کے بعد ان کی موجودگی چنداں ضروری نہیں۔"

پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگا۔ میں ان کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہنستے ہوئے کسی کی آنکھیں بھی جاری تھیں اور کسی کا منہ میڑھا ہوا جا رہا تھا۔ اولیویر کی مونچھوں کے بال سور کی گردن کے بالوں کی طرح کھڑے تھے۔ پلٹین کا پتلا حقیر چہرہ ہنسی کے مارے سڑ کر کچھا ہوا جا رہا تھا۔ یا خدا، کیسی بے آبروئی ہوئی۔ بہ ظاہر میں برف کی طرح ٹھنڈا اور ساکت تھا مگر بہ باطن آگ بگولا تھا۔ میں نے فضا بدلنے کے لیے میجر سے دریافت کیا۔

"کیوں میجر صاحب! رجسٹ میں پریڈ کے اوقات کیا ہیں؟"

"کپتان جیرارڈ، مجھے یقین ہے آپ ہمارے اوقات میں تبدیلی نہ فرمائیں گے۔" میجر نے جواب دیا۔ پھر ایک بے ساختہ قہقہہ پڑا، میں خاموش سا ہر ایک کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا جب ذرا سکون ہوا تو میں نے تیز لہجے میں کپتان پلٹین سے دریافت کیا "مجلس مشاورت کس وقت ہوتی ہے؟"

ابھی اس کی زبان سے کوئی معینہ خیر جملہ نکلنے ہی والا تھا کہ میری کڑوی نظروں نے اسے روک دیا۔ اس نے جواب دیا "چھ بجے!"

میں نے کہا "آپ کا شکریہ!" اس کے بعد میں نے اس کمپنی کا جائزہ لیا۔ چودہ افسران تھے جن سے مجھے نمٹنا تھا۔ ان میں دو لڑکے بھی شامل تھے جو کم سن تھے اور حال ہی میں سینٹ سائرس آئے تھے۔ میں نے ان کی حماقت نظر انداز کر دی۔ اب رہ گئے دو میجر، چار کپتان اور سات لیفٹیننٹ، میں نے ہر ایک کو غور سے دیکھا اور پھر کہا۔

"معززین، میں اپنے آپ کو اس نیک نام رجسٹ کا اہل نہیں پاتا اور نہ میں آپ لوگوں سے اس گستاخانہ برتاؤ کی صفائی یا معذرت کا خواہاں ہوں جو میرے ساتھ کیا گیا ہے۔ بس آپ اس کے ذمے دار ہیں، میں آپ سب کو سبق دے لیئر نہ رہوں گا اور آپ کا کوئی حیلہ بہانہ چلنے نہیں دوں گا۔ اگر اوکرم آپ تیار ہو جائیے۔"

حاضر جوابی

حضرت خواجہ حسن بھڑی (110521ء) فرماتے ہیں کہ ایک شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ صبح روشن کیے جا رہا ہے۔ میں نے اس کو روک کر پوچھا "بیٹے! تم بتا سکتے ہو کہ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے؟"

میرا سوال سنتے ہی بچے نے ایک لمحے توقف کیا پھر فوراً ہی پھونک مار کر شمع گل کر دی اور مجھ سے کہنے لگا۔

"آپ مجھے بتائیے کہ روشنی کہاں چلی گئی؟ تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔"

آپ فرماتے ہیں کہ یہ جواب سن کر میں لا جواب ہو گیا۔

انتخاب: اظہر جہیل صدیقی، کراچی

"آپ کو اس کام میں ذرا بھی وقت نہ ہوگی، میں تیار ہوں۔ میں اپنی فوج نمبر 5 کے نام پر چم ہلاتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ آپ کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں، میں آپ کی ہر طرح کی سہولتیں کر دوں گا۔" میجر نے کہا۔

"آپ کا شکریہ! مگر میرا چیلنج ان تمام حاضرین کے لیے ہے جو میرے اظہار خیال پر ہنسے تھے۔" میں نے طعنیہ انداز میں کہا۔

"پھر آپ کس سے لڑیں گے؟" کپتان پلٹین نے دریافت کیا۔

"آپ سب سے۔" میں نے جواب دیا۔

انہوں نے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ سب اٹھے اور پیچھے کی طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں ان کی بڑبڑاہٹ اور کھسکھس پھر سناتا رہا۔ وہ ہنس رہے تھے اور اس وقت تک مجھے محض جتنی خور بچھ کر میرا معینہ اُزار ہے تھے۔ پھر وہ کمرے میں واپس آ گئے۔

"اگرچہ آپ کی خواہش غیر واجب ہے مگر منظور کر لی جائے گی۔ آپ یہ ڈویل کس طرح لڑنا چاہتے ہیں؟ شرائط بھی آپ خود ہی تجویز کر دیں۔" میجر اولیویر نے کہا۔

"قتلوار سے، اور آپ میں سے جو لوگ بڑے عہدے دار ہیں ان سے پہلے لڑوں گا۔ ابتدا میجر اولیویر سے ہوگی، صبح ساڑھے پانچ بجے یعنی اسبلی بگل بجنے سے پہلے ہر ایک

طرح اس ذخیرے میں آگ لگادی جائے تو ہمارے لیے راستہ صاف ہے۔“
”میں وہاں کس طرح پہنچ سکتا ہوں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں آپ کو ابھی بتاتا ہوں۔ اس شہر میں ہمارا ایک فرانسیسی ایجنٹ ہے، اس کا نام ہوبرٹ ہے، یہ بہادر شخص ہمیں اندر کی خبریں بھیجتا رہتا ہے۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح سویرے میگزین اڑا دے گا مگر آج دو دن گزر گئے، دو ہزار بہادر سپاہیوں کا طوفانی دستہ دو دن سے منتظر کھڑا ہے کہ کب دیوار میں شکاف ہو اور کب وہ شہر پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ آخر اسے ہوا کیا؟ دو دن سے نہ کوئی دھماکا ہوا نہ اس نے کوئی پیغام بھیجا ہے۔“
”آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں وہاں جا کر اس سے ملوں۔“

”بالکل پتا کرنا ضروری ہے کہ وہ بیمار ہے، زخمی ہے یا بدقسمتی سے مارا گیا ہے۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ہم اس کے منتظر ہیں یا دوسری جگہ سے حملہ کریں، جب تک ہمیں اس کی طرف سے کوئی خبر نہ ملے، ہم دوسرا قدم نہیں اٹھا سکتے۔“ وہ کچھ دیر دیر کے لیے رکا پھر سانس لے کر بولا ”دیکھو جیرارڈ! یہ شہر کا نقشہ ہے۔ تمہیں اس میں یہ عبادت خانے اور خانقاہوں کا حلقہ دکھائی دیتا ہے نا، اس کے ساتھ ہی یہ بہت سی سڑکیں ہیں۔ یہ اس بڑی سڑک کی شاخیں ہیں جو مرکزی اسکوائر سے گرجا گھر کو جاتی ہے۔ تم جب اس چوک پر پہنچ جاؤ گے تو اس سڑک کے ایک کونے میں گر جاؤ گے۔ اسی کونے پر نیٹ ٹولینڈ اسٹریٹ ہے، اس سڑک پر گر جاؤ گے جاتے ہی دابنے ہاتھ پر ایک موپدی کی اور دوسری شراب کی دکان ہے۔ ان کے بیچ میں ایک چھوٹا سا مکان ہے جس میں ہوبرٹ رہتا ہے۔ میں نے یہ جو کچھ کہا تم سمجھ گئے نا؟“

”بالکل جناب! آپ کی باتیں خاصی دلچسپ ہیں۔“
”تمہیں اس مکان پر پہنچ کر ہوبرٹ سے ملنا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا اس کی تجویز ابھی قابل عمل ہے یا ہم اسے متروک سمجھیں؟“

پھر اس نے مجھے ایک پلندہ دیا جو ایک میلے کپلے فلائین کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کہا ”لو یہ فرانسیسی درویش کی گدڑی ہے، یہ نہایت کارآمد بھی ثابت ہوگی۔“
میں نے گدڑی لینے سے پرہیز کیا اور کہا ”اے ہمکن کر تو میں جاسوس معلوم ہونے لگوں گا۔ میں اپنی وردی میں جاؤں گا۔“

”ناممکن ہے یہ، بھلا شہر کی سڑکوں سے تم کس طرح گزر سکو گے؟ یاد رکھو اسپین والے دشمن کو قیدی بنا کر نہیں رکھتے، تم جس لباس میں پکڑے جاؤ گے اس کے مطابق تمہارا حشر ہوگا۔“

یہ بات اس نے ٹھیک کہی تھی۔ میں کافی عرصے اسپین کے نواح میں رہ چکا ہوں، مجھے خود معلوم تھا کہ وہاں قیدی کا انجام موت سے زیادہ دردناک ہوتا ہے، میں سرحد تک ان کے مظالم کی داستانیں سنتا چلا آیا تھا۔ میں نے فرانسیسی سادھو کا لباس پہن لیا اور کہا ”اب میں تیار ہوں۔“

”تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”میرے پاس تلوار ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا وہ لوگ اس کی کھڑکڑاہٹ سن کر چونکے گئے نہیں؟ یہ چاقو اور تلوار ہمیں چھوڑ دو۔ ہوبرٹ سے کہنا کل۔۔۔ علی الصباح چار بجے ہمارا طوفانی دستہ تیار رہے گا۔“ وہ پھر کچھ دیر کے لیے رکا۔ ادھر ادھر نظریں گھما کر بولا۔ ”یہاں سے باہر جاتے ہی تمہیں ایک سارجنٹ ملے گا جو تمہیں شہر میں داخل ہونے کا طریقہ بتائے گا، اچھا خدا حافظ!“

کمرے سے باہر نکلنے وقت میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دونوں جرنیل سر جوڑ کر نقشے پر جھکے ہوئے تھے اور ان کی ٹوپوں کے پسندنے مل مل کر آپس میں گھلے رہے تھے۔ میں نے سوچا یہ ابھی قال ہے۔ میں دروازے پر آیا، دیکھا ماتحت انجینئر افسر میرا منتظر کھڑا تھا۔ میں نے اپنے خرقے کا کمر بند باندھا۔ فوجی ٹوپی اتار کر قلندرانہ کفن سر سے لپیٹ لیا۔ سواری کے پوٹوں سے کانٹے علیحدہ کیے اور خاموشی سے اپنے رہبر کے ساتھ ہولیا۔

دیواروں پر اسپینی سنتریوں کی لائن لگی ہوئی تھی، وہ ہماری اگلی چوکیوں پر متواتر فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم دونوں ان سے بچتے ہوئے برباد شدہ دیوار کے بلے پر چڑھتے اترتے ایک بڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے آ کر ٹھہرے۔ سارجنٹ رک گیا اور اس نے کہا۔

”ادھر چڑھنے کے لیے یہ درخت بہت اچھا ہے، ڈنڈوں کی میزمری بھی اس کے مقابلے میں کمتر ہوگی۔ بس چڑھ جاؤ، اوپر جا کے تم چھوٹی والی ڈال پکڑ کر آسانی سے مکان کی چھت پر اتر سکتے ہو۔ اس کے بعد تمہارا محافظ فرشتہ تمہاری رہبری کرے گا۔ اس سے زیادہ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا، خدا حافظ۔“

میں بھاری خاکی گون کمر میں اڑس کر سارجنٹ کی ہدایت کے مطابق آہستہ آہستہ ایک شاخ سے دوسری پر

اُچھلتا ہوا اوپر چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ چوٹی کے قریب جا پہنچا۔ چھت کی کالی منڈیر سامنے نظر آرہی تھی، اوپر تاروں بھرا آسمان تھا۔ اب مجھے ایک مضبوط تہنی کی تلاش تھی جس کے ذریعے میں دیوار پر پہنچ سکتا مگر یہاں تک کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ میں ساکت ہو کر سننے سے چٹ گیا۔ ایک آدمی چھت پر جھکا جھپکا میری طرف آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والی بندوق تھی۔ اس کا انداز مشکوک اور خطرناک تھا۔ وہ ایک جگہ رکا اور پھر چلا، یہاں تک کہ وہ میرے قریب صرف چند گز کے فاصلے پر آ گیا اور فصیل کے کنارے پر گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا پھر اس نے گولی چلا دی۔

میری کہنی میں سخت کمر و نچ آئی تھی اور میں درخت سے نیچے گرتے گرتے بچا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے اس نے یہ فائر مجھ پر نہ کیا ہو بلکہ کسی دوسرے کو نشانہ بنایا ہو، اس وقت درخت کے نیچے سے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا کہ فائر کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس نے سارجنٹ کو تازہ لیا تھا جو درخت کے نیچے کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسپینی نے اس غریب کو نشانہ بنایا تھا۔ آپ خیال کریں کہ اس نے اندھیرے کے باوجود ٹھیک نشانہ لگایا اس لیے کوئی اچھا نشانہ نہیں ہوگا۔ نہیں، یہ لوگ قرائیں استعمال کرتے ہیں جس میں گولی کی بجائے چھوٹے چھوٹے دھات کے کپڑے اور چھترے وغیرہ بھرے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسی ہی آسانی سے مار سکتے ہیں جس طرح میں درخت کی تہنی پر بیٹھے ہوئے تیز کو گولی مار سکتا ہوں۔

اسپینی اب تک جھکا ہوا اندھیرے میں نیچے جھانک رہا تھا کہ یکبارگی نیچے سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی مرتے وقت کراہتا ہے، اسپینی نے ادھر ادھر دیکھا، کوئی کھٹکنا نہ تھا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ نیچے جا کر جلدی سے اس بدقسمت فرانسیسی کا کام تمام کر دے یا اس کی جامہ تلاشی یعنی مقصود ہوگی کہ شاید کوئی مطلب کی چیز اس کی جیب سے برآمد ہو سکے غرض جو بھی اس کی منشا ہو۔ اس نے اپنی بندوق وہیں چھت پر ڈالی اور خود جھکا جھکا آگے بڑھا اور ایک تہنی پکڑ کر درخت پر جمبول گیا۔ میں نے فوراً اپنا چاقو اس کے جسم میں پیوست کر دیا۔ وہ درخت کی شاخوں میں جھجھڑاتا ہوا دم سے زمین پر جا گرا۔ زخمی سارجنٹ نے بھی اپنا بدلہ لینے میں دیر نہ کی کیونکہ میں نے کشتہ کشتا ہونے اور فرانسیسی زبان میں ایک دو قسمیں کھانے کی آوازیں سنیں۔

میں نے چند منٹ تک توپنے کی جرأت نہ کی، اس خیال سے کہ اس آواز پر ضرور کوئی آئے گا مگر ہر طرف خاموشی تھی۔

میں ٹھنڈوں سے رہینگا ہوا چھت پر پہنچا۔ اسپینی کی بندوق وہاں بڑی تھی مگر وہ بیکار تھی اس لیے کہ بارود کی پکی اس کی پٹی میں تھی۔ میں نے بندوق اٹھا کر نیچے پھینک دی، اس خیال سے کہ اگر دشمن کا کوئی آدمی اسے یہاں پڑے ہوئے دیکھے گا تو ضرور خیال کرے گا کہ یہاں کوئی واقعہ ہوا ہے۔ پھر میں نے چھت سے نیچے اتر کر شہر میں داخل ہونے کی ترکیب سوچی اور ادھر ادھر راستہ تلاش کیا۔ مجھے یقین تھا کہ جس راستے سے سنتری چڑھ کر اوپر آیا تھا۔ اس راستے سے میں نیچے اتر کر شہر میں پہنچ سکتا ہوں، بس وہی راستہ مناسب ہوگا۔

اچانک ”مینولو۔۔۔ مینولو“ پکارنے کی آواز ابھری پھر ایک سایہ ساد کھائی دیا جیسے کوئی جھکا جھکا چور دروازے سے نکل کر چاندنی میں چھت پر آ رہا ہو۔ میں نے فور سے دیکھا تو ایک داڑھی والا نظر آیا۔ جب وہ نیچے چھت پر چاندنی میں آ گیا تو تین اور زرد پوش سپاہی اس کے ساتھ آ کر مل گئے۔ میں نے بندوق چھت سے نیچے پھینک دی تھی ورنہ ضرور راز فاش ہو جاتا۔ جب انہیں سنتری کا کوئی پتا نہ چلا تو انہوں نے خیال کیا وہ ضرور چھت سے نیچے کی طرف چلا گیا ہے۔ وہ سب واپس ہوئے اور بڑھتے چلے گئے پھر کچھ ٹھہر کر میں چور دروازے کی طرف بڑھا، کواڑ کھلا ہوا تھا۔ میں زینے سے اتر کر اندر پہنچا۔ مکان قطعی خالی تھا، میں اس کے درمیان سے گزر کر سامنے کے کھلے ہوئے دروازے سے سڑک پر آ گیا۔

یہ ایک تنگ گلی کی ٹوٹی پھوٹی سڑک تھی جو آگے جا کر چوڑی سڑک سے مل گئی تھی۔ جگہ جگہ آگ کی ڈھیریاں اور جلنے کے نشانات تھے، سپاہی اور دہقان پڑے سو رہے تھے، شہر میں اس درجے نقصان پھیلا ہوا تھا کہ انسان کا زندہ رہنا محال تھا۔ محاصرے کو ایک ماہ سے زیادہ گزر چکا تھا۔ غلامظنون کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جا بے جالائیں پڑی سڑکیں تھیں۔ لوگوں کو صفائی اور تدفین کی مہلت ہی نہ تھی۔ یہاں بہت سے لوگ ادھر سے ادھر آگ تاجتے پھر رہے تھے، ان میں سے بعض لوگ قلندر یا فقیر قسم کے بھی نظر آئے۔ انہیں بے روک ٹوک چلتے پھرتے دیکھ کر میرے دل کو ڈھارس ہوئی اور میں جلدی سے بڑے چوک کی طرف چل دیا۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے آگ تاجتے رہے تھے۔ اتفاقاً ایک شخص نے اٹھ کر میری آستین پکڑ لی اور مجھے روک لیا پھر ایک عورت کی طرف اشارہ کیا جو بے حس و حرکت سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مر رہی ہے اور یہ شخص مجھ سے عیسائی مذہب کے دستور کے مطابق دعا و حلف کے لیے کہہ رہا ہے۔ میں نے عورت کے حق میں چند دعائیں کلمات استعمال کیے اور دستار

قلندری اس کے سینے تک جھکا دی۔ اس کے بعد میں نے اپنا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھایا اور آگے کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے میری آستین چھوڑ دی اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میں متیقانہ انداز سے اپنے راستے پر روانہ ہو گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ سڑک سیدھی شہر کے اندر جائے گی جہاں فوجی دستے ہوں گے۔ شہر مشعلوں اور روشنیوں سے جگمگا رہا ہوگا۔ میں تیزی سے سڑک پر بڑھتا چلا گیا۔ راستے میں ایک دو آدمیوں نے ہنگ آمیز کلمات کہہ کر مجھے مخاطب کرنا چاہا مگر میں ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر گرجا والی سڑک سے تیزی کے ساتھ گزرتا ہوا چلا گیا۔ اب میں شہر کی اس سمت میں تھا جو ہمارے حملے سے کافی فاصلے پر تھی، وہاں کوئی فوجی کیمپ نہیں تھا۔ ایک کھڑکی سے اتفاقیہ کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔

جس مکان کا مجھے پتا دیا گیا تھا، اسے تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ مکان وہیں سوچی کی دکان اور شراب خانے کے درمیان واقع تھا۔ اس میں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی، دروازہ بند تھا۔ تاہم میں نے چٹنی کھولنی چاہی تو وہ کھل گئی، میں نہیں سمجھتا تھا کہ مکان میں کوئی ہوگا۔ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے چاروں طرف ٹٹولنا شروع کیا۔ میرا ہاتھ ایک میز کے کنارے سے لگا، میں خاموش کھڑا رہا کہ اب کیا کروں؟ ہو برٹ کو کس سے اور کس طرح معلوم کروں؟

اس وقت میں جس مکان میں تھا وہاں ذرا سی غلطی سے جان جانے کا خطرہ اور مشن کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے وہ تنہا نہ رہتا ہو، کسی ایسی خاندان کے ساتھ شراکت میں رہتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میری اور اس کی ملاقات سے ہم دونوں ہی کی جان خطرے میں پڑ جائے، میں مسلسل سوچے جا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کبھی ایسا پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میرے کان میں گھس پھسکی سی آواز آئی، مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میری رگوں کا خون سرد ہو کر جم گیا ہو۔

”مان ڈیو..... مان ڈیو.....“ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی جان کنی کے وقت کسی کو پکارتا ہے پھر اس اندھیرے میں کسی نے سسکی بھری پھر وہی خاموشی طاری ہو گئی۔ اس خوفناک سی آواز نے مجھے لرزادیا تھا مگر یہ لرزش کچھ امید دلارہی تھی کہ بولنے والا فراموشی تھا۔

”تم کون ہو؟“ ہمت کر کے میں نے پوچھا مگر گنگٹانے کے سوا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔

”موسیو ہو برٹ، کیا تم ہو؟“ میں نے اس سے

دریافت کیا۔

”ہوں۔“ ایک آہ بھری۔

آواز اس قدر دھیمی اور آہستہ تھی کہ میں اس سنائے میں مشکل سے سن سکا۔

”پانی..... خدا را..... پانی!“

جس طرف سے یہ آواز آئی تھی، میں اس طرف بڑھا اور دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے کراہنے کی آواز سنی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہونہ ہو یہ آواز میرے سر کے اوپر سے آرہی ہے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ پاؤں پھیلا کر اوپر ٹٹولا مگر خالی ہوا کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔

”تم کہاں ہو؟“ میں نے یہ آواز بلند پوچھا۔

”یہاں.....“ نہایت کچکپائی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ دیوار پر پھیرنے شروع کیے، یکبارگی میرے ہاتھ کسی برہمنہ شخص کے پیروں سے جا ملے جو میرے سر سے اونچے تھے اور کسی چیز پر نکلے ہوئے بھی نہ تھے۔ میں یکدم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور چھتاق کی ڈبیا جیب سے نکال کر روشنی کی، پہلے ہی شعلے میں ایک آدمی ہوا میں تیرتا ہوا دکھائی دیا، گھبراہٹ کی وجہ سے ڈبیا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی، میں نے مشکل سے کاہنتی ہوئی انگلیوں سے ڈبیا اٹھائی اور پھر پتھری اسٹیل پر ماری۔ اس دفعہ میں نے موم جتنی جلائی تھی۔ اسے اوپر اٹھا کر جو دیکھا تو خوف و ہراس کی کوئی انتہا نہ رہی، ایک آدمی کو میٹھیں ٹھونک کر دیوار پر لٹکا دیا گیا تھا۔ جیسے کھلیان کے دروازے پر بندے کو کیلوں سے جڑ دیتے ہیں۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں موٹی موٹی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ بے چارہ، بد قسمت، اس وقت نزع کے عالم میں تھا۔ اس کا سر کاٹ دھڑک رہا تھا اور کالی خشک زبان ہونٹوں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کے لیے پیاس کی شدت زخموں کی تکلیف سے کم نہ تھی جو اس کی موت کے باعث ہو سکتی تھی۔ ان درندہ صفت انسانوں نے سونے پر سہاگہ یہ کیا تھا کہ اس کے سامنے میز پر شراب کا بھرا ہوا بیکر رکھ دیا جو اس کی تکلیف میں ایک اور اضافہ تھا۔ میں نے میز چھتی اور اس پر کھڑا ہو گیا پھر جگر اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس میں نکلنے کی طاقت ابھی باقی تھی۔ اس کی دھندلی آنکھوں میں روشنی آگئی اور آہستہ سے گنگٹا کر کہا۔

”کیا تم فراموشی ہو؟“

”ہاں، مجھے ان لوگوں نے تمہارا حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔“

”میرا راز فاش ہو گیا تھا، اس لیے انہوں نے میرے

ساتھ یہ سلوک کیا۔ میں اب نہیں بچوں گا۔ مرنے سے پہلے میں وہ باتیں تمہیں بتا دیتا چاہتا ہوں جو مجھے معلوم ہیں۔ ہلدی سے ذرا سی شراب اور دو مہربانی، جلدی کرو، میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ آہ.....“ وہ کراہا..... میری تمام طاقتیں اب جواب دے چکی ہیں، میں جو کہتا ہوں وہ سنو، بڑی ماں کے کمرے میں بارود کا ذخیرہ ہے، مگر جا کے سامنے چھوٹی ماں سسرال بھلس کی کونھری ہے، وہاں دیوار کے ایک سوراخ میں لپٹے کا برا ہے جس کا سلسلہ بارود تک ہے، دو دن گزر گئے، یہ کام تیار ہو چکا تھا لیکن انہوں نے ایک خط پکڑ لیا جس کی وجہ سے مجھے سولی دے دی گئی۔“

”یا خدا! تم دونوں سے یہاں لٹکے ہوئے ہو؟“

”میرے رفیق! معلوم ہوتا ہے، دو سال گزر گئے، کیا میں نے اپنے وطن فرانس کے لیے یہ خدمت انجام نہیں دی؟ بس اب ایک خدمت تم میری کرو، میرے دل پر بھرجا مارو تاکہ میری تکلیف جلد ختم ہو جائے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں اس کی۔ میں تمہاری خوشامد کرتا ہوں۔“

درحقیقت وہ علاج و معالجے جیسی شے سے مایوس ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس وقت سب سے بڑی ہمدردی کا عمل وہی ہو سکتا تھا جو اس کی التجا تھی مگر اس قسم کے سرد خون سے چاتو آلودہ کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے سوچا اگر اس حال میں اس کی جگہ میں ہوتا اور اس طرح کے رحم کی درخواست کرتا تو.....؟

فورا خیال آیا کہ میری جیب میں ایک ایسی چیز ہے جس سے فی الفور موت واقع ہو سکتی ہے۔ یہ چیز میں نے اپنے نازک وقت کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ اس وقت مجھ سے زیادہ اس کا مستحق یہ لاچار ہے، جس نے درحقیقت ملک اور قوم کی ایک اعلیٰ خدمت انجام دی ہے، میں نے جیب سے چھوٹی سی قیشی نکالی اور وہ چند قطرے جو اس میں تھے، شراب کے پیالے میں جھاڑ دیے اور اوپر اٹھا کر اسے دینا چاہا تھا کہ دروازے پر ہتھیاروں کی جھنجھاٹ سنائی دی۔

میں نے ردی کل کردی اور کھڑکی کے پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور دو اپنی کمرے میں داخل ہوئے، ان کے چہرے خوفناک اور کالے تھے، وہ شہری لباس پہنے کاغذوں پر بندوبست رکھے ہوئے سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لائین تھی، میں پردے کی مہربوں سے ان کی ہر حرکت دیکھ رہا تھا اور یہ خیال کر کے ڈر رہا تھا کہ کہیں میرا سراغ نہ مل گیا ہو مگر پھر یقین ہو گیا کہ وہ محض میرے بد قسمت ہم وطن کا آخری نظارہ کرنے آئے

ہیں، جس شخص کے ہاتھ میں لائین تھی، اس نے ہاتھ اونچا اٹھا کر لائین سرتے ہوئے آدمی کے سامنے کی، پھر دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

لائین کی روشنی میں قریب ہی رکھے ہوئے پیالے پر ان کی نظر پڑ گئی۔ ایک شخص نے پیالہ ہاتھ میں اٹھا کر مجبور اور لاچار ہو برٹ کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ ہو برٹ نے پینے کے لیے گردن آگے بڑھائی تو اس نے پیالہ پیچھے ہٹا لیا اور خود ایک لمبا گھونٹ لے کر پیٹ میں اٹار لیا مگر فوراً ہی اس نے ایک نیچ ماری۔ دونوں ہاتھوں سے گلا پکڑ لیا اور مٹی کے ڈھیلے کی طرح زمین پر گر پڑا۔ دوسرے شخص نے جب اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا اٹھا اور خوف زدہ ہو کر دیواروں کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اس کے سڑک پر دوڑتے قدموں کی آوازیں سنتا رہا، کچھ فاصلے پر جا کر آواز آنا سوتوف ہو گئی۔

پردے کے پیچھے سے نکل کر میں نے دیکھا کہ وہ لائین میز پر گر گئی ہوئی، جل رہی تھی جو اپنی چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اس کی روشنی میں دیکھا کہ ہو برٹ کا سر کاٹ دھڑک رہا تھا۔ شراب کے سینے پر آگیا تھا گویا اس کا دم نکل چکا تھا۔ شراب کے پیالے تک ہونٹ بڑھانے کی یہ اس کی آخری کوشش تھی۔

کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک کے علاوہ غلطی خاموشی تھی۔ دیوار پر میرے فرانسیسی دوست کی خمیدہ ڈراؤنی شکل لٹک رہی تھی اور فرش پر میرے اپنی دشمن کی بے جس و حرکت لاش پڑی تھی۔ دورخی لائین کی دھندلی روشنی میں یہ منظر اس قدر بیت ناک اور لرزہ خیز تھا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں نہ دیکھا تھا۔ دس ہزار مقتولوں کا میدان میں نے دیکھا تھا جہاں لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے مگر کبھی ایسا پریشان نہیں ہوا تھا جیسا اس وقت اس دھندلی روشنی میں تھا۔ میں کمرے میں دو شکلیں دیکھ دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔ میرے ایسا مضبوط اعصاب کا آدمی بھی حواس باختہ ہو گیا تھا۔ پھر میں بھی جھپٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا جیسے وہ اپنی اس اندوہناک مکان سے نکل کر بھاگا تھا۔ جب تک گرجا سامنے دکھائی دیتا رہا، میں برابر دوڑتا رہا..... یہاں تک کہ میں نے گرجا کی دیوار کے نیچے جا کر دم لیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر پکڑے وہاں کھڑا ہوا سانس درست کرتا رہا۔ جب میں وہاں کھڑا ہوا سانس ٹھیک کر رہا تھا تو میرے سر کے اوپر کی جانب گر جا کے گھنٹوں نے پیر شور صدا کے ساتھ دو بجائے۔ میں نے سوچا، چار بجے طوفانی لشکر کو اس جگہ حملہ کر دیتا ہے۔ اس لیے مجھے کل دو گھنٹے میں پورا کام انجام دینا تھا۔

گر جائے اندر سے منور نظر آ رہا تھا۔ بہت سے آدمی اندر باہر آ جا رہے تھے، اپنی تجویز بروئے کار لانے کا یہ اچھا موقع مجھے معلوم ہوا کہ یہاں مجھے کون پہچان سکتا تھا۔ میں بھی بے نیازی سے اندر داخل ہو گیا۔ ہر آدمی پہلی نظر میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ جگہ پناہ گاہ، اسپتال اور ذخیرہ گاہ کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔

گر جا کے بغلی گوشے میں سامان رسد بھرا ہوا تھا۔ دوسرے حصے میں بیماروں اور زخمیوں کے لیے گھاس وغیرہ کے بستر بچھے ہوئے تھے۔ محن کے وسط میں سیکڑوں مجبور، امانت اور بے کس لوگ کچڑ اور گارے میں کھانا پکا رہے تھے۔ کچھ لوگ اندر کی طرف عبادت میں مشغول تھے۔ میں بھی ایک قسم کی آڑ میں جا کر دوڑالو بیٹھ گیا اور دل سے اپنی خوش قسمتی پر شکر ادا کیا کہ اس مصیبت سے زندہ سلامت نکل آیا۔ میں نے دعا مانگی۔ ”یا خدا! آج کی رات میرے ہاتھوں وہ کام انجام پائے، جس سے میرا نام جرنی کی طرح اہلین میں بھی روشن ہو جائے۔ اے خدا! اپنے جبرارڈ کو شاد کام کر دے۔“

☆☆☆

تین بج رہے تھے، میں گر جا سے نکل کر میڈونا کی خانقاہ کی طرف چلا جہاں حملہ ہونے والا تھا۔ آپ نے غور فرمایا۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں جو یوں ہی کالوں کی طرح فراہمی کی کمپ واپس چلا جاتا اور پیر پورٹ کر دیتا کہ انوس ہے، ہمارا ایجنٹ مارا گیا۔ اس لیے شہر میں داخل ہونے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کیے جائیں، یہ اپنے وطن سے غداری اور بدعتی کے مترادف ہوتا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو، کسی نہ کسی طرح ہو رٹ کا نام ممکن کام پایہ تکمیل تک پہنچا کر رہوں گا ورنہ فوج میں ایک لائق اور دلیر سینئر کپتان کی جگہ خالی ہو جائے گی۔

میں بے روک ٹوک اس کھلے محن یا چوڑی سڑک سے گزر گیا جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس عظیم الشان عظیم خانقاہ میں آ گیا جو شہر کے بچاؤ کے لیے پشت پناہ بنی ہوئی تھی۔ یہ مرلح شکل کی عمارت تھی جس کے بچوں بچ ایک باغیچہ تھا۔ باغیچے میں سیکڑوں مسلح اشخاص کیل کانٹے سے لیس بیٹھے تھے، انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ فراہمی اس جگہ حملہ کرنے والے ہیں۔

اب تک جتنی لڑائیاں ہم نے لڑی تھیں ان میں سپاہ کا مقابلہ سپاہ سے ہوا تھا مگر اہلین میں پہنچ کر ہمیں پتا چلا کہ عوام سے لڑنا مشکل کام ہے، ذرا غور کیجئے اگر آپ نے مقابلے

میں ڈٹے ہوئے تیلی جنیوں کا جھوم یا سودا گروں یا مذہبی دیوانوں کا مشتعل جھوم زیر کر لیا تو کیا بہادری ہوئی؟ یہ کس قسم کی فتح کہلائے گی؟ دوسرے اس مقابلے میں خطرے کی بات یہ ہوتی ہے کہ عوام کی اصول کے پابند نہیں ہوتے، غم اور غصے کے جذبے سے مجبور ہو کر بالس، لگی، گنڈاسے، پتھر، گرز لے کر ہل پڑتے ہیں اور خواہ مخواہ مجروح کر ڈالتے ہیں۔ جب میں نے یہ بولگھوٹی مشتعل فوج خانقاہ کے باغیچے میں دیکھی تو غور کیا کہ ہمارا کام کس قدر مشکل اور عجیب تر ہے۔ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم سپاہیوں کا کام یہ نہیں ہے کہ سیاست میں زیادہ غور و فکر کریں اور اپنا دماغ پریشان کریں۔ اہلین کی جنگ تو شروع ہی سے عجیب ہے اور جبرارڈ عجیب و غریب قسم کے کاموں کو سرانجام دینے کے لیے فرانس میں پیدا ہوا ہے۔

بھلا اس قسم کے غور و فکر کا مجھے وقت کہاں تھا۔ باغیچے کی طرح خانقاہ میں بے روک ٹوک داخل ہونا ناممکن تھا۔ پہلے میں نے باغیچے کا ایک چکر لگایا، اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ ایک طرف ایک بڑی کھڑکی نظر آئی جس کے کواڑوں کے شیشے دھندلے تھے اور وہ گر جا سے ملحق تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے ہورٹ کا کہنا یاد آ گیا کہ بڑی ماں کا کمر اس جگہ کے قریب ہے جہاں بارود کا ذخیرہ ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کا قلیتہ بھی قریب ہی کے کسی کمرے میں ہوگا۔ مجھے کسی نہ کسی خانقاہ میں داخل ہونا چاہیے۔ دروازے پر گارڈ تعینات تھا، میں روک ٹوک کے بغیر اندر نہیں جاسکتا تھا مگر ایک فوری تجویز الہام کی طرح میرے دماغ میں آئی اور میں سمجھ گیا کہ کام اسی طرح بن سکتا ہے، باغیچے میں ایک کنواں تھا، اس کنوئیں پر بہت سے خالی ڈول رکھے ہوئے تھے، ان میں سے دو ڈول میں نے پانی سے بھر لیے اور دونوں ڈول لے کر دروازے پر پہنچا۔ کسی شخص کے دونوں ہاتھوں میں پانی سے بھرے ہوئے دو ڈول ہوں اور وہ انہیں لے کر اندر جا رہا ہو تو دیکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ اسی خدمت پر مامور ہوگا۔ سوال و جواب کی کیا ضرورت ہے۔ دربان نے دروازہ کھول دیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ اب میں اس راستے پر تھا جو سلیٹ کے پتھروں کی چوڑی چوڑی سڑکوں سے پنا ہوا تھا اور اس میں دائیں اور بائیں راہباؤں یعنی تارک الدنیا عورتوں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ میں بے پس و پیش بڑھتا چلا گیا کیونکہ میں نے پہلے ہی باغیچے میں سوچ لیا تھا کہ گر جا کی طرف چلنا ہے۔

کچھ اپنی سپاہی راستے پر کھڑے ہوئے تمباکو پی رہے

ھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے مجھے مخاطب کرنا چاہا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی مجھ سے دعا کے طالب ہوں گے، میں نے وہی دعائیہ کلمے جو مجھے یاد تھے۔ پڑھے اور ان پر دم کر دیا۔ وہ مطمئن سے ہو گئے۔ اس مقام سے گر جا قریب تھا۔ میں نے غور کیا اور سمجھ لیا کہ پہلی کوٹھری کے بعد دوسری کوٹھری میں بارود ہے، دروازے کے آگے زمین کچھ دور تک کالی ہو رہی تھی اور دروازے میں بڑا سا تالانگہ ہوا تھا۔

دوسری ایک دوسرے کے مقابلہ بند و قیس لیے کھڑے تھے، ان میں سے ایک کی ہتھی میں گئی آڑی ہوئی تھی، میں نے سوچا اگر یہ دوسرا سنتری نہ ہوتا تو زیادہ دیر نہ لگتی اور گئی میرے ہاتھ میں ہوتی۔ مگر دو آدمیوں کی موجودگی میں ایسا ہونا مشکل تھا۔ بارود کی کوٹھری سے دوسری کوٹھری گر جا سے متصل تھی۔ یہ ضرور سسٹر انجلس یعنی چھوٹی ماں کی ہوتی چاہیے، اس کا ایک کواڑ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دل مضبوط کر کے پانی کے ڈول راستے میں رکھ دیے اور اجازت کے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ کم از کم نصب درجن بپاک قسم کے اپنی اندر دکھائی دیں گے مگر امید کے خلاف میری آنکھوں نے کچھ اور ہی دیکھا۔ وہ کمر اقلتی طور پر ان تارک الدنیا عورتوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا جنہوں نے چند وجوہ کی بنا پر اپنا مسکن چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہاں میں نے تین عورتیں ایک طرف بیٹھی ہوئی دیکھیں۔ ان میں ایک بچے چہرے کی متعمر عورت تھی جو غالباً بڑی ماں ہوگی، اس کے علاوہ دو جوان اور خوبصورت عورتیں تھیں۔ میں داخل ہوا تو وہ سب کھڑی ہو گئیں، ان کے چہروں پر پریشانی اور گھبراہٹ تھی۔ میرا دماغ حاضر تھا۔ میں معاملے کی اصلیت تاڑ گیا۔ چونکہ خانقاہ پر حملہ ہونے والا تھا۔ اس لیے اصولاً انہیں دوسری جگہ منتقل کر دینا ضروری تھا، کچھ عجیب نہیں کہ وہ کسی ایسے حکم کی منتظر بیٹھی ہوں، اس لیے میرا ان کے پاس آنا توقع کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک عہد کے تحت ان دیواروں کے سائے میں رہتی چلی آ رہی تھیں اس لیے وہ اپنے مذہبی پیشوا کے حکم کے بغیر کوٹھریاں نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ میں نے تصویر ہی تصور میں عمل شروع کیا۔ دروازے پر نظر گئی تو دیکھا کہ گئی تالے میں پھنسی ہے۔ میں نے ان راہب عورتوں کو اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ذرا تامل کیا تو میں نے حکمتانہ انداز سے اپنا چہرہ زور سے زمین پر مارا اور انہیں فوراً باہر نکل جانے کا اشارہ کیا اور اشاروں ہی سے بتایا کہ وہ یہاں کی

نسبت گر جا میں زیادہ محفوظ رہیں گی۔ فرض وہ میرے پیچھے ہوئیں اور میں نے انہیں گر جا میں قربان گاہ تک پہنچا دیا۔ یہ جگہ بارود سے کافی فاصلے پر تھی۔ جب یہ تینوں تارک الدنیا عورتیں گر جا کی قربان گاہ تک پہنچ گئیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ ایک بڑا خطرہ راستے سے دور ہو گیا تھا۔

میں اکثر نازک موقعوں پر پیش آنے والے خطرات پہلے سے تاڑ جاتا ہوں۔ میں نے آخری نظر بڑی ماں کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی بڑی بڑی کالی چمک دار آنکھیں میرے دامن ہاتھ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے تعجب کا اظہار ہو رہا تھا اور چہرے سے شک کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس کی دو وجوہ تھیں، پہلی یہ کہ میرا دہاتا تھا اس سنتری کے خون سے سرخ ہو رہا تھا جسے میں نے درخت پر چاقو مار کر ہلاک کیا تھا۔ خیر یہ بات تو سمجھ سکتی تھی کیونکہ چاقو وغیرہ مارنا سارا گوسا میں اس وقت عام تھا اور وہاں کے پادریوں کی بہادری بھی مشہور تھی مگر میں اپنی بیچ کی انگلی میں ایک سونے کی انگشتری پہنے ہوئے تھا۔ یہ ایک جرمن نواب زادی کا تحفہ تھا جس کا نام میں یہاں ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ انگشتری اس وقت قربان گاہ کے یسب کی روشنی میں تیزی سے چمک رہی تھی۔ ایک درویش کے ہاتھ میں انگشتری کا ہونا ناممکنات میں سے تھا کیونکہ درویش لوگ انتہائی غربت کی زندگی بسر کرنے کی قسم کھا چکے ہوتے ہیں۔ میں یکدم پیچھے ہٹا اور تیزی سے گر جا کے دروازے کی طرف چلا مگر قند بیدار ہو چکا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑی ماں پیچھے ہٹ چکی تھی۔ میں دوڑ کر گر جا کے دروازے سے باہر نکل گیا اور خانقاہ کی غلام گردن پر ہولیا۔ مگر وہ چیخ کر کھڑے ہوئے سنتریوں کو مخاطب کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی ”اسے پکڑو۔“ خوش قسمتی سے اس وقت میرا دماغ حاضر تھا۔ میں نے بھی دوڑتے ہوئے سامنے کی طرف اشارہ کر کے چلنا شروع کر دیا۔ گویا ہم دونوں ایک ہی مقصد کے لیے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ میں دوسرے ہی لمحے میں کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گیا اور اندر سے بھاری دروازہ بند کر کے اوپر کی چٹنی لگا دی اور بھاری موصل کواڑوں کے بیچ میں اڑا دیا۔

اگر وہ ذہین ہوتے تو مجھے تباہ کرنے کے لیے بارود کی تلی دروازے کے پیچھے رکھ کر دروازہ اڑا سکتے تھے مگر خوش قسمتی سے یہ ترکیب انہیں سوچھی ہی نہیں۔ یہ آخری موقع تھا کیونکہ میں اب اپنی اس ”خطرناک مہم“ کی انتہائی اور آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس قدر مصائب اور آلام کے بعد اب میں سارا گوسا کے بارود کے قلیتے کی تلاش میں کبھی اُدھر تھا کبھی اُدھر

تھا۔ دشمن بمیڑیوں کی طرح قراغرا کر دروازے پر بند قوتوں سے ٹپ کے مار رہے تھے مگر میں ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ میں ہو برٹ کے کہنے کے مطابق بارود کا قلیتہ چاروں کونوں میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ قلیتہ ضرور بارود کے سامنے کی دیوار کے کسی سوراخ میں ہوگا۔ میں نے گھنٹوں کے بل رینگ رینگ کر ہاتھوں سے ٹولا، ناخنوں سے دیوار کی درزیں کریدیں مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اچانک دو گولیاں دروازے کے پار ہو کر دیوار پر آ کر لگیں۔ اب دھڑ دھڑ اور چھڑ چھڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی کی ڈھیری کی نظر آئی۔ میں خوشی سے اس کی طرف بڑھا لیکن وہ محض راکھ کا ڈھیر نکلا۔ میں لاچار پیچھے ہٹ کر ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں گولی لگنے کا امکان نہیں تھا۔ دشمن دروازے پر امنڈ امنڈ کر آ رہے تھے اور انہوں نے بے حد شور مچا رکھا تھا۔ میں حتی الامکان دماغی توازن سمجھ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ان کے شور و شر کی طرف میرا دھیان نہ جائے اور میں قلیتہ کی تلاش میں ہمد تن متوجہ اور مصروف رہوں۔ میں نے بیک سو ہو کر پھر ایک بار غور کیا کہ ہو برٹ نے ضرور قلیتہ کسی ایسی جگہ چھپایا ہوگا کہ وہ ان گوشہ نشین عورتوں کی نظروں سے اوجھل رہے، میں نے سوچا کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس جگہ چھپاتا؟ یہ سوچتے ہی میری نظر ایک جگہ پر پڑی جو ایک کونے میں گھڑا تھا۔ اس کے قدموں پر پھولوں کے ہار پڑے تھے، درمیان میں ایک چراغ روشن تھا۔ بڑی جگت سے میں نے پھولوں کی پتیاں سمیٹ کر ایک طرف کیں، غور سے دیکھا تو ایک باریک سیاہ ڈوری نظر آئی جو دیوار کے ایک سوراخ میں جا کر غائب ہوئی تھی۔ میں نے اس کا سرا بھا کر چراغ کی نو سے ملا دیا اور خود زمین سے چٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے بجلی گرنے کی سی کڑک اور بھاری گرج کی صدا بلند ہوئی اور دیواریں لہرائیں۔ چھت چڑچڑا اٹھی۔ خوف زدہ اسپیدیوں کی چیخ پکار اور بھاگنے کی آوازیں آئیں اور طوقانی لشکر کے سپاہیوں کے نعرے ابھرے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کوئی دل خوش کرنے والا خواب دیکھ رہا ہوں، اس کے بعد مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

جب ہوش آیا تو دیکھا کہ دو فرانسسی سپاہی مجھے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرا سر دھجی کی طرح سن پک رہا تھا۔ میں پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر قدم ڈمکائے جا رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، کمرے میں دیواروں اور چھت کے پلاسٹر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ فرنیچر منتشر پڑا تھا۔ دیواروں کی

اینٹوں میں لمبی لمبی دراڑیں پڑ گئی تھیں مگر کوئی بڑا شکاف نہ تھا۔ دراصل خانقاہ کی دیواریں اس قدر مستحکم اور مضبوط بنائی ہوئی تھیں کہ بارود کا دھماکا انہیں تباہ نہیں کر سکا تھا البتہ اس حادثے نے کھڑکیاں کھول دی تھیں جس کے ذریعے ہمارا طوقانی لشکر چڑھا چلا آیا۔

دراغین میں ایسا خوف و ہراس پھیلا کہ انہوں نے مقابلہ کیے بغیر دروازے کھول دیے۔ میں دوڑ کر کمرے سے باہر غلام گردش کی طرف آیا۔ تمام راستہ میرے ہم وطن فرانسیسی سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں مارشل لیننٹر سے ملا جو اپنے اسٹاف کے ساتھ داخل ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے روک لیا اور نہایت شوق سے میرا قصہ سنا۔

”شاباش..... شاباش..... کپتان جیرارڈ!“ اس نے کہا ”تم نے عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کی اطلاع ملک معظم شہنشاہ نیولین کو دی جائے گی۔“

”جناب عالی!“ میں نے کہا ”یہ سب کچھ بے چارے ہو برٹ کا کیا دھرا ہے۔ میں نے تو صرف اس کی تجویز پایہ تکمیل تک پہنچادی جس کے لیے اس نے اپنی جان تک دے دی اور دوسرے جناب عالی! اگر آپ مجھے کہنے کی اجازت دیں تو کہوں، خوش قسمتی سے اس اہم کام کے لیے جیرارڈ جیسا مناسب آدمی بھی آپ کے ہاتھ لگ گیا۔“

”بلاشبہ تمہاری اور ہو برٹ کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔“ مارشل لیننٹر نے کہا ”کپتان جیرارڈ، اس وقت ساڑھے چار بجے ہیں، تمام رات کی مشقت نے تمہیں بھوکا مار دیا ہوگا۔ میں اور میرا اسٹاف شہر میں جا کر ناشتا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے معزز مہمان ہو گے۔“

”دوستو! اس کے بعد تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ مجھ پر طعنہ زنی کرنے، پھبتیاں گننے اور طنزیہ قہقہے لگانے والے اور مجھے خفی خور سمجھنے والوں نے مجھے بارہ گواروں کی سر جھکا کے سلائی دی تھی۔ تب میں نے نہایت جذبات میں ایک جڑاثر تقریر کی۔“

”میرے رفیقو! ایک کمزور آدمی خطرے کے مقابلے میں خود کو فولا دینا سکتا ہے مگر کسی شخص کے ضمیر یا جذبات بدل ڈالنا اور اس پر قابو پالینا بڑا مشکل کام ہے۔ میرے رفیقو.....!“

اس کے بعد جانے کیوں میری آواز گھٹ گئی۔ میرے بارہ کے بارہ رفیقوں نے میرے سامنے اپنے سر تسلیم خم کر دیے تھے۔



راگ کی آگ

یعقوب جمیل

جب تاریخ دانوں کا قلم عصبيت کی روشنائی سے چلنے لگے تو یہی کچھ ہوتا ہے، اسی طرح تاریخ مسخ ہونے لگتی ہے۔ تانی کا کردار زبردستی گھڑا گیا۔ اسے تان سین سے بڑا ثابت کرنے کے لیے ایک فرضی کہانی بھی گھڑ لی گئی۔ اس کہانی پر ایک نہیں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ بالی ووڈ میں کئی فلمیں بھی ہیں جن میں ”تانی“ اور ”بیجو باورا“ سرفہرست ہیں۔ سچ کہی جانے والی اس فرضی کہانی کو صرف معلومات میں اضافے کی خاطر شائع کیا جا رہا ہے۔

جس نے بدلے کی خاطر تان سین کو موسیقی میں گھست دے وہی

ان چیمپنوں میں ترہ تر ہو کر آگرہ کے محلات، برج اور مینارے کسی خوبصورت جادوگری کا تصور پیش کر رہے تھے۔ شہر نے آدھی رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن دور جتنا غدی کی چمکی سطح پر ایک شاعری جبراپانی کی جوان لہروں سے مگراتا ہوا بڑی مستی سے تیر رہا تھا۔

وہ ایک حسین ترین چاندنی رات تھی اس رات چاند اپنے مکمل وجود اور بھرپور شباب کے ساتھ آسمان پر جگمگاتے ہوئے بے شمار ستاروں کا مہمان تھا ہاتھوں میں کرنوں کی پیکاریاں لیے وہ آسمان کے آگن کو دو دھیارنگ میں شراپور کر رہا تھا۔ اس دھیارنگ کے چھینے زمین پر بھی پڑ رہے تھے۔

آسانی رگت میں ڈھکی ہوئی بجرے کی چھت پر اس وقت اکبری دربار کے بڑے بڑے امیر امراء سپہ سالار اور وزیر مشیر آفتاب موسیقی تان سین کے سرنگیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان سارے قدر دانوں کے درمیان بیٹھا ہوا تان سین اپنی ادھ کھلی آنکھیں لیے اپنا ایک ہاتھ سامنے کی طرف پھیلا کر آدھی رات کا راگ الاپ رہا تھا، مستی میں ڈوبے ہوئے اس کے سرود کو سچ سچ میں پیالوں کی کھٹک اور مدھوش درباریوں کی 'واہ واہ' تار تار کر دیتا۔

سنگیت اور سرود کا جادو گرمیاں تان سین آج پورے جوش و جنوں کے ساتھ اپنی آواز کی لہروں کو جتنا کے کنارے کھڑے غلوں کے پتھروں سے ٹکرائے دے رہا تھا جس کی وجہ سے وہ سب بے جان پتھر بھی اس کے گلے سے نکلے ہوئے بولوں کو دہرائے پر مجبور تھے۔ سچ سچ تان سین کے جادو کا آج کوئی جواب نہیں تھا۔ واہ واہ کی صدا میں بلند ہو رہی تھیں اور تان سین کی الاپ اپنے مخصوص انداز میں جاری تھی۔

تمام درباری پوری طرح سادو سنگیت کے جادو میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ایسے میں اچانک ہی جمناندی کے پتے گھاٹ سے پینا کے سرود میں لپٹی ہوئی ایک بے حد نرم اور ملائم آواز ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے دوش پر لہرائی ہوئی تان سین کے شاہی بجرے سے ٹکرانے لگی۔

اوپنی آواز میں وہ کوئی گویا ہی تھا۔ جو پینا پر آدھی رات کا خاص راگ ہی الاپ رہا تھا اس کو بے کی الاپ میں کچھ ایسا نشہ تھا کہ اس میں ڈوب کر گھاٹ کے پتھروں نے تان سین کی دہائی دینا بند کر دی۔

آکھرتی پیچھتی اور لہروں کی طرح مچلتی ہوئی سرود کے اس جوار بھانانے دھیرے دھیرے آگے بڑھ کر جتنا کی لہروں پر تیرتے شاہی بجرے کو چھونا شروع کر دیا۔ جیسے کوئی کسی بند دروازے پر ہلکے ہلکے دستک دے کر اپنی آمد کی اطلاع دے رہا ہو۔ تان سین کے کانوں میں بھی وہ آواز پڑی تو وہ بُری طرح سے چونک پڑا لیکن وہ درباری گویا تھا۔ اس لیے اس نے بڑی ہوشیاری اور بڑی مہارت سے اس اجنبی گویے کی الاپ کو اپنی الاپ کے ذریعے روک کر اپنا رنگ جمائے رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔

لیکن اجنبی گویے کی الاپ تو سر چڑھ کر بولنے والا جادو ساتھ لے کر آئی تھی جس نے تھوڑی ہی دیر میں بجرے میں بیٹھے ہوئے سارے ہی درباریوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا، فضا بالکل اچانک ہی بدل گئی تھی اور پھر ذرا دیر بعد ہی جب

چند گئے چنے خوشامدی لوگ جو تان سین کی آواز کے اتار چڑھاؤ پر سر ہلانے اور تال ملانے کے عادی تھے وہ بھی اپنا سر ہلاتا اور جھومنا بند کر کے چپ چاپ بیٹھ گئے تھے۔ تان سین نے جب دور کنارے سے آتی ہوئی راگ "بیہوک" کی الاپ کو اپنے ارد گرد کے لوگوں پر اثر انداز ہوتے محسوس کیا تو اس کے ہاتھوں میں بھی کپکپاہٹ کی لہر دوڑنے لگی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اچانک ہی اپنے تان پورے کے چاروں تار پر ایک ساتھ اپنی انگلی پھیر کر چپ ہو گیا۔

زندگی میں شاید پہلی بار تان سین کی تان اور اس کے فن نے ایسی ٹھٹھن اور ٹپ محسوس کی تھی۔ اجنبی آواز کے طوفان نے شاہی بجرے میں آگے بڑھ کر جمناندی کے دوسرے کنارے پر کھڑے ریت کے ٹیلوں اور پڑوہا کے جھرمٹ میں سوئی قبروں پر بھی دستک دینا شروع کر دی تھی اور جلد ہی اس دوسرے کنارے میں بھی اجنبی گویے کی بازگشت گونجنے لگی۔ اس طرح دوسرے کنارے سے بھی اس انجان گویے کی جیت کا اعلان دہرایا جانے لگا۔

"یہ کس کی آواز ہے؟ کون گارہا ہے؟" راجا جان سنگھ نے اس اجنبی آواز کو دھیان سے سنتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں تان سین سے سوال کیا۔

"نہ جانے کون پاگل ہے۔" تان سین ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"آپ رک کیوں گئے آفتاب موسیقی؟" فیضی نے پرجسس لہجے میں پوچھا اور آگے کہا "ساز آپ کے انتظار میں ہیں۔"

"یہ ساز اس انجان پردیسی گویے کی مہمان نوازی کے لیے چپ ہو گئے ہیں ورنہ....." شراب کے نشے میں چورتان سین کی آواز جھوٹ نہ بول سکی۔

"واقعی اس گویے کی الاپ نے تو اس چاندنی رات کا رنگ دوتا کر دیا ہے۔" ایک گویے درباری نے تان سین کی طرف آنکھ مار کر فقرہ کسا۔ یہ سن کر راجا بھگوان داس سے رہا نہیں گیا اور وہ بولے "رنگ دوتا کر دیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ارے جنت کی حوریں بھی راگنی چھیڑنا بھول گئی ہیں کچھ ایسا ہی زہر بھرا ہے اس گلے میں۔"

"جیو جیو تانک۔" اچانک تان سین کے ایک سازندے نے ہانک لگائی "تم نے مرکز سنگیت کے سینے پر رکھا ہوا بھاری پتھر ہٹا دیا ہے۔ ابھی تو آگرے پر سے گانے پر لگی پابندی کو بٹے ہوئے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ پھر بھی

اپنے ایسے کلاکار سامنے آنے لگے..... یہ الاپ اور یہ آواز تو دور سے ہی دلوں میں اترتی جا رہی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

"یہ گویا چاہے جو کوئی بھی ہو اسے تو شہنشاہ اکبری خدمت میں پیش کرنا چاہیے۔" راجا ڈائزل نے اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے درباریوں کی طرف دیکھ کر کہا "کیونکہ شہنشاہ سے بڑھ کر اس انجان کلاکار کے فن کی قدر اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے مہابلی اکبر اعظم کو آفتاب موسیقی میاں تان سین کے علاوہ کسی اور کو سننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" راجا جان سنگھ نے پھر تان سین پر اپنی ہمدردی اور مہربانی کا مینہ برسایا۔

لیکن وہاں ہونے والی ان تمام باتوں سے دور چلے جانے والے تان سین نے ان باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا۔ اس وقت اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف سایا ہوا تھا اچانک وہ شراب کی صراحی کو اپنے ایک ہاتھ میں تمام کر دھیرے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور درباریوں کے شور شرابے اور فقرے ہازیوں کی آدھی کو نظر انداز کرتا ہوا شاہی بجرے کے ساتھ بندھی ہوئی چھوٹی سی کشتی پر بیٹھ گیا اور رسی کے بندھن کو کھول کر خود ہی چھو چلا تا ہوا کشتی کو گھاٹ کی جانب لے جانے لگا۔

گھاٹ کی جانب سے آنے والی انجان گویے کی آواز اب کچھ صاف اور تیز سنائی دینے لگی تھی اور تان سین کی چھوٹی سی کشتی تیزی سے آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی گویے کی آواز تان سین کو اپنی طرف متوجہ رہی تھی اور ایک طرح سے یہ اس انجان گویے کی جیت ہی تھی۔

☆☆☆

کشتی کو گھاٹ پر لگا کر تان سین ہاتھ میں صراحی لیے اوپر آ گیا جہاں چاندنی رات میں ایک درخت کے قریب ایک نوجوان خوبصورت شخص اپنے دونوں ہاتھوں میں پینا تھا۔ تان سین دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آ کر رک گیا، نوجوان گویے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو تان سین نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت اچھا گاتے ہو تم..... تمہاری آواز میں نے اپنے بجرے پر کئی تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور تمہیں دیکھنے چلا آیا۔"

"تشریف رکھیے۔" نوجوان نے تان سین کے قیمتی لباس کو دیکھتے ہوئے ہی سمجھ لیا تھا کہ آنے والے شخص کا تعلق مہنا شاہی دربار سے ہی ہوگا۔

"آدھی رات کا یہ خوبصورت راگ تم نے کہاں سے

سیکھا؟" تان سین نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے پوچھا۔ "یہ راگ بیہوک میں لے اسنے بابا سے سیکھا ہے۔" نوجوان گویے نے کہا "اور میری بیٹا سے بھی انہی کے سر لگتے ہیں۔"

"مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔" کہہ کر تان سین نے شراب کا ایک پیالہ بھر کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ہوئے آگے کہا "لو میرے دوست ہماری ملاقات کی طوفی میں ایک دوسرے کی سلامتی کے نام پر۔"

"نہیں شکریہ میں براہمن ہوں شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا۔" گویے کے انکار میں فخر کی جھلک تھی۔

"مگر یہ شراب نہیں ہے دوست۔" تان سین مسکرا کر بولا "یہ تو آپ حیات ہے یہ وہ عمل ہے جس کے رنگ میں ڈوب کر سنگیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔"

"لیکن بابا کہتے ہیں کہ سات سرود کی ست رنگی کے علاوہ گویے کو کوئی اور عمل نہیں کرنا چاہیے۔"

نوجوان گویے نے کسی ہونہار طالب علم کی طرح اپنا سبق دہرایا تو تان سین اس کی معصومیت پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اور مسکراتے ہوئے ہی بولا "گلتا ہے بہت پیار کرتے ہیں تمہارے بابا..... تب ہی تو تم ان کے پڑھائے ہوئے سبق کو اپنی پگڑی میں باندھ کر پھرتے ہو۔"

"بے شک..... ہمارے بابا انسان نہیں پیار کے دیوتا ہیں۔" نوجوان گویے نے سینہ تان کر فخریہ لہجے میں کہا "بابا اکثر کہتے ہیں کہ بیٹا ملہار تو میرے سنگیت کلا کی زعمہ تصویر ہے۔ کوئی مٹی کے بت بنا کر خوش ہو لیتا ہے لیکن میں نے تو اپنی کلا کے ذریعے وہ جان دار بت بنایا ہے جو ہندوستان کے کونے کونے میں میری کلا کی فتح کا جھنڈا لہرائے گا۔ تیرا بابا اگر بھری جوانی میں نہ اٹھ گیا ہوتا تو میں کب کا اپنی منزل پر پہنچ کر رام نام ہری بجن میں لگ گیا ہوتا۔ یہ سب کہتے کہتے بابا کی آنکھیں بھرتی ہیں۔" بولتے بولتے نوجوان گویے کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی نمی نظر آنے لگی لیکن وہ اسی جوش سے بولتا گیا "بابا اکثر ہم دونوں کو گود میں بٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اصل سے سو ذرا زیادہ پیارا ہوتا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر تان سین بھری طرح سے چونک پڑا۔ اسے تو ابھی تک اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس ایک گویے سے ہی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن کسی دوسرے کا نام سن کر اس کے تو کان ہی کھڑے ہو گئے لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور مسکراتے ہی کوشش کرتا ہوا پوچھ بیٹھا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ یہ تم کس دوسرے کی بات کر رہے ہو؟"

”ارے میں تو بتانا ہی بھول گیا۔“ نوجوان گویا جلدی سے بولا ”دوسری ہے رانگی میری بہن! ہم دونوں جڑواں پیدا ہوئے تھے دونوں کو ساتھ ساتھ ہی ریاض کرایا ہے بابا نے میں گاتا ہوں تو وہ سنگت کرتی ہے بابا کہتے ہیں کہ تم دونوں ہی میرے لیے سُر اور تال کے جوڑے کی طرح ہو۔“

”ہوں۔“ تان سین نے بڑی بے چینی سے شراب کا پیالہ اٹھا کر اپنے حلق میں اغلیل لیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا ”تم تو پنجاب کے رہنے والے ہو اور جہاں تک میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہیں کسی سے عشق ہو گیا ہے اور اسی کی کشش تمہیں یہاں تک لائی ہے۔“

جواب میں نوجوان گویا صرف مسکرا کر رہ گیا۔ جب اس نے تان سین کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو تان سین نے پھر بے چینی سے پوچھا ”کیا میں جان سکتا ہوں وہ حینہ کون ہے جس کی کشش تمہیں آ کر وہ تک پہنچ لائی ہے؟“

”وہ سچ سچ بہت حسین ہے میرے محترم دوست۔“ نوجوان گویے نے بڑے ہی گیمبر لہجے میں کہا ”وہ مجھ جیسے بے شمار گانے والوں میں موجود ہے لیکن اس ماں کے ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور میں اس کے ہاتھوں کی جھکڑیاں توڑنے کے لیے ہی آ کر آیا ہوں۔“

”کیا نام ہے اس ماں کا؟“ تان سین نے پوچھا ”اور کس نے اسے جھکڑیوں میں جکڑ رکھا ہے؟“

”وہ ماں پتا بجانے والی سرسوتی دیوی کے نام سے مشہور ہے اور ساز اور آواز کے سارے ہی سُر اس کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے دنیا میں جتنے بھی گویے ہیں سب اسی سرسوتی دیوی کے بیٹے ہیں۔“ نوجوان گویے ملہار نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”یہ بات تو میں نے سنی ہے۔“ تان سین بولا ”لیکن تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ اس ماں کو کسی نے جھکڑیاں پہنا کر قید کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ وہ ظالم کون ہے؟“

”اس کا گھمنڈی بیٹا جس کا نام تان سین ہے۔“ نوجوان ملہار نے نفرت بھرے لہجے میں کہا ”اس نے شہنشاہ اکبر کے شاہی دربار میں صرف اپنا سکہ جمائے رکھنے کے لیے اور خود کو آفتاب موسیقی کہلانے کے لیے سُرنگیت کی دیوی سرسوتی ماں کو دوسرے اُن گنت بیٹوں کی آواز کو شاہی دربار تک بھی پہنچنے نہیں دیا وہ ایک کینہ پرور اور حاسد شخص ہے جس نے بھی کسی اور گویے کی فن کارانہ صلاحیتوں کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ اسے ہر لمحہ اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ اگر کوئی اور گویا شاہی دربار میں آ گیا اور شہنشاہ اکبر نے اسے پسند یدگی

کی سند دے کر کسی خطاب سے نوازا دیا تو اسے درباری گوئی کی حیثیت سے وہ پندیرائی حاصل نہیں ہوگی جس کا وہ اب تک تنہا ہی مالک ہے۔ بس اسی لیے اس نے سُرنگیت کی ہر آواز کو شاہی محلات سے دور رکھا اور اس طرح اس نے نہ صرف اپنے شمار گویوں کو ان کے حق سے محروم کیا ہے بلکہ ان گویوں کو پتہ کرنے والی ماں کو بھی بانجھ بنا کر اپنی دیواروں کے اندر قید کر رکھا ہے تاکہ اس کے سروں کی آواز شہنشاہ اکبر کے دربار تک نہ پہنچے۔“

نوجوان گویے ملہار کی باتیں سن کر تان سین کے جسم میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی اور اس کی آواز کھلی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں اور وہ بڑی عجیب سی نظروں سے نوجوان ملہار کی طرف دیکھنے لگا۔ ملہار کی باتیں سن کر وہ اندر ہی اندر سوچ رہا تھا کہ اپنی اصلیت اس نے ملہار پر ظاہر نہ کرے بہت اچھا کیا ہے۔ ورنہ شاید یہ نوجوان گویا اس جگہ اس دیرانے میں اس کی گردن دیوچ لیتا۔

”لیکن تمہیں دیر ہوگئی ہے میرے بھائی!“ تان سین نے خود کو سنبھالا اور نرم لہجے میں کہا ”پنجاب سے آ کر وہ بہت دور ہے اس لیے تم تک یہ خبر نہیں پہنچی ہوگی کہ سرسوتی دیوی کو اسی کے ایک اور لاڈلے بیٹے بیجو باور نے اس کے سارے بندھن توڑ کر اسے آزاد کر دیا تھا۔ اس لیے تمہارا یہاں آ کر بے کار ہو گیا ہے۔“

”بے کار کیوں؟“ نوجوان ملہار نے ایک جھٹکے سے تان سین کی طرف دیکھ کر کہا ”مجھے تو یہاں آنا ہی تھا۔ کہتے ہیں کہ ملہار بیٹے تو تو ایک انمول رتن ہے اور رتن کی قدر تو بادشاہ کے دربار میں ہی ہوتی ہے۔ وہ مجھے بادشاہ سلامت کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔“

”درست فرماتے ہیں تمہارے بابا“ تم سچ سچ ہی انمول رتن ہی ہو لیکن اس طرح تم شہنشاہ کے دربار میں نہیں جاکو سکو گے۔ سنسان راہیں اور یہ اجنبی شہر۔ دربار تک جانے کے لیے تمہیں کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہوگی۔ ایسے سہارے کی جو تمہیں سیدھے دربار تک لے جائے۔“ تان سین نے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ ملہار بولا ”اور مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی طرح راستہ مجھے مل ہی جائے گا۔“

”تو پھر ایسا کرو تم میرے ساتھ میرے غریب خانے چلو۔“ تان سین بولا ”میں تمہاری مدد کروں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری آواز شہنشاہ کے دربار میں گونجنے لگے۔“

”کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں گے؟“ نوجوان

ملہار نے بُرا امید لہجے میں پوچھا۔

”کوشش ضرور کروں گا۔“ تان سین اُٹھتے ہوئے بولا ”ہلاؤ و میرے ساتھ۔“

☆ ☆ ☆

اپنے میزبان کے شاندار محل میں پہنچ کر نوجوان ملہار نے دیکھا کہ وہ کس امیرے غیرے کے گھر میں مہمان بن کر نہیں آیا ہے بلکہ یہ تو سنگیت کے جادوگر آفتاب موسیقی تان سین کا محل ہے اور اس کا نیا دوست خود تان سین ہے۔

ملہار کو یاد آیا کہ اس نے تان سین کے منہ پر ہی اس کی بُرائی کی تھی لیکن اس کے باوجود بھی تان سین کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی تھی اور اب وہ اسے اپنے ساتھ اپنے محل میں لے آیا تھا تاکہ وہ اس کے شاہی دربار میں رسائی کے سلسلے میں اس کی مدد کر سکے۔ نوجوان ملہار اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ تان سین تو ایک اچھا بیٹا اور نیک آدمی ہے اور ایسا بیچاؤ کار اپنے جیسے کسی فن کار کی حق تلفی کیسے کر سکتا ہے؟

ملہار تان سین کے محل میں رہ کر اس کی دوستی مہمان نوازی اور مہربانیوں کے رنگ میں ڈوب گیا اور آخر ایک دن اس نے اپنی بہن رانگی کو خط لکھ دیا کہ جلد ہی اس کی رسائی شاہی دربار میں ہو جائے گی۔ اس کے لیے خود آفتاب موسیقی تان سین اس کی مدد کر رہا ہے۔ تان سین ہی اسے اپنے ساتھ اپنے محل میں لے آیا ہے اور آج کل وہ اس کا مہمان ہے۔

☆ ☆ ☆

کئی دن گزر گئے جب نوجوان ملہار کی بہن رانگی کو اپنے بھائی کی کوئی خبر نہیں ملی تو وہ پریشان ہوگئی۔ اس نے اپنے جاننے والوں کے ذریعے آ کر وہ محل میں موجود اپنے بھائی کی خیر خیریت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں سے رانگی کو اطلاع ملی کہ اس نام کا کوئی گویا نہ تو بھی آ کر وہاں آیا ہے اور نہ ہی کسی نے یہاں بھی اس کی آواز ہی سنی ہے۔ اس خبر نے رانگی کو اور بھی بے چین کر دیا پھر وہ خود آ کر وہ پہنچی تاکہ تان سین سے مل کر وہ اپنے بھائی کے بارے میں پوچھ سکے۔ لیکن کئی دنوں کی کوشش کے باوجود وہ تان سین سے ملنے میں کامیاب نہ ہو سکی، ہر بار اسے تان سین کے محل کے دروازے سے یہ کہہ کر رخصتا دیا گیا کہ تان سین ہر ایرے غیرے سے نہیں ملا کرتے۔

تان سین کے محل کے پھرے داروں کے اس سلوک نے رانگی کو شک میں مبتلا کر دیا کہ اس کے بھائی نے اسے خود مل میں لکھا تھا کہ وہ تان سین کے محل میں ہی اس کا مہمان ہے اور تان سین نے اسے شاہی دربار تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے

لیکن اب اپنے بھائی کے نہ ملنے پر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ کہیں یہ تان سین کی ہی کوئی سازش نہ ہو گی کہ وہ کینہ پرور گویا کسی اور کو اپنے مقابل دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ بھلا اس جیسا حاسد آدمی یہ کیوں چاہے گا کہ شاہی دربار میں شاہی گویے کی گدی اس کے ہاتھ سے نکل جائے اور دربار اکبری میں اسے جو تو قیر حاصل ہے وہ کوئی اور لے جائے۔

سوچتے سوچتے رانگی کو یقین ہو گیا کہ حسد اور رقابت کی آگ میں جل کر تان سین نے ہی اس کے بھائی کو کہیں کسی اندھیری کوٹھری میں قید کر دیا ہے یا اسے کہیں گم کر دیا ہے۔ آخر تک ہار کر وہ اپنے بھائی کی گمشدگی کی فریاد لے کر شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچ گئی۔

دربار اکبری میں سارے منصب دار اور درباری موجود تھے جن میں تان سین بھی موجود تھا۔ رانگی نے شہنشاہ اکبر کو اپنے بھائی کی گمشدگی کی بات بتائی اور یہ بھی بتایا کہ وہ ایک گمنا گویا ہے جسے خدا نے اس فن میں پوری طرح نواز رکھا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح شہنشاہ اکبر کے دربار میں حاضر ہو کر ان کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرے تاکہ شہنشاہ اکبر کی داد پا کر وہ گم نامی کے اندھیروں سے باہر نکل سکے اور اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ دربار اکبری کے شاہی گویے آفتاب موسیقی میاں تان سین سے بہت بہتر گویا ہے۔ جسے سننے کے بعد شہنشاہ اکبر تان سین کی جادوگری کو بھول جائیں گے۔

رانگی کی یہ ساری باتیں سن کر اکبر نے کہا ”ہم بھتیجا فن کاروں کی قدر کرتے ہیں اور انہیں نوازتے بھی ہیں لیکن یہ قول تمہارے تمہارا بھائی آ کر وہ آیا ہوا ہے اور وہ آ کرے میں ہے تو ابھی تک دربار میں کیوں نہیں آیا ہے؟“

”وہ اس لیے نہیں پہنچ سکا جہاں پناہ کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کہیں قید کر دیا گیا ہے۔“ رانگی نے کہا ”یا پھر اس کی آواز کو دبانے کے لیے اسے قتل کر دیا گیا ہے۔“

”لیکن ہماری ریاست میں ایسا کون ہے جس نے ایک غریب فن کار کے ساتھ بے وجہ ایسا ظالمانہ سلوک کیا ہے؟“ شہنشاہ اکبر نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

”جہاں پناہ دنیا میں حاسدوں کی کمی نہیں ہے۔“ کہہ کر رانگی نے ایک نظر تان سین پر ڈالی اور مزید کہا ”ایک فن کار ہی دوسرے فن کار کا دشمن بن گیا ہے۔ جو نہیں چاہتا کہ جہاں پناہ کے دربار میں جو منصب اسے حاصل ہے وہ اس سے چھین جائے اس لیے اس حاسد نے میرے بھائی کو غائب کر دیا ہے تاکہ اس کی آواز آپ تک نہ پہنچ سکے اور وہ بدستور آپ کی

آنکھوں کا تارایتا رہے۔

”یہ تو حق دار کی حق تلفی کی گئی ہے۔“ شہنشاہ اکبر نے کہا ”تم صاف صاف بتاؤ کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اس کا؟“ ”مجھے ذرا ہے جہاں پناہ کہ اس شخص کا نام اگر میرے منہ سے نکلا تو شاید اکبری انصاف عتاب میں بدل جائے۔“ ”لڑکی ہوش کی بات کرو۔“ شہنشاہ اکبر نے غصے میں چیخ کر کہا ”تم اس وقت انصاف کے دربار میں کھڑی ہو اور ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔ تم بے خوف ہو کر ہمیں اس کا نام بتاؤ جس نے تمہارے بھائی کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے؟“

”اس ظالم اور حاسد شخص کا نام ہے میاں تان سین جسے شہنشاہ اکبر نے آفتاب موسیقی کا خطاب دے رکھا ہے۔“ راگنی نے یہ کہہ کر جیسے اکبر اعظم کے سینے پر گھونسا مارا ہو۔ شہنشاہ اکبر تان سین کا نام سنتے ہی اچھل پڑا اس کی آنکھیں غصے میں سرخ ہوتی چلی گئیں اور پھر وہ پورے رعب و دبدبے سے چیخ پڑا ”لڑکی! تم اکبری دربار کے ایک چمکتے ہیرے پر یہ فضول اُترام لگا رہی ہو۔ تمہیں اس کا ثبوت دینا ہوگا اور اگر تمہارا اُترام سچ ثابت نہیں ہوا تو ہم تمہاری گردن اُڑا دیں گے۔“

”جہاں پناہ! میں جو اُترام لگا رہی ہوں وہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر ہی لگا رہی ہوں۔“ راگنی نے بڑے ہی پُراعتماد لہجے میں کہا اور پھر اپنے آچھل میں بندھا ہوا ایک کاغذ نکال کر پیش کار کی جانب بڑھا دیا۔ پیش کار نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر اسے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

”کیا ہے اس کاغذ میں؟“ شہنشاہ اکبر نے پوچھا۔ ”جہاں پناہ! یہ میرے بھائی کا وہ خط ہے جو اس نے آگرے سے لکھا تھا کہ وہ یہاں میاں تان سین کے محل میں اس کا مہمان ہے اور تان سین نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ بہت جلد اسے شاہی دربار میں لے جائے گا۔ بس جہاں پناہ! اس کے بعد سے ہی میرے بھائی ملہار کا کوئی پتا نہیں ہے۔ اس خط سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ میاں تان سین کے محل میں ہی رہ رہا ہے لیکن جب میں اس سے ملنے یہاں آئی تو تان سین کے محل کے پہرے داروں نے مجھے تان سین سے ملنے ہی نہیں دیا۔“ یہاں تک کہ کر راگنی نے مڑ کر تان سین کی طرف دیکھ کر پوچھا ”کیا میاں تان سین کو انکار ہے کہ میرا بھائی ان کا مہمان نہیں تھا؟“

شہنشاہ اکبر نے حیران نگاہوں سے تان سین کی طرف دیکھا تان سین کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے وہ ذرا دیر تک تو راگنی کے سوال کا جواب ہی نہیں دے سکا۔ سارے

دربار میں ایک گھبر اور منحوس سا تناٹا چھایا ہوا تھا۔ مغل سلطنت کی تاریخ میں شاید یہ پہلا ہی موقع تھا جب رعایا کی ایک غریب لڑکی نے اکبری دربار کے نورتنوں کے سر تاج آفتاب موسیقی میاں تان سین پر اپنے بھائی کو گم کر دینے یا اس کو قتل کرنے کا اُترام عائد کیا تھا۔

تان سین ابھی اپنی گھبراہٹ پر قابو بھی نہیں پاسکا تھا کہ شہنشاہ اکبر کی آواز گونجی ”آپ بولتے کیوں نہیں میاں تان سین؟ جواب دیجئے۔ یہ لڑکی کیا پوچھ رہی ہے؟“

”یہ درست ہے جہاں پناہ!“ تان سین نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا ”وہ پردیسی گویا چند دنوں تک میرا مہمان رہا تھا لیکن ایک دن وہ مجھے بتائے بغیر ہی کہیں چلا گیا۔“

”یہ جھوٹ ہے جہاں پناہ!“ راگنی گرج کر بولی ”میزبان اور مہمان کو جب ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں تھی تو مہمان اپنے میزبان کو بتائے بغیر کیوں چلا گیا؟ اور وہ کہاں چلا گیا؟“

”مگر یہ سچ ہے کہ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں چلا گیا؟“ تان سین نے کہا۔

”آپ جہاں پناہ کے سامنے بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔“ راگنی نے اسی کڑخت لہجے میں کہا ”لیکن میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ اب ساری دنیا یہ بات جان جائے گی کہ آپ نہ صرف جھوٹے ہیں بلکہ فن موسیقی کے دشمن اور اس کے قاتل بھی ہیں۔“ یہ کہہ کر راگنی نے شہنشاہ اکبر کی طرف دیکھا اور التجا آمیز لہجے میں بولی ”جہاں پناہ! میری یہ چھوٹی سی درخواست ہے کہ مجھے میاں تان سین کے محل میں گانے کا موقع دیا جائے۔“

”مگر اس سے کیا ہوگا؟“ شہنشاہ اکبر نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے گانے کی آواز سن کر تمہارا بھائی لوٹ آئے گا؟“

”ہاں جہاں پناہ!“ راگنی نے گھبر لہجے میں کہا ”اگر میری آواز میں کشش اور میرے فن میں سچائی کی طاقت ہوگی تو میاں تان سین کے محل کی ایک ایک اینٹ ان کے گناہ اور ان کے جرم کے خلاف آواز بلند کرے گی۔ جہاں پناہ! میں نہ تو کوئی درباری گائیک ہوں اور نہ ہی درباری ”واہ واہ“ کے بہارے میری تان گونجتی ہے۔ میں تو وہ غریب فن کار ہوں جو فن موسیقی کو عبادت سمجھتی ہے اور مجھے اپنی عبادت پر پورا بھروسہ ہے۔“

راگنی کی باتیں سن کر شہنشاہ اکبر کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے ایک طائرانہ نظر

دربار یوں پر ڈالی اور مسکرا کر کہا ”ہمارے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ ہوگا ہم نے دیکھ راگ اور راگ ملہار کے کرشمے تو دیکھے ہیں لیکن موسیقی کی طاقت کا یہ انوکھا تماشا ہم پہلی بار ہی دیکھیں گے۔“ راگنی نے جھک کر شہنشاہ اکبر کا شکریہ ادا کیا۔ اسے تان سین کے محل میں گانے کی اجازت مل چکی تھی۔

تان سین کے محل کا باغ دربار یوں اور شہر کے دیگر محمول لوگوں سے کچھ مچ بھرا ہوا تھا۔ سامنے کے ایک تخت پر خود شہنشاہ اکبر براجمان تھا۔ محل کے آس پاس کے مکانات کی چھتوں اور اپنے اپنے اونچے پتھروں پر بھی تماشا بین چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔

راگنی اپنے بوڑھے بابا کے ساتھ شہنشاہ اکبر کے تخت کے قریب سبز گھاس کے قالین پر کچھی سفید چاندنی پریشی تھی۔ رام لوگوں کی بے قرار آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر شہنشاہ اکبر کا اشارہ پا کر راگنی نے بیٹا کے تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور چہرے سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے اس کی انگلیوں نے بیٹا کے تاروں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ پھر اس کے گلے سے اداسی میں ڈوبی ہوئی ایک تان نکلی اور پھر وہ تان دل میں اُتر جانے والے

بولوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ وقت گزرتا رہا اور آس پاس بیٹھے ہوئے ہر شخص پر نشے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی ”جاگو رے جاگو..... راگھونا تھہ کتور“ راگنی کی دروہری آواز اپنے بیارے بھائی کو پکار رہی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد اس کی آواز کا ہاؤ تیز ہوتا جا رہا تھا پھر یہ آواز دگنی سے سختی اور چوگنی ہو گئی پھر اچانک اس کے بول ہی بدل گئے۔ اب راگنی کے الاپ سے بھیر دی راگ کی کپکپا دینے والی ایک جھنکار سی نکل رہی تھی۔ اس کی آواز کی لہروں میں یوں لگ رہا تھا جیسے جتنا عادی کی لہریں بھی نشے میں بدست ہو کر شہر کے اونچے اونچے برج اور میناروں کو چاٹ جانا چاہتی ہوں ایسا لگ رہا تھا جیسے بھیر دی راگ کی تیز لہر تان سین کے محل میں ہی نہیں بلکہ

سارے شہر میں گونج رہی ہو۔

باغ کے کھلے میدان میں بیٹھے ہوئے سامعین کی بے گنی لہجہ لہجہ بڑھتی جا رہی تھی اور شہنشاہ اکبر کو تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اور تھوڑی دیر تک یہی حالت رہی تو راگنی کے گلے سے نکلتی ہوئی آواز کے بارود سے آگرے کا قلعہ بھی زمین سے ہوجائے گا۔ سارے محل ترچھے ہو جائیں گے اور حویلیاں

ہاٹیں اڑنے لگیں گی۔

راگنی کی انگلیاں بیٹا کے تاروں پر سے کبھی کی ہٹ چکی

صحت مند زندگی کی 20 علامات:

☆ بھرپور نیند سوجاگنے پر پھرتی اور اسٹگ ظاہر ہونا ☆ پاخانہ باقاعدہ اور صاف و بندھا ہوا آنا ☆ بھوک کی نوعیت نارمل رہنا ☆ تمام دن کے افعال و مشاغل میں دلچسپی کا برقرار رہنا ☆ پیٹ چھاتی سے کم ہونا ☆ نشی اور متحرک اشیا کی خواہش کا پیدا نہ ہونا ☆ ولی طور پر خوش محسوس ہونا اور روحانی طور پر مطمئن رہنا ☆ بغیر تھکاوٹ کے کئی گھنٹوں تک کام کرنے کی صلاحیت کا ہونا ☆ بڑھ چڑھ کر تعمیری کاموں میں حصہ لینا ☆ خوش مزاج ہونا، چڑچڑاہٹ نہ ہونا ☆ چہرے پر رونق اور طبیعت کا ہشاش بشاش ہونا ☆ آنکھوں میں چمک اور بے خونئی کا نمایاں ہونا ☆ چہرے پر مسکراہٹ رہنا ☆ جسم میں ہمیشہ جواں ہمتی اور قوت کا احساس رہنا ☆ ہر حال میں تعمیری نظریات رکھنا ☆ تمام جسمانی افعال بہ آسانی انجام دینا ☆ جسم صاف ستھرا اور بے داغ ہونا ☆ بال و جلد صحت مندی کی طرف مائل رہنا ☆ محل مزاج ہونا۔

☆ بیارجم کی 20 علامات:

☆ ذیل میں بیس ایسی علامات بیان کی جا رہی ہیں جو بیارجم کی غماز ہیں ☆ کسی بھی جسمانی فعل کا غیر فطری ہونا ☆ گہری و پرسکون نیند کا نہ آنا ☆ پاخانہ پتلا یا گائے دار آنا ☆ بھوک کا نہ لگنا ☆ افعال و مشاغل سے بوریٹ ہونا ☆ پیٹ بڑھا ہوا ہونا یا مٹا ہوا ☆ نشی اشیا کی شدید خواہش رکھنا ☆ انسان افسردہ اور مردہ دل رہنا ☆ تھوڑا سا کام کرنے سے تھکاوٹ ہو جانا ☆ تعمیری کاموں میں دلچسپی نہ ہونا ☆ چڑچڑاہٹ غالب رہنا ☆ چہرے بے رونق رہنا اور سرد در رہنا ☆ آنکھوں میں مردنی چھائے رہنا ☆ چہرے سے افسردگی نمایاں ہونا ☆ جسم میں ہمیشہ نقاہت و تھکاوٹ کا رہنا ☆ مختلف وجوہ کی بنا پر تخریبی خیالات غالب رہنا ☆ جسمانی افعال کو کرنے سے نفرت ہونا ☆ جسم سے بدبو آنا اور چہرے پر داغ دھبے نمایاں ہونا ☆ بال گرنا اور جلد عموماً خشک رہنا ☆ بہت جلد خفصا آنا۔

تھیں، لیکن بچا کے تاروں کی جھنکار بدستور گونج رہی تھی۔ رانگی کے گردن کی نیس پھولی ہوئی تھیں جن سے نکلنے والی آواز اب برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ شہنشاہ اکبر نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں اور کئی کمزور دل لوگ تو خوف کے مارے چیخ پڑے۔ ان چیخوں کی بھیاںک آوازیں سے رانگی کا دھیان بٹ گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا تو سامنے بیٹھے ہوئے لوگ خوف سے تھر تھرا رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر اس نے فوراً اپنے سروں کا رخ موڑ لیا، ٹھنڈی ٹھنڈی پُر سکون لہروں کی طرف دھیرے دھیرے وہ لوٹنے لگی اور پھر اس کے گلے سے وہی بیٹھے پول نکلنے لگے ”جاگورے جاگورے گھوتا تھ کنور.....“

اس بار ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر اس مسکراہٹ میں اس کے دل کے درد کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ خود شہنشاہ اکبر اس کے درباریوں اور سامنے بیٹھے ہوئے تمام لوگوں نے راگنی کے ہونٹوں پر درد بھری مسکراہٹ کو دیکھا، ان میں سے کئی لوگ تو اپنے جذبات پر قابو ہی نہ رکھ پائے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سارا ماحول ہی درد اور اُداسی کے رنگ میں ڈوب گیا تھا اور آخر کار راگنی کے راگ کی پکار رنگ لے آئی، گڑ گڑاہٹ کی ایک آواز نے یکا یک ہی سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی اور لوگوں نے اس طرف دیکھا تو انہیں شیشم کے ایک درخت کے نیچے کی زمین اس طرح ہلٹی ہوئی نظر آئی جیسے وہاں زلزلہ آ گیا ہو اور شیشم کا درخت جڑ سے اکڑ کر گر جانے والا ہو۔

شہنشاہ اکبر اور دیگر تمام لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک اور گڑگڑاہٹ ہوئی اور شیشم کے درخت کے نیچے کی مٹی دو حصوں میں پھٹ گئی اور اس میں سے نوجوان ملہار کی لاش نکل کر ایک لمحے کے لیے اوپر اٹھ کر ہوا میں معلق ہو گئی۔ اس کی گردن آدمی کٹی ہوئی تھی اور اس کے خون آلود کپڑوں میں مٹی چسکی ہوئی تھی۔ رانگی اور اس کے بوڑھے بابا کے منہ سے ایک ساتھ ہی چیخ نکلی اور دوسرے ہی لمحے وہ لاش اس گڑھے میں جا کر غائب ہو گئی اور زمین پھر ہموار ہو گئی۔

لوگوں کی آنکھیں اب بھی اس جگہ جمی ہوئی تھیں لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نوجوان گویے ملہار کی لاش اپنے گل کا ثبوت پیش کر کے جا چکی تھی۔ راگنی سسک سسک کر رو رہی تھی اور اس کا بوڑھا بابا زمین پر سر پٹک رہا تھا "ثبوت مل گیا ہے میاں تان سین.....!" اچانک شہنشاہ اکبر کی گرج دار آواز نے ماحول کے بھیا نک ستائے کو توڑ دیا۔ "ہمارے ساتھ یہاں

ماہنامہ سرگزشت

موجود ہزاروں آنکھوں نے بھی وہ منظر دیکھا ہے، ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم جسے موسیقی کا دیوتا سمجھتے تھے وہ ایک کینہ پرور حاسد اور قاتل شخص ہے۔ اس کے ہاتھ ایک معصوم بے گناہ کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔“ یہ کہہ کر شہنشاہ اکبر نے ایک گہرا لمبا سانس لے کر تان سین کی طرف گھور کر دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، راغنی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”جہاں پناہ، سچائی آپ کے سامنے آگئی ہے۔ بھگوان نے میری اور میرے سُرور کی لاج رکھ لی ہے اور اب انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ انصاف کیجئے جہاں پناہ!“

”اس کی سزا تو موت ہی ہوتی ہے، ظلم ایسی.....“
 دور باریوں میں سے ایک شخص نے اٹھ کر جذباتی لہجے میں کہا
 ”اس بے گناہ نوجوان کی لاش خود آپ کے انصاف کو
 نکار رہی ہے۔“

”انصاف ضرور ہوگا۔“ شہنشاہ اکبر نے اپنی گرج دار اور آواز میں کہا اور پھر سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا ”تان سین کو بیڑیاں پہنا کر اس قفل میں نظر بند کر دیا جائے اور کل اسے شاہی دربار میں پیش کیا جائے جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔“ یہ کہہ کر شہنشاہ اکبر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

دوسرے روز شاہی دربار تمام درباریوں اور شہر کے دیگر
عالمین سے کچھا مہج بھرا ہوا تھا۔ رانگی اپنے بابا کے ساتھ
دربار میں موجود تھی۔ تھوڑی دیر بعد شہنشاہ اکبر کی آمد کا اعلان
ہوا تو تمام درباری اپنی اپنی جگہ پر منسوب کھڑے ہو گئے۔
"کارروائی شروع کی جائے اور مہرم تان سین کو دربار میں
پیش کیا جائے۔" شہنشاہ اکبر کے تخت پر بیٹھے ہی پیش کار نے
اعلان کیا تو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تان سین کو دربار میں
کر کھڑا کر دیا گیا۔

”میاں تان سین!“ دربار میں شہنشاہ اکبر کی بھاری
سرکھ آواز گونجی ”چونکہ تمہارے اس گناہ نے جرم کا کوئی چشم
بید گواہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم خود ہی ہمیں سچ
بتا دو حالانکہ تمہارے گل کے باغ کی مٹی نے ہمیں اس
جوان گوئے کی لاش دکھا دی ہے لیکن اس کے باوجود ہم
تمہارے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔“

”جہاں پناہ“ میں اپنے اس فعل پر شرمندہ ہوں اور عمل
ی سے معافی کا خواستگار ہوں۔“ نان سین نے سر جھکا کر
مجھے لہجہ میں کہا، ”لیکن اپنی صفائی میں میں اتنا ضرور کہوں گا
کہ یہ جرم میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا ہے، مجھے خود حیرت
ہے کہ یہ شیطانی فعل مجھ سے نادانستگی میں سرزد ہو گیا ہے۔“

مئی 2012ء

”اے کی حالت میں مجھے اس بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ میں لپکا کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“

”آدی کو نشہ اتنا ہی کرنا چاہیے جتنا وہ برداشت کر سکے۔“ شہنشاہ اکبر نے کہا ”زیادتی کی حالت میں سلطان غالب آ ہی جاتا ہے۔“

”لیکن جہاں پناہ میاں تان سین جھوٹ بول رہے ہیں۔“ راگنی نے کھڑے ہو کر کہا ”یہ کوئی شیطانی فعل نہیں ہے بلکہ یہ ایک موچا سمجھا منصوبہ تھا اور اس منصوبے کو عملی جامہ بنانے کا فیصلہ میاں تان سین نے اسی وقت کر لیا تھا جب مرے بھائی ملہار کے گانے کی آواز سن کر وہ اکیلے ہی گھاٹ جا کر اس سے ملے تھے اور اسے اپنے ساتھ اپنے محل میں لے آئے تھے اور پھر ایک رات انہوں نے وہی کیا جو انہوں نے پہلے سے سوچ لیا تھا۔“

”بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔“ شہنشاہ اکبر نے کہا ”ہمیں ہمارے ہات سے اتفاق ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس نے جو ان ملہار کو قتل کیا ہے اور اس کی لاش اپنے محل کے باغ میں ایک درخت کے نیچے دفن کی ہے جسے وہاں سے کھود کر لایا جاسکتا ہے۔ اس لیے انصاف کا تقاضا ہے کہ قتل کی سزا موت ہی ہو سکتی ہے اور ہم اسے سزائے موت دیتے ہیں۔“

”نہیں..... نہیں عالم پناہ!..... رحم رحم۔“ دربار میں موجود ن سین کے مداح جیچ پڑے لیکن شاہی حکم صادر ہو چکا تھا پھر ب تان سین کو سپاہی باہر لے جانے لگے تو اچانک ہی راگنی کا زحما بابا اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور استعجا آمیز لہجے میں بولا ”نہیں جہاں پناہ..... ذرا ٹھہریے میں مرنے والے ان بیٹے ملہار کا باپ ہوں..... اور ہاتھ جوڑ کر کلہاڑی سے خواست کر رہا ہوں کہ میرے بیٹے کے قاتل کو کوئی سزا نہ دی جائے اسے معاف کر دیا جائے جہاں پناہ!“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ شہنشاہ اکبر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ بوڑھے بابا کی بات سن کر دو بار میں جو دھماکا لوگ بھی حیرت بھری نظروں سے بوڑھے بابا کو ہی دیکھ رہے تھے اور ان کی سماعت سے شہنشاہ کی آواز ٹکرا رہی تھی۔ ”قتل جیسے بھیانک جرم کے لیے معافی کی کوئی منجائش نہیں ہے۔ تان سین کو اسے کسے کی سزا چھوٹنی ہی ہوگی۔“

”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں قل الہی کہ مجرم اپنے جرم کی راضی و رنجستے۔ مگر یہ سزا ایسی نہ ہو جو ایک جھٹکے میں ہی پوری جائے اور مجرم کو اپنے کیے پر پچھتانے کا وقت ہی نہ ملے۔“

”ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے۔“ شہنشاہ اکبر نے کہا

”فرم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

ماہنامہ سمگشت

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کوہس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دار الحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061
0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

”جہاں پناہ میں یہ کہتا چاہتا ہوں کہ اس شخص کے لیے سزائے موت ناکافی ہے۔“ بوڑھے بابا نے کہا ”میری اور میری بیٹی کی بھی یہی خواہش ہے کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے“ اس کی بیٹیاں کھول دی جائیں کیونکہ اس کی موت سے اکبری انصاف کا دل تو بھر جائے گا لیکن سزا کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ یہ زندہ رہے گا تو زندگی بھر اس گناہ کا جھوڑا اس کے سینے پر برستا رہے گا اور اس کے جرم کی بجلی اسی کے سر پر گرا کر اسے بے موت مارتی رہے گی۔ جہاں پناہ یہ میرے معصوم بیٹے کی شاندار جیت کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ جب تک زندہ رہے گا جہاں پناہ ”لوگوں کے دلوں میں میرے بیٹے اور میری بیٹی راگنی کے بھائی کی جیت کی کہانی اپنے آپ کو جیتی رہے گی۔“

”بہت خوب بہت خوب!“ بوڑھے بابا کے چپ ہوتے ہی شہنشاہ اکبر نے کہا ”تم نے اپنے بیٹے کے قاتل کی جان بخشی کر کے اس پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ لیکن ہم اسے کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔ آج سے میاں تان سین کا نام ہمارے نورتنوں سے نکال دیا جائے گا۔ اب یہ آفتاب موسیقی بھی نہیں رہا۔ ہم اس کو حاصل تمام خطابات اور تمام مراعات سے محروم کرتے ہیں اب یہ محل کے عیش و آرام کے بجائے کہیں کسی جمو پڑے میں گناہی کی زندگی بسر کرے گا“ اسے نہ کہیں گانے کی اجازت ہوگی اور نہ ہی ساز بجانے کی۔“ اتنا کہہ کر شہنشاہ اکبر نے صوبے دار کی طرف دیکھ کر حکم دیا ”اس کی بیٹیاں کھول کر اسے جتنا کہے پار کہیں گوشہ گناہی میں دھکیل دیا جائے تاکہ یہ جب تک زندہ رہے دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھتا رہے۔“

شاہی حکم سننے ہی سپاہیوں نے تان سین کی بیٹیاں کھولنا شروع کر دیں اور ٹھیک اسی وقت راگنی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ”جہاں پناہ میری بھی ایک گزارش ہے۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔“

”اجازت ہے بیٹی کہو کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ شہنشاہ اکبر نے کہا۔

”جہاں پناہ تان سین کا یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان بھر میں صرف وہی ایسا گائیک ہے جو دیکھ راگ کے ذریعے بھی ہوئی شمع کو روشن کر سکتا ہے اور اس کی اسی خوبی کی وجہ سے شہنشاہ اکبر نے اسے آفتاب موسیقی کا خطاب دے کر شاہی دربار کا خاص گائیک بنایا ہے۔“

”تو اس میں غلط کیا ہے لڑکی؟“ شہنشاہ اکبر نے پوچھا۔

”غلط یہ ہے جہاں پناہ کہ تان سین نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ ہندوستان میں اس کے سوا کوئی گویا دیکھ

راگ نہیں گاسکتا۔۔۔۔۔۔“ راگنی نے کہا ”دراصل اس حاسد اور کینہ پرور شخص نے اپنی درباری طاقت کے زور پر کسی گویے کی آواز کو آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ فن کسی کی میراث نہیں ہے۔ دیکھ راگ گانے والے اتنے بڑے ہندوستان میں اور بھی کئی ہوں گے لیکن فی الحال میں چاہوں گی کہ محل الہی میرے بابا کو بھی سن لیں اور میاں تان سین کو بھی سننے کو موقع دیں تاکہ اس کے جھوٹ کا پردہ سب کی آنکھوں کے سامنے مزید چاک ہو جائے۔“

”راگنی بیٹی تم ہمیں تماشے پر تماشہ دکھانا چاہتی ہو؟“ شہنشاہ اکبر نے ہنس کر کہا ”بھلا تان سین کے علاوہ ایسا کو سا فن کار ہے جو دیکھ راگ گا کر ساری بھیجی شمعوں کو جلا سکے؟“

”اگر آپ اجازت دیں تو میرے بابا دیکھ راگ گا کر یہ ثابت کر دیں گے کہ یہ راگ صرف تان سین ہی نہیں گاسکتا۔“ راگنی نے پراعتماد لہجے میں کہا ”جہاں پناہ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ دیکھ راگ کا وارث صرف تان سین ہی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ ہم تمہارے بابا کو اجازت دیتے ہیں۔“ شہنشاہ اکبر نے کہا ”اور تھوڑی دیر کے لیے تان سین کو بھی اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں۔“

”بہت بہت شکر یہ عالم پناہ میں آج اس شاہی دربار میں دیکھ راگ پیش کروں گا جس کے بغیر سرسیت شاندار محل اندھیروں میں ڈوبا نظر آتا ہے۔“ بوڑھے پنجابی بابا نے اپنی پگڑی کو شان سے سر پر جاتے ہوئے کہا ”جہاں پناہ ان تمام شمع دانوں کو اس وقت چپ رہنے کا حکم دیجئے جب تک میرے راگ کا جادو انہیں بولنے پر مجبور نہ کر دے“ سارا دربار بوڑھے گویے کا سنگیت سننے کے لیے بے تاب تھا۔ ایک طرف تان سین بیٹھا بڑی حیرت سے بوڑھے گویے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شہنشاہ کے اشارے پر دربار کی تمام شمع دانوں کو بجھا دیا گیا پھر شاہی حکم پر بوڑھے گویے نے بیٹا اٹھا کر اس کے تاروں کو چھیڑا اور اپنی الاپ شروع کر دی۔

پہلے تو اس کی الاپ میں بہت دھیمپن تھا پھر دھیرے دھیرے وہ الاپ دوگنی اور پھر چوگنی ہو کر دربار میں گونجنے لگی۔ تان سین کے سوا دربار میں موجود سارے ہی لوگ اس بوڑھے کے دیکھ راگ میں مست ہو چکے تھے بوڑھا کو اپنی الاپ کے درمیان میں بھی کبھی دھیمی آواز میں کسی آواز کا پکارتا جاتا تھا ”نائیکی۔۔۔۔۔۔ نائیکی۔۔۔۔۔۔ آ جانا نائیکی۔۔۔۔۔۔“ دیر تال کے سنگ آ۔۔۔۔۔۔ نائیکی میرے راگ کو سب سے ادھ

ہولی پر پہنچانے کے لیے آ۔۔۔۔۔۔“ وہ دھیمی دھیمی آواز میں اپنے لگت کی دیوی کو نکارتے نکارتے بڑبڑانے لگتا تھا ”روشن گردے تھوڑی دیر کے لیے محل کے سارے شمع دانوں کو۔۔۔۔۔۔ روشن کر دے“ نائیکی۔۔۔۔۔۔ روشن کر دے۔“ اس بڑبڑاہٹ کے بعد اس کی الاپ اور تیز ہو گئی۔۔۔۔۔۔ پھر ذرا دیر بعد ہی یکا یک محل کے سارے شمع دان ہنس پڑے اور اندھیرے دربار میں اُجالا پھیل گیا۔

سارے درباری گردن اٹھائے روشن شمع دانوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خود شہنشاہ اکبر بھی حیرت بھری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا پھر اچانک دربار میں اس کی آواز گونج اُچی ”اپنے دیکھ راگ سے ان نیچے شمع دانوں کو روشن کر کے تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس راگ کا ایک اکیلا وارث صرف تان سین ہی نہیں ہے بلکہ۔۔۔۔۔۔“

”نمبریے جہاں پناہ، یہ دیکھ راگ نہیں تھا۔“ اچانک تان سین نے اپنی جگہ سے اٹھ کر شہنشاہ اکبر کی بات کاٹ دی اور آگے بولا ”یہ بوڑھا آپ کو فریب دے رہا ہے جہاں پناہ!“

”کیسا فریب؟“ شہنشاہ اکبر نے گرج کر کہا ”بھئی ہوئی شمعوں کو ہم نے اور سارے دربار نے اپنی آنکھوں سے چلتے دیکھا ہے اور تم یہ کہہ رہے ہو یہ فریب ہے؟“

”جی ہاں عالم پناہ! یہ کن ہڑاجادو ہے۔“ تان سین نے جواب دیتے ہوئے کہا ”اور اس جادو کی راگ کو اس فریبی نے دیکھ راگ کہہ کر پیش کیا ہے۔ یہ نظر بندی ہے جہاں پناہ آنکھوں کا دھوکا ہے۔“

”اپنی بکواس بند کرو میاں تان سین!“ بوڑھا گویا بھی اپنی ہلکے پر کھڑا ہو گیا اور بولا ”تم کیا جانو دیکھ راگ کسے کہتے ہیں؟ دوسروں کے فن سے حسد کرنا اور جتنا تو تمہاری فطرت میں شامل ہے اور اسی حسد میں تم نے میرے جوان بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ وہ تمہاری گدی نہ چھین لے۔“

”اس جرم کی سزا تو مجھے مل چکی ہے عالم پناہ!“ تان سین نے بوڑھے گویے کی جانب دیکھنے کے بجائے شہنشاہ اکبر سے کہا ”لیکن پھر جی میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی یہ ہل سازی ایک حقیقی گویے کے سامنے نہیں چل سکتی میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں کہ یہ دیکھ راگ نہیں تھا۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ دیکھ راگ نہیں تھا؟“

”اس لیے جہاں پناہ میں دیکھ راگ کے ایک ایک سُر ایک ایک تان اور ایک ایک راگ سے واقف ہوں۔“ تان سین نے کہا ”اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ دیکھ راگ نہیں تھا۔“

”تو پھر شمع دان کیسے روشن ہو گئے؟“

”میں نہیں کہہ سکتا جہاں پناہ!“ تان سین نے کہا ”یہ جادو، فریب، اندر جال، نظر بندی کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن دیکھ راگ ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”کیا ثبوت ہے میاں تان سین کہ تمہاری بات سچ ہے؟“ شہنشاہ اکبر نے پوچھا۔

”اپنی بات کی سچائی کے لیے میں اجیر کے خلیفہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ دیکھ راگ نہیں تھا۔“ تان سین نے کہا۔

”فن کو فن سے نہ جیت پانے پر تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔“ شہنشاہ اکبر نے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم جھوٹے ہو پہلے بھی جھوٹ بولتے رہے ہو تمہاری بات پر کیسے یقین کیا جائے؟“ اجیر کے خلیفہ کیا تم کو سوا کی ہری داس کی قسم بھی کھا سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔“

”بس! بس۔۔۔۔۔۔ جہاں پناہ!“ تان سین نے ایک ہاتھ سے اپنا سینہ مسلتے ہوئے کہا ”میری بھول کی آپ نے مجھے سزا دے دی ہے لیکن میرے معزز استاد کو کچھ نہ کہیے۔ دیکھ راگ ان کی سب سے بڑی وراثت ہے میرے پاس جس کا حق دار دنیا میں صرف اکیلا میں ہی ہوں۔“

”تو تم دیکھ راگ گا کر اپنے دعویٰ پر مہر لگا دو میاں تان سین!“ راگنی نے اٹھ کر کہا ”جہاں پناہ تمہیں شاہی دربار میں آخری بار گانے کا موقع دے سکتے ہیں۔“

”جو یوزیری نہیں ہے میاں تان سین!“ شہنشاہ نے کہا ”ہم تمہیں دربار میں گانے کا ایک آخری موقع دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں اپنے جرم کی سزا بھگتنے کے لیے بن باس جانا ہی ہوگا۔ کہو کیا کہنا ہے تمہیں؟“

”کاش میں گاسکتا جہاں پناہ!“ تان سین نے اس بار اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ مسلا اور بڑے درد بھرے لہجے میں بولا ”اس راگ کو گانے کے لیے اپنے کلیجے میں جو آگ میں لگاؤں گا اسے سیکھ ملہا رہا گانے والے کے سوا کوئی اور شخص انہیں کر سکے گا اور سیکھ ملہا رہی بیٹی ہی گاسکتی ہے جو یہاں سے دور گوالیار میں ہے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے جہاں پناہ!“ بوڑھے گویے نے اٹھ کر کہا ”یہ اپنی خامیوں کو چھپانے کا بہانہ ہے۔ آخر میں نے بھی تو آپ کے سامنے یہی راگ گایا ہے۔“

”چپ رہو فریبی بڑھے۔“ تان سین نے غصے میں اسے ڈانٹ کر کہا ”تو نے بھرے دربار میں ہم سب کو بے وقوف بنایا ہے۔ ہماری نظر بندی کر کے تو نے یہ تمہیں جلائی ہیں۔ تو جادوگر ہے جادوگر۔ لیکن اب میں گاؤں گا اپنے استاد کی

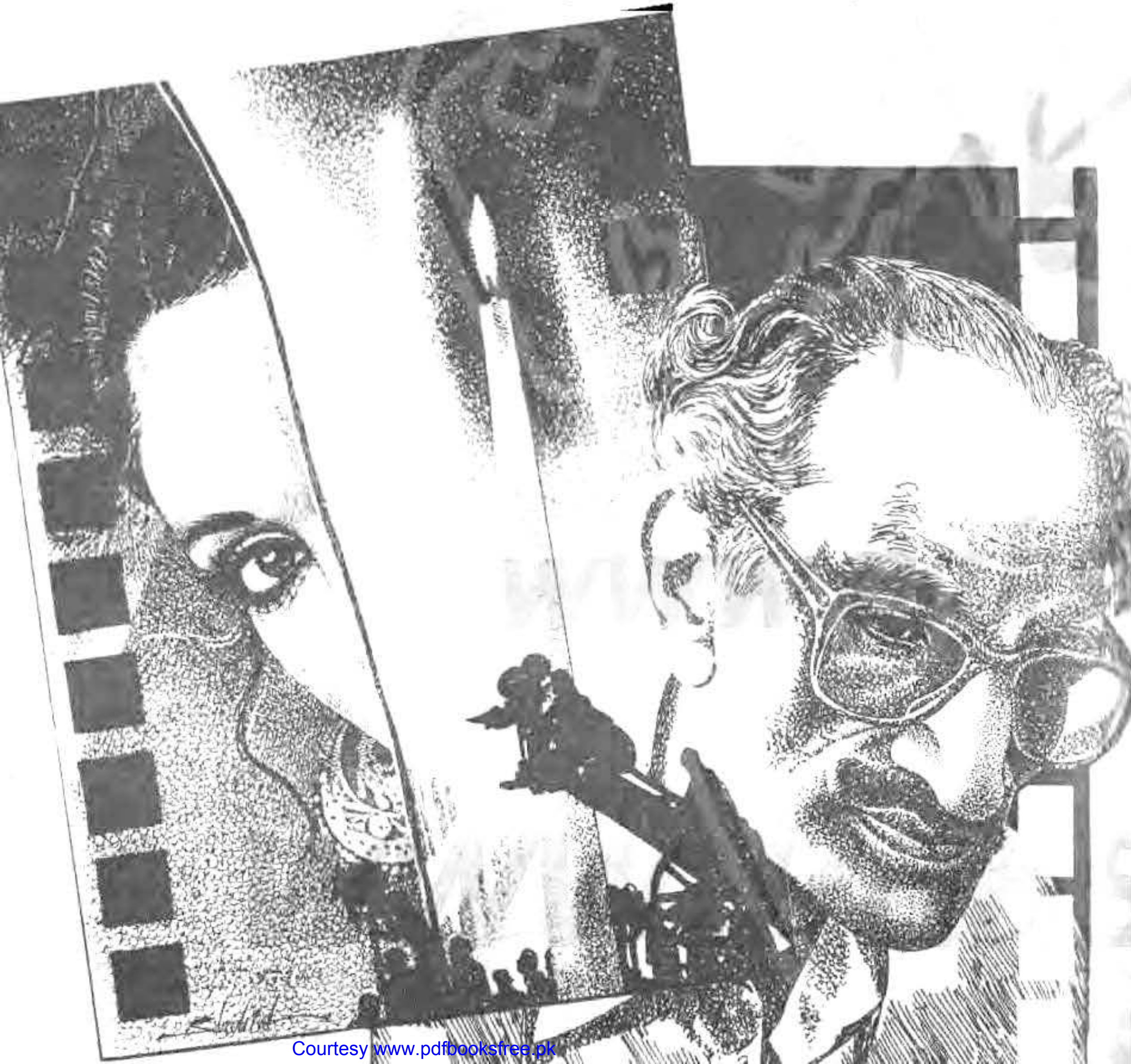
یہ اجنبی سی منہ لیں اور زخموں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستوں
آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عزت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستوں

علی سفیان آغا کی یادداشتیں

2039

ایسے در روزگار خال خال ہی فطر آتے ہیں جو نصف صدی سے
علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوئے اور
اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ اُن کے ذہن و سما کی پیرو
میں کوئی کمی واقع ہو نہ اُن کا قلم کبھی قہقہے کا شکار نظر آئے
آفاق صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں۔ وہ جس شخص سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے
فشان اُس کی پیشانی پر قسرت کو دیتے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی
سے وابستگی کے دوران میں اُنھیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے
ملنے اور اُس کے بارے میں گاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شہید اور میل
ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طویل اور بہت زیادہ قابل رشک ہے
آئیے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات
کریں۔ ورنہ اس عہد کا فضاں کر دین جو آج خواب معلوم ہو گا۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان دراز سال سرگزشت



کا خون کر کے میرے کیچے میں آگ لگا لی تھی اور میں نے
اندراجال کا کرشمہ دکھا کر اس آگ کو تمہارے کیچے میں لوٹا دیا۔
بے وقوف تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ میرا دیکر راگ تو ایک
جادو کی کھیل تھا۔ کیا تم نے دیکھا تھا کہ سارے شمع دان ایک
لمحے کے لیے جل کر دوسرے ہی پل بجھ گئے تھے۔ یہ سب
ہماری ایک چال تھی کہ تم غصے میں آ کر دیکر راگ کا ڈھک
اور وہی ہوا اور اب جو یہ شمع دان روشن ہیں یہ سچ سچ دیکر
راگ سے جلانے گئے ہیں۔ تمہارے کیچے کا سارا خون چوس
کر یہ بہت دیر تک جلتی رہیں گی اور تم بھی جلتے رہو گے
ترتے رہو گے اس وقت تک جب تک موت ملہار تمہارے
جسم کو ٹھنڈا نہیں کر دیتی۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔

بوڑھے کو بے کے چپ ہوتے ہی دربار میں ایک گہرا
ساتا اور گہری اُداسی چھا گئی۔ سینے کی جلن سے ترپتے ہوئے
تان سین کی نبض پر ہاتھ رکھ کر شاہی حکیموں اور ویدوں نے
بے بسی سے اپنا سر ہلا دیا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے تان سین کی
خوابش کے مطابق فوراً ہی تیز رفتار گھڑ سواروں کا دستہ تان
سین کی بیٹی کو لانے کے لیے گوالیار بھجوا دیا تھا لیکن بیٹی کے
آنے تک تان سین کے تپتے ہوئے جسم کو جتنا کے کنارے
پانی میں لٹا دیا گیا۔ لیکن اس کے سینے کی جلن کم ہونے کے
بجائے بڑھتی ہی رہی اور تان سین اس آگ میں پانی میں
پڑا پڑا ہی جلتا رہا۔

آگرہ سے گوالیار اور گوالیار سے آگرہ ایک لمبا فاصلہ
تھا۔ بیٹی کے آتے آتے سرنگیت کا سورج غروب ہو چکا تھا
تان سین کی بیٹی نے آ کر اس کی لاش کے پاس بیٹھ کر میٹھ
ملہار گایا جس کی وجہ سے سات دنوں تک دلی اور آگرہ کی
سڑکیں پانی میں ڈوبی رہیں۔ خوب بارش ہوئی زمین پر بہتے
پانی نے میٹھ ملہار کی طاقت سے آگرہ کی اونچی اونچی چوٹیوں
پر اپنا سردے مارا۔ سیلاب کی سی کیفیت سے آس پاس کے
گاؤں میں تباہی کی سی حالت پیدا ہو گئی لیکن راگ میٹھ ملہار
سے بھی تان سین کے جلتے جسم کو زندہ نہیں ملی۔ تان سین نے
اپنے سینے میں آگ بھر کر جو دیکر راگ گایا تھا اس دیکر
راگ کی آگ نے خود تان سین کے جسم کو ہی راگ کے ذمیر
میں تبدیل کر دیا تھا۔

اور دیکر راگ کے سانپ کا ڈسا تان سین میٹھ ملہار
کے پانی سے بھی پھر زندہ نہ ہو سکا۔ تان سین کی یہ دردناک
موت رانگی اور اس کے بوڑھے بابا کی جیت تھی۔ انہوں نے
اپنے بیٹے اور بھائی ملہار کے قتل کا بدلہ لے لیا تھا۔

آبرورکھ کے لیے مجھے گانا ہی ہو گا۔ اتنا کہہ کر اس نے
شہنشاہ اکبر کی طرف دیکھا اور پھر ادب سے جھک کر بولا
”جہاں پناہ آپ نے تو میری زندگی بخش دی ہے۔ مجھے
موت کی سزا نہیں دی گئی لیکن اب میں سنگیت کی زندگی
بچانے کے لیے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال رہا ہوں
اور میرے یہ دشمن بھی یہی چاہتے ہیں لیکن آپ سے میری یہ
آخری درخواست ہے کہ اگر دیکر راگ گانے کے بعد میرا
کیچا جلنے لگے تو میری بیٹی کو گوالیار سے فوراً بلا دیجئے گا۔ تاکہ
وہ میٹھ ملہار کا کر میری آگ کو ٹھنڈا کر دے۔“

اس کے بعد شہنشاہ اکبر کے اشارے پر شمع دانوں کو پھر
سے بچھا دیا گیا اور پھر تان سین نے آگے بڑھ کر زمین کو چوم
کر اپنے استاد ہری داس کو دل ہی دل میں یاد کیا اور دربار
کے پتھوں بیچ قالین پر اپنا تانپورہ لے کر بیٹھ گیا۔

تانپورے کے تاروں نے دیکر راگ کے سرچھیڑے
اور آفتاب موسیقی نے اپنی موت کا ترانہ شروع کیا۔ اس کی
الاپ نے دھیرے دھیرے مدھم کی زمین چھوڑی اور ددگنے
کی چڑھائی پر چڑھانے لگی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دیکر
راگ کے سُروں نے دربار میں موجود تمام لوگوں پر مدھوشی کی
سی کیفیت طاری کر دی۔۔۔۔۔ درباری واہ واہ کر رہے تھے اور
جمجم رہے تھے۔ شہنشاہ اکبر بھی جو اجنبی نوجوان کو بے ملہار
کے قتل سے ناراض ہو کر تان سین سے بات کرنا بھی گوارا نہیں
کر رہا تھا وہ بھی اس کی الاپ پر اپنا سر ہلانے لگا تھا۔

تان سین کی تان اب اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی
جو اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی روشنی کو منانے کے لیے
دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھتی جا رہی تھی سُروں کی
چال تھی کہ پہل پہل بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ سچ ہی آج
تان سین اپنے فن کی بلند یوں پر نظر آ رہا تھا اور اس کی درد
بھری الاپ تمام حدود کو پھیلائی نظر آ رہی تھی۔

ایک ایک تمام شمع دانوں نے ہنس کر اپنی آنکھیں کھول
دیں اور دربار کا کوٹنا جھگڑا اٹھا۔ دیکر راگ کی طاقت
کا مایاب ہوئی لیکن تان سین کو یہ فتح بہت مہنگی پڑی۔ اپنے
کیچے میں بھیا تک جلنے کے لیے تان سین درباریوں کی داد کا شکریہ
ادا کرنے کے لیے بہ مشکل اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کا ایک ہاتھ
زور زور سے اپنے سینے کو مسل رہا تھا اور دوسرا ہاتھ سلام کے
لیے پیشانی تک اٹھا ہی تھا کہ اچانک تان سین اپنی ناگوں پر
اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دم سے بیٹھ گیا۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔
ہا۔۔۔۔۔ چلو آفتاب موسیقی۔۔۔۔۔ اپنی آگ میں ہی جلو۔۔۔۔۔ اچانک
بوڑھا گویا پاگلوں کی طرح چیخ پڑا ”تم نے میرے معصوم ملہار

بیماری میں انسان کو عموماً تین چیزیں یاد آتی ہیں۔
 ”اللہ تعالیٰ، اماں اور بیوی۔“ تجھ جب بہت چھوٹا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کو علم نہیں ہوتا۔ بھلا چھ ماہ یا ایک سال کا بچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مہربانی کے بارے میں کیا جان سکتا ہے؟ البتہ جب وہ بولنا شروع کرتا ہے تو اس کی زبان سے اماں، امی، ماما کے الفاظ نکلتے ہیں۔ کیونکہ اس عمر میں وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ سارے گھر میں صرف ایک ہستی ہے جو اس کے ہر درد کا مداوا کر سکتی ہے اور وہ ہے ماں! عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچے کی معلومات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ بہت حیران ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی بھی ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور با اختیار ہے۔ اس عمر میں بچوں کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ ماں باپ، استاد اور گھر والوں کی گفتگو سن کر وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ جو اتنے با اختیار اور ساری دنیا کے مالک ہیں۔ دیکھنے میں کیسے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں، کیا کھاتے پیتے ہیں؟ اس عمر میں بچے آپس میں اس قسم کی باتیں کرتے سناتے دیتے ہیں۔

”ہاں بھی ہے تم کو اللہ تعالیٰ کتنے بڑے ہیں؟“
 ”ہاں ہاں، معلوم ہے..... وہ بہت بڑے ہیں۔ ہم سے بہت بڑے۔“
 ”جب وہ اتنے بڑے ہیں تو رہتے کہاں ہیں؟“
 ”آسمان پر۔“
 ”مگر جب وہ ٹانگیں پھیلاتے ہیں تو کیا وہ زمین تک آ جاتی ہیں۔“
 ”ارے بے وقوف! انہیں ٹانگیں پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو ہر وقت لینے رہتے ہیں۔“
 اس قسم کی گفتگو آپ نے اکثر معصوم بچوں کی زبانی سنی ہوگی۔ بچوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ بہت چھوٹے معصوم بچے جب کسی چیز کی بڑائی بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں ”وہ بہت بڑے ہیں، اللہ تعالیٰ سے بھی بڑے۔“

”ارے بے وقوف، اللہ تعالیٰ سے بھی بڑا کون ہو سکتا ہے؟ وہ ساری دنیا کو اپنے اشارے سے چلاتے ہیں۔“
 ”میرا مطلب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے تو چھوٹے ہیں مگر اور سب سے بڑے ہیں۔“
 اس طرح جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں بچوں کی

معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اماں کی زبانی سنتے ہیں کہ اللہ سے دعا کرو۔ دینی پیاروں کو تندرستی دے سکتا ہے تو پھر بچے جب بیمار ہوتے ہیں تو تکلیف میں بھی پہلے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، اس کے بعد اماں کو۔

یہی بچے جب اور بڑے ہو جاتے ہیں، شادی شدہ اور صاحب اولاد ہو جاتے ہیں تو انہیں علم ہوتا ہے کہ اماں (اگر زندہ ہیں) تو پہلے کی طرح حصار داری نہیں کر سکتیں۔ اب فرائض بیوی کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی بیوی کی خصلت، محبت اور خدمت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ شوہر کی کتنی اور کس طرح دیکھ بھال کرتی ہے۔ لہذا بیماری کی صورت میں اب انسان اللہ تعالیٰ اور بیوی کو ہی پکارتا ہے۔

اس تعارف کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پچھلے دنوں جب ہم زیادہ بیمار ہوئے تو شدید بخار کے عالم میں اللہ تعالیٰ اور لفظی کو پکارتے رہتے تھے۔ ایک روز ہمیں خیال آیا کہ ہم اماں کو تو بھول ہی گئے۔ انہیں ہماری لازماً بہت فکر ہوگی۔ اس روز ہم نے اماں کو بھی بہت پکارا اور یاد کیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے دن ہماری طبیعت بہتر تھی۔ ماں کو جنت کی چھاؤں بلا وجہ ہی تو نہیں کہتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس کا رتبہ مقرر کر دیا ہے۔

اب ہم آپ کو کیا بتائیں کہ ہم بذات خود کوئی کام نہیں کر سکتے یا اگر کرتے ہیں تو درست نہیں کر سکتے۔ بچپن میں ہماری تمام ضرورتیں اماں پوری کرتی تھیں، اب یہ ذمے داری ہماری تنگم لٹنی نے سنبھال لی ہے۔ کھانے پینے، دوائیوں کے استعمال، مختلف نمٹ، ڈاکٹروں کے پاس لانا لے جانا۔ کھانے پینے کا بندوبست کرنا۔ سردی کے موسم میں ہمیں گرم کپڑوں سے ڈھانپنا۔ راتوں کو اٹھ کر یہ دیکھنا کہ ہم ہر طرف سے لحاف سے ڈھکے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ہمیں سہارا دے کر غسل خانے لے جانا، جانیگہ پہنا کر غسل کرانا، جسم پر کریم لٹنا، ہماری پسند کے کھانے پینے کی کوئی چیز مہیا کرنا۔ وقت توڑی دیر کے بعد کھانے یا پینے کی کوئی چیز مہیا کرنا۔ وقت پر دوائیاں پلانا اور کھلانا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے لوگوں اور معاملات کا بھی خیال رکھنا اور اس تمام بھاگ دوڑ کے باوجود ہر وقت ہنستے رہنا۔ یوں تو سبھی اپنی بیویوں کو بہترین سمجھتے ہیں مگر درحقیقت ایسی بیویاں اللہ کم ہی لوگوں کو دیتا ہے اور ان کم لوگوں میں سے بھی بہت کم لوگوں میں ہم اپنا شمار کرتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ بیوی کے کتنے فائدے ہیں۔ گھر داری کرنا، گھر والوں کی دیکھ بھال کرنا، بیماری میں ڈاکٹر اور نرس کے فرائض ادا کرنا اور بیمار کا خود اس سے بھی زیادہ

خیال رکھنا، پریشانی اور دکھ میں تسلی دینا۔ نمازیں پڑھنا، دعائیں کرنا۔ اتنے بہت سے کام اور کون کر سکتا ہے سوائے بیوی کے بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں بیوی ہو۔ اور ہاں، یہ تو ہم بھول ہی گئے کہ جب ہم بیزاری کے عالم میں ہوتے تو وہ میگزینوں سے لطفے سنا کر ہمیں ہنساتی تھیں۔ کبھی کبھی ہماری پسندیدہ کتابوں کے اقتباس پڑھ کر بھی سناتی تھیں۔ اس طرح بیمار تو ہم تھے مگر بیماری تنگم کاٹ رہی تھیں۔

یہ مطور لکھنے کا مقصد میاں بیوی میں جھگڑے کرانا نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ شاید اس سے کچھ حاصل کر سکیں اور ایک مقصد ان سب لوگوں کے لیے شکر یہ ادا کرنا بھی ہے جو ہمارے بس میں نہیں ہے۔

☆☆☆

بیماری اور شدید بخار میں نیند تو آتی نہیں ہے۔ نیم غنودگی یا غنودگی سی طاری رہتی ہے اس لیے ہمیں اللہ کو یاد کرنے اور دعائیں پڑھنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا پڑتا تھا۔ سب سے پہلے تو ہمیں وہ ڈاکٹر یاد آئے جنہوں نے ہمارے حیرت انگیز علاج کیے۔ ان میں سے ہر ایک سے ہماری دوستی تھی۔ بے تکلفی تھی۔ یہ سب نہایت نفس انسان اور اعلیٰ درجے کے لوگ تھے۔

ڈاکٹر فیض احمد جو نیا، وہ ہمارے لیے جو بھی دوا کی بتاتے اس کو سب سے پہلے خود استعمال کر کے اس کی تعریفیں بیان کرتے رہے۔ انہیں ایک شوق پُرانی فلموں کے گالوں کا تھا۔ فرصت کے وقت وہ ہمیں پاس بٹھالیتے اور کسی پُرانی فلم کے گانے کا ایک بول پڑھ کر کہتے ”اب اس کا دوسرا مصرع تو بتاؤ۔“

کبھی ہم بتا دیتے اور کبھی غلط جواب دیتے۔ وہ ہماری کم علمی پر بہت ہنستے تھے اور پھر دوسرا مصرع بتا کر پوچھتے۔ ”آفاق صاحب، یہ بتائیے یہ کس فلم کا گانا ہے، کس نے گایا تھا؟ کس پر قلم لایا گیا تھا؟“

سچ تو یہ ہے کہ یاد ہونے کے باوجود ہم ڈاکٹر صاحب کے اچانک اور بے در پے سوالوں سے بوکھلا جاتے تھے۔ ان کا ایک دستور یہ تھا کہ کوئی مریض آ کر سلام کر کے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے۔ بعض مریض تو بے چارے شرمندہ ہو کر رہ جاتے تھے۔

ایک دن ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب، آپ ان سے ہاتھ کیوں نہیں ملاتے؟“

کہنے لگے ”آپ بھی ایسے ہی نکلے۔ کبھی کوئی شخص خدا جانے کہاں سے آ رہا ہے، ہاتھ میں کس قسم کے جراثیم لے کر

آیا ہے۔ اب میں ہر بار مصافحہ کر کے صابن سے ہاتھ دھوتا رہوں تو سارا دن اسی کام میں گزار جائے۔“

پہلے وہ آئی سرجن تھے پھر ہو میو پینک ڈاکٹر بن گئے اور آنکھوں کے لیے دوائیں وہ خود جڑی بوٹیاں ڈھونڈ کر بناتے تھے۔

انہوں نے موتیا کے علاج کے لیے از خود دوا کی بنائی تھی جو واقعی بہت موثر تھی۔ ان کی دوا کی سے ہمارا موتیا ایک بار تو بالکل صاف ہو گیا تھا مگر جب دوبارہ نمودار ہوا تو ہم نے پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب، آپ کی ایجاد تو ٹیل ہوئی۔“
 کہنے لگے ”ایجاد ٹیل نہیں ہوئی، آپ ٹیل ہو گئے۔ آپ کمزور بہت ہیں، پہلے اپنی کمزوری دور کریں۔“
 ”کیسے کریں، پہلوانی کریں؟“

”اچھی خوراک کھائیں اور یہ دوا کی استعمال کریں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ایک دوا کی کی شیشی اٹھائی، ہم سمجھے ہمیں پلا میں گے مگر وہ پہلے خود پی گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہم سے کبھی دوا کی کے پیسے نہیں لیے حالانکہ ان کے پاس دور دور سے مریض آتے تھے اور وہ فیس وصول کرنے کے معاملے میں۔ خامے فراخ دل تھے۔ اگر ہم کبھی کہتے بھی کہ ”ڈاکٹر صاحب، اچھا نہیں لگتا، ہم آپ سے کب تک مفت دوائیں لیں گے؟“

نہتے ”جب آپ تندرست ہو جائیں گے تو پانی پانی وصول کر لیں گے۔“

مگر ہوا یہ کہ ایک دن اچانک ان کا ہارٹ ٹیل ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام شیخ کا دکھ تو تازہ ہے۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والا، تندرست، اُن تھک انسان، چندھوں میں دنیا سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے ہوئے کہا ”ہم تو چلے۔“ اور چلے گئے۔

ان کے مریض بے شمار تھے مگر ان کے پاس لطفے بھی بے شمار تھے۔ سارے دن مریضوں کو لطفے سناتے رہتے تھے۔ خدا جانے وہ لطفے یاد کرتے تھے یا لطفے ان پر نازل ہوتے تھے۔ ہر مریض کے لیے حسب حال ان کے پاس نیا لطفہ ہوتا تھا۔

ہمارے تو وہ بے حد قریب تھے بلکہ بے حد محبت اور عقیدت کرتے تھے۔ ہر اچھی چیز جو کوئی انہیں لا کر دیتا، وہ ہمیں دے دیا کرتے تھے۔ فلمی ماحول میں مل کر جوان ہوئے تھے اس لیے فلمی الف لیلے پڑھنے کے لیے ضرور وقت نکال لیتے تھے۔ پڑھنے کے بعد اس کو دریا یاد دلاتے کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات بھی بیان کرتے اور پُرانے وقتوں اور پُرانے لوگوں کو یاد کر کے ہم دونوں اُداس ہو جاتے۔ اب جو ہم بیمار ہوئے تو وہ بہت یاد آئے۔ کیونکہ ہم پڑ پڑیشن کا حملہ ہوتا تو وہ



سراج الدولہ کا ایک منظر

ہم وہاں سے سیدھے ڈاکٹر عزیز کے پاس پہنچے۔
 ”ڈاکٹر صاحب، کیا ہومیو پیتھی میں ہرنیا کا علاج ہے؟“
 ”کیوں نہیں جی۔“
 ہم نے کہا ”ہمیں ہرنیا ہو گیا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد آپریشن کریں گے۔“
 ”ہرنیا بائیں جانب ہے یا دائیں جانب؟“
 ”دائیں جانب۔“
 ”کوئی ہات نہیں ہے۔ آپ کے پاس پلاؤڈنا 200 ہے؟“
 ”جی ہاں۔“
 ”تو دو سو کی ایک خوراک ہر روز صبح لیں اور آٹھ دن بعد مجھے بتائیں۔“
 ہم نے فوراً یہ آسان علاج شروع کر دیا۔ چند دن گزر گئے اور ہم بھول بھی گئے کہ ہمیں ہرنیا تھا۔ ہم نے اپنا پیٹ دبایا کر دیکھا۔ کوئی تکلیف بھی نہ درم۔
 ہم نے فوراً ڈاکٹر صاحب کو فون کیا ”ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم!“
 ”ہاں جی، فرماؤ۔“
 ”ڈاکٹر صاحب، ہمارا ہرنیا تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب کیا کریں؟“
 ”ہفتے میں دو خوراکیں لے کر دوائی چھوڑ دیں۔“

اور پھر لو اسے نو اسی کی پرورش بھی ہومیو پیتھک دوائیوں پر ہی ہوئی ہے۔ انہیں تو بہت سی دوائیوں کے نام اور استعمال کا علم ہے۔ کھانسی ہو، گلا خراب ہو، پیٹ میں گڑبڑ ہو، وہ خود ہی مخصوص دوائی نکال کر کھا لیتے ہیں۔

ہومیو پیتھک دوائیاں میٹھی ہوتی ہیں۔ اس لیے بچے بہت شوق سے کھا لیتے ہیں۔ زیادہ چھوٹے بچے تو سویت کچھ کر شیشیاں خالی کر دیتے تھے۔ بہت مشکل سے ان سے چھپا کر دوائیاں رکھی جاتی تھیں۔

ڈاکٹر عزیز دراصل تحصیل دار تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انہیں ہومیو پیتھی سے دلچسپی ہو گئی۔ ان کے پاس بہت تباب کتابیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب سے جب پہلی بار ملاقات ہوئی تو وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ ان کی آنکھوں پر بہت موٹے موٹے شیشے لگے ہوئے تھے۔ اس کو آپ صاحب شیشہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب وہ کوئی کتاب دیکھتے تھے تو اس کی اپنی عینک کے بالکل نزدیک لے جا کر پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہماری جسم تھا، ایک حیدر میں معمولی سالنگ بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس کے باوجود باقاعدگی سے نہ صرف کلینک میں بیٹھتے بلکہ اپنی جائیداد کے مقدمات بھی لڑتے تھے۔ جس روز وہ بغل میں بہت سی فائلیں دبائے نظر آتے تو معلوم ہو جاتا کہ آج مقدمہ بازی کا دن ہے۔

ڈاکٹر صاحب مناسب موقع پر ہی مسکراتے تھے۔ مذاق کرتے ہوئے ہم نے کبھی انہیں نہیں سنا۔ مگر نہایت خوش اخلاق اور سادہ انسان تھے۔

ڈاکٹر عزیز نے ہمارے رشتے داروں اور خود ہمارے ایسے علاج کیے کہ سن کر دوسرے ڈاکٹر زبھی حیران رہ گئے۔ ہم چونکہ بیک وقت کئی ڈاکٹروں سے علاج کراتے تھے اور ان کے ساتھ ہومیو پیتھی کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے اور جس ڈاکٹر کے علاج سے فائدہ ہوتا تھا، فوراً دوسرے ڈاکٹر کو اس سے مطلع کرتے تھے۔

ایک بار ایک ایلو پیتھ ڈاکٹر دوست نے ہمیں بتایا کہ آفاقی صاحب، آپ کو تو ہرنیا ہو گیا ہے۔

ہم نے پوچھا ”اس کا علاج کیا ہے؟“
 بولے ”نی الحال اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ آپ احتیاط کریں کہ تیز نہ چلیں۔ تیزی سے سیڑھیاں نہ چڑھیں۔ چھلانگیں لگانے سے پرہیز کریں۔“

”مگر آپ تو پرہیز بتا رہے ہیں، علاج کیا ہے؟“
 بولے ”علاج وقت آنے پر ہوگا۔ جب یہ ذرا بڑھ جائے گا تو آپ کا آپریشن کریں گے۔“

ہفتے کی دوائی کے لیے بھی صرف پچاس روپے لیتے تھے۔ ایک دن ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب، آپ کے اتنے اخراجات ہیں، آپ مریض بھی کم دیکھتے ہیں اور اتنی کم قیمت وصول کرتے ہیں۔“

بولے ”آفاقی صاحب، دراصل اللہ نے روزگار کا بندوبست کر دیا ہے۔ یہ دواخانہ میں نے کمائی کے لیے نہیں بنایا ہے۔ اللہ کی مہربانی سے دال دلیہ چل رہا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کے تین باقی پاس ہو چکے تھے مگر چند روز بعد پھر کلینک میں بیٹھنے نظر آئے۔ ہم ان کی کمزوری دور کرنے اور انہیں آرام کرنے کے مشورے دیتے رہتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے ”آفاقی صاحب، کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے مریض میں ہوں اور آپ ڈاکٹر!“

ایک بار ہم نے ایک صاحب کے بارے میں بتایا کہ وہ زائچہ بنا کر یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ آپ کو کیا امراض ہیں۔

مسکرائے اور بولے ”آفاقی صاحب، انہیں لا کر سامنے والے کمرے میں بٹھا دیتے ہیں۔ ہمارا آدھا کام تو ہو ہی جائے گا۔ صرف دوائی دینے کا کام باقی رہ جائے گا۔“

ڈاکٹر صاحب کے نمازی تھے۔ دست شامی، زائچے، وغیرہ پر بالکل یقین نہیں رکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ سب لوگ خدائی کام کر رہے ہیں۔ اگر اللہ کو مستقبل کا حال بتانا مقصود ہوتا تو ہر انسان کو خود ہی کیوں نہ بتا دیتا۔

ہم کہتے ”مگر ڈاکٹر صاحب، ستاروں اور چاند کا اثر تو دنیا اور دنیا والوں پر پڑتا ہی ہے۔“

”نعوذ باللہ۔ اسی لیے تو چاند، سورج اور ستاروں کی پوجا کی جاتی تھی۔“

ایک دن صبح فون آیا کہ ڈاکٹر صاحب بیٹھے بیٹھے چپ چاپ مر گئے۔

اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔ اللہ مغفرت کرے، خوب انسان تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عزیز اور ہمارا پچاس سال سے زیادہ ساتھ رہا۔ ماڈل ٹاؤن میں سڑک کے دوسری جانب ان کا کلینک تھا۔ اس کی اگلی گلی میں ان کا گھر تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے مراسم بڑھے تو انہوں نے بوقت ضرورت ہمیں وقت بے وقت اپنے گھر آنے کی اجازت بھی دے دی۔ اکثر ہم ٹیلی فون پر اپنا مرض بتا کر ان سے دوائیوں کے نام پوچھ لیتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھی ہومیو پیتھک دوائیوں کا ایک چھوٹا سا اسٹور ہے۔ ضرورت کی ہر دوائی یہاں موجود ہے۔ ہماری بیٹیاں



چکوری میں ندیم اور شیانہ

ہمارا حوصلہ بڑھاتے اور بتاتے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا نعمتیں دی ہیں جن سے کروڑوں لوگ محروم ہیں۔

ڈاکٹر زید ظفر کے انتقال کو کئی سال گزر چکے ہیں مگر یقین نہیں آتا کہ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ خود بھی آخری سالوں میں دل کے مریض ہو گئے تھے۔ صبح شام کنتی کے مریض دیکھتے تھے۔ ان کا کلینک سب سے زیادہ صاف ستھرا، خوبصورت اور سجا ہوا تھا۔

ان کے چہرے پر ہر وقت ایک مدہم سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ مریض کا حال سننے تو بھی مسکراتے رہتے۔ اعلیٰ درجے کے ہومیو پیتھ تھے۔ انہوں نے ہمارے اور ہمارے جاننے والوں کے حیرت انگیز علاج کیے۔ جن لوگوں کو ہومیو پیتھی پر یقین ہی نہ تھا، وہ بھی قائل ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی سیکریٹری جو مریضوں کے لیے وقت اور دن مقرر کرتی تھی، اس کی دی ہوئی تاریخ اور وقت کی پابندی ضروری تھی، وقت پر نہ آنے پر دوسرے مریض کا نمبر آ جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب دیر سے آنے والے کو دیکھتے ضرور تھے مگر دوسرے مریضوں کے بعد۔ مریض کا احوال سن کر بھی مسکراتے رہتے مگر یہ مسکراہٹ تسلی آ سیز ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے مل کر ہی نصف بیماری تو دور ہو جاتی تھی۔ ریٹائرڈ میجر تھے۔ ہومیو پیتھی کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ کلینک نہایت شاندار اور انرکنڈیشنڈ تھا۔ کام کرنے والی پانچ لڑکیاں بھی صبح شام موجود ہوا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں ایک



ظہیر رحمان ایک باصلاحیت ہدایت کار

صحت، شکل و صورت اور شخصیت میں ہم نے تو کبھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آپ حیات پی کر آئے ہیں۔

ایک دن صبح سویرے ان کی نیگم کا فون آیا ”ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔“

ہم فوراً چھاؤنی میں ان کی کوشی پر پہنچے۔ یہ ڈاکٹر صاحب بھی آنا فانا رخصت ہو گئے۔ ملازم نے بتایا کہ باہر سے کار

میں آ گئے۔ چند لمبے بعد نیگم صاحب نے ملازموں کو بلایا۔ ڈاکٹر صاحب کو ہارٹ ایک ہو گیا تھا۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے

یہ ڈاکٹر صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خوب آوی تھے۔ اچھے کھانے کے شوقین تھے۔ سودا سلف خود خرید کر لاتے تھے

اور کھانوں میں تجربے کرتے رہتے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب کسی خاص کھانے کی بات کرتے تو لگتا تھا جیسے خود بھی لطف

اندوز ہو رہے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے، بہت اچھے اور دیانت دار ڈاکٹر تھے۔ مریض کا حال سنتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ہمدردی کا ایسا جذبہ جھلکتا تھا جیسے اس کی تکلیف

خود بھی محسوس کر رہے ہیں۔ ☆☆☆

ڈاکٹر طارق محمد خاندانی حکیم اور ہومیو پیتھ تھے۔ ان کے دادا حکیم تھے۔ والد بھی حکیم اور ہومیو پیتھ تھے۔ وہ خود بھی

ہومیو پیتھ تھے اور بہت اچھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ چالیس پینتالیس سال کی عمر میں ہی تصوف کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔ فرصت کے وقت دین اور تصوف کی باتیں

ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک مرشد بھی تھے جن کے پاس باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے کلینک کا ہمارا دریافت کرنا ہو تو مزید بازار میں کسی سے دریافت کر لیں کہ دو آنے والے ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔ ہر کوئی ان کا پتا بتا دیتا تھا۔ وہ دو آنے

”اماں جی، آپ کے لیے بھی کافی ہے۔“ اماں کو یقین تو نہیں آیا مگر جب ایک ہفتے بعد ہی نمایاں فائدہ نظر آیا تو اماں ڈاکٹر اسد الرحمن کی مرید ہو گئیں۔ معمولی سی تکلیف بھی ہوتی تو فون اٹھا کر ان سے بات کر لیتیں اور وہ انہیں مطمئن کر دیتے تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب سے تعلقات بڑھتے گئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ جوں ہی ڈاکٹر اسد الرحمن آئیں گے، ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب جو ایک سرکاری اسپتال میں ملازم تھے، چند روز کے لیے لاہور سے باہر چلے گئے۔ انہی دنوں ہمیں سخت بخار چڑھ گیا جو اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ٹیسٹ بھی کرائے مگر بخار نے ہمارا

پہچان نہیں چھوڑا۔ ہم سخت چڑچڑے اور بد مزاج ہو گئے تھے۔ کسی قریبی دوست کا فون بھی آتا تو اسے برا بھلا کہتے۔

ان ہی دنوں پتا چلا کہ ڈاکٹر اسد الرحمن واپس آ گئے ہیں۔ وہ فوراً پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم مرض کی تفصیل بیان کرتے، انہوں نے کہا ”آقا فی صاحب، آپ کو تو

ٹائیفاؤڈ ہو گیا ہے۔“

”ٹائیفاؤڈ؟“ ہم ڈر گئے۔ بولے ”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ جو چھ گھنٹے کے وقفے سے یہ کپسول کھائیں، پرسوں آپ کا بخار کم ہو جائے گا

اور پھر اتر جائے گا۔“

ڈاکٹر صاحب نے نہ کوئی ٹیسٹ کرایا نہ تفصیل جاننے کی کوشش کی۔ تیسرے دن ہمارا بخار کم ہو گیا۔ دو دن بعد اتر گیا۔

ڈاکٹر صاحب ہمیشہ مریضوں کو سستی دوائیں تجویز کرتے تھے۔ ان خود غرض ڈاکٹروں سے وہ بہت ناراض تھے جو دوا کی دس روپے میں مل سکتی ہے، یہ اپنے کمیشن کے لالچ

میں دوسری کمپنی کی دوائی پچاس روپے قیمت کی لکھ دیتے ہیں۔ اب تو یہ پیشہ بھی خالص نہیں رہا۔

ڈاکٹر صاحب ایم بی بی ایس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ پھر ایسا دل لگا کہ واپس ہی نہ گئے۔ لاہور کے ایک خاندان میں شادی کی۔ بہت

مطمئن اور پرسکون انسان تھے مگر ملک کی سیاسی صورت حال کی وجہ سے اکثر پریشان رہتے تھے۔

ان کا اکلوتا بیٹا بھی ڈاکٹر تھا جو امریکا چلا گیا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک دو مہینے کے لیے بیٹے کے پاس چلے جاتے تھے۔

زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی

کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی یاد ہر روز ہمیں آتی ہے۔ خصوصاً جب بیمار ہوتے ہیں، اللہ نے کیسے کیسے لوگ بنائے ہیں، اللہ جنت نصیب کرے، آمین۔

☆☆☆

ڈاکٹر اسد الرحمن ایلا پیٹک ڈاکٹر تھے۔ دراصل وہ جنرل پریکٹیشنر تھے اور ان کی تشخیص غضب کی تھی۔ سب سے

پہلے انہوں نے اماں کا علاج شروع کیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن کے رہنے والے ایک ڈاکٹر کا اس زمانے میں بہت شہرہ تھا۔ گھریلو

تعلقات بھی تھے۔ اماں ان سے اس لیے خوش تھیں کہ وہ ہر روز بیڈن روڈ کے کلینک جاتے ہوئے پابندی سے اماں کا طبی

معائنہ کرتے تھے۔ بہت شائستہ اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ان کے تمام خاندان سے ہم لوگوں سے اچھے مراسم تھے۔

اب مشکل یہی تھی کہ یہ ڈاکٹر صاحب نے میں سات آنکھ دوائیوں سے زیادہ تجویز نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک خوراک

تھی۔ اماں بے چاری صبح کی گولیاں لے کر بیٹھیں تو دوپہر تک ایک ہی خوراک ختم نہیں ہوتی تھی اس لیے ناغہ ہو جاتا تھا۔ ہم

نے اماں کو بہت سمجھایا کہ آپ کسی اور ڈاکٹر کا علاج کریں۔ ان کی تو ایک ہی خوراک سے آپ کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ بیٹا، یہ پُرانے معائنہ ہیں۔ میرے مزاج کو بھی

جانتے ہیں۔ نیا ڈاکٹر تو میرا مزاج جاننے میں ہی ہفتوں لگا دے گا۔

ہم نے کہا ”اماں، یہ حکیموں کے زمانے کی باتیں ہیں۔ آج کل کے ڈاکٹر مزاج اور نبض وغیرہ سے واقف نہیں ہوتے۔ بس مرض تشخیص کر کے اس کی دوا دے دیتے ہیں۔“

بڑی مشکل سے اماں ڈاکٹر اسد الرحمن سے علاج کرانے پر راضی ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ہم کافی عرصے سے جانتے تھے۔ بہت ہی حلیم، آہستہ گو اور خوش مزاج انسان تھے۔

اماں کو آ کر انہوں نے سلام کیا۔ پھر معائنہ کیا، اس کے بعد پہلے ڈاکٹر کے نسخے دیکھے اور بولے ”اماں جی، آپ اتنی

بہت سی گولیاں کھاتی رہی ہیں؟“

”کیا کروں ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر کی بات تو ماننی پڑتی ہے۔“

ڈاکٹر اسد الرحمن نے ایک کاغذ پر ایک سیرپ لکھ دیا اور کہا کہ کھانے سے آدھے گھنٹے پہلے ایک بڑا چھوٹا شربت پی لیا کریں۔“

”مگر ڈاکٹر صاحب، آپ نے گولیاں تو لکھی ہی نہیں؟“



وحید مراد اور چتر اقلیم بھیا میں

اس کے بعد سے آج تک ہمیں ہر نیا کی شکایت نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر عزیز بہت بااخلاق آدمی تھے اور وضع وار بھی۔ ہم نے انہیں ہر ہفتے ”فیلی میگزین“ کی ایک کاپی پیش کرنی شروع کر دی۔ اگلی بار ہم دوائی لینے گئے تو ڈاکٹر صاحب

بولے ”میسے زیادہ نہیں ہیں، رہنے دیجئے۔“

”مگر ڈاکٹر صاحب.....!“

”دیکھو ناجی، آپ مجھے ہر ہفتے اتنا مہنگا میگزین دیتے ہو۔ میری دوا کی قیمت اس سے کم ہے۔“

ہم نے کہا ”ڈاکٹر صاحب، آپ مروت میں غلطی کر رہے ہیں۔“

”وہ کیسے جی؟“

”دیکھئے، ہمارا تو سارا خاندان ہفتے بھر آپ سے دوائی لیتا ہے، یہ سودا آپ کو مہنگا پڑے گا۔“

ڈاکٹر صاحب مسکرائے ”یہ تو ٹھیک ہے جی، اچھا آپ آدمی قیمت دے دیا کریں۔“

ہم ڈاکٹر صاحب کو عرصہ دراز سے جس حال میں دیکھتے رہے تھے، ہمیں امید نہیں تھی کہ ڈاکٹر بھی وفات بھی پائیں گے۔

ایک دن صبح ان کے گھر سے خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب کا رات کو انتقال ہو گیا۔ ہم نے دیکھا کہ چاند نیاں بھی ہوئی تھیں۔ کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ قرآن شریف کے سہارے رکھے گئے تھے۔ لوگ پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہو گئے مگر ہم یہ سوچ کر حیران ہو رہے تھے کہ کیا ڈاکٹر عزیز بھی مر سکتے ہیں؟

بہت خوبیوں والے انسان تھے۔ بے شمار مریضوں کو اللہ نے ان کے ذریعے شفا دی۔ مگر وہ شخص خود اپنا علاج نہیں

والے اس لیے مشہور تھے کہ ان کے دادا اور والد ہمیشہ دوائے کی دوائی دیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر طارق محمود وضع دار انسان تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ عید الفطر پر وہ مٹھائی اور عید الاضحیٰ پر گوشت لے کر نہ آئے ہوں۔ ہمارے ساتھ کچھ خصوصی تعلق قائم ہو گیا تھا۔ بیماری کا سینے تو خود ہی چلے آتے۔ ڈاکٹر صاحب کی تشخیص بہت اچھی تھی۔ بڑے بڑے سیریس مریضوں کو ان کے علاج سے تندرست ہوتے دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب اچھے، صحت مند آدمی تھے مگر پھر اچانک گھٹنا شروع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ بلند پریش کے مریض ہیں۔ ہم نے کہا ”ڈاکٹر صاحب، آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔ اپنا علاج کیوں نہیں کرتے؟“

بولے ”میں دوسرے ڈاکٹروں کے مشورے سے دوائی استعمال کر رہا ہوں۔“

ایک سال کے اندر ہی ڈاکٹر صاحب گھل کر آدمی بھی نہیں رہے۔ انہوں نے بذات خود بے شمار لوگوں کے بلند پریش کا علاج کیا تھا مگر اللہ کو منظور نہ تھا کہ وہ صحت مند ہوتے۔

ایک دن خبر ملی کہ ڈاکٹر طارق محمود کا انتقال ہو گیا ہے۔ مریضوں کا اتنا بڑا نقصان!

اب ان کا بیٹا عثمان ان کی جگہ بیٹھتا ہے۔ سارے انداز دیے ہی ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا یوں اچانک چلا جانا، بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

داستانیں تو بہت ہیں، اب ایک حکیم صاحب کا عجیب و غریب قصہ بھی سن لیجئے۔

بہت اچھے طبیب اور قباض تھے۔ ان سے اگر فون پر بھی پوچھ لو کہ حکیم صاحب، فلاں شربت یا دوائی کہاں سے لے گی؟ شام کو ان کا فرستادہ تین چار بوتلیں اور خمیرے کے چار چھ ڈبے لیے چلا آتا تھا۔

نام تو ان کا عبدالباقی چشتی تھا مگر ہم انہیں چشتی صاحب ہی کہتے تھے۔ صحت مند اور خوش خوراک انسان تھے۔ خود کھا کر اور دوسروں کو کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ہم جب بھی فون کرتے، وہ کہتے ”آفاق صاحب، کھانے کے لیے کبھی کچھ دقت نکالے نا۔“

وقت بہت آرام سے گزر رہا تھا۔ ایک بار معلوم ہوا کہ حکیم صاحب بیمار ہیں اور کئی دن شفا خانے بھی نہیں آئے۔ گھر پر فون کیا تو بہت کمزور آواز میں بات کی۔ پوچھا، حکیم

صاحب آپ کو تکلیف کیا ہے؟

جواب میں کہا ”پھر بتاؤں گا۔“

کچھ عرصے بعد جب وہ تندرست نہ ہوئے تو ہم نے پھر بیماری کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگے ”آفاق صاحب، کسی بد بخت نے جادو کر دیا ہے۔ نہ کھا سکتا ہوں، نہ پی سکتا ہوں۔ دن اور رات میں سو بھی نہیں سکتا۔“

کئی دن بعد ہم نے فون کیا تو کسی اور نے فون اٹھایا۔

ہم نے پوچھا ”حکیم صاحب اب کیسے ہیں؟“

”آفاق صاحب، کچھ نہ پوچھئے۔ سونے کے لیے لیٹے ہیں تو گھبرا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ نیند سے تو جیسے دشمنی ہو گئی ہے۔“

”آپ نے کوئی اور علاج بھی کرایا؟“

”بہت علاج کرائے۔ عاتلوں سے بھی مدد لی مگر ان کی حالت گزرتی جا رہی ہے۔ لیٹ کر یا بیٹھ کر سو نہیں سکتے اس لیے ساری رات صوفے کی پشت پر سر رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں۔“

جادو ٹوٹنے کا ہم نے بھی سنا تھا مگر اب خود دیکھ لیا۔

چند دن بعد حکیم صاحب انتقال کر گئے۔

یہ ہم نے ان چند معالجوں کا تذکرہ کیا ہے جو گزشتہ چند سالوں میں وفات پا گئے ہیں، ورنہ ڈاکٹروں، حکیموں اور ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کی ایک بہت طویل فہرست ہے۔ بہت صاحب کمال، دیانت دار، ہمدرد اور نیک سیرت ہونے کے علاوہ بہت اچھے معالج بھی تھے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ عجیب آدمی ہے جو اپنی بیماری اور ڈاکٹروں، حکیموں کا قصہ لے بیٹھا۔ ہمارا واسطہ ایسے ڈاکٹر اور حکیموں سے بھی پڑا ہے جو یکتائے زمانہ تھے۔ آج کل بھی ایسے کئی بے غرض اور مخلص ڈاکٹر موجود ہیں۔ اخبارات میں جب آج کے ڈاکٹروں کی سنگدلی اور مریضوں کی تکالیف سے بے پروائی کے واقعات پڑھتے اور سنتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کس قدر تبدیل ہو گئی۔ ورنہ ہم نے تو جو ڈاکٹر دیکھے وہ آج کل نایاب ہیں۔

جن دنوں ہم السر کے آپریشن کے بعد پوسی ایج میں زیر علاج تھے تو وہاں قریباً تمام ڈاکٹر ز امریکی تھے۔ وہ مطلب کی بات کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کرتے تھے۔ انہی مصروفیات کی وجہ سے مگر ہم نے مختلف مسائل کے بارے میں بحث چھیڑ کر ان سے دوستی کا نتھ لی تھی۔

اس زمانے میں وہاں ایک ہڈیوں کے ڈاکٹر تھے۔ وہ جب بھی اپنے مریضوں کے لیے خون محفوظ کرتے کوئی اور ڈاکٹر ہنگامی حالات کے باعث لے جا کر وہ خون استعمال کر لیتا تھا۔ آخر انہوں نے ایک بار اپنا خون لیا اور اس پر لکھ

دیا۔ کوئی ہاتھ نہ لگائے، ذاتی۔“

ایک دل کے مریض کو فوری ضرورت پڑی تو ڈاکٹر خون کی وہ بوتل بھی اٹھا کر لے گیا۔ آخر انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ اپنی بیٹی کا خون ایک بوتل میں محفوظ کر کے اپنے گھر کے فرج میں رکھ دیا اور اگلے دن اپنے مریض کا آپریشن کر کے اطمینان کا سانس لیا۔ تو جناب، ہم نے ایسے ڈاکٹر بھی دیکھے ہیں جن کی مثالیں دی جائیں تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔

ان ڈاکٹروں کا تذکرہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ جب تین ہفتے تک تیز بخار میں مدھوش رہے تو بہت سے پرانے ڈاکٹر اور حکیم یاد آ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے انسانیت کی بے لوث خدمت کی اور ساری زندگی مریضوں کو آسانیاں فراہم کرتے ہوئے گزار دی۔ کیسے لوگ تھے وہ بھی۔

شکریہ اے حسین انسانو
راستے جگمگاتے جاتے ہیں
اللہ تعالیٰ انہیں اجر عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

اس بخار کے عالم میں ہم نے تین کہانیاں بھی سوچی تھیں۔ تین ہفتے تک فی ہفتہ ایک کہانی سوچتے اور اس میں تبدیلیاں کرتے رہے۔ یہ کہانیاں ہمیں آج بھی یاد ہیں لیکن فائدہ کیا؟ بس دہنی ورزش کرتے اور بخار کو بھلاتے رہتے تھے۔

☆☆☆

بہاری کے دوران میں ہی ہم سوچتے رہے کہ اب تک کس کس کے بارے میں اور کیا کیا لکھ چکے ہیں۔ یاد آیا کہ پاکستان کے ایک بہت اچھے ہنرمند، ہدایت کار کو ہم نے اپنی فہرست میں تو شامل کر رکھا ہے مگر ان پر کبھی لکھا نہیں۔ ان کا نام حسن عسکری ہے۔ کم گو اور گوشہ نشینی میں عمر گزارنے والے۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اردو اور پنجابی فلموں میں نئی روایات قائم کی ہیں۔ انہوں نے بعض ایسے موضوعات بھی قلمائے جنہیں ہاتھ لگاتے ہوئے دوسرے ہدایت کار ڈرتے تھے مگر ان موضوعات کو انہوں نے شاہکار اور یادگار فلموں میں ڈھال دیا۔

وہ ایک تعلیم یافتہ اور تخیل سے بہرہ مند ہدایت کار ہیں۔ مثال کے طور پر ان فلموں کو دیکھا ہو تو یاد کیجئے اور نہ دیکھا ہو تو سی ڈی لا کر ضرور دیکھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہماری فلمی صنعت میں کیسے کیسے گہر بنایا بچھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے آج سے تیس پچیس سال قبل ایسے موضوعات پر دلچسپ اور انوکھی فلمیں بنائیں جن کو انڈیا میں آج بھی نہیں قلمایا جاتا۔

چند فلموں کے نام سنئے۔

اور ہاں..... طوفان جو پنجابی فلموں میں ایک روایت ساز فلم تھی، دوریاں میں انہوں نے ایک گورنر کی کہانی قلمبندی کی۔ سلاخیں، ترے پیار میں، گزرا، آگ، وحشی جٹ، دل کسی کا دوست نہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر فلمیں بنائیں اور انہیں یادگار بنا دیا۔ وہ اداکاروں سے کام لینے کے ماہر ہیں۔ فلموں میں ایک چھوٹے چھوٹے ہدایت کارانہ ٹچ لگاتے ہیں کہ ایک ہی شاٹ پر دیکھنے والا داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

انہوں نے 1972ء میں ہدایت کاری کا آغاز کیا تھا۔ یہ ایک پنجابی فلم تھی۔ ”خون اور پینا“ بہت کامیاب ہوئی اور نقادوں کو احساس ہوا کہ ایک حساس اور سمجھ دار ہدایت کار نمودار ہوا ہے۔ انہوں نے اب تک 55 کے لگ بھگ فلمیں بنائی ہیں۔ کم تعداد کی وجہ یہ ہے کہ وہ موضوع کو پسند کر کے ہدایت کاری کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں اور پھر فلم ساز کو تخلیقی کاموں میں دخل نہیں دینے دیتے۔ چلو عشق لڑائیں ان کے مزاج کی قلم نہ بھی مگر انہوں نے اسے بھی کامیاب کر دکھایا۔

اس دور میں پنجابی فلموں کے سپر اسٹار لالہ سدر جیر تھے۔ وہ ایکشن فلموں کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ ”خون اور پینا“ جاگیر داری نظام کے خلاف ایک باغیانہ فلم تھی۔ قلم ہر اعتبار سے بہت معیاری اور کامیاب تھی۔ ان کی فلموں کے موضوع اس تیزی سے تبدیل ہوتے تھے کہ فلم بین حیران رہ جاتے تھے اور یہ فلمیں کامیاب بھی ہوتی تھیں جن میں حسن عسکری کی تخلیقی صلاحیتوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ 1975ء میں انہوں نے اپنی ایک یادگار پنجابی فلم ”وحشی جٹ“ پیش کی۔ اس فلم نے نہ صرف بے حد کامیابی حاصل کی بلکہ پنجابی فلموں میں ایک نئے رواج کی داغ بیل ڈالی۔ یہ فلم احمد ندیم قاسمی کے افسانے ”گنڈاسا“ سے اخذ کی گئی تھی لیکن منظر نامے، اداکاری اور سب سے بڑھ کر ہدایت کاری نے اسے پنجابی فلموں میں ایک سنگ میل کی حیثیت دے دی۔ یہ فلم جنگ و جدل سے بھرپور تھی جس کے خلاف اظہار رائے بھی کیا گیا لیکن ایک فلم کی حیثیت سے یہ حسن عسکری کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

سلطان راہی کو ایک ایکسٹرا سے پنجابی فلموں کا ہیرو بنانے کا اعزاز ہدایت کار ڈار نے بخشا تھا اور وہ بطور ہیرو کامیاب بھی رہے تھے لیکن انہیں پنجابی فلموں کا سپر اسٹار بنانے کا کریڈٹ حسن عسکری کو جاتا ہے۔ انہوں نے اس فلم کو بہت آرٹسٹک انداز میں بنایا تھا جس کی وجہ سے یہ دوسری

پنجابی فلموں سے بدرجہ بہتر تھی۔ اگر سلطان راہی کو ہیرو ڈار صاحب نے بنایا تھا تو حسن عسکری نے سلطان راہی کو پنجابی فلموں کی ضرورت بنا دیا جو حیثیت انہیں آخری دم تک حاصل رہی۔ سلطان راہی نے اس فلم میں گنڈاسے کا بہت انوکھے انداز میں استعمال کیا تھا۔ یہ ہر اعتبار سے ایک اعلیٰ معیار کی فلم تھی۔ اس فلم کی نمائش کے بعد معیاری پنجابی فلموں کا دور شروع ہو گیا تھا۔

”طوفان“ ایک رنگین فلم تھی جو کہانی، اداکاری، کردار سازی، ہدایت کاری کے اعتبار سے ایک نیا اور کامیاب تجربہ تھا۔ سلطان راہی نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیا تھا اور ان کی ایک ٹانگ میں چلتے ہوئے معمولی سا ٹانگ پیدا کر کے ہدایت کار نے اس خالی کوئی اہم موقع پر بہت کامیابی اور خوبصورتی سے استعمال کیا تھا۔ یہ قلم حسن عسکری کی ہدایت کاری کے فن کا نمونہ تھی۔

1977ء میں حسن عسکری کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ آخری میدان، قانون اور سلاخیں۔ پہلی دو فلموں نے اوسط درجے کا بزنس کیا لیکن سلاخیں نے تھلکے محاذ پر کافی عرصے بعد حسن عسکری نے ایک خوبصورت اردو فلم پیش کی تھی جس نے اپنے موضوع اور ہدایت کاری کی وجہ سے ایک تھلکے محاذ پر اس فلم کے ذریعے انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ پنجابی اداکاروں میں بنانے پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ یہ بے حد کامیاب فلم تھی۔ محمد علی اور بارہ شریف نے اس فلم میں پہلی بار ایک ساتھ کام کیا تھا اور اداکاری کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ ایسی فلمیں پاکستان میں بہت کم بنی ہیں جنہوں نے موضوع، کرداروں کی خوبصورتی اور ہدایت کاری کے اعتبار سے اعلیٰ معیار قائم کیا ہو۔ اس فلم کی موسیقی بھی بہت اچھی تھی۔ اس فلم کا تقسیم سازنگ علی گلی گایا جاتا تھا۔ اس کے بول تھے۔

تیرے میرے پیار کا ایسا ناتا ہے
دیکھ کے تیری صورت دل کو چین آتا ہے
یہ قلم باپ بیٹی کے پیار کی انمول کہانی تھی۔

بارہ شریف نے اس فلم میں ڈبل رول ادا کیا تھا۔ یہ گولڈن جوبلی فلم تھی جس نے ہدایت کاروں کی صفِ اول میں حسن عسکری کا نام لکھوا دیا تھا۔ اس کے بعد ان کی پنجابی فلم ”میلہ اور اکبر خان“ منظر عام پر آئیں۔ قلم میلہ میں انجمن نے ایک یادگار کردار ادا کر کے فلم ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔ اس کے اگلے سال ان کی تین فلمیں قلاب ہوئیں۔ قلم سونے کی تلاش ایک دلچسپ فلم تھی مگر حسبِ توقع کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس فلم میں فی دی اداکار عابد علی نے سائنس دان کا

کردار کیا تھا۔ یہ فلم متوقع تاثر پیدا نہ کر سکی حالانکہ ایک اچھی پیشکش تھی مگر قلم ساز وہ لوکیشنز اور اشیا فراہم نہ کر سکا جو ضروری تھیں۔

1988ء میں حسن عسکری کی تین فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ مغرور، قاتل اور شیر خان۔ تینوں فلموں میں سلطان راہی مرکزی کردار تھے۔ مغرور میں سلطان راہی کی اداکاری قابلِ دید تھی لیکن یہ فلم زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ حسن عسکری کی اکثر فلموں میں مرکزی کردار سلطان راہی نے ہی ادا کیے تھے۔

قلم ساز شہزاد گل کی فلم ”ترے پیار میں“ حسن عسکری نے حقیقت کا رنگ بھرنے کے ساتھ ہی اسے ایک یادگار رومانی فلم بنا دیا تھا۔ یہ ایک بامقصد رومانی فلم تھی جس میں حسن عسکری اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ اس فلم نے بے شمار ایوارڈ حاصل کیے تھے۔

حسن عسکری کے ساتھ ہمیں بھی ایک بار کام کرنے کا موقع ملا۔ پاکستان میں جن دنوں بھارتی فلم نکاح میں کام کرنے کے بعد سلی آغا کا بہت چرچا تھا اور ہر فلم ساز انہیں ان کی شرائط پر سائن کرنے کو تیار تھا، قلم ساز شعی ملک انہیں کاسٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلی آغا بہت سی فلمیں اور ان سے فون کے ذریعے معاملات طے ہو رہے تھے۔

انہوں نے پہلے تو دریافت کیا کہ معنف کون ہوگا اور میں سائن کرنے سے پہلے کہانی پڑھوں گی جو دلچسپ رومانی اور انگلستان میں رہنے والی ایک دولت مند لڑکی کی کہانی ہونی چاہیے۔ اس فلم کا اسکرپٹ ایک مہینے میں مکمل ہونا چاہیے۔

یہ شرائط سن کر ہم نے تو صاف انکار کر دیا مگر شعی ملک سے ہماری گہری دوستی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آفاقی صاحب، یہ کام آپ کے سوا کوئی نہیں کر سکا۔ انہوں نے اتنے تقاضے کیے کہ عملاً سارا دن ہمارے گھر پر ہی گزارتے تھے۔ کبھی فون پر بات کرتے، کبھی بھینے کے چکر لگاتے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں سلی آغا کی پہلی فلم کا اعزاز سب سے پہلے انہیں حاصل ہونا چاہیے۔

ہم نے کہا کہ بھائی، کہانی تو تب لکھی جائے گی جب ہدایت کار کا انتخاب ہوگا۔ اس کے مشورے سے ہی یہ عجب و غریب قسم کی کہانی بن سکتی ہے۔ وہ دوسرے دن حسن عسکری صاحب کو لے کر ہمارے گھر آ گئے۔ ان سے ہماری پہلے بھی یادداشت تھی۔ وہ بہت انکسار اور خلوص سے ملتے تھے اور بہت احترام کرتے تھے۔ اب حسن عسکری صاحب کو ہم نے کچھ آئیڈیاز سنائے۔

ان میں سے ایک انہیں اور شعی ملک صاحب کو بہت پسند آ گیا۔

انہوں نے کہا ”آفاقی صاحب! بس دو دن میں اس کا آئیڈیا لکھ دیجئے، پرسوں سلی آفاقی آج ہی اس کا ایک دن کے لیے۔ یہ آئیڈیا انہیں جا کر سنانا ہوگا۔“

ہم نے کہا ”شعی صاحب، آپ آرٹسٹ کا دماغ اتنا خراب نہ کیجئے۔ وہ سلی آفاقی ہے، بالی ووڈ کی کوئی بڑی اسٹار نہیں ہے اور بالی ووڈ کی اسٹارز بھی اتنے خیر نہیں کرتیں۔“

ملک صاحب کا صرف ایک جواب ہوتا تھا۔ ”آفاقی صاحب، پلیز میری خاطر۔“

ان کی خاطر ہم نے کہانی کا آئیڈیا، اہم کردار اور اہم واقعات لکھ کر تیار کر دیے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ بولے ”میں نے کراچی کے لیے آپ کی اور حسن عسکری صاحب کی سٹیٹس بک کرا دی ہیں، ہوٹل کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔“

ہم نے عرض کی کہ آپ جانتے ہیں، ہم خود کہانی نہیں سنا سکتے۔ آپ عسکری صاحب، ملک صاحب کے ساتھ چلے جائیے۔ عسکری صاحب بہت اچھی طرح کہانی سنائیں گے۔“

ملک صاحب نے بمبئی فون کیا تو سلی آفاقی نے کہا کہ کہانی تو میں صرف مصنف کی زبانی سنوں گی۔

ہم نے پھر صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے ضد کی تو ہم نے کہا کہ وہ خود ہی کہانی پڑھ لیں۔ ہم تو نہیں سنائیں گے۔

اس کے بعد جب ان سے بے تکلفی ہوئی تو وہ اکثر مذاق اڑاتی تھیں کہ آپ کیسے کہانی نوٹس ہیں کہ کہانی نہیں سنا سکتے۔

بہر حال، عسکری صاحب اور شعی ملک صاحب کراچی آ گئے۔ وہاں سے ان کا فون آیا کہ سلی آفاقی کو کہانی پسند آ گئی ہے۔ وہ ہیرو کے لیے ندیم کی فرمائش کر رہی ہیں۔

ندیم سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا گیا تو ان دنوں وہ مصروف تھے۔ بعد میں فیصل رخصت کا نام زیر غور آیا۔ ہم فیصل کے گھر بذات خود گئے، ان کے والد سے ہماری بہت گہری دوستی تھی۔ انہوں نے بہت پذیرائی کی لیکن ان دنوں ان کے پاس بھی وقت نہ تھا۔

کافی بحث کے بعد ہم نے جاوید شیخ کا نام پیش کیا جو مزاحیہ اور ڈرامائی دونوں کرداروں کے ساتھ انصاف کر سکتے تھے۔ سلی آفاقی سے جاوید شیخ کی ملاقات کرائی گئی۔ شکر ہے کہ انہوں نے جاوید شیخ کی مشکوری دے دی۔

کون جانتا تھا کہ فلم کی تکمیل کے دوران میں ہی دونوں محبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ جاوید شیخ اپنی پسند

کی بیگم زینت منگھی اور دو بچوں کو چھوڑ کر سلی آفاقی سے شادی کر لیں گے۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ داستان ہے جو پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے۔

☆☆☆

لبنی بچیوں کے امتحان کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جاسکتی تھیں۔ اس لیے پہلی بار ہم نے تنہا ہی سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ حسن عسکری صاحب کے ساتھ ان کی بیگم تھیں جن سے ہماری پہلی ملاقات لاہور انٹرپورٹ پر ہوئی۔ بیگم عسکری سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ بہت باوقار، بااخلاق اور تعلیم یافتہ خاندان ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دونوں اولاد سے محروم ہیں مگر آپس میں بہت خوش ہیں۔ یہ 92-91ء کا ذکر ہے۔

بیگم عسکری نے آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران میں ہمارا بہت خیال رکھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ہمیں چائے تک بتانی نہیں آتی۔ اس لیے صبح کی چائے وہ کھڑکی پر دستک دے کر ہمیں پہنچا دیتی تھیں۔ شام کی چائے اور اکثر مرغن کھانا تھا کی محبت اور مہربانی سے مل جاتا تھا۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ گئے تھے مگر شادی کا اعلان نہیں کیا تھا۔

سلی آفاقی نے لندن پہنچ کر بہت مہنگے ملبوسات اور جوتوں وغیرہ کی خریداری شروع کر دی۔ ہم نے ایک ہزار پونڈ کے ایک لباس کے بارے میں سنا تو بے ہوشی طاری ہو گئی۔ سلی آفاقی کو روک ٹوک کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ شعی ملک لاہور میں تھے۔ انگلستان میں پروڈکشن کے انتظامات ان کے بھانجے جاوید ملک کے ذمے تھے۔ وہ نہایت شریف اور مہذب انسان تھے۔ شعی ملک صاحب کی ہدایت کے مطابق ہر ایک کا خیال رکھتے تھے اور تمام سہولتیں فراہم کرتے تھے۔ یوں بھی انہیں سلی آفاقی کے ہر حکم کی تعمیل کا حکم تھا۔

یوں تو وہاں بہت سے واقعات پیش آئے لیکن چند واقعات بہت دلچسپ ہیں۔ ہم یہ بتانا بھول گئے کہ فلم کا نام ”ہم اور تم“ تھا۔ یہ بہت دلچسپ رومانی کہانی تھی مگر سلی آفاقی کی مداخلت اور مشوروں کی وجہ سے اس کا تصور ہی بدل گیا۔ اس فلم میں ننھا، افضل بھی ہمراہ تھے۔ ننھا اداکارہ نازلی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے بقول ان کے انہیں لیلیٰ مجنوں کی طرح پیار تھا۔

سب سے پہلے لوکیشنز کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ یہ ایک دولت مند رئیس زاوی کی کہانی تھی اس لیے اس کی رہائش اور دوسری تقاریب کے لیے شاندار محل درکار تھے۔ ان دنوں موسلا دھار بارش تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی مگر ہم، جاوید صاحب، حسن عسکری اور ان کی بیگم، سب لندن کے

گروہ و لاج میں محلات تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کئی رئیسوں نے تو صاف انکار کر دیا۔ چند پرانے انگریز رئیسوں کو جاوید صاحب نے رضامند کیا۔ موسلا دھار بارش اور کڑا کے کی سردی تھی۔

انگلستان کے مشہور زمانہ ایک ڈسٹرکٹ میں جھیل کے اندر ایک وسیع و عریض شاندار محل تھا جہاں صرف کشتی کے ذریعے رسائی تھی۔ پروگرام کے مطابق انگریز رئیس کا کشتی بان ہم سب کو لینے آیا۔ اس نے اس قدر تیزی سے کشتی چلائی کہ ہمیں تو ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

ہم نے اس سے کہا ”بھائی، ہم حیرنا نہیں جانتے۔“ وہ بولا ”فکر نہ کریں، میں پیشہ ور غوطہ خور ہوں۔“ یہ سن کر ہمارا خون مزید خشک ہو گیا۔

محل کے ساحل پر پہنچ کر کشتی بان نے ہمیں اُتارا اور کچھ کہے بغیر غائب ہو گیا۔ بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی مگر بے حد ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

ہم لوگ محل کی طرف بڑھے تو سامنے ایک بورڈ نظر آیا ”خطرناک کتوں سے ہوشیار۔“

ہم سب ڈر گئے۔ دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ کس سے پوچھیں کس سے معلومات حاصل کریں؟ بیگم عسکری بولیں ”کچھ لوگ خوفزدہ کرنے کے لیے بھی ایسے بورڈ لگا دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں کتا ہی نہ ہو۔“

اس مشورے کے سہارے ہم کچھ آگے بڑھے تو اچانک محل کی جانب سے ایک خرگوش کے سائز کا خوبصورت کتا نمودار ہوا۔ وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت ناراض تھا۔ وہ اپنی نازک سی ریشمی آواز میں ”بیخ بیخ“ کرتا رہا۔ اس کی آواز شاید دو فٹ کے فاصلے تک بھی نہیں جا رہی ہوگی مگر وہ جان لڑا کر بھونک رہا تھا اور بار بار ہم لوگوں پر حملہ آور ہو رہا تھا۔

بیگم عسکری کے سوا سب اس سے ڈر گئے۔ جب وہ ان کے نزدیک پہنچ کر ”بیخ بیخ“ کرنے لگا تو انہوں نے لات مارنے کے انداز میں پیرا اس کی طرف اٹھا کر ڈانٹا تو وہ ”بیخ بیخ“ کر کے ان سے دور بھاگ گیا مگر دوسروں پر بدستور حملہ آور ہوتا رہا۔

ہم چاروں طرف دیکھ رہے تھے کہ بھی کس سے مدد طلب کریں۔ جب خرگوش نما کتا اس تمام کوششوں کے باوجود ہمیں ڈرانے میں ناکام رہا تو ”بیخ بیخ“ کرتا ہوا محل کی طرف واپس چلا گیا۔ ہم نے سوچا کہ چلو، جان بچی اور لاکھوں پائے۔ ابھی پوری طرح سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہی خرگوش کے سائز کا کتا دوبارہ نمودار ہوا۔ اس بار اس کے

ساتھ ایک گدھے کے سائز کا ٹوناک صورت کا کتا بھی تھا۔ شاید وہ اس بڑے کتے کو اپنی مدد کے لیے لے کر آیا تھا۔

اس دیرانے میں اتنے بڑے سائز کے کتے کو دیکھ کر ہم سب سہم کر رہ گئے اور دفاعی طور پر اکٹھے بھی ہو گئے۔ ہمارے پاس تو کوئی چھوٹی سی لکڑی بھی نہ تھی کہ اس کو ڈرانے کی کوشش کرتے۔

یہ مددگار کتا (بقول جاوید صاحب کے غنڈہ) ہم سے کچھ دور آ کر رک گیا۔ پہلے تو اس نے جھوٹے کتے کی بیخ بیخ نما رپورٹ سنی اور پھر تمام واقعات سے واقف ہونے کے بعد ناراض ہو کر اپنے خوفناک دانت نکال کر غرایا اور ہماری طرف بڑھا۔ ہم سب واقعی خوف زدہ ہو گئے۔ اس قسم کے خوفناک کتے صرف بھونکتے ہی نہیں کاٹ بھی لیتے ہیں۔

جب وہ دانت نکال کر غراتا ہوا ہماری طرف بڑھا تو ہم سب نے اس کو بہت زور سے ڈانٹا۔ یہ ڈانٹ نہیں دراصل ہماری خوف زدہ آوازیں تھیں۔ اتنی بہت سی آوازیں سن کر وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ لان میں کوئی پتھر بھی نہیں پڑا تھا کہ ہم اسے پتھر سے ہی ڈراتے، کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا کہ وہ غراتا ہوا ہماری طرف بڑھتا اور ہم سب کی آوازیں سن کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اس دوران میں چھوٹا کتا بھی بیخ بیخ کر کے اچھل کود میں مصروف تھا۔

یہ سلسلہ دو چار منٹ جاری رہا مگر ہمیں یوں لگا جیسے گھنٹوں بیت گئے، اتنی دیر میں محل کی طرف سے ایک کارندہ یا ملازم قسم کا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے دونوں کتوں کو ڈانٹ کر چپ کرایا اور پھر ہماری طرف بڑھا۔

”آپ لوگ کون ہیں اور یہاں تک کیسے آ گئے؟“ ہم نے بتایا کہ ڈیوگ نے ہمیں مدعو کیا ہے اور ہم کشتی کے ذریعے یہاں آئے ہیں۔ کشتی والا ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اور ان کتوں سے واسطہ پڑ گیا۔

تیز چلتی ہوئی ہوا میں بیگم حسن عسکری کی مثال پھڑ پھڑ رہی تھی۔ وہ شخص بولا ”اگر آپ نے ایسا لباس نہ پہنا ہوتا تو کتے آپ پر اتنے ناراض نہ ہوتے۔“

ہم خاموش رہے۔ وہ بولا ”آئیے میرے ساتھ۔“ ہم نے کہا ”پہلے ان کتوں کو یہاں سے لے جائیے۔“ اس نے کہا ”آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اس وقت میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے کتوں کو پکڑا۔ جواب میں بڑے کتے ہم خاموش رہے۔

وہ بولا ”آئیے میرے ساتھ۔“ ہم نے کہا ”پہلے ان کتوں کو یہاں سے لے جائیے۔“ اس نے کہا ”آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اس وقت میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے کتوں کو پکڑا۔ جواب میں بڑے کتے

ہم خاموش رہے۔ وہ بولا ”آئیے میرے ساتھ۔“ ہم نے کہا ”پہلے ان کتوں کو یہاں سے لے جائیے۔“ اس نے کہا ”آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اس وقت میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے کتوں کو پکڑا۔ جواب میں بڑے کتے

نے اس کو پیار کر لیا۔ چھوٹا مجبور تھا اس لیے اچھل اچھل کر رہ گیا مگر اس کے پیروں سے چٹ کر اٹھ کر محبت کرتا رہا۔ محل کے سامنے دو طرفہ سڑکیاں تھیں۔ اس کے بعد محل کی عمارت تھی۔

انگریز ملازم نے کہا ”آپ یہاں ٹھہریے۔ میں اندر خبر کرتا ہوں۔“

ہم نے کہا ”مگر ان کتوں کو بھی ساتھ لے جائیے۔“ وہ کتوں کے ساتھ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آیا اور بتایا کہ لارڈ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم اتنی مصیبتوں سے گزر کر ان کے بلانے پر آئے اور لارڈ صاحب نے باہر نکل کر ہمارا استقبال بھی نہ کیا۔

محل بہت شاندار تھا۔ قدیم زمانے کے قالین، صوفے، پردے، روشنیاں اور آرائش کا دوسرا سامان قابل دید تھا۔ ہم ایک دو کمروں اور کئی گیلریوں سے گزر کر بڑے ہال میں پہنچے جہاں لارڈ صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ بے نوشی اور کپ شپ میں مصروف تھے۔ انہوں نے اٹھ کر ہم سب سے مصافحہ کیا اور زحمت پر معذرت کی۔

ہمارے میز پر بیٹھے ہی ایک باوردی ویٹر ہم سے پوچھنے آیا کہ آپ کیا پسند کریں گے؟ دسکی، روم یا برانڈی؟ ہم نے کہا ”اگر اچھی سی کافی مل جائے تو مہربانی ہوگی۔“

یہ سن کر ویٹر سمیت ہر شخص نے ہمیں یوں گھور کر دیکھا جیسے ہم نے کوئی بہت بُری بات کہہ دی ہے۔ بہر حال، کافی بہت گرم اور مرے دار تھی۔ ہم لوگ آپس میں مشورے کرتے رہے۔ یہ محل رہنے کے لیے تو اچھا تھا لیکن ہماری شوٹنگ کی ضروریات کے لیے مناسب نہ تھا۔

جاوید صاحب کچھ دیر بعد لارڈ صاحب کو اٹھا کر اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ یہ لارڈ اور ان کے ساتھ کے مرد اور خواتین اعلیٰ خاندانی لوگ تھے۔ لباس اور بول چال سے لارڈ ماؤنٹ بینن کے زمانے کے لگتے تھے۔ انہوں نے ہم سے ایک دور کی باتیں کرنے کے بعد توجہ ہی نہ دی اور آپس میں گفتگو کرنے میں مصروف ہو گئے۔

کچھ دیر بعد جاوید صاحب لارڈ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور رخصت کی اجازت طلب کی۔ سب سے ہاتھ ملا کر ہم لوگ آگے مڑ مڑتے ڈرتے باہر نکلے۔ ہم نے تنہائی سے کہا کہ آپ اپنی مثال سنبھال کر رکھیے۔

ملازم ہمیں جمیل کنارے تک لے گیا جہاں وہی کشتی

بان ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں اس پر بہت غصہ تھا مگر پھر سوچا کہ بلاوجہ پہلی اور آخری ملاقات میں غصہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ جمیل سے باہر نکلے تو جاوید صاحب نے بتایا کہ لارڈ تین دن کی شوٹنگ کے لیے بیس ہزار پونڈ طلب کر رہے ہیں۔ ہم سب کو شوٹنگ کے لیے یہ محل پسند ہی نہیں تھا اس لیے فیصلہ کیا کہ مزید تلاش جاری رکھنی چاہیے۔

ہم نے چند اور محل بھی دیکھے۔ کافی فاصلے تھے۔ صبح سویرے ہوٹل سے نکلے تو شام ڈھلے والیں آتے۔

ایک محل ہم سب کو بہت پسند آیا۔ اس کے آس پاس کا ماحول بہت اچھا تھا۔ نشیب و فراز میں سبزہ زار، بلند و بالا درخت، خوبصورت لان۔ محل کے اندر بھی شوٹنگ کی ضرورت کے مطابق ہر چیز مناسب تھی۔ یہ کئی سو سال پرانا محل تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے آج ہی بنا ہے۔ آرائش خالص انگریزی انداز کی تھی۔

مالک نے اپنا تعارف مسٹر اسٹراٹنگ کہہ کر کیا مگر معلوم ہوا کہ بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ساٹھ بیسٹھ سال کی عمر تھی مگر دیکھنے میں چالیس کے لگتے تھے۔ بول چال اور انداز خالص انگریزی۔ پڑانے انگریزوں کے لہجے میں انگریزی بولتے تھے اور کم ہی گفتگو کرتے تھے۔ جاوید صاحب نے چھٹی چڑی باتیں کر کے اور ان کی قدیم اور نادر اشیاء کی تعریف کر کے ان سے کرائے میں بھی بہت رعایت کرائی تھی۔

اس گھر میں ایک تو لارڈ اسٹراٹنگ صاحب تھے اور دوسری ایک موٹی سی میڈ یعنی گھر کا خیال رکھنے والی ملازمہ۔ لیکن تمام اختیارات ان ہی کے پاس تھے۔ انہیں سب جینی کہتے تھے۔

گھر کا تیسرا فرد ایک کتا تھا۔ یہ بہت شریف اور بیمار کتا تھا۔ لارڈ نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے بہت دیر تک پیار کیا۔ کتے نے بھی لارڈ کا منہ چوما۔ یہ کتا ایک مخصوص جگہ پر لیٹا رہتا تھا۔ بھونکنے کی صلاحیت سے شاید محروم ہو چکا تھا اس لیے کراہتا رہتا تھا۔ اس کی موجودگی کا احساس بھی ہمیں اس کے کراہنے سے ہی ہوا تھا۔ ہم سب نے حیرت ظاہر کی تو لارڈ نے بتایا کہ یہ ان کا پڑانا خاندانی کتا ہے بلکہ خاندان کا ہی ایک فرد ہے۔ اب بوز ہا اور بیمار ہو چکا ہے۔ اس کا باقاعدہ علاج ہو رہا ہے۔ اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عنقریب اس کی آنکھ کا آپریشن ہونے والا ہے کیونکہ اس کی نظر بے حد کمزور ہو گئی ہے۔ ”اب تو یہ مجھے بھی نہیں پہچانتا۔“ یہ کہہ کر وہ آب دیدہ ہو گئے۔

انگریزوں کی ایک خوبی یا بُرائی یہ ہے کہ انہیں اپنے بیوی

بچوں اور رشتے داروں سے اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی کہ اپنے کتے سے ہوتی ہے۔ کتا ان کی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ وہ ساری دنیا کو چھوڑ سکتے ہیں مگر اپنے کتے سے جدا کی برداشت نہیں کرتے۔ اس گھر میں بھی کتے کے لیے مخصوص اور آرام دہ رہائش گاہ بنائی گئی تھی۔ یوں تو اس کو سارے گھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ مسٹر اسٹراٹنگ نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ جب تندرست تھا تو کتا ان کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ ان کی بیگم کا کافی عرصے پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا تھا جو دو چار سال میں ان سے ملنے آ جاتا تھا۔ گھر کی دیکھ بھال کی تمام ذمے داریاں جینی کے سپرد تھیں۔ وہ اکیلی عورت سارے گھر کو صاف شفاف رکھتی تھی۔

مسٹر اسٹراٹنگ تو جاوید ملک سے بات چیت طے کر کے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد جینی نے ہمیں نمبر واری ہدایات دیں۔

1- شوٹنگ کے دوران میں کوئی چیز اپنی جگہ سے ہلائی نہیں جائے گی۔

2- گھر کی صفائی کا بہت خیال رکھا جائے گا۔

3- کھانا خوشبودار نہ لائیے گا جس سے گھر میں اس کی خوشبو بس جائے۔

4- اگر زیادہ خوشبودار کھانا ہو تو باہر لان میں بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔

5- سگریٹ نوشی گھر کے اندر بالکل منع ہے۔ اگر کسی جگہ سگریٹ کی راکھ پائی گئی تو معاہدہ ختم ہو جائے گا۔

6- چائے دن میں صرف دوسرے فرائیم کی جائے گی۔ ایک صبح کیادہ بجے اور دوسری شام کو چار بجے۔

7- شوٹنگ کے خاتمے پر اپنا تمام سامان سمیٹ کر اور گھر میں صفائی کر کے رخصت ہوں۔

یہ اہم شرائط تھیں اور بھی چھوٹی موٹی شرطیں تھیں کہ جمیل میں گندگی اور سگریٹ نہ پیسکتے جائیں۔ پھولوں کا خاص خیال رکھا جائے۔ بلا ضرورت لان میں نہ گھوما جائے۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو پریشان نہ کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

فلم پونٹ کے سب لوگوں کو نہایت سختی سے ان ہدایات کی پابندی کرنے کی ہدایت کر دی گئی پھر بھی فلم والے عموماً سگریٹ اور چائے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کو وہ ”پیٹرول“ کا نام دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر پیٹرول نہ ہو تو گاڑی کیسے چلے گی؟

شوٹنگ شروع ہوئی تو اس احترام کے ساتھ جیسے ہم لوگ

بختتم پیس میں آ گئے ہیں۔ سگریٹ کے شوقین تو ہا ہر جا کر سگریٹ نوشی کر لیتے تھے مگر چائے کے مادی بہت پریشان تھے۔ دن میں صرف دو مرتبہ مقررہ اوقات پر چائے ان کے لیے ناکافی تھی۔ ایک ساؤنڈ ریکارڈسٹ نے ایک بار بڑی التجا بھری آواز میں جینی سے چائے کی فرمائش کر دی تو مس جینی نے تاریخی گھڑیال کی طرف اشارہ کر کے انہیں بتایا کہ ابھی چائے کا وقت نہیں ہوا۔ ہم لوگ کھانے کے ساتھ چائے کا سامان بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے مگر مخصوص اوقات کے علاوہ باورچی خانہ بند رہتا تھا اس لیے مجبور تھے۔

ساؤنڈ ریکارڈسٹ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب جینی سامنے آئیں تو وہ بیماروں کی طرح کراہنے لگتے تھے۔ جینی نے اس بارے میں دریافت بھی کیا لیکن سب خاموش رہے۔ اگلے دن انہوں نے یہ ڈراما کیا کہ اچانک دل تمام کر قالین پر گر گئے۔ ہم سب پریشان ہوئے کہ انہیں اچانک کیا ہو گیا، جینی بھی یہ خبر سن کر بھاگی بھاگی آئی۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ نیم بے ہوشی کے عالم میں دل تھامے پڑے تھے۔

”انہیں فوراً اسپتال لے کر چلو۔“ انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے اسسٹنٹ نے کہا ”ان کا علاج اسپتال میں نہیں ہو سکتا۔“

”تو پھر کہاں ہو سکتا ہے؟“

”دیکھیے مس جینی! ہم نے آپ کو پہلے نہیں بتایا تھا مگر یہ سات سال کی عمر سے چائے نوشی کر رہے ہیں۔ چائے کا نشہ ان کی رگ رگ میں سما گیا ہے۔ اگر دن میں بارہ پیانی جائے نہ ہیں تو ان کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ دماغ میں آکسیجن کی کمی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہارٹ ایک بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کیا کریں، مجبور ہیں۔“

یہ ڈرامائی داستان سن کر مس جینی کا دل پھل گیا۔ انہوں نے کہا ”میں کسی انسان کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ انہیں کچن استعمال کرنے کی اجازت ہے مگر ان کے سوا کسی اور کو یہ اجازت نہیں ہے۔“

اس طرح انہوں نے ڈراما چاکر اپنا کام نکال لیا۔ اب مسٹر اسٹراٹنگ کی سنیے۔ وہ نہایت خالص اور پکے انگریز تھے۔ صاحب جائیداد تھے۔ دن کے وقت آفس جاتے تھے۔ شام کو آ کر اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک دن وہ ذرا جلدی آ گئے۔ دوسرے لوگ تو شوٹنگ میں مصروف تھے۔ ہم باہر لان میں بیٹھے منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ کار سے اتر کر سیدھے ہمارے پاس آ گئے۔

”ہیلو، گڈ ایوننگ سر!“ انہوں نے خالص انگریزی لہجے میں کہا۔

ہم نے بھی ”گڈ ایوننگ، مائی لارڈ!“ کہہ کر جواب دیا۔ وہ بولے ”آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ آئیے اندر بیٹھتے ہیں۔“ پھر گھڑی دیکھ کر بولے ”اب تو چائے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ ایک پیالی چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

ہم دونوں اندر ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ سردی زیادہ نہیں تھی مگر انہوں نے شاندار قدیم آتش دان میں آگ روشن کی۔ آگ کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک چمچا قسم کی چیز اور اسے کریدنے کے لیے لوہے کا ایک خوبصورت راڈ بھی تھا۔

بولے ”اس گھر میں ہر چیز اٹیک ہے۔ کئی سو سال پرانی۔ ہمارے دادا پر دادا نے جو سامان اکٹھا کیا تھا وہ بھی ہم نے سنبھال کر رکھا ہے اور اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔“ ہم نے کہا ”واقعی، آپ کا محل تو ایک قیمتی میوزیم ہے۔ ہم تو ہر چیز کو دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔“

”دراصل مشرقی روایات بھی بہت بُرائی ہیں۔ مگر یہ امریکن.....“ انہوں نے جبراً سامنے بتایا ”کہتے ہیں کہ پیسے سے سب کچھ خرید سکتے ہیں۔“

”آپ صحیح کہتے ہیں۔“ ہم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”یہ خاندانی لوگ تو ہیں نہیں، نہ ان کی بُرائی تاریخ اور روایات ہیں۔ نئے نئے دولت مند ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ انہیں تو بات کرنے کی نیز بھی نہیں ہے۔ اب دیکھیے، ایک امریکن میرے پاس آئے، وہ میرے گھر کی کئی چیزیں منہ مانگی قیمت پر خریدنا چاہتے تھے۔ میں نے معذرت کر لی۔ آخر بولے کہ یہ آتش دان ہی مجھے فروخت کر دیں۔“ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کیا۔ پھر کہنے لگے ”اچھا یہ چٹا اور آگ کریدنے والا راڈ ہی دے دیجئے۔“ میرا بس چلنا تو انہیں اٹھا کر پھینک دیتا مگر خاموش رہا۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔

”واقعی، یہ تو بدتمیز ہی ہے۔“ ہم نے کہا ”کہ جس گھر میں جائیں وہاں کی چیزیں خریدنی شروع کر دیں۔“ کہنے لگے ”ایسا نہ کہیے۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو دولت کے لالچ میں ہر چیز فروخت کر دیتے ہیں۔ ایک لاپچی لارڈ نے تو اپنا پورا محل فروخت کر دیا، جانتے ہیں کس لیے؟“

”وہ امریکی اس گھر کو بالکل اسی صورت میں امریکا لے

جا کر اس میں رہا کرے گا۔ لالچ کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ اپنی روایت، اپنی اقدار، اپنی تہذیب کیا کوئی دولت کے عوض فروخت کر سکتا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ ہم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ہم نے مزید اضافہ کیا ”ہمارے مشرقی ملکوں میں بھی خاندانی لوگ ایسی باتوں کو پسند کرتے ہیں۔ وضع داری اور خاندانی وقار کی بہت عزت کی جاتی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ بولے ”ان امریکیوں کی تو نہ کوئی تاریخ ہے نہ تہذیب۔ ساری دنیا کے بد معاش، لنگے اور جرائم پیشہ لوگ امریکا جا کر آباد ہو گئے۔ ان سب کی قومیت الگ ہے۔ تہذیب الگ ہے۔ طور طریقے الگ ہیں۔ امریکی ایک قوم نہیں، قوموں کا کاک نسل ہے۔ ان لوگوں کو تہذیب بھی باہر کے لوگوں نے آ کر سکھائی ہے۔ جو اچھے خاندانی اور تعلیم یافتہ لوگ وہاں جا کر آباد ہو گئے ہیں، ان ہی کی وجہ سے ان کا بھرم قائم ہے۔“

مسٹر اسٹرائگ امریکیوں کے سخت دشمن تھے۔ امریکیوں کی صورت دیکھتے ہی ان کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔

بہر حال امریکیوں کی مخالفت کے باعث ہم دونوں کے تعلقات اور زیادہ اچھے ہو گئے۔ مسٹر اسٹرائگ کو سب سے زیادہ فکر اپنے کتے کی تھی۔ اس کی صحت کی طرف سے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ وہ بے چارہ تو خاموش، آنکھیں بند کیے گرا ہٹا رہتا تھا۔ مسٹر اسٹرائگ اس کا سراپنی گود میں رکھ کر آنسو بہاتے رہتے تھے۔

ایک دن ہم نے پوچھا ”مسٹر اسٹرائگ۔ جی (کتے) کی صحت کافی خراب ہے۔ عمر بھی کافی ہو چکی ہے۔ اس بڑھاپے میں آپ اس کی آنکھوں کا آپریشن کیوں کر رہے ہیں؟ اس سے کیا فرق پڑے گا؟“

وہ بولے ”فرق یہ پڑے گا کہ وہ مجھے دیکھ سکے گا۔ یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔“

تین دن تک بغیر خوشی اس محل میں شونگ ہوتی رہی اور بہت اچھے تعلقات کے ساتھ ہم نے مسٹر اسٹرائگ، جینی اور جی کو الوداع کہا۔

اس شونگ میں عسکری صاحب کی بیگم بھی آ جاتی تھیں۔ شونگ دیکھنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ آس پاس کے ماحول سے بہت متاثر تھیں اور اکیلی بیٹھی دیر تک یہ مناظر دیکھتی رہتی تھیں۔ یا پھر کوئی کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ جاتی تھیں۔

اکثر ہم بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتے اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ بیگم عسکری صرف تعلیم

یافتہ ہی نہیں، گہرا مطالعہ بھی رکھتی تھیں۔ اس لیے ان سے مختلف موضوعات پر بات کر کے بہت خوشی ہوتی تھی۔ انہیں فلموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ادب، شعر و شاعری اور دوسرے موضوعات پر بات کرنا پسند تھا۔

ہم نے انہیں شاید ہی کبھی اداس یا غم زدہ دیکھا ہو۔ کبھی کبھی ہمیں حیرت بھی ہوتی تھی کہ ایک گھر میں صرف دو میاں بیوی رہتے ہیں۔ عسکری صاحب شونگ پر چلے جاتے تو وہ بالکل تنہا ہو جاتی تھیں۔ فلموں کی شونگ اور دوسری مصروفیات کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ عسکری صاحب کبھی جلدی گھر آ جاتے اور کبھی دیر سے آتے۔ ان کا اتنا طویل عرصہ بالکل تنہا گزارنا بہت مشکل ہے لیکن انہوں نے کتابوں سے دوستی کر لی تھی۔ کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہو جائے تو پھر کسی اور دوست کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اگر آپ کوئی دلچسپ کتاب پڑھ رہے ہوں اور کوئی دوست آ جائے تو طبیعت پر ہار گزرتا ہے۔

یہ ایک عجیب و غریب اور خوش مزاج جوتا تھا۔ ہم نے انہیں ہر وقت خوش و خرم ہی دیکھا۔ ایسے لوگ دنیا میں کم ہی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

کبھی مشرقی پاکستان بھی ہمارا ہی ایک حصہ تھا۔ دونوں طرف کے لوگ آزادی سے آتے جاتے تھے۔ محبت سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ ہمارا مشرقی پاکستان کئی بار جانا ہوا۔ ان دنوں وہاں اردو بولنے والوں کی کمی نہ تھی اس لیے آپس میں بات چیت میں بھی آسانی تھی۔ بہت خلوص اور محبت کا رشتہ تھا دونوں میں۔ مشرقی پاکستان سے احتشام (جنہیں یہاں نہ جانے کیوں کیپٹن کہا جاتا تھا) کافی عرصے لاہور میں رہے۔ فلم سازی کی تربیت انہوں نے لاہور ہی میں لی تھی۔ یہاں تمام فلم والوں سے ان کی دوستی تھی اور ہلسی مذاق چلتا رہتا تھا۔ اردو بہت اچھی اور روانی سے بولتے تھے۔ بعد میں یہ مشرقی پاکستان جا کر بہت بڑے اور نامور فلم ساز اور ہدایت کار بنے۔ ان کے چھوٹے بھائی مستفیض نے بھی کئی فلموں کی ہدایت کاری کی تھی۔

مشرق پاکستان میں یوں تو ہماری سب سے دوستی تھی لیکن عطا الرحمن سے تعلقات برادرانہ ہو گئے تھے۔ انہیں اچھا میں خان عطا کہا جاتا تھا۔ بڑا عرب اور دبدبہ تھا ان کا۔ سرکاری افسروں سے لے کر فلم والوں تک سبھی ان کا احترام کرتے تھے اور ان سے ڈرتے تھے۔ وہ صاف گوا آدمی

تھے۔ ہر ایک کو کھری کھری سنا دیتے تھے۔ یہاں یہ ہے کہ کبھی ان سے مرعوب تھے۔ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے ہم ڈھاکا گئے تو انہوں نے ڈھاکا کلب میں ہمیں ٹھہرایا۔ آمدورفت کے لیے اپنی کار اور ڈرائیور بھی دے دیا تھا۔ دفتر سے فارغ ہو کر وہ سیدھے ہمارے پاس آ جاتے تھے۔ بہت خوش مزاج اور ہنس کھڑی آدی تھے۔

ہم ڈھاکا کا ایک کو پروڈکشن کے لیے گئے تھے۔ ڈھاکا کے ایک فلم ساز اور تقسیم کار جن کا شباب کیرالوی سے کاروباری تعلق تھا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کو پروڈکشن بنانے کی خواہش کی۔ شباب صاحب نے بھی ان کے لین دین اور کاروباری دیانت کی تعریف کی، لاہور میں ایک کہانی طے ہو گئی۔ اب ہمیں ڈھاکا جا کر ان سے معاملات طے کرنے تھے۔

ڈھاکا گئے تو خان عطا ہمیں لینے کے لیے ایئر پورٹ آئے۔ جب انہیں ہمارے آنے کا مقصد معلوم ہوا تو خاموش ہو گئے، پھر بولے ”آفاقی، تم کو مجھ سے مشورہ تو کرنا تھا۔“

ہم نے کہا ”ہم خود بھی کئی سال سے انہیں جانتے ہیں۔ شباب صاحب سے ان کا کاروباری رشتہ ہے، اس لیے ہم نے بھروسہ کر لیا۔“

عطا صاحب چپ ہو گئے۔

ڈھاکا کلب کو اس زمانے میں وہاں جیم خانہ کلب کی حیثیت حاصل تھی۔ بہت اچھے تعلیم یافتہ لوگ وہاں آتے تھے، جن میں سرکاری افسر اور فلمی لوگ بھی شامل تھے۔ صرف اعلیٰ درجے کے لوگ ہی کلب میں آ جاتے تھے۔

ہم نے مصطفیٰ صاحب (فلم ساز) کو باخبر کر دیا تھا مگر وہ نہ ایئر پورٹ آئے نہ ہی اس روز کلب آئے۔ شام کو آئے تو ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلے گئے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم صرف تین دن کے لیے آئے ہیں۔ کل آپ معاملات طے کر کے معاہدہ کر لیں۔ وہ ”ہاں ہاں“ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ عطا الرحمن شام کو آئے تو پوچھا ”مصطفیٰ آیا تھا؟“

ہم نے تمام واقعات بتا دیے۔ انہوں نے ایک بند لفظ ہمیں دیا اور کہا کہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہی اسے کھولنا۔ مصطفیٰ صاحب نے دو دن ہمیں بہت تنگ کیا پھر بولے

کہ سیرا بیٹا کو پروڈکشن نہیں کرنا چاہتا۔ ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ ہم نے کہا کہ بات چیت تو ہم دونوں میں ہوئی تھی، یہ بیٹا کہاں سے درمیان میں آ گیا؟

بولے ”آفاقی صاحب، بچے بڑے ہو جائیں تو ان کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔“

یہ کہہ کر شام کو آنے کا وعدہ کر کے وہ چلے گئے۔
شام چار بجے کا وقت تھا مگر وہ سات بجے تک نہیں آئے۔ اسی دوران میں عطا الرحمن آگئے تھے۔ ہم نے ساری بات انہیں بتائی تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولے ”ایسے لوگ ہی فلم انڈسٹری کو بدنام کرتے ہیں۔“

شام سات بجے جب مصطفیٰ صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ آئے تو خان عطا الرحمن پیگ لگا چکے تھے۔
مصطفیٰ صاحب انہیں ہمارے ساتھ دیکھ کر کچھ گھبراے گئے۔ ہم لوگ بڑے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

عطا الرحمن نے کہا ”مصطفیٰ! تم بہت ذلیل آدمی ہو۔ ایک شخص کو لاہور سے بلا کر بٹھا رکھا ہے۔ آج تمہیں چار بجے آنا تھا مگر تم سات بجے آئے ہو۔ تم تو مجھے انسان کے بچے نظر نہیں آتے۔“

ان کی بلند اور گونج دار آواز سن کر سب متوجہ ہو گئے۔
مصطفیٰ صاحب نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر عطا الرحمن سخت غصے میں تھے۔

انہوں نے کہا ”تم جانتے ہو، تم نے جس شخص کو ڈھاکا بلا کر ذلیل کیا ہے، یہ کون ہے؟ سارا پاکستان اس کی عزت کرتا ہے۔ مگر تم کہیں اور سور کے بچے ہو۔“ (سور کا بچہ غصے میں ان کی پسندیدہ گالی تھی)

مصطفیٰ صاحب بولے ”اچھا، اس وقت میں جاتا ہوں۔ کل صبح آ کر آقا صاحب سے بات کروں گا۔“

ہماری بجائے عطا صاحب نے گرج کر جواب دیا ”آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے ایک شریف آدمی کو جتنا ذلیل کرنا تھا کروا۔ آج کے بعد اگر تم ڈھاکا کلب میں نظر آئے تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ بس جاؤ اور اپنے اس فراڈ بیٹے کو بھی ساتھ لے جاؤ۔“

بھری مجلس میں یہ ذلت اٹھا کر مصطفیٰ صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ عطا الرحمن نے کہا ”محاف کرنا آقا صاحب! ایسے ذلیل لوگوں نے ہی فلم انڈسٹری کو برباد کیا ہے۔ تم جب تک ڈھاکے میں رہنا چاہو شوق سے رہو۔“

ہم نے کہا ”ہمیں تو کل سری لنکا جانا ہے۔“
”میں تمہاری بکنگ کرادیتا ہوں اور دیکھو، پھر کبھی مجھ سے مشورے کے بغیر کسی سے ذلیل کرنے کے لیے ڈھاکا نہ آنا۔ دھر بہت سور کا پتھر رہتا ہے۔“

ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہم نے خان عطا کا بند لٹافہ کھولا جس میں لکھا تھا ”اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔“
یہ واقعہ تو بریکل تذکرہ ہی نکل آیا۔ دراصل ہم یہ بتانا

چاہتے تھے کہ بنگالی اردو سے کتنی محبت کرتے تھے۔ پاکستان سے جانے والی فلموں کو کلکتہ سے آنے والی فلموں سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ پاکستانی فن کاروں کے پرستار تھے۔

مشرقی پاکستان میں فلمی صنعت کا آغاز پہلے ہو چکا تھا جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ چھوٹی سی انڈسٹری تھی۔ سرمائے کی بھی کمی تھی لیکن گانوں کی ریکارڈنگ کے لیے وہ لاہور ہی آیا کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد انہیں خیال آیا کہ اردو فلمیں کیوں بنائیں۔ اردو فلموں کے لیے ان کا سرمایہ اور بھی کم تھا۔ پہلے وہ گلوکاروں اور صدا بندی کے لیے لاہور آیا کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ انہوں نے سارا کام وہیں شروع کر دیا یعنی خود کفیل ہو گئے۔ انہیں احساس تھا کہ مغربی پاکستان کی شہرت اور کشش تھی، وہ بہت زیادہ تھی۔ مغربی پاکستان کی فلموں میں سرمایہ بھی دل گھول کر لگایا جاتا تھا۔ لیکن انہوں نے اردو میں فلمیں بنانے کا آغاز کر دیا اور انہیں ایک نئی رعتی بخشی۔ ان میں اردو فلمیں بنانے کا ایک جذبہ تھا۔ انہوں نے بہت ذوق و شوق اور لگن کے ساتھ اردو فلموں کا آغاز کیا تھا۔ یہ ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔

مشرقی پاکستان میں پہلی اردو فلم ”چندا“ بنائی گئی تھی اس کے ہدایت کار احتشام تھے۔ شبنم اور رخصت نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ ان دونوں اداکاروں سے اس وقت مغربی پاکستان میں کوئی واقف نہیں تھا۔ اس لیے یہاں اس فلم کی پذیرائی آغاز میں نہیں ہوئی لیکن مختلف نظارے، کئی اصلی لوکیشنز اور کہانی کی سادگی کے باعث اس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا اور یہ دونوں مغربی پاکستان میں بھی پہچانے جانے لگے۔ یہ فلم 1963ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اس کی کامیابی سے حوصلہ پا کر احتشام صاحب کے بھائی مستفیض نے اسی سال فلم ”تلاش“ بنائی۔ اس فلم میں بھی شبنم اور رخصت مرکزی کردار تھے۔ مغربی پاکستان کے بھیڑ چال والے ڈسٹری بیوٹرز نے اس پر توجہ نہ دی یہاں تک کہ نگار کے انڈیٹر الیاس رشیدی نے کہا کہ تم ایک لاکھ میں لے لو مگر کوئی اس پر راضی نہ تھا۔ خدا خدا کر کے یہ فلم ریلیز ہوئی اور دھماکا کر دیا۔ یہ چندا سے بھی زیادہ کامیاب ہوئی۔ اس طرح مشرقی پاکستان میں اردو فلمیں بنانے کا رواج ہو گیا۔ انہوں نے بشیر اور خواتین گلوکارائیں بھی تلاش کر لی تھیں۔ اب وہ مغربی پاکستان کے محتاج نہیں رہے تھے۔ اردو فلموں کو وہاں مقبول کرانے میں سرور بارہ بنگوی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب تھے

اسکرپٹ لکھنے کے بعد فن کاروں کا تلفظ بھی درست کراتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے فلم والے ہمیشہ ان کی عزت کرتے رہے اور انہیں استاد کا درجہ دیتے رہے۔

1967ء میں ہدایت کار احتشام نے ایک چوکنا دینے والی فلم بنائی۔ فلم کے مکمل ہونے سے پہلے اس کے بارے میں لوگوں کی اچھی رائے نہ تھی کیونکہ احتشام نے اس فلم میں بالکل نیا تجربہ کیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی معروف گلوکارہ فردوسی بیگم کراچی آئیں تو ان کی ملاقات ندیم بیگ (ندیم) سے بھی ہوئی جو ان دنوں گلوکار بننے کی دھن میں لگے ہوئے تھے۔

ندیم خوش شکل اور خوش آواز تھے۔ اردو بھی بہت اچھی بولتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فردوسی بیگم ان پر مہربان ہو گئیں اور ان سے کہا کہ کراچی میں تو امکان کم ہے لیکن ڈھاکا میں تمہیں گلوکاری کا موقع مل سکتا ہے جہاں گانے والوں کی بہت کمی ہے۔ ندیم کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ فردوسی بیگم انہیں ڈھاکا لے گئیں اور احتشام سے ملاقات کرائی۔ احتشام صاحب کو ندیم کی آواز اور ان کی اکلوتی صاحبزادی فرزانہ کو ان کی صورت شکل پسند آگئی۔ گلوکار کے طور پر ان کا انتخاب کر لیا گیا لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ فلم کے اصل ہیرو عظیم کسی وجہ سے شونگ پر نہ آ سکے تو احتشام صاحب نے ندیم کو فلم کا ہیرو منتخب کر لیا۔ اس فلم کی ہیروئن بھی ایک موٹی موٹی آنکھوں والی خوش شکل اداکارہ شبنم تھیں۔

فلم شروع ہوئی تو ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ فلم بین بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ لیکن ڈھاکا میں نئے نئے چہرے متعارف کرانے کا رواج تھا اور احتشام صاحب سے لوگوں کو بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں اس لیے فلم کے بارے میں لوگ پُر امید تھے۔

اس فلم کا نام ”چکوری“ تھا۔ فلم جب نمائش کے لیے پیش کی گئی تو تھلکے بج گیا۔ ندیم جیسا خوبصورت، پُرکشش ہیرو اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ شبنم کی یہ پہلی فلم تھی مگر ان کی سادگی ہی ان کی اداکاری کی تعریف بن گئی۔ اس فلم میں ندیم کا گایا ہوا گانا آج بھی گایا جاتا ہے، جس کے بول تھے۔

کہاں ہوتم کو ڈھونڈ رہی ہیں
یہ بہاریں، یہ ماں
اس فلم نے ڈھاکا سے لاہور تک دھوم مچادی۔ اس کے گانے گلی گلی گائے جانے لگے۔ ندیم اور شبنم اچانک پیراشار بن گئے تھے۔ لاہور سے فلم ساز دونوں کو ایک ساتھ لاگ لگ فلموں میں کاسٹ کرنے کے لیے ڈھاکا کے چکر لگ رہے تھے۔

1970ء میں ہدایت کار ظہیر رحمان نے ایک اور دھماکا کیا۔ انہوں نے پاکستان کی پہلی سنیما اسکوپ فلم بنائی جس کا نام ”جلتے سورج کے نیچے“ تھا۔ یہ ایک معاشرتی فلم تھی اور پاکستان کے لیے فخر کی بات یہ تھی کہ یہ پاکستان میں بنائی جانے والی پہلی سنیما اسکوپ فلم تھی جس کے ذریعے پاکستان کا نام ترقی یافتہ فلم ساز ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ ڈھاکا کو یہ حیثیت حاصل تھی کہ وہاں پاکستان کی پہلی رٹکن اور پہلی سنیما اسکوپ فلم بنائی گئی۔ دراصل بنیادی وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں زیادہ تر فلمی صنعت سے وابستہ لوگ تعلیم یافتہ، تخلیق کار اور سوچے والے تھے جبکہ ہمارے ہاں بھیڑ چال تھی جس کا نتیجہ بالآخر ہم سب نے دیکھ لیا۔ ڈھاکا میں بہت اچھی معلوماتی، ڈرامائی اور میوزیکل فلمیں بنائی گئیں جو کسی نہ کسی حوالے سے آج بھی یاد ہیں۔

ڈھاکا میں جو فلمیں بنائی گئیں، ان کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔ پہلی اردو فلم چندا جو 1963ء احتشام صاحب نے بنائی تھی اور پہلی ہی فلم بہت کامیاب تھی۔ اس فلم نے پاکستانی فلموں میں ایک سنیما رجحان پیدا کر دیا۔

اس کے بعد ڈھاکا میں اردو فلموں کا سیلاب آ گیا۔ بنگالیوں نے کلکتہ سے آنے والی فلموں کو چھوڑ کر مغربی پاکستان کی اردو فلموں میں زیادہ دلچسپی لیتی شروع کر دی۔ ڈھاکا میں کم سرمائے اور کم وسائل کے باوجود فلم انڈسٹری درست بنیادوں پر استوار کی گئی۔ بیشتر لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ بناوٹ اور نمود و نمائش کا کوئی تذکرہ ہی نہ تھا۔

ظہیر رحمان بے حد ذہین اور خیمہ مند لو جو ان ہدایت کار تھے۔ انہوں نے ڈھاکا کی پہلی اردو رٹکن فلم ”سنگھم“ بنا کر نیا تجربہ کیا۔ یہ فلم بھی 1963ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بہت کامیاب رہی تھی۔ روزی ہارون اور غلیل اس میں اہم کردار تھے۔

سرور بارہ بنگوی نے آخری اسٹیشن بنا کر حقیقی فلموں کا بہت خوبصورت آغاز کیا۔ ہارون اور شبنم مرکزی کردار تھے۔ شبنم ہی کے گرد کہانی گھومتی تھی۔ شبنم نے بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ خان عطا نے نواب سراج الدولہ جیسی عظیم تاریخی فلم بنا کر اپنے قوی ہیروز سے فلم بینوں کو متعارف کرایا۔ سونے ندیا، جاگے پانی، ان کی ایک اور تجربہ انگیز فلم تھی۔ سرور بارہ بنگوی نے ”تم میرے ہو“ جیسی رومانوی فلم بنائی۔ مشرقی پاکستان کی فلموں کی موسیقی عموماً اچھی ہوتی تھی جو فلم کی کامیابی میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔ اس فلم میں شبنم، ندیم اور مہنازا اہم اداکار تھے۔



وہ ایک بڑے شاعر کا بیٹا، ایک نامور شاعر کا بھانجا، ایک الفاظ کی فسون ساز ماں کا دلارا تھا۔ ادب اس کی رگ رگ میں سمویا ہوا تھا مگر قسمت کی دیوی نے اس کے باپ پر مہربان تھی نہ اس کا ساتھ دینے پر راضی تھی پھر بھی اسے اپنے قلم پر بھروسا تھا۔ اسے یقین کامل تھا کہ ایک دن اس کا قلم اس کی زندگی بدل دے گا اور یہی ہوا۔ اس نے بمبئی کی فلم نگری میں انوکھا تجربہ کیا جو سوفیصد کامیاب ٹھہرا اور اس نے زنجیروشعلے جیسی معرکتہ آرا فلمیں پیش کر دیں۔

بالی وڈ کے ایک نامور کہانی کار و شاعر کی داستانِ حیات

کوڑے دار مانا جاسکتا ہے۔ جاوید اختر کے ٹیلنٹ پر شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی تقدیر واقعی بہت مہربان رہی ہے، یہ تقدیر ساتھ نہ دیتی تو شاید جاوید اختر ایک گناہم نفس ہی رہتے

جاوید اختر کی کہانی بہت عجیب ہے۔ جب سفر شروع ہوا تو منزل کا پتہ تھا، ایک بھٹکا مسافر راہ پکڑے اور ایک شائدار منزل اس کا مقام ظہرے تو کیا قسمت سے بڑھ کر کسی

مئی 2012ء

167

ماہنامہ سرگزشت

استنبول کے گزرائے شہر میں جائے تو وہی گزرائے مکان، گلیاں اور دکانیں لیکن صاف شفاف۔ برادر کے گھروں میں کمر کی میں عورتوں کی آپس میں بات چیت ہے۔ دکانوں، قبوہ خانوں کا وہی انداز۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے انہیں منجھ کر دیا ہے۔ گزرائے شہر دیکھ کر نئے شہر کا حسن بھی مامہ پڑ گیا۔ یوں لگتا ہے گزرائے دور پھر لوٹ آیا ہے۔

یہ تو دنیا کے دوسرے پُرانے شہروں کا ذکر ہے۔ ہمارے شہروں میں بھی پُرانی تہذیب اور تمدن کے نظارے موجود ہیں لیکن غلاقت، بے پردائی، غلط استعمال، ایٹمیٹک نما عمارتوں کی ٹوٹ پھوٹ۔۔۔۔۔ گندگی کے ڈھیر دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہی ہمارا ماضی تھا حالانکہ ایک زمانے میں قدیم لاہور واقعی حسن و تہذیب کا گہوارہ تھا جس کی داستانیں آج بھی سنہری یادیں تازہ کر دیتی ہیں۔

لاہور کا پُرانا شہر اگر کسی اور ملک میں ہوتا تو دنیا بھر کے
سیاحوں کا مرکز ہوتا۔ یہاں کی بیچ دار گلیاں، نشیب و فراز،
پُرانے مکان جو اب سمار ہو رہے ہیں۔ پُرانی عمارتوں کے
آگے لکڑی کے منقش کام والی بالکونیاں، یہ شہر اگر پُرانی
عالت میں سجا کر سنوار کر پُرانی تہذیب و تمدن اور پُرانے
احول میں، درختوں کے سائے میں چائے خانے جہاں
سمارے مٹھے کے لوگ گپ شپ لگا کر اپنے دل کی بھڑاس
کالا کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بیالیوں میں چائے کا دور۔
صاف ستھرے مٹھے جہاں آس پاس کی عورتیں چغلیاں
کھانے یا ایک دوسرے کی بُرائی کرنے میں یہ استیول کی
ورتوں سے کم نہیں ہیں، انداز جدا ہیں۔

پُرانا لاہور واقعی ایک حسین شہر تھا۔ نہریں، قد آور
و بصورت ایک قطار میں لگے ہوئے یوکلپٹس کے درخت،
رکلی موتیا، چینی کی خوشبو سے مہکتی ہوئی، لاہور ادبی اور ثقافتی
مرکز بھی تھا۔ ادب، موسیقی، فنون لطیفہ کا ایسا گہوارہ تھا جہاں
مارے ہندوستان سے صاحب کمال کھینچے آتے تھے اور پھر
میں کے ہو کر رہ جاتے۔

لاہور کے نکلنے سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ یہ اصل ثقافتی اور موسیقاروں کے مرکز بھی تھے۔ یہ ایک طبع سے سرائے کا کام بھی کرتے تھے۔ ہندوستان کا کون سا بڑا فن کار تھا جس نے یہاں اپنے فن کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ استاد غلام علی خاں جیسے صاحب فن یہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

فلم تكتفوا كما في ألف ليلة (أبجى جمل) هو اس دامت ان هر ونگ
که من وند را قعات که طبع آید بهاء کا شمار دیکھتہ نہ معلولہ

• 2012, مئی

حلاش، ناچ گھر، پریت نہ جانے ریت، سگم (رکتم)
شادی، یہ بھی ایک کہانی، میسے، بندھن، ملن، کاجل، ساگر،
بہانہ، کیسے کہوں، آخری اسٹیشن، سات رنگ، مالا، اُجالا،
پرگنہ، پروانہ، پونم کی رات، چکوری، نواب سراج الدولہ،
درشن، چھوٹے صاحب، انجمن، ہمد، سوئے ندیا جاگے پانی،
جگنو، تم میرے ہو، چاند اور چاندنی، گوری، جہاں دل بچے
شہنائی، شہید تیتو میر، جینا بھی مشکل، داغ، پیاسا، سنگن،
اناڑی، پائل، چلو مان گئے، چلتے سورج کے بیچے۔
مندرجہ ذیل فلمیں کو پروڈکشن میں بنائی گئیں۔

ہم سے ہے زمانہ، ہدایت کار جاوید فاضل۔ اداکار،
ندیم، شیوا، مصطفیٰ۔
تلاش۔ ہدایت کار، حسن عسکری۔ اداکار، بیٹیا، ندیم،
شفیع محمد۔

پامیلا۔ ہدایت کار، جمشید نقوی۔ کاسٹ، نیلی، جاوید شیخ۔

زمین آسمان۔ ہدایت کار، نذر الاسلام۔ اداکار، عظیم،
شبانہ، ششما شاہی (نیپالی اداکارہ)

شرقی پاکستان کے اسٹوڈیوز میں ہم نے بڑی بڑی
ہیر و نتوں کو سفید یا سفید ساڑیاں پہن کر آتے دیکھا۔ اداکار
بھی ایسے ہی سادہ تھے۔ نامور اداکارائیں بھی سائیکل رکشا
میں سفر کرنا پڑا لی یا احساس کمتری نہیں سمجھتی تھیں۔

سب سے بڑا فرق ماحول کا تھا۔ نظم و نسق بہت زیادہ تھا۔ ہدایت کار کی عزت اور احترام قابلِ دید تھا۔ بڑے بڑے اداکار، ہدایت کار کی مرضی کے تابع تھے۔ ایک بار ہیر وئن کا بوری تاخیر سے شوٹنگ پر آئیں تو نفع نقصان کا خیال کیے بغیر انہیں فارغ کر دیا گیا۔ (جبکہ کا بوری بنگلہ فلموں کی سپر اسٹار تھی)

پاکستانی فلمی صنعت کے لیے مشرقی پاکستان کی خدمات
بہت زیادہ ہیں۔

☆☆☆

استنبول کے میسر کے حالیہ دورے کا تذکرہ آپ نے سنا اور پڑھا ہوگا۔ استنبول صحیح معنوں میں ایک عروسِ البلاد ہے۔ جدید شہر کو تو آپ کسی بھی مغربی ملک کے شہر سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ کچھ تو قدرتی حسن اور پھر انسانی کوشش۔ لیکن قابلِ ذکر حصہ استنبول کا پُرانا شہر ہے۔ ترکی کے دوسرے حصوں میں بھی قدیم شہروں کو بہت صاف ستھرا اور ہناسنوار کر رکھا گیا۔ ترکی ہی کیا ہر مہذب ملک اپنے ماضی پر فخر کرتا ہے، وہ اپنے ماضی پر رشک کرتا ہے۔

ماہنامہ سرگزشت

166



جاوید اختر کے صاحبزادے فرحان، ادمونا کے ہمراہ

ہاتھ پکڑ کر اس بڑے کمرے میں لے گئیں جہاں فرش پر بہت سی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان تخت پر سفید کفن میں لپیٹے ہوئے چہرے لیے لیٹی ہوئی تھیں۔ خالہ ان دونوں بچوں کو تخت کے پاس لے گئیں اور بولیں ”اپنی ماں کو آخری بار دیکھ لو۔“

اس وقت جاوید کی عمر آٹھ سال تھی، وہ یہ تک جانتے نہ تھے کہ موت کیا ہوتی ہے؟ تھوڑی دیر بعد یہ چہرہ ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے دب جائے گا۔ وہ اپنی ماں کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتے ہیں۔ خالہ کی آوازاں کی سماعت سے گھراتی ہے ”ان سے وعدہ کرو کہ تم زندگی میں کچھ بنو گے۔ کچھ کر کے دکھاؤ گے۔“ جاوید کچھ نہیں کہہ پائے بس دیکھتے رہتے ہیں، پھر کوئی عورت اس بے جان چہرے کو ڈھک دیتی ہے۔

ماں کے انتقال کے بعد دونوں بھائی جاوید اور سلمان، نانا کے گھر میں ہی رہ گئے۔ جاوید کا داخلہ لکھنؤ کے مشہور اسکول کالون تعلقی دار کالج میں چھٹی کلاس میں کر دیا جاتا ہے۔ اس اسکول میں امیر گھرانوں کے بچے پڑھتے تھے۔ جاوید کو جیب خرچ کے طور پر ایک آنہ ملا کرتا تھا جبکہ اسکول کی کینٹین میں سب سے سستی چاکلیٹ بھی آٹھ آنے کی تھی۔ ایسے میں جاوید کو گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر خواجہ لگانے والی بھگوتی یاد آنے لگتی جہاں سے ایک آنے میں مزے دار چائے ملا کرتی تھی۔ اس اسکول میں پڑھنے والے

پڑ گئیں اور پھر زندگی کا بقیہ حصہ انہوں نے بیماری سے لڑتے ہوئے ہی گزارا۔ ممکن ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ خطوط کسی اعلیٰ ادبی شاہکار کے زمرے میں نہ آتے ہوں لیکن ان کی سطح سے ایک ایسی عورت کا دکھ جھلکا ہے جو اپنے محبوب شوہر کی جدائی سے بڑھ چلا ہے اور زندگی کا بہترین حصہ ملازمت، بیماری اور بچوں کی دیکھ بھال میں گزاری ہے۔ ان خطوط کا مجموعہ پہلی بار 1955ء میں مکتبہ جامعہ کے زیر اہتمام ”حرفِ آشنا“ اور ”زیر لب“ کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کیا گیا۔ بعد میں ان خطوط کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ ہندی کے سابق سربراہ پروفیسر امین دجاہت نے ہندی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی تقریب رونمائی میں اردو کے نامور ادیبوں کے علاوہ جاوید اختر کے چھوٹے بھائی سلمان اختر اور شائستہ اعظمی نے بھی شرکت کی۔ ان خطوط کے اقتباسات سناتے ہوئے شائستہ اعظمی جذباتی ہو گئیں۔ خاص طور پر صوفیہ کا آخری خط انتہائی درد انگیز تھا جو انہوں نے اپنی وفات سے 19 روز قبل جاوید اختر کو لکھا جس کی ایک سطر سناتے ہوئے شائستہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ”آخر، آؤ..... مجھے مرنے نہ دو۔ میں مرنا نہیں چاہتی البتہ بہت تھک گئی ہوں ساھی!“

جاوید اختر کو اپنی ماں کے مرنے کا دن اچھی طرح یاد ہے، جب ان کی روتی ہوئی خالہ حمیدہ، دونوں بھائیوں کا

میں صوفیہ کو بھی اسی کالج میں ملازمت مل گئی۔ 1949ء میں انہوں نے کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور فلموں میں نغمہ نگاری حیثیت سے اپنا مستقبل بنانے کے لیے بمبئی چلے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات دوسرے ترقی پسند ادیبوں مثلاً ملک راج آنند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ سے ہوئی۔ بمبئی کا سلورس ریسٹورنٹ ان کا مستقل ٹھکانا تھا۔ جاوید اختر کو بمبئی کی فلم نگری میں اپنی جگہ بنانے کے لیے کافی انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران صوفیہ ہی ان کی مالی معاونت کرتی رہیں جو ملازمت کی وجہ سے بھوپال میں ہی رک گئی تھیں۔ بہر حال 1955ء میں فلم ”پانچوین“ کے ذریعے جاوید اختر کو بحیثیت نغمہ نگار پہلی کامیابی ملی لیکن صوفیہ اس خوشی میں شرکت کرنے کے لیے موجود نہ تھیں۔ وہ 17 جنوری 1953ء کو کینسر میں مبتلا ہو کر اس جہاں فانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد جاوید اختر نے 17 ستمبر 1956ء کو خدیجہ طلعت نامی ایک خاتون سے دوسری شادی کر لی جن سے ان کی تین اولادیں شاد اختر، مصیوہ اختر اور الینا اختر ہیں۔ جاوید اختر کا انتقال 19 اگست 1976ء کو ہوا۔

جاوید اختر کی پہلی بیوی صوفیہ نے اس دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا جب مسلمان خواتین کے لیے اسکول چلانا بھی ایک خواب کی مانند تھا۔ وہ ترقی پسند نظریات کی حامل تھیں اور انہوں نے اپنی زندگی کے فیصلے بھی خود ہی کیے۔ جب جاوید اختر نے بمبئی جانے کی فحاشی تو صوفیہ نے اس کی مخالفت نہیں کی لیکن وہ ایک باشعور اور حقیقت پسند خاتون تھیں اور جانتی تھیں کہ ایک اجنبی شہر میں قدم بھانے کے لیے جاوید اختر کو کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے دونوں بچوں جاوید اور سلمان کے ساتھ بھوپال میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ان کا یہ فیصلہ کتنا برحق تھا۔ ابتدائی چند برس جاوید اختر کے لیے بے حد دشمن تھے۔ یہ صوفیہ ہی تھیں جو کالج سے ملنے والی تنخواہ میں سے گزارے کے لیے انہیں پیسے بھیجتی تھیں۔ جاوید اختر سے انہیں بہت محبت تھی جس کا

اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے جو صوفیہ نے 43ء اور 53ء کے درمیان انہیں لکھے۔ یہ خطوط ایک ایسی عورت کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں جو اپنے شوہر سے دور رہ کر بچوں کی پرورش کر رہی ہے اور اسے مالی پریشانیوں کے علاوہ صحت کے مسائل کا سامنا ہے۔ جاوید اختر سے جدائی کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے بمبئی جانے کے ایک سال بعد ہی وہ بیمار

لیکن تقدیر کو ہی ان کی کامیابی کی واحد وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے عوامل ہیں جنہوں نے جاوید اختر کو اس منزل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جاوید اختر کو بچپن سے ہی ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے اس کے اندر ایک باغی شخص کی نشوونما ہونے لگی، جو حوصلہ مند اور پُر عزم ہے، ناکامیوں سے دل برداشتہ ہونے کے بجائے ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ آگے قدم بڑھاتا ہے۔

جاوید اختر کی زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی محرومیوں سے واسطہ پڑ گیا۔ آٹھ سال کے تھے کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ کسی وجہ سے باپ کا پیار بھی نہیں مل سکا۔ عملی زندگی کا آغاز دھکے کھاتے ہوئے کیا اور پھر زندگی کے یہ دکھ ہی انہیں خوشیوں کی طرف لے گئے۔ جاوید اختر نے ایک علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ 17 جنوری 1945ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جاوید اختر اردو کے قادر الکلام شاعر، فلمی نغمہ نگار اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم اراکین میں سے تھے۔ ان کی شادی 1943ء میں صوفیہ اختر سے ہوئی جو اردو کے مشہور رومانوی انقلابی شاعر اسرار الحق مجاز کی بہن تھیں۔ جبکہ دادا مظفر حیدر آبادی بھی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب مولانا فضل حق خیر آبادی سے ملتا ہے جو ایک شاعر، فلاسفر اور مذہبی اسکالر ہونے کے علاوہ 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے مجاہد کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں آبائی شہر خیر آباد سے 30 جنوری 1858ء کو گرفتار کر کے کالا پانی بھیج دیا گیا۔ بعد میں ان کے بیٹے شمس الحق نے کسی نہ کسی طرح ان کی رہائی کا پروانہ حاصل کیا اور انہیں لینے کے لیے 13 فروری 1861ء کو پورٹ بلیر پہنچے لیکن ان کی یہ کوشش رانگاں گئی کیونکہ صرف ایک روز قبل یعنی 12 فروری 1861ء کو مولانا کو پھانسی دی جا چکی تھی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے مرزا غالب کی فرمائش پر ان کے پہلے دیوان کی تدوین بھی کی تھی۔

جاوید اختر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ان کا ارادہ ہی ایچ ڈی کرنے کا تھا لیکن گھریلو حالات کی وجہ سے انہیں گوالیار واپس آنا پڑا جہاں وہ وکٹوریہ کالج سے بحیثیت اردو پتھر ادا بستہ ہو گئے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل فسادات کی وجہ سے وہ بھوپال منتقل ہو گئے اور حمید یہ کالج میں شعبہ اردو و فارسی کے سربراہ کے طور پر کام کرنے لگے۔ بعد



ہنی ایرانی

کہا "بھوک، بیماری، مفلسی، ان سب میں ہم برابر کے حصے دار ہیں۔"

"میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ جب ہم دونوں میں اتنی دہنی ہم آہنگی ہے۔ مزاج بھی ملتا جلتا ہے، دکھ سکھ سانبھے ہیں تو پھر کیوں نہ ہم مل کر کام کریں۔"

جادید کو ہنسی آگئی اور بولے "موسیقاروں کی جوڑی تو سنی ہے لیکن رائٹرز کی جوڑی، واقعی کمال کا آئیڈیا ہوگا۔"

"مجھے اس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں۔ جب دودل ملتے ہیں تو محبت کا پودا تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔"

دو ذہن مل گئے تو سوچو کیا ہوگا؟ دیسے بھی تم نے سنا ہوگا کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔"

جادید نے سوچا، کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے؟ اس کم از کم ایک فائدہ تو یقینی ہے کہ ناکامی کا دکھ دونوں کے حصے میں

آدھا آدھا آئے گا۔ یہی وہ تاریخی لمحہ تھا جب سلیم جادید کی جوڑی منظر عام پر آئی۔ ایس ایم ساگر نے جو کہانی دی تھی،

اس کا اسکرپٹ سلیم خاں نے لکھا اور مکالمے جادید کے حصے میں آئے۔ دونوں کو اس کام کا معاوضہ دس ہزار روپے ملا جو

انہوں نے برابر برابر تقسیم کر لیا۔

اس کے بعد سلیم جادید نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کامیابی نے ان کے گھر کا دروازہ دیکھ لیا تھا اور ان کی لکھی ہوئی فلمیں

دھڑا دھڑا ہٹ ہو رہی تھیں۔ "ہانسی میرے سامھی، زنجیر، بیتا اور گیتا، شعلے، دیوار، ترشول، ڈون، کالا پتھر، دوستانہ، شکتی،

مسٹر انڈیا"..... ان سبھی فلموں نے باکس آفس پر کامیابی کے ریکارڈز قائم کیے اور سلیم جادید کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت

بن گیا۔ وہ پھر اشارز کی طرح قیمتی کاروں میں گھومتے اور منہ مانگا معاوضہ وصول کرتے۔ بڑے بڑے فلم سازان کے

دروازے پر قطار باندھے کھڑے رہتے۔ ان کی بس ایک ہی کوشش ہوتی تھی کہ سلیم جادید کسی بھی قیمت پر ان کے لیے اسکرپٹ لکھ دیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اسکرپٹ ان کی تقدیر بدل دے گا۔ فنا سرز اور فلم ڈسٹری بیوٹرز کی ایک ہی فرمائش

ان کے ڈائلاگز لکھ دیا کریں تو وہ انہیں چھ سو روپے مہینہ لیا گئے۔ جادید کے لیے یہ چھ سو اس وقت چھ کروڑ کے برابر تھا۔ اس لیے وہ اس نوکری کے بارے میں سوچنے لگے پھر

اپن آیا کہ نوکری کر لی تو بھی چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ لکھنؤ میں تین روز گزر گئے۔ پھر انہوں نے انکار کر دیا۔

بیمنی میں پانچ برس ہونے کو آئے۔ روٹی ان کے لیے چاند کی مانند تھی جو کبھی دکھائی دیتا ہے اور کبھی چھپ جاتا

4۔ یہ پانچ برس ان پر بہت بھاری تھے، لیکن سر نہیں لٹا سکے۔ وہ بھی ناامید نہیں ہوئے، انہیں پورا یقین تھا، کچھ

مرد ہوگا۔ وہ یونہی مرجانے کے لیے پیدا نہیں ہوئے

آخر نومبر 1969ء میں انہیں وہ کام مل گیا جسے فلم والوں

لاربان میں "بریک" کہا جاتا ہے۔

فلم "سرحدی لیرا" کے سیٹ پر جادید اختر کی ملاقات

بیم خاں سے ہوئی۔ سلیم 24 نومبر 1935ء کو مدھیہ

پٹن کے شہر اندر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پولیس

فیسر تھے جبکہ ماں جوانی میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔ سلیم خاں

اپنی شادی 1964ء میں سلیم نامی ایک خاتون سے ہوئی

ان سے ان کے چار بچے سلمان خاں، ارباز خاں، سہیل

ماں اور الورا خاں ہیں جبکہ دوسری شادی انہوں نے

1971ء میں مشہور قاصد اداکارہ ہیلن سے کی۔ ہدایت کار

امرا ناتھ نے انہیں ایک شادی کی تقریب میں دیکھا اور

ان کی مردانہ وجاہت اور خوبصورتی سے متاثر ہو کر انہیں بیمنی

نے کی دعوت دی۔ سلیم خاں اپنی آنکھوں میں سنہرے سپنے

ہائے بیمنی پہنچے تو کے امرا ناتھ نے انہیں چار سو روپے ماہوار

اپنی کہنی میں اداکار کی حیثیت سے ملازمت دے دی۔ سلیم

ماں نے مختلف فلموں میں چھوٹے بڑے کردار ادا کئے لیکن

ان کی نظروں میں نہ آ سکے۔ سلیم خاں کی قابل ذکر فلموں

میں "تیسری منزل" (1966ء)، "سرحدی لیرا"

(1966ء) اور "دیوانہ" (1967ء) شامل ہیں۔

جادید اختر اور سلیم جلد ہی ایک دوسرے کے قریب

آ گئے۔ یہاں تک کہ دونوں نے ایک ساتھ ہی رہائش اختیار

کر لی۔ سلیم خاں کو لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ان کے دماغ میں نت

نئے آئیڈیاز جنم لیتے جنہیں وہ کاغذ پر منتقل کرتے رہتے۔

ان کی دلوں ہدایت کار ایس ایم ساگر نے سلیم خاں کو ایک فلم کا

اسکرپٹ لکھنے کے لیے کہا۔ اس وقت جادید وہاں

موجود تھے۔ انہوں نے بھی اس میں دلچسپی ظاہر کی تو سلیم

خاں کو ایک انوکھا خیال سوچا اور وہ بولے "یار! تم میرے

انگریزوں نہیں بن جاتے؟"

"وہ تو میں اب بھی ہوں۔" جادید نے مسکراتے ہوئے

ماہنامہ سرگزشت

کہہ دیں گے تاکہ فوری رد عمل سامنے آ جائے۔

میٹرک کے بعد علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔ خالہ بہت رورہی

تھیں اور خانو انہیں چپ کرانے کے لیے کہہ رہے تھے "تم

اس طرح رورہی ہو جیسے یہ مجاڑ پر جا رہا ہو۔" اس وقت نہ خالہ

جانتے تھے اور نہ ہی جادید کو اندازہ تھا کہ زندگی کی جنگ میں

اسے کتنے محاذوں پر لڑنا ہوگا۔

علی گڑھ سے بیمنی جاتے ہوئے باپ نے انہیں آدمی

راستے یعنی بھوپال میں چھوڑ دیا۔ کچھ دن سوتلی ماں کے

ساتھ رہے پھر وہ گھر بھی چھوٹ گیا۔ دوستوں کے سہارے

زندگی گزرنے لگی۔ ان کا ایک دوست اعزاز بخش کر کے اپنا

گزارہ کرتا تھا۔ کمرے کا کرایہ بھی وہی دیتا تھا۔ یہ تو بس

ساتھ رہنے کے روادار تھے۔ جب دونوں میں جھگڑا ہوتا اور

بات چیت بند ہو جاتی تو یہ اس سے پیسے نہیں مانگتے تھے بلکہ

دیوار پر لٹکی ہوئی اس کی پتلون میں سے نکال لیتے تھے یا وہ خود

ہی ان کے سر ہانے ایک یا دو روپے رکھ کر چلا جاتا تھا۔

سیکینڈ ایئر کے بعد اعزاز کسی دوسرے شہر چلا گیا اور انہیں

کالج کے کمپاؤنڈ میں ایک خالی کمرارہنے کے لیے مل گیا۔

جادید نے تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ تین

برس تک بھوپال روٹری کلب کا مباحثہ جیتتے رہے۔

انٹر کالجیٹ ڈیبیٹ میں بھی کئی مرتبہ انعام جیتا۔ کالج یونین

کے ایکشن میں حصہ لینے والی ہر پارٹی چاہتی کہ یہ اس کی

طرف سے ہو لیں۔ جادید اختر کو ایک سن سے نہیں صرف بولنے

سے دلچسپی تھی چنانچہ جو پارٹی زیادہ پیسے دیتی تھی، یہ اس کی

طرف سے تقریر کر دیتے۔

14 اکتوبر 1964ء کو جادید اختر بیمنی چلے آئے۔ بیمنی

آنے کے چھ دن بعد ہی باپ کا گھر چھوڑنا پڑ گیا۔ اس وقت

ان کی جیب میں 27 پے پیسے تھے اور وہ یہ سوچ کر خوش

ہو رہے تھے کہ زندگی میں کبھی انھیں سنے پیسے بھی جیب میں

آگئے تو وہ فائدے میں رہیں گے اور دنیا کھائے میں۔

بیمنی میں ابتدائی دو سال بہت کھن گزرے۔ یوں تو

ایک چھوٹی سی فلم میں 100 روپے مہینہ پر مکالمے لکھنے کا کام

مل گیا تھا۔ کچھ فلموں میں اسٹنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔ پھر

ایک فلم میں مکالمے لکھنے کا کام مل گیا۔ جادید صاحب کچھ سین

لکھ کر ڈائریکٹر کے پاس گئے۔ اس نے سین پڑھا اور سارے

کاغذ جادید کے منہ پر مارے ہوئے بولا "تم زندگی میں کبھی

رائٹرز نہیں بن سکتے۔"

باندہ میں وہ جس دوست کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ

بھی ایک دن چلا جاتا ہے۔ اب اس کمرے کا کرایہ کون دے

گا؟ ایک مشہور اور کامیاب رائٹرز پیش کش کرتے ہیں کہ اگر

ماہنامہ سرگزشت

بچے بڑی بڑی باتیں کرتے تو جادید کا چھوٹا سا ذہن چٹختے لگتا۔ ایک دن اس کے کلاس فیلوز راکیش نے بتایا کہ ڈیڑی اسے پڑھنے کے لیے انگلینڈ بھیجیں گے۔ جادید کو یاد آ گیا۔ کل ہی تو

نانا کہہ رہے تھے "ارے کم بخت، میٹرک پاس کر لے تو کسی

ڈاک خانے میں مہر لگانے کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔"

راکیش کی بات سن کر جادید نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ بڑا ہو کر

امیر آدمی بنے گا تاکہ اس کے بچے ڈاک خانے میں نوکری

کرنے کے بجائے پڑھنے کے لیے انگلینڈ جاسکیں۔ یہ پہلا

خواب تھا جو جادید اختر نے آٹھ سال کی عمر میں جاگتی آنکھوں

سے دیکھا۔

ماں کے مرنے کے بعد اس کے اٹاٹوں کی تقسیم لازمی

تھی۔ صفیہ نے اپنے ترکے میں دو بیٹے جادید اور سلمان

چھوڑے تھے۔ چھوٹے بھائی کو نانائے رکھ لیا اور جادید کو خالہ

کے حوالے کر دیا گیا جو علی گڑھ میں رہائش پذیر تھیں۔ جادید

نے سوچا، ٹھیک ہی تو ہے۔ دو تہیم بچوں کو کوئی ایک گھر میں تو

نہیں رکھ سکتا۔ خالہ کے گھر کے سامنے ایک بڑا سا میدان تھا

اور اسے پار کرنے کے بعد وہ اسکول آتا ہے جس کا نام

منٹورس کل ہے۔ خالہ نے اسکول میں داخلہ کراتے ہوئے ہیڈ

ماسٹر سے کہا تھا "خیال رکھیے گا، ان کا دل پڑھائی میں کم فلمی

گانوں میں زیادہ لگتا ہے۔"

خالہ نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ اس وقت تک جادید اختر کو

فلموں اور فلمی گانوں کا چسکا لگ چکا تھا۔ انہیں بہت سے فلمی

گانے یاد تھے لیکن گھر میں یہ گانے گانا تو کیا سننا بھی منع تھا۔

اس لیے اسکول سے واپس آتے ہوئے زور زور سے گاتے

تھے۔ جادید اختر کا اسکول، علی گڑھ یونیورسٹی کے علاقے میں

ہی تھا۔ چنانچہ ان کی دوستی اسکول کے دو چار لڑکوں کے علاوہ

یونیورسٹی کے لڑکوں سے بھی ہو گئی۔ بڑے لڑکوں کی طرح

انہیں بھی ہونٹوں میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ اسکول کی کتابوں

میں دل نہیں لگا تو ناول پڑھنا شروع کر دیے۔ کئی مشہور

شاعروں کے اشعار زبانی یاد ہو گئے۔ یونیورسٹی میں جب بھی

بیت بازی ہوتی، یہ اپنے اسکول کی طرف سے جاتے اور ہر

بار انعام جیتتے۔ یونیورسٹی کے بہت سے لڑکے لڑکیاں انہیں

پہچانتے گئے۔ پندرہ سال کی عمر میں ایک لڑکی کو خط لکھا۔ ان

کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خط میں کیا لکھا جائے۔ ان کے

دوست بھلو نے مدد کی اور دوسرے دن انہوں نے ہمت

کر کے وہ خط اس لڑکی کو پکڑا دیا۔ بقول جادید، وہ ان کی

زندگی کا پہلا اور آخری پریم پتر تھا۔ لڑکی وضع دار تھی، اس لیے

کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے بعد جادید نے تہیہ کر لیا کہ

وہ آئندہ کبھی لڑکی کو خط نہیں لکھیں گے۔ جو کہنا ہوگا وہ منہ پر ہی

ماہنامہ سرگزشت

ہوتی تھی جو فلم سازوں سے کرتے تھے ”سلیم جاوید ہے تو لے جاؤ، جتنا پیسا چاہیے، لے جاؤ۔“ برصغیر کی فلمی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی رائٹر کے نام پر فلم فروخت ہوتی ہو۔ یہ اعزاز سلیم جاوید ہی کے حصے میں آیا۔

سلیم جاوید کی جوڑی نے فلمی مصنفین کو انڈسٹری میں ایک باعزت مقام دیا۔ اس سے پہلے ان کی حیثیت منشی جیسی تھی اور نہ ہی فلم کی پبلسٹی میں ان کا نام دیا جاتا تھا۔ جاوید اختر کا کہنا ہے کہ ان کی کوششوں سے فلم کے پوسٹرز میں اسٹوری رائٹر کا نام شامل ہونے لگا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا ”ہم دونوں کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ فلم کے پوسٹرز میں نام شامل نہ کیے جانے کی وجہ سے ان کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ جب پروڈیوسر، ڈائریکٹر، موسیقار اور اداکاروں کے نام فلمی پوسٹرز میں دیے جاسکتے ہیں تو فلمی مصنف کا نام کیوں نہیں دیا جاتا؟ اس سلسلے میں کئی پروڈیوسرز کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رہی۔ مجبور ہو کر ہم دونوں نے راست اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اور طے پایا کہ وہ خود ہی شہر میں لگے ہوئے تمام پوسٹرز پر اپنا نام لکھ دیتے ہیں۔ ہم نے ایک دکشا کرائے پر لیا اور رنگ کی بالٹی اور برش لے کر اس میں سوار ہو گئے۔ یہ آپریشن رات بھر جاری رہا اور ہم نے شہر میں لگے ہوئے تمام پوسٹرز پر اپنا نام لکھ دیا۔ اس واقعے کے بعد پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز نے فلمی پوسٹرز پر ہمارا نام دینا شروع کر دیا۔“

شعلے کی ریکارڈ توڑ کامیابی کے بعد سلیم اور جاوید کی سوچ کا انداز بھی بدل گیا۔ سب نے کہا سلیم جاوید نے کمال کر دکھایا ہے۔ ان دونوں نے اس کمال میں اپنا حصہ زیادہ جانا اور یوں ساجھے داری جاتی رہی۔ دونوں باوقار انداز میں الگ ہو گئے۔ ایک دوسرے کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ گویا دونوں نے رائٹر ہونے کی لاج رکھ لی۔ یہ بتادیا کہ سوچنے سمجھنے والے لوگ ہیں جو ایک غلطی کرتے ہیں تو دوسری غلطی سے ضرور بچ جاتے ہیں۔

سلیم اور جاوید کی علیحدگی فلمی صنعت کے لیے حیرت، تعجب اور صدمہ کا باعث بنی۔ ہر کوئی اس کی وجہ جاننا چاہتا تھا لیکن ان دونوں نے اپنے لب ہی رکھے تھے۔ جاوید صاحب آج بھی اس روش پر قائم ہیں اور سلیم جاوید کے تعلق کے حوالے سے خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں لیکن سلیم خاں نے 29 سال بعد چپ کا روزہ توڑ دیا۔ انہوں نے ای ٹی وی چینل کے میزبان کوئل نانا کو انٹرویو دیتے ہوئے اس علیحدگی کی جو

وجہ بیان کی وہ کچھ یوں تھی۔
”جاوید فلمی دنیا میں نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی قسم آزمائی کرنا چاہتے تھے لیکن میں اپنا نام کسی ایسے کام کے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی اس کے بارے میں کچھ معلوم تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ ہمارا اشتراک اسکرپٹ لکھنے کی حد تک ہی ہے، وہ لکھ جائیں تو اپنے نام سے نغمہ نگاری کر سکتے ہیں۔ یہ بات حال کی طبع نازک کو ناگوار گزری اور انہوں نے مجھ سے علیحدگی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔“

سلیم خاں کے اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصل وجہ بتانے سے گریز کر رہے ہیں۔ اگر جاوید صاحب فلموں کے لیے گانے لکھنا چاہتے تھے اور سلیم خاں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس پر بھی راضی تھے کہ جاوید اپنے نام سے گانے لکھ سکتے ہیں تو پھر جھگڑا کس بات پر تھا؟ اس بارے میں انیتا پادھی نے اپنی مراثی کتاب ”میری رنگ بھی روپ“ میں کچھ اور ہی کہانی بیان کی ہے۔

”سلیم جاوید نے ایجابھ بچن کے ساتھ ”زنجیر“ اور ”دیوار“ جیسی ہٹ فلمیں کرنے کے بعد اسے ”مسٹر انڈیا“ میں کام کرنے کی پیشکش کی جسے اس نے کسی وجہ سے مسترد کر دیا۔ یہ بات جاوید اختر کو ناگوار گزری اور انہوں نے سلیم خاں سے کہہ دیا کہ وہ آئندہ ایجابھ بچن کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔ سلیم خاں نہیں چاہتے تھے کہ اس مرحلے انڈسٹری کے نمبر ون اداکار کے ساتھ کوئی تنازعہ مول جائے لہذا انہوں نے جاوید صاحب کی تجویز سے اتفاق کر لیا۔ اس گفتگو کے چند روز بعد جاوید اختر نے ایجابھ بچن کے گھر ہولی کی تقریب میں شرکت کی اور رنگ میں اسے بتادیا کہ سلیم خاں اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب سلیم خاں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اس واقعے کے تین چار ماہ بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی اور ایجابھ بچن نے اعلان کر دیا کہ وہ جاوید اختر کے ساتھ کام کرتا رہے گا۔ اس کے بعد سلیم خاں اور ایجابھ بچن میں فاصلہ بڑھتا گیا پھر جب سلیم کا بیٹا سلمان خاں 1988 میں پردہ فلم پر جلوہ گر ہوا تو نفسیاتی اور فطری طور پر وہ ایجابھ بچن کو اپنے بیٹے کا حریف سمجھنے لگا۔

جاوید صاحب کو قریب سے جاننے والے اس کہانی پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں سلیم کی مصنفہ نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ جاوید صاحب صاف گواہ راست باز شخص لگائی بھائی نہیں کر سکتا۔ ممکن

ہاں صاحب نے ایجابھ بچن سے یہ بات کسی اور پیرائے میں کہی ہو لیکن سلیم صاحب تک بات پہنچانے والے شخص نے اسے دوسرا رنگ دے دیا۔

کچھ لوگوں کے خیال میں اس علیحدگی میں شبانہ اعظمی کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات تو سمجھی جانتے ہیں کہ سلیم جاوید کے کام میں جاوید صاحب کا حصہ زیادہ تھا۔ سلیم صاحب پلاٹ لکھتے تھے اور اسے اسکرین پلے و مکالموں کے ساتھ کاغذ پر منتقل کرنے کا فریضہ جاوید صاحب سرانجام دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیم صاحب کا حلقہ انہماک بے حد وسیع تھا۔ وہ اپنے تعلقات کو استعمال کرنے کا ہر جانتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ جاوید صاحب کو پس منظر میں رکھا اور خود پروڈیوسرز سے معاملات طے کرتے رہے۔ اب جاوید صاحب کی زندگی میں شبانہ آئی تو اس نے جاوید صاحب کو یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ اب انہیں سلیم خاں کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ ان کے بغیر بھی اپنے کیریئر کو آگے دھاکتے ہیں۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے سلیم کو الگ کرنے کا منصوبہ بنایا اور ہدایت کار لیش چوہڑا کو راضی کر لیا کہ وہ جاوید کی تحریر کردہ فلم ”مشعل“ کی ہدایات دیں جو اس نے سلیم خاں سے چھپ کر خود لکھی تھی۔ جب جاوید کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنے طور پر بھی کام کر سکتے ہیں تو انہوں نے سلیم کی علیحدگی اختیار کر لی۔

سلیم اور جاوید کی علیحدگی کی اصل وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس کا آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس شاندار شراکت کا خاتمہ کہاں دردناک انداز میں ہوا۔ علیحدگی کے بعد سلیم خاں نے اپنے طور پر ایک فلم ”انگارے“ لکھی لیکن اس سے وہ گاریاں نہ نکل سکیں جن کی توقع سلیم خاں سے کی جا رہی تھی۔ دوسری فلم ”فلک“ بھی جو نمائش کے پہلے روز ہی زمین میں ہو گئی۔ تیسری فلم ”نام“ تھی جس کے پروڈیوسر راجندر لاد اور ہدایت کار ہمیش بھٹ تھے۔ یہ فلم حیرت انگیز طور پر لاہاب رہی اور لوگوں کو یقین آ گیا کہ سلیم خاں کے قلم میں اگلی جان باقی ہے لیکن بعد میں آنے والی فلموں ”قبضہ“، ”لوان“، ”پھر کے پھول“ اور ”دل تیرا دیوانہ“ میں وہ کوئی کمال دکھائے اور آہستہ آہستہ گوشہ گمائی میں چلے گئے۔ ان دنوں وہ ایک پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا بیشتر وقت ہمارے قارئین پر گزرتا ہے۔ نہ جانے انہیں سلیم جاوید کا الہ آباد آتا ہے یا نہیں؟

سلیم خاں سے علیحدہ ہونے کے بعد جاوید صاحب نے ہمارے قارئین کے اسکرپٹ لکھے جن میں ”بے تاب“،

مشعل، پریم، میری جگہ“ اور ”روپ کی رانی چوروں کا راجا“ قابل ذکر ہیں۔ وہ چاہتے تو ہر کہانی لکھ سکتے تھے لیکن لیش چوہڑا نے انہیں ایک نئی راہ دکھادی۔ اس کا احوال جاوید صاحب کی زبانی سنئے۔

”شاعری سے میرا رشتہ پیدائشی اور دلچسپی ہمیشہ سے ہے۔ لڑکپن سے جانتا ہوں کہ چاہوں تو شاعری کر سکتا ہوں مگر آج تک کی نہیں۔ 1979ء میں پہلی بار شعر کہا اور اس طرح اپنی وراثت اور اپنے باپ سے صلح کر لی۔ لیش چوہڑا کا خیال تھا کہ میں فلمی نغمات لکھ سکتا ہوں۔ بار بار کے وعدے کے باوجود ہمت نہیں کر پاتا۔ ”سلسلہ“ بن رہی تھی۔ ایجابھ اور جیا بچن کے بیچ ریکھا کی اصل کہانی کو لیش چوہڑا سیلو لائڈ پر منتقل کر رہے تھے۔ ”دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے“ لیش جی نے ان بولوں کو اپنی قلم سے جوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو ”سلسلہ“ کے گانوں کو خوب پذیرائی ملی اور یوں اسکرپٹ رائٹر جاوید اختر کی شناخت ایک مستند نغمہ نگار کے طور پر ہونے لگی۔“

اس کے بعد جاوید صاحب نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ پوری توانائی، جوش اور جذبے کے ساتھ فلموں کے لیے نغمات لکھنے لگے۔ اب جاوید صاحب دوبارہ اشار بن گئے تھے۔ ایک ایسی دنیا کے ستارے جو انہوں نے خود تخلیق کی تھی، جو غلطوں، جذبات اور احساسات سے بچی ہوئی ہے۔ وہ آج فلمی دنیا کے سب سے معروف اور چاہے جانے والے نغمہ نگار ہیں لیکن انہوں نے اپنے آپ کو محض فلمی نغمہ نگاری تک محدود نہیں کیا بلکہ تخلیقی شاعری پر بھی توجہ مرکوز رکھی۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ”ترکش“ کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔

جاوید صاحب کو کئی ایوارڈ اور اعزازات مل چکے ہیں۔ حکومت ہند کی جانب سے انہیں 1999ء میں پدم شری اور 2007ء میں پدم بھوشن کا اعزاز دیا گیا۔ سلیم خاں کے ساتھ مل کر انہوں نے جن فلموں کے اسکرپٹ لکھے، ان پر وہ سات مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں جبکہ بحیثیت نغمہ نگار بھی انہیں سات فلم فیئر ایوارڈ ملے ہیں۔ وہ پانچ مرتبہ بہترین نغمہ نگار کا نیشنل فلم ایوارڈ اور دو مرتبہ اسکرین ویڈیو کون ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے مشہور نغمے ”سندیسے آتے ہیں“ پر پہلا زلی ایوارڈ ملنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

جاوید صاحب کی پہلی شادی ہنی ابراہمی سے ہوئی۔ ان دنوں جاوید صاحب بیٹا اور بیٹا کا اسکرپٹ لکھ رہے تھے۔ جی بھی اس فلم میں کام کر رہی تھی۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ

حیثیت والو جی

محمد امجد

دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں مذاہب پھیلے ہیں۔ سچے جھوٹے جیسے بھی ہوں، سب کے ماننے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں اور تعداد میں اضافے کے لیے مسلسل تبلیغ کرتے رہتے ہیں مگر یہ ایک ایسا مذہب ہے جو خود کو خفیہ رکھتا ہے پھر بھی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کے ماننے والے بھی حد درجہ پراسرار ہیں۔ اپنی تقاریب کو خفیہ رکھتے ہیں۔

ایک انتہائی خفیہ مذہب کا تذکرہ خاص



فلوریڈا کا ایک علاقہ کلیروائر۔ بہت ہی چھوٹا سا علاقہ، گنتی کی چند دکانیں۔ اس قصبے کی نوعیت ایسی ہے کہ دونوں طرف کچھ دکانیں بنی ہوئی ہیں اور ان کے درمیان ایک سڑک کل کھاتی ہوئی آگے چلی گئی ہے۔

ان دکانوں میں ایک گروسری ہے جس میں روزمرہ ضروریات کی چیزیں ملتی ہیں۔ ایک ہیٹرول پمپ ہے۔ ایک ہوٹل ہے اور اسی قسم کی اور دو تین دکانیں ہیں۔ لیکن یہ پورا علاقہ سویا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان دکانوں میں

اس کے حصے میں آئے ہیں۔
شانہ اعظمی اور جاوید صاحب کی ملاقات کنگی اعظمی کے گھر پر ہوئی۔ کنگی صاحب کے دولت کدے پر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا ٹھکانہ لگا رہتا تھا۔ کنگی اعظمی، کیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور جاوید اختر بھی اپنے ترقی پسند نظریات کے سبب ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ پھر نہ جانے کب اور کب جاوید صاحب اور شانہ کے بیچ مراسم بڑھنے لگے اور اب ان کی ملاقاتیں گھر کے علاوہ دوسرے مقامات پر ہونے لگیں۔ محسوس کرنے لگے کہ ان کے درمیان حقیقی ساتھیوں جیسا مضبوط رشتہ پروان چڑھ رہا ہے جو ایک دوسرے کو سمجھتے اور جذبات احترام کرتے ہیں۔ جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔

جاوید اور شانہ کے رومانس کی خبریں عام ہوئیں تو ہندی ایرانی کو فکر لاحق ہو گئی۔ اس نے خبر کی تصدیق کے لیے اپنے جاسوس دوڑائے۔ جاوید کے پڑوسیوں نے بھی ہندی ایرانی بتایا کہ وہ اکثر و بیشتر رات کو دیر سے گھر آتے ہیں جب ہندی ایرانی کو یقین ہو گیا کہ جاوید صاحب پوری طرح شانہ کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں تو اس نے ان کی زندگی سے نکلنے فیصلہ کر لیا۔ اس بارے میں جاوید صاحب کا کہنا ہے۔
”طلاق بھی ہماری دوستی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اگر باپ کے الگ ہونے سے بچوں میں کوئی کڑواہٹ نہیں تو اس میں میرا کمال بہت کم اور ہندی کی تعریف بہت زیادہ ہے۔ دنیا میں کم لوگوں کی اتنی عزت کرتا ہوں جتنی عزت میرے دل میں ہندی کے لیے ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہندی علیحدگی اختیار کرنے میں کچھ جلدی کی ہے لیکن جلدی کچھ نہیں ہوتا، اس طرح کے فیصلے تو اوپر ہو چکے ہوتے ہیں، ہمیں پھر میں خبر ہوتی ہے۔“

شانہ صرف ان کی بیوی ہی نہیں، محبوبہ بھی ہے۔ اس سے پاس ایک خوبصورت دل اور قیمتی ذہن بھی ہے، جس میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے اور شانہ پر یہ مصرع پوری طرح فٹ بیٹھتا ہے۔ آج جاوید صاحب اور شانہ آگے پرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں بھی جاوید صاحب کا ذہن پوری طرح جوان ہے، وہ پورا توانائی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ بہت کچھ پانے کے بعد ان کی جستجو اور لگن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہماری دعا ہے وہ زندگی کی آخری سانس تک اسی جوش اور جذبے کے ساتھ کام کرتے رہیں۔

بتاتے چلیں کنگی ایرانی اور اس کی بڑی بہن ڈیزی ایرانی نے ہندی فلموں میں چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر بڑا نام کمایا۔ وہ ڈھائی سال کی تھی جب ستین بوس نے اسے اپنی فلم میں کاسٹ کیا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے سینا اور گیتا اور کئی چنگ جیسی فلموں میں کام کیا اور اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی جاوید صاحب سے ہو گئی جن سے اس کے دو بچے فرحان اختر اور زویا اختر پیدا ہوئے۔ یہ دونوں فلمی صنعت سے وابستہ ہیں۔ فرحان اختر بیک وقت اسکرپٹ رائٹر، ایکٹر، پلے بیک، نغمہ نگار اور فلم پروڈیوسر کی حیثیت میں کام کر رہا ہے۔ اس نے 2001ء میں 27 سال کی عمر میں فلم ”دل چاہتا ہے“ سے ہدایت کاری کا آغاز کیا جبکہ 2008ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”راک آن“ سے اس کا ایکٹنگ کیریئر شروع ہوا۔ زویا اختر نے 2009ء میں ریلیز ہونے والی فلم لک بائی چانس سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ وہ اس فلم کی پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور رائٹر بھی۔ آنے والی فلموں میں زندگی نہ ملے گی دوبارہ اور زخمی شامل ہیں۔

ہندی ایرانی کو بھی لکھنے سے دلچسپی تھی۔ اس نے پہلی کہانی ”آئینہ“ کے نام سے لکھی تو جاوید اختر نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ وہ لکھتا جاری رکھے پھر اس نے ”لمحے“ کا اسکرپٹ لکھنا شروع کیا جو دس ماہ میں مکمل ہوا جبکہ فلم کی شوٹنگ صرف آٹھ مہینے میں مکمل ہو گئی۔ ہدایت کار کے طور پر اس کی پہلی فلم ”ارمان“ تھی۔ وہ 1991ء سے لے کر اب تک پندرہ فلموں کے اسکرپٹ لکھ چکی ہے۔

جاوید اختر اور ہندی ایرانی کا ساتھ زیادہ دیر نہ سکا۔ ہندی بیمار رہنے لگی تھی۔ جاوید صاحب نے اس کے علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن دونوں جانتے تھے کہ یہ شادی زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی لہذا انہوں نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ظاہر تو طلاق کی یہی وجہ بتائی گئی ہے لیکن اصل معاملہ کچھ اور ہے۔ ان کے تعلقات میں بگاڑ اس وقت آیا جب شانہ اعظمی، جاوید صاحب کی زندگی میں آئی۔

شانہ اعظمی کا مختصر تعارف کچھ یوں ہے کہ وہ مشہور ترقی پسند شاعر کنگی اعظمی اور اس کے اداکارہ شوکت اعظمی کی بیٹی ہے۔ اس نے سینٹ زیورس کالج بمبئی سے سائیکالوجی میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد پونا کے فلم انسٹی ٹیوٹ سے اداکاری کا کورس کیا اور 1974ء میں فلم ”انکوز“ سے اداکاری شروع کی۔ اسے پہلی ہی فلم پر بہترین اداکارہ کا نیشنل فلم ایوارڈ ملا۔ وہ اب تک 120 فلموں میں کام کر چکی ہے۔ پانچ مرتبہ بہترین اداکارہ کا نیشنل فلم ایوارڈ اور چار مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ



شہید مرتضیٰ محمدی

شہید کبھی مرتے نہیں، اللہ تعالیٰ سے رزق پاتے ہیں۔ اس بات پر ہمارا ایمان ہے۔ سعودی عرب کے اس شہر میں بھی ایسے ہی دو جسم قبر سے نکلے ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ جسم ڈیڑھ صدی قبل سانس لیتے تھے۔ گروہ مرجعے ہیں تو ان کا جسم مسخ کیوں نہیں ہوا، یہ ایک ایسا راز ہے جس تک پہنچنا میڈیکل سائنس کے لیے ناممکن ہے۔ عقل کی کسوٹی پر اسے پرکھا ہی نہیں جاسکتا کہ شہداء و صدیقین کا مقام بہت بلند ہے۔

ایک سو سال بعد قبر سے برآمد اجسام کا احوال

منہ کے بل گر پڑا۔ اس کا چہرہ پتھر جی زمین سے ٹکرایا تھا اور خون کا نوارہ ساناک سے اُبل پڑا تھا۔

کیمن کے در پر وہ جس طرح ٹھوکر کھا کر مر گیا تھا، اسے دیکھ کر سب چہرے ان رہ گئے تھے کیونکہ وہاں کوئی پتھر بھی نہیں تھا جس سے ٹھوکر لگتی۔ مزدوروں نے بھاگ کر اسے سہارا دیا تھا اور جب پر سوار کر کر شہر پہنچایا گیا تھا۔ فرسٹ ایڈ کے بعد وہ اگلی صبح ہی سائٹ پر پہنچا تھا۔

سائٹ پر کام جاری تھا۔ بھاری مشین کھدائی میں لگی ہوئی تھی مگر کام کی رفتار اب بھی دبی تھی۔ وہ چاہ کر بھی رفتار تیز نہیں کر پایا تھا۔ وہ غصے میں بھٹاتا ہوا سپروائزر کے پاس پہنچا۔ سپروائزر 42 سالہ مصری نژاد تھا۔ خف بے نام تھا۔ اس نے کھدائی کے ہونے کی وجہ سے مزدوروں میں بہت مقبول تھا۔ اس نے انجینئر کو دیکھتے ہی سلام کیا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ انجینئر غصے میں ہے اس لیے اس نے پہلا جملہ ادا کیا۔ ”ہم نے زمین نرم کرنے کے لیے پانی چھوڑا ہے۔ پانی کی وجہ سے زمین نرم ہوگئی ہے اور کھدائی تیز ہے، آپ فکر نہ کریں۔“

”فکر کیسے نہ کروں، مجھے بھی جواب دینا پڑتا ہے۔“

سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا، دھوپ کی شدت عروج پر تھی۔ مزدور پسینے سے شرابور تھے مگر کھدائی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اسی زور شور سے جاری تھی۔ کپنی نے ایک ماہ کا وقت دیا تھا۔ اس ایک ماہ میں مزدوروں کو اسٹرپٹر کھڑا کر دینا تھا مگر حالت یہاں یہ تھی کہ زمین اتنی سخت تھی کہ مشینی پھاؤڑے کام کرنے سے انکاری تھے۔ بار بار بلیڈ ٹوٹ رہے تھے۔ جب تیسری بار بلیڈ چٹا تو انجینئر کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا ”یہ سارے مزدور کام چھوڑ دیں، دانستہ کام روک رہے ہیں، سب کو نکال باہر کرو۔“

”اتنے مزدوروں کو نکال دینا آسان نہیں ہے پھر یہ سب مصری ہیں۔ ذرا سی بات پر سب ایک ہو جاتے ہیں۔“ سپروائزر نے دبی آواز میں جواب دیا۔

”میں کچھ نہیں جانتا، سب کو نکال باہر کرو، مجھے ہر حال میں کام چاہیے، کل میدان کھدایا ہوا ہوگا۔ مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہوگا۔“ انجینئر نے چیختے ہوئے کہا اور کیمن کے دروازے کی جانب بڑھا۔

غصے سے تن تاتا ہوا وہ باہر نکلا تھا کہ اسے جھٹکا لگا اور وہ

ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ پچھلے دنوں کراچی میں ہی اس کے بانی ہارڈ کا جنم دن منایا گیا اور اس میں شامل ہونے والے افراد برٹش یا امریکن نہیں تھے بلکہ پاکستانی تھے۔

انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ سیلف گرومنگ کے چکر میں آکر اس عقیدے میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ کراچی میں ایک کتابچہ تقسیم کیا گیا جس کا نام Way to Happiness تھا۔

اس کتابچے میں وہی بنیادی عقائد ذرا مختلف انداز سے شامل کیے گئے تھے جو ان کی مذہبی کتاب Dianetics میں ہیں۔ یہ کتابچہ اردو میں بھی تقسیم ہوا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے مرکز سے ہٹ کر ادھر ادھر بھٹکنے لگے ہوں۔ جس طرح امریکی اور یورپی اقوام بھٹک رہی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ ہمارے لیے بہت بڑی بد قسمتی کی بات ہوگی۔

جب کراچی کی بات چل نکلی ہے تو اس حوالے سے کراچی کے ایک اور فرقے کا حال سن لیں۔

یہ فرقہ اپنے آپ کو جبریل کہتا تھا۔ اس کے سب سے بڑے مبلغ اور رہنما ساجد نام کے ایک مصور تھے۔ جن کی رہائش کراچی کے علاقے لیاقت آباد میں تھی۔ اس فرقے کے عقائد بھی کچھ عجیب تھے۔

ان کا ماننا تھا کہ قرآن شریف حضرت جبریل علیہ السلام پر نازل ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ جبریل صرف پیغام لانے کے لیے جاتے تھے۔ کیونکہ پیغام تو آپ کے ذہن اور دل پر بھی لقا ہو سکتا تھا۔ پھر اس کے لیے کسی پیغام بر کی کیا ضرورت پیش آگئی؟

ان کے یہاں عبادات میں ذکر اور مراقبے کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ (ذکریوں کی طرح) ان کی اپنی الگ دنیا تھی۔ ان کے اجتماعات میں اوروں کو شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف وہی آیا کرتے جو ان کے عقیدے کے پیروکار ہوتے۔

ایک دانش ور نے بہت چتے کی بات کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جن مذاہب کی رسومات خفیہ طور پر ادا کی جاتی ہوں، مجھ میں کہ ان میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔



Reality یعنی سچائی کی۔ اور C علامت ہے Communication یعنی ابلاغ کی۔

اس فرقے کا ان پر مکمل اعتقاد ہے اور وہ اسی کے مطابق مل کرتے ہیں۔

یہ بھی اپنی علامت کے طور پر کراس استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا یہ کہ اس آٹھ کونوں والا ہوتا ہے۔ جو ان کے بقول وجود کے آٹھ مظاہر ہیں۔

یہاں وہ بدھ ازم کے قریب ہو جاتے ہیں۔ فلش رائٹر ہارڈ ان کا پیغمبر ہے۔ وہ اس کا جنم دن اور بری بھی مناتے ہیں۔ اس دن کام پر نہیں جاتے۔

اس فرقے نے اپنی جزیں امریکا کے علاوہ یورپ میں بھی مضبوط کر لی ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں کو بھی عام طور پر چرچ کہا جاتا ہے۔

ان کی عبادتوں میں ہر شخص شریک ہو سکتا ہے لیکن یہ عام عبادتیں ہوتی ہیں جو تبلیغ کے لیے ہوتی ہیں اور جب کوئی ان کی باتوں سے متاثر ہو کر اس فرقے کا رکن بن جاتا ہے تو اس کے بعد اسے اعلیٰ ترین مدارج ملے کرائے جاتے ہیں۔

وہ مدارج کیا ہوتے ہیں اور وہ ریاضت کیسی ہوتی ہے، یہ باہر والوں کو معلوم نہیں ہو پاتا۔

اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ دوسروں سے مختلف ہے اور وہ طریقہ ایسا ہے کہ ہر شخص اسے اپنی بنیادی اور ابتدائی ضرورت سمجھ لیتا ہے۔

یہ براہ راست اپنے نظریات اور عقیدے کی بات نہیں کرتے بلکہ آنے والے کی شخصیت کو متاثر کن بنانے کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ جسے آپ Selfgrooming کہہ سکتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ جس قدر آپ کی ظاہری شخصیت کھری ہوگی ہوگی اسی قدر آپ کی روح بھی کھری گی، لہذا وہ شخصیت کی تعمیر پر بہت زور دیتے ہیں۔

اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، تقریر کی خصوصیات، ڈریسنگ، کردار شناسی، مراقبہ وغیرہ۔ اور یہ ایسی باتیں جو تقریباً ہر شخص کی ضرورت ہیں۔

کون ایسا ہے جو آئیڈیل نہیں بننا چاہتا؟ اسی لیے لوگ ان کے ممبر بن جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کے عقیدے کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔

یہ لوگ اپنا کام مختلف N.G.O کے ذریعے انجام دیا کرتے ہیں اور یہ ان جی اوز اس وقت پوری دنیا میں موجود

ہوتی کہ وہ ایسا زبردست جھٹکا مارے جس سے انسان اُچھل کر دور جا گرے۔ اس کی بات سب نے فہمی میں آزادی۔ شہر سے ایک دوسرے آپریٹر کو بلوایا گیا۔ منقطعہ عیسر سے فیس فیٹ میں وہ ایک گھنٹے میں پہنچ گیا۔

سچ باسط الخیای نامی وہ آپریٹر بہت تجربے کا تھا۔ حافظ قرآن اور علاقے کی مسجد میں کبھی کبھی امامت بھی کرتا تھا۔ اس نے یہ کام شوقیہ سیکھا تھا۔ پھر کافی عرصہ تک اس نے اس کام کو کیا۔ اب بھی جب کہیں سے بلاوا آ جاتا تھا تو وہ چلا جاتا تھا۔ بنیادی طور پر سبیل علم اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس کے والد بھی ایک مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے اور وہ بھی اسی کام سے وابستہ تھا۔ اس دن بھی جب اسے بلا یا گیا تو وہ مدرسہ سے آ کر بیٹھا تھا۔ اس کہنی کے سپردانز سے اس کی پرانی یاد اللہ بھی اسی لیے وہ بلائے پر چلا آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر جب اسے تمام حالات کا علم ہوا تو اس نے یہی کہا کہ آپ لوگ اچھی طرح غور کر لیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی ایسی قوت ہے جو کام کو روکنا چاہتی ہے۔

”بھائی میرے یہاں میری نوکری کا سوال ہے۔ اگر روٹھ صاحب نے تمہاری باتیں سن لیں تو سمجھو کہ میری نوکری کا خدا حافظ۔“ سپردانز نے فہم کر لیا۔

”رزق کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ میرا دل نہیں ہے کہ میں کام کروں مگر میں تمہاری وجہ سے یہ کام کروں گا۔“

”باتی باتوں کو چھوڑو اور کام سنبھال لو۔ مجھے اپنی نوکری کی فکر ہو گئی ہے۔ روٹھ صاحب بہت غصے میں ہیں۔“ سپردانز نے فہم کر لیا۔

باسط الخیای نے عادت کے مطابق پہلے کلام اللہ کا ورد کیا پھر لیور کو دبا یا۔ بلڈ وزر حرکت میں آ گیا اور زمین کا سینہ شق ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کافی ساری زمین شق ہو چکی تھی کہ اس نے کام روک دیا۔

انجن بند ہوتے ہی سپردانز دوڑتا ہوا آیا ”اب کیا ہوا؟“ ”نیچے دیکھو۔“ اس نے اوپر سے چیخ کر کہا تو سپردانز نے گڈھے میں جھانکا اور سکتے میں آ گیا۔ اس لیے کہ وہاں اسے کسی کا سر نظر آیا تھا۔ آدھا جسم مٹی میں دبا ہوا تھا۔ مگر جو حصہ باہر تھا وہ کسی لاش کا سر لگ رہا تھا۔ یہ ایک نئی انجین تھی۔ اس لیے کہ اب پولیس کو بلانا ضروری ہو گیا تھا۔

گڈھے میں کسی کی لاش پڑی ہے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح اس کو نے سے اس کو نے تک میں پھیل گئی تھی۔ مزدور دوڑ دوڑ کر آ رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کھڈے کے گرد ایک جم غیر جم ہو گیا۔ مزدوروں میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کام پوری طرح

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ آتی ہوئی ٹرالر کے وہیل کے نیچے ایک چھوٹا سا پتھر آیا، پتھر ٹالر کے کناروں سے دبا تھا اس لیے پھسل کر اُچھلا اور غلیل سے پھینکے گئے گٹے کی طرح آ کر اس کے سر سے لگرایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سر سے خون کی دھار بہنے لگی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ابھی ٹاک کا بانسہ پھٹا تھا، اب سر پٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس پر پے در پے میمبٹیس کیوں ٹوٹی پڑ رہی ہیں۔ وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا اور فیلڈ میڈیکل اسٹاف اس کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔

وہ مرہم پٹی کر کر فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک مزدور نے آ کر اطلاع دی ”سر بلڈ وزر آپریٹر کو تیز بخار آ گیا ہے۔“ ”ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ بھلا چنگا تھا۔“ سپردانز کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں، صبح صبح تھا مگر کچھ دیر پہلے اسے تپ ہوئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیز بخار چڑھ گیا۔“

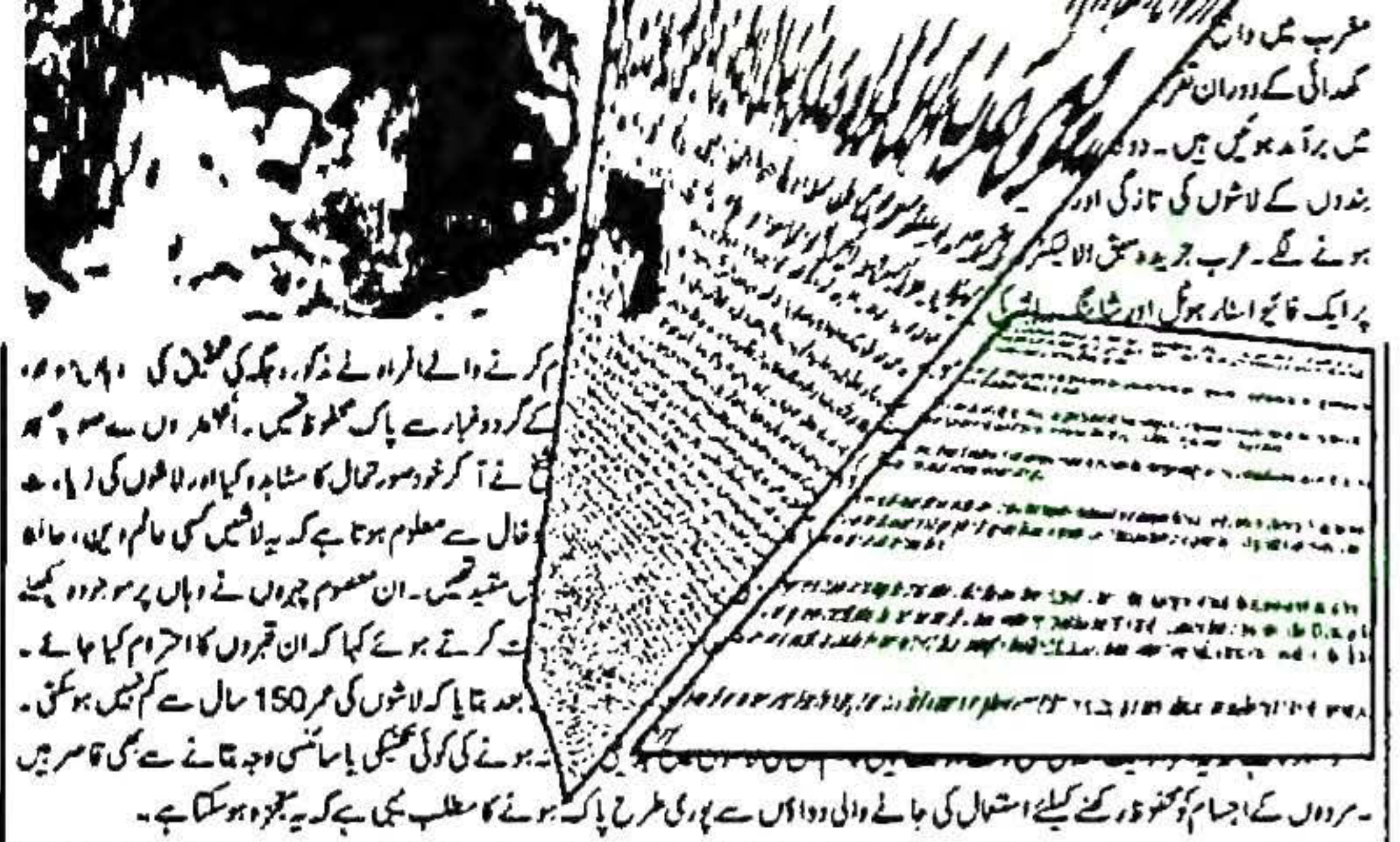
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، چلو میں دیکھتا ہوں۔“ کہہ کر وہ بلڈ وزر کے پاس آیا۔ بلڈ وزر آپریٹر کو دو مزدور سہارا دے کر خیمے کی طرف لے جا رہے تھے۔

سپردانز نے اسسٹنٹ آپریٹر موشان کو آواز دی۔ موشان 26 سال کا ایک قد آور جوان تھا۔ وہ بھی مصری تھا مگر مذہبی طور پر عیسائی تھا۔ آرتھوڈوکس سیرین عیسائی۔ اس کے چہرے پر کھنٹی داڑھی تھی مگر مسلمانوں کی طرح وہ ٹوپی پہنتا تھا۔ دیکھنے والے اسے پہچان نہیں پاتے تھے کہ وہ عیسائی ہے، اکثر لوگ اسے مسلمان سمجھتے تھے۔ موشان کو سپردانز نے کہا کہ وہ اپنے استاد کی جگہ سنبھال لے۔

سپردانز کا حکم وہ رو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اتنا تجربہ تو تھا کہ بلڈ وزر کو کیسے آپریٹ کرنا چاہیے۔ کس لیور کو دبانے سے بلیڈ اوپر اٹھتا ہے اور کس کو دبانے سے وہ نیچے گر کر زمین میں پوسٹ ہو جاتا ہے۔ اس نے سیٹ سنبھالتے ہی آپریٹ لیور کو کھینچا۔ لیور کھینچتے ہی ایک محیر العقول واقعہ رونما ہوا۔ شاید ہی کسی کو یقین آئے مگر اسے اوپر سے پلیٹ فارم سے گرتے ہوئے سب نے دیکھ لیا تھا۔ وہ سات فٹ کی بلندی سے گرا تھا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

کام ایک بار پھر بند ہو گیا تھا۔ سب اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میڈیکل اسٹاف اسے ٹریسٹ دینے میں مصروف ہو گیا تھا۔

موشان ہوش میں آیا تو لوگوں نے گرنے کی وجہ جاننا چاہی۔ کچھ دیر تک وہ ذہن پر زور دیتا رہا، پھر اس نے بتایا کہ بلڈ وزر میں کرنٹ آ گیا تھا۔ اسی کے جھٹکے سے وہ گرا تھا۔ یہ بھی ایک ناممکن بات تھی۔ بلڈ وزر کی بیٹری اتنی طاقتور نہیں



مگر نے والے لڑا لے ذکر، جگہ کی مہین کی ۱۰۰۰۰۰ کے گرد وبار سے پاک مکتو فہمیں۔ انکھروں سے صدمہ پہنچنے آ کر خود صور حال کا مشاہدہ کیا اور لاشوں کی لاش خال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لاشیں کسی عالم میں، حالہ میں مشیدہ تھیں۔ ان معصوم چہروں نے وہاں پر سو جڑو کیسے کرتے ہوئے کہا کہ ان قبروں کا احترام کیا جائے۔ بعد بتایا کہ لاشوں کی عمر 150 سال سے کم نہیں ہو سکتی۔ ہونے کی کوئی ممکنہ یا سائنسی وجہ بتانے سے بھی قاصر ہیں۔ مردوں کے اجسام کو کھنڈر کئے کیلئے استعمال کی جانے والی دوا اس سے ہاری طرح پاک ہونے کا مطلب بھی ہے کہ یہ بجز ہو سکتا ہے۔

انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش کے اخبارات میں خبریں

یہاں کیوں دبا کی۔ کہیں اور جا کر اسے دباتے۔ اب خواہ مخواہ شرطے آ کر وقت برباد کریں گے۔ رپورٹ مرتب کرنے کے نام پر ایک دو دن برباد کرویں گے۔ یہاں وقت بالکل نہیں ہے اور یہ نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

بکنا جھٹکا انجینئر اس کھڈے تک پہنچا۔ گڑھے کے نزدیک پہنچ کر اس نے نیچے جھانکا پھر آہستہ آہستہ وہ نیچے اُترا۔ اس کے ساتھ سپردانز کو بھی نیچے اُترنا پڑا۔ وہاں ایک نہیں دو لاشیں تھیں۔ دونوں لاشوں کے درمیان چھ ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ پہلے ایک لاش نظر آئی تھی۔ لاش دیکھتے ہی مشین روک دی گئی تھی اور بلڈ وزر کے بجائے پھاؤڑے سے مٹی ہٹائی گئی تھی۔ اسی دوران ایک اور لاش نظر آ گئی۔ ان دونوں لاشوں کا صرف آدھا آدھا حصہ باہر تھا۔ ہائی کا حصہ اب تک مٹی میں دبا ہوا تھا۔

وہ دونوں لاش کے سر ہانے کھڑے ہو کر معائنہ کر رہے تھے۔ دونوں لاشوں کی شکل ایک جیسی تھی۔ بہت زیادہ مشابہت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا دونوں بھائی ہیں۔ کھلتا ہوا رنگ، چوڑی ہونٹیں اور ایک جیسی چھوٹی داڑھی، عمر بھی تقریباً برابر لگ رہی تھیں۔ تیس پینتیس سال کی عمر ہوگی مگر چہرے پر غضب کی معصومیت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی سوئے ہیں۔

لاش کا معائنہ کرنے کے بعد انجینئر نے کہا ”یہ تو قتل کی واردات نہیں لگتی اور نہ جلد بازی میں یہ لاش دبا کی گئی ہے۔“ ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے سر!“ سپردانز نے تائید کی۔ ”اس لیے کہ دونوں لاشوں پر سفید کپڑا اڑھا دیا گیا۔“ ”جی ہاں سر!“ ”مگر سفید کپڑے کے نیچے انہوں نے اسے روایتی

رک چکا تھا۔ ہر کوئی چہ میگوئیوں میں مصروف تھا۔ جتنے منہ تھے، اتنی باتیں تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کسی راگیر کو قتل کر کے یہاں دبا یا گیا ہے کیونکہ علاقے کے کسی شخص کا قتل ہوتا تو بات پھیل جاتی پھر یہ علاقہ بھی زیادہ بڑا نہ تھا۔ کسی گمنجان شہر میں بھی ایک ساتھ دو آدمی غائب ہو جائیں تو ہر طرف بانٹیں شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ تو معمولی سا قصبہ تھا۔ پھر جہاں کام ہو رہا تھا وہ اس قصبے سے بھی باہر کا علاقہ تھا۔ دو شہروں کے درمیان یہ قصبہ ہے، پھر یہ قصبہ ایک ایسی گزرگاہ پر واقع ہے جو ہمہ وقت مصروف رہتی ہے۔ سیاحتی مرکز ہونے کی وجہ سے دن رات لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس شاہراہ پر ایک دو تیس سے زائد فائبرسٹار ہوٹل بھی ہیں جن میں مسافر آرام کی غرض سے ٹھہرتے رہتے ہیں۔ کون کب آیا، اس کی خبر عام لوگوں کو نہیں ہوتی اسی وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ کسی مسافر کو لوٹنے کے بعد کسی جرائم پیشہ نے قتل کر کے لاش یہاں لا کر دبا دی ہے۔

گڈھے کے گرد مزدوروں کی بھیڑ اس طرح جمع تھی کہ آگے بڑھنا دشوار تھا۔ انجینئر روٹھ کو خبر دی جا چکی تھی۔ وہ بھی آ گیا تھا اور اب وہ سپردانز کے ساتھ اس طرف بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔ سپردانز کو امریکی بالکل پسند نہ تھے۔ وہ اچھے اور برے دونوں حالات میں گالیاں بکتے تھے۔ سپردانز کچھ کچھ مذہبی رجحان کا تھا اس لیے اسے یہ خرافات پسند نہ تھیں لیکن کیا کرتا کہ مجبوری تھی۔ وہ چاہ کر بھی انجینئر کو منع نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی انجینئر اس وقت سخت غصے میں تھا۔ اسے جرائم پیشہ افراد پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا کہ اگر قتل کرنا ہی تھا تو انہوں نے لاش

ملبوسات پہنا رکھے ہیں۔ جب سب پر کپڑے موجود ہیں تو پھر اوپر سے کپڑے سے ڈھکا کیوں گیا، باضابطہ کفن بھی پہنایا جاسکتا تھا۔ انجینئر کی آواز میں فکر کا عنصر در آیا تھا۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

”لیکن سر، شاید آپ کو یاد نہیں ہے کہ ہم مسلمان اپنے مردوں کو اس کے کپڑوں میں بھی دفن کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوران جنگ شہید ہوتے ہیں، ان کی لاش کو غسل و کفن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی حالت میں بھی دفن کر دیتے ہیں۔“

”مگر آج کل یہاں، اس علاقے میں کوئی جنگ بھی تو نہیں ہوئی ہے۔“ انجینئر نے پرسوج انداز میں کہا۔

”یہی تو حیرت کی بات ہے کیونکہ لاش کے چہرے سے ظاہر ہے جیسے یہ کوئی شہید ہے۔“ سپروائزر کے جواب پر انجینئر نے اسے گھور کر دیکھا پھر وہ مٹی ہٹانے کے لیے بیٹھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا مگر جیسے ہی اس نے لاش کے قریب کی مٹی میں ہاتھ لگایا، وہ خود بخود پیچھے کی جانب الٹ گیا۔ اس کا سر گڑھے کی دیوار سے ٹکرایا تھا پھر وہ اوپر کی جانب چہرہ اٹھا کر چلایا ”جلدی.....جلدی مجھے باہر نکالو۔“

بلڈوزر کا آہنی بک نیچے لٹکا دیا گیا جسے کپڑے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ سپروائزر بھی اسی طرح باہر آ گیا تھا۔ اوپر آ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ انجینئر نظر نہیں آ رہا تھا۔

”صاحب جی کہاں ہیں؟“ اس نے ترک زبان میں ایک مزدور سے پوچھا۔

”اپنے کیمین میں ہیں۔“ مزدور نے جواب دیا ”ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ وہ آرام کر رہے ہیں۔“

سپروائزر انجینئر کے کیمین کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسے بھی فکر ہوگئی تھی کہ صبح سے ایک نہ ایک بات ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ اب کام بند کرنا پڑے گا۔

سعودی عرب کے جنوب مغربی صوبہ عسیر کے علاقے قمیس مشیط میں ایک عالی شان ہوٹل کی تعمیر کے لیے ہو رہی کھدائی کے موقع پر یہ باتیں رونما ہو رہی تھیں۔ اب لاش کی برآمدگی نے مزید پریشانی کھڑی کر دی تھی۔ پولیس کو خبر دینا ضروری تھا اور یہ کام صرف انجینئر کر سکتا تھا یا پھر اس کے حکم سے وہ خود۔ اسی بات کی اجازت لینے وہ اس کیمین میں آیا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے دیکھا کہ انجینئر اپنے بستر پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر پوچھا ”سر اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

آواز سننے ہی وہ جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا ”تم نے دیکھا تھا میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”کیا ہوا تھا؟“ سپروائزر نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا تھا۔ ڈیڑہ پاڑی کو ہاتھ لگاتے ہی مجھے ایسا لگا تھا جیسے 440 پونڈ کا کرٹ لگا ہو بھی تو میں الٹ کر گر گیا تھا۔“ انجینئر نے جواب دیا تھا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے میری سمجھ سے باہر کی بات ہے۔ تب سے میں مسلسل اسی بات پر غور کر رہا ہوں۔ تم کچھ بتا سکتے ہو؟“

”سر میری بات پر یقین کریں گے؟“

”ہاں بولو؟“

”ہم مسلمان مردوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ پاک مردوں کو تو کچھ زیادہ ہی احترام دیتے ہیں۔“

”پاک اور ناپاک کیا؟“ مردے مردے ہوتے ہیں۔“

”نہیں سر! وہ لوگ جو زندگی بھر پاک زندگی گزارتے ہیں وہ اللہ والے ہوتے ہیں۔ شہداء اور صدیقین میں ہوتے ہیں۔ ان کی لاشیں بھی پاک اور طاہر ہوتی ہیں۔ ان کو ہاتھ لگانے والا بھی طاہر ہونا ضروری ہے۔“ ان کی باتیں جاری تھیں کہ باہر سے خبر آئی ”سر شرطے آئے ہیں۔“

سپروائزر باہر آ گیا، اب اسے ہی پولیس والوں سے نمٹنا تھا۔ وہ اس گڑھے کی طرف آیا۔ بھی اس کی نظر علاقے کی مسجد کے امام پر پڑی۔ شیخ احمد بن محمد الحواشی کا شمار علاقے کے دیندار لوگوں میں ہوتا تھا۔ پورے قصبہ میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے بھی لاشوں کا معائنہ کیا تھا۔ ان کے بعد ہی پولیس والے گڑھے میں اترے تھے اور لاشوں کا معائنہ کیا تھا۔

معائنہ کے بعد انہوں نے لاش پر پڑی مٹی بھی ہٹا دی تھی۔ اب دونوں لاشیں باہر نکالی جا رہی تھیں۔ سپروائزر کی نظر ان لاشوں کے جسم پر موجود کپڑوں پر جم کر رہ گئی تھی۔ ان دونوں کے ملبوسات؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں کسی ڈراما کمنٹی کے ہوں۔ اس لیے کہ ان کے لباس نہایت قدیم تراش کے تھے۔ آج کیا پچاس سال جیستر بھی ایسی تراش کے کپڑے کوئی نہیں پہنتا ہوگا۔ کئی سو سال پہلے کے ملبوسات لگ رہے تھے۔

لاشوں کو ایمبولنس میں ڈال کر اسپتال بھیج دیا گیا۔ اگلے دن اسپتال سے جو خبر آئی اسے سن کر مزدوروں میں پھر سے ایک بار خوف کی لہر دوڑ گئی۔

اسپتال میں ڈاکٹروں کی ٹیم نے لاش کا معائنہ کیا تھا۔ کئی قسم کے تجربے بھی کیے تھے۔ وہ سب اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ یہ لاشیں آج کی نہیں ہیں۔ انہیں مرے ہوئے

ایک ڈیڑھ صدی سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔

اتنی پرانی لاش اور صحیح سلامت اور یہ عالم کے کل کی لگ رہی تھی۔ یہی بات سب کو حیران کر رہی تھی۔ ہر ایک اس بات سے آگاہ تھا کہ لاش زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی۔ ایک ہفتے میں گنا سڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے لاش کا پیٹ پھٹتا ہے۔ آنتیں اور دیگر اعضا گل کر مٹی میں جذب ہوتے ہیں پھر باری آتی ہے نسون، پٹھوں کی پھر ہڈیوں کی بالوں کی اور دانتوں کی۔

لیکن یہاں تو سب کچھ سلامت تھا۔ جسم پر موجود کپڑے تک سلامت تھے۔ چہرے کی رونق تک ماند نہیں پڑی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان کے ہونٹوں پر ملگوتی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

یہ خبر جب ”الاکٹر ونیہ“ میں شائع ہوئی تو پورے صوبے سے لوگ امنڈ پڑے مگر حکومت نے لاشوں کو دیکھنے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس کی ایک وجہ وہاں کا قانون ہے۔ سعودی عرب میں کسی مردے کو اہمیت دینا یا قبر پر جانا ممنوع ہے۔

خبر ملنے کے بعد اخباری نمائندے نے علاقے کا دورہ کیا اور اپنی تحقیق اپنے اپنے اخبارات میں لگائی۔ ان ہی خبروں سے جو کہانی ابھر کر سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے:

”اس علاقے میں سنا جاتا ہے کہ کبھی وہاں کوئی بہت پرانا قبرستان تھا۔ لیکن یہ قبرستان کب تھا اس کا چشم دید گواہ کوئی بھی نہیں۔ جب کہ قصبہ میں ایسے۔۔۔ افراد بھی موجود ہیں جن کی عمر تو تے سے بھی زائد ہے۔ ان طویل عمر کے لوگوں نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ہم نے اپنے بچپن میں سنا تھا کہ یہاں کبھی قبرستان تھا اور اس میں ایک بڑی تعداد اسلام پھیلنے کے ابتدائی ایام کے شہداء کی تھی۔ وہاں ایک مقبرہ بھی تھا۔ لیکن وہ مقبرہ کس کا تھا اس بارے میں وہ بھی بتا نہیں سکے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں ایک چشمہ ہوا کرتا تھا۔ جس کا پانی شریں اور ٹھنڈا تھا۔ یہ علاقہ یمن کی گزرگاہ ہے، مدینہ منورہ سے آنے والے قافلے اسی راہ سے یمن جاتے تھے۔ تھکے مارے، آتے جاتے مسافر یہاں کسی گھنے بیڑ کے نیچے بیٹھ کر آرام کیا کرتے تھے۔ اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ مگر جب علاقے کی آبادی بڑھی تو یہاں گندگی پھیلنے لگی۔ قصبے کا گندنا لالابھی نہیں گرتا تھا۔ شاید گندگی کی وجہ سے آہستہ آہستہ چشمہ سوکھتا رہا، اب تو یہ ایک خیر میدان ہے۔ پھر یہاں ایک مذبح خانہ بھی بنایا گیا جس کی وجہ سے گندگی مزید بڑھ گئی اور چشمہ بالکل سوکھ گیا۔ قبرستان کا وجود بھی مٹ گیا۔ سرکاری فائلوں میں اس علاقے کے بارے میں ایک رپورٹ ملتی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق تقریباً پون صدی

قبل اس علاقے کے ایک شخص محمد صالح الباقی نے مفتی اعظم شیخ ابن باز سے فتویٰ طلب کیا تھا۔ اس نے مفتی اعظم کو لکھا تھا کہ یہاں ایک مصلیٰ ہے جو ایک مقبرے کے احاطہ میں واقع ہے، کیا میں اس مصلیٰ پر نماز پڑھ سکتا ہوں۔ مفتی اعظم نے مصلیٰ کا مقبرے میں ہونے کی وجہ سے نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس فتوے کی وجہ سے اس بات کا ثبوت مل جاتا ہے کہ اس علاقے میں کبھی کوئی مقبرہ تھا۔

علاقے کے لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ اس میدان میں عرصہ قبل بہت پرانی شکتہ، کھن سالہ قبریں بھی جو حادثہ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ کچھ لوگوں نے اخباری نمائندوں کو یہ بھی بتایا کہ اس علاقے میں دوپہر کے وقت طویل سائے دیکھے گئے ہیں۔ اس علاقے کے ایک معتبر شخص حسن عوضہ شہرانی نے اخباری نمائندے کو بتایا کہ دن کے وقت بھی یہاں ایسا لگتا ہے جیسے طویل القامت افراد آ جا رہے ہیں، کپڑوں کی سرسراہٹ جیسی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کبھی کبھی گھوڑوں کی ہنہانہٹ بھی سنائی دے جاتی ہے۔

پہلے یہاں کافی سارے گھنے درخت تھے مگر جب گندگی پھیلنے لگی تو درخت سوکھنے لگے۔ روایت ہے کہ یہاں ایسی بہت ساری قبریں ہیں جو اسلام کے ابتدائی دور میں راہِ حق کے شہیدوں کی ہیں، یہ علاقہ سعودی علاقوں میں سب سے ٹھنڈا علاقہ ہے اور یہاں برفباری بھی کبھی ہو جاتی ہے۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے لوگ گرمیاں گزرنے یہاں آتے رہتے تھے۔ یمن کی سرحد نزدیک ہونے کی وجہ سے یمن جانے والے قافلے یہاں ٹھہر کر سستانا ضروری سمجھتے تھے، اب جب آبادی میں اضافہ ہوا تو اس علاقے کی خوبصورتی کم ہوتی چلی گئی۔ یمن کی سرحد سے اس قصبے تک کل انتیس بڑے اور مشہور ہوٹل ہیں۔ اس میدان کی کھدائی بھی ایک ہوٹل کی تعمیر کے لیے جاری تھی کہ لاشیں نکل آئیں اور تمام کام بند ہو گیا۔ حکومت نے لاش کو نہایت خفیہ انداز میں کھیں دفن کر دیا ہے کیونکہ یہاں قانوناً جرم ہے کسی مزار پر جانا۔ اس علاقے کے میئر عبداللہ ذہرائی نے اخباری نمائندوں کو بتایا ہے کہ انہیں اطلاعات ملی ہیں کہ اس علاقے میں شہدائے اسلام کی قبریں موجود ہیں۔ اس لیے ہم نے مذکورہ مقام کی حد بندی کا حکم دیا ہے۔ تاہم بلدیہ کی کمیٹی کی جانب سے اس معاملے میں اعلیٰ حکام، متعلقہ محکمہ جات، مفتی اعظم سے رجوع کیا گیا ہے۔ اب وہی سب اس بارے میں فیصلہ کریں گے۔



سراپ

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

184

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراپ۔ ایسا سراپ جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بہنکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سراپا لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزرتی اور گزرتی رہتی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال دلوں سے گندمی ایک تہلکہ خیز کہانی



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آدمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد دہی ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے

زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور در بدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف سرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہ جیسے لوگ میرے دکن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور دسم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میری بھانجی کی اپنے دو خیال جاری تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوگی۔ فائرنگ سے اس کا معیتر زخمی ہو گیا۔ میں زرین کو لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بچکے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک دواؤں کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہو سکی۔ بھی ڈیوڈ شاہ آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کر لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پراسرار وادی تک پہنچاؤ تو میں مرشد سے بھی گلو خلاصی کرادوں گا۔ اس کے بعد شانے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بچکے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، مونا و سادھنا کو عبداللہ والے بچکے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں جاننیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ وہ مجھے لے کر اپنے بچکے پر پہنچی۔ ہم دیوار پھاند کر اندر پہنچے تھے کہ شہلا نے پستول نکال کر کہا کہ تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ میں نے اسے قابو کیا اور راضی کر لیا کہ وہ بینک کا لاکر کھلوانے میں ہماری مدد کرے گی مگر اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے اس کے پیروں میں نعلی بم باندھ کر کہا کہ یہ ریویوٹ سے پھٹ سکتا ہے اگر تم نے غلط حرکت کی۔ بھی اس نے عجیب حرکت کی اور اپنا پیر میرے پیروں میں پھنسا کر بولی "میرے ساتھ تم بھی مرو گے۔" بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا کہ یہ صرف احتیاط کیا ہے کیونکہ گزشتہ بار اس نے دھوکا کیا تھا۔ وہ اسی حالت میں بینک جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسم کونشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا ہے۔ وہ مجھے ریغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کر کے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیب آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھاگادیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کر لایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شاہ کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چکا دی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو مدد دلانے کے لیے فرار کر دیا۔ تب فتح خان، برٹ شاہ کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بلوایا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شانے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شاہ کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شاہ بڑا بڑا "نارتھ..... بکسٹ کرنے لگا۔ (اب آکے پڑھیں)

دم توڑتے برٹ شانے جو کہا تھا وہ اتنی ہلکی آواز میں تھا کہ مجھے بھی بہ مشکل سنا کی دیا تھا۔ فتح خان خاصا دور تھا اس کے سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے ساتھی کو آنکھ سانی کرنے میں مصروف تھا۔ فتح خان کا آدمی تڑپ رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں برٹ شانے کے پیچھے روانہ ہونے والا تھا۔ اس دوران میں برٹ شاہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور اس سے رہ رہ کر خون رس رہا تھا۔ دل کی اوپری

تھا اس نے ڈراما کر کے اپنے آدمیوں کی مدد سے ایک ناکارہ پستول مجھے دے دیا اور شاید یہ بات اپنے دوسرے ساتھیوں کو نہیں بتائی تھی۔ اس لیے فتح خان کا آدمی اسے سچ سچ کا پستول اور فتح خان کو خطرے میں دیکھ کر بوکھلا گیا اور اس نے برٹ شاہ پر گولی چلا دی۔ خود فتح خان کے وہم و گمان میں بھی ایسی چوشتن نہیں ہوگی۔ بلکہ مجھے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ برٹ شاہ جس سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا اس وقت ایسی پھرتی اور چالاکی کا مظاہرہ کرے گا۔ مجھے اور فتح خان کو اُلجھا چھوڑ کر وہ خاموشی سے غار میں گیا اور پستول نکال لایا۔ میگزین وہ پہلے ہی میری جیکٹ سے کسی وقت نکال چکا تھا اور اپنے تئیں مسلح ہو کر اس نے فتح خان پر چڑھائی کی اور مارا گیا۔ اس کی پھرتی اور چالاکی خود اسے بھی پڑ گئی تھی۔

برٹ شاہ کی موت پر فتح خان کے چہرے پر نہایت خوف ناک تاثرات تھے۔ اس نے اپنے ساتھی کو بلاتا مل شوٹ کر دیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ برٹ شاہ کی موت اس کے لیے کتنا بڑا صدمہ ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ "فتح خان اب کیا ہو گا ہیروں کے بارے میں صرف یہی جانتا تھا؟" میں نے برٹ شاہ کی طرف اشارہ کیا تو اس نے رائفل کا رخ میری طرف کر دیا اور کاٹ کھانے والے انداز میں غرایا۔

"شہباز خان، اب ہیرے تم تلاش کرے گا۔"

"احتمالاً باتیں مت کرو اور پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں برٹ شاہ سے اگلوانے کی کوشش کر رہا تھا؟"

"بس میرے کو معلوم ہو گیا۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ "شہباز خان تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتا اس خنزیر نے مر کر میرا کتنا بڑا نقصان کیا ہے۔"

"نقصان اس نے نہیں تمہارے آدمی نے کیا ہے۔"

میں نے صبح کی۔ "اس نے گولی مار کر برٹ شاہ کا خاتمہ کر دیا اور میں نے بھلا کیا کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا اور پھر اس نے دوبارہ واک ٹاکی پر اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف خاموشی چھا کی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فتح خان کا کوئی آدمی جواب دینے کے لیے زندہ نہیں رہا تھا۔ اس نے غصے میں واک ٹاکی زمین پر پٹخ دیا اور رائفل کا رخ دوبارہ میری طرف کر دیا۔ "شہباز خان یہ تمہارا کوئی چال ہے۔ تم نے برٹ شاہ کو کپڑے اتار کر میرے کو مجبور کیا کہ میں یہاں آؤں اور پیچھے سے کسی نے میری ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔"

"بھلا میں نے تمہیں کیسے مجبور کر دیا؟"

"تم جانتا ہے کہ تمہارا جیکٹ کا کارٹر میں چپ لگا ہے اس سے میں تمہارا بات سنتا ہے۔ اس لیے تم نے یہ چکر کیا۔ ادھر میں نکلا ادھر پیچھے سے تمہارے آدمیوں نے میرے آدمیوں پر حملہ کر دیا۔ شاید ادھر سب مارا گیا ہے۔"

میں نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے۔ "میں تمہارے قابو میں ہوں اپنے ساتھیوں سے کس طرح رابطہ کر سکتا تھا اور دوسرے تم جو چاہے مجھ پر الزام لگانے کے لیے آزاد ہو۔"

"یہ الزام نہیں ہے، میں بے وقوف تھا جو سمجھا کہ تم قابو میں ہے لیکن تم بہت ہوشیار آدمی ہے۔ اپنے آدمی بلانے کے لیے تم نے مہر کو بھیجا اور اس کا چپ ضائع کر دیا۔ اس طرح میرے آدمی کو پتا نہیں چلا وہ کدھر گیا ہے۔ وہ گیا اور تمہارے ساتھی کو بلالیا۔"

مجھے حیرت ہوئی اس نے تقریباً ٹھیک تجزیہ کیا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ میں نے مہر کو راجا عمر دراز کی طرف بھیجا تھا اور اگر کسی نے سچ سچ فتح خان کے پڑاؤ پر حملہ کیا تھا تو وہ راجا عمر دراز کے آدمی ہو سکتے تھے۔ مگر میں نے ٹھوس لہجے میں تردید کی۔ "یہ تمہاری سوچ ہے فتح خان جو تمہیں مایوسی کے عالم میں ناکامی کی وجوہات بتا رہی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے مہر وہاں سے چپکے سے فرار ہوئی ہے اور میں ان سات آٹھ دنوں میں مکمل طور پر تمہاری نگرانی میں رہا ہوں۔ میں نہ تو اسے کسی ساتھی سے رابطہ کر سکتا ہوں اور نہ ہی اس قسم کا منصوبہ بنا سکتا ہوں کہ تمہیں یہاں بلاؤں اور پیچھے تمہارے ٹھکانے پر حملہ ہو جائے۔ تم سوچو اگر میرا اپنے آدمیوں سے رابطہ ہوتا تو کیا اس وقت میں نہتا تمہارے سامنے کھڑا ہوتا۔ میں آتے ہی تمہیں قابو کر لیتا اور اس کے بعد سویرا کا پتا بھی چلا لیتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب جتنا تمہارے لیے غیر متوقع ہے اتنا ہی میرے لیے بھی غیر متوقع ہے۔"

میرے مدلل جواب نے فتح خان کو موچنے پر مجبور کر دیا تھا پھر اس نے سر جھٹکا۔ "شہباز خان ابھی میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ ابھی میں تمہیں نے لے جائے گا اور اگر تمہارا ساتھی ہوا تو پہلے تمہیں گولی مارے گا۔ قتل نہیں کرے گا بلکہ تمہارا دونوں ٹھکانا توڑ دے گا پھر تم بھی اپنے پیروں پر نہیں چل سکتے گا۔ پھر سویرا کو مرشد کے حوالے کرے گا۔"

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "فتح خان تم بلاؤ مجھ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ فرض کرو کہ یہ میرے ساتھی ہیں تب بھی مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں اپنے دفاع میں جو مناسب سمجھوں وہ کروں جیسے تم جو مناسب سمجھو رہے ہو وہ کر رہے ہو۔ اب تم

جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ پرائیویٹ

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

لے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویزا یونین
کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر
میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 نیر 111 کمپنیشن ڈینس باؤسگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی

نوم: 35895313 فیکس: 35802551

منی 2012

191

ماہنامہ سرگزشت

منی 2012

190

منی 2012

منی 2012

منی 2012

منی 2012

کیس کے اثر سے بے ہوش ہو رہا تھا تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ
ہم کام کس کا ہے۔ کیا میں دوبارہ فتح خان کے ہتھے چڑھ گیا تھا یا
پھر یہ وہ تھے جنہوں نے فتح خان کو شکست دی تھی۔ ہوش میں
آنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں شاید مخالف پارٹی کے
ہاتھ آیا تھا۔ ورنہ فتح خان دولت مند تھے لیکن اس کے پاس
اس قسم کی کوئی پرورش جگہ نہیں تھی وہ خود نارل جگہوں پر رہنے کا
مادی تھا۔ اس کے نزدیک عیاشی صرف شراب اور عورت کا
ہم تھا اسے ٹھکانوں سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اسے
کچھ اچھی جگہوں پر بھی دیکھا تھا لیکن عام طور سے اس کے
لوگ انے بس سر چھپانے کی جگہ ہوتے تھے۔

میرے جسم پر دوسرا اور صاف ستھرا لباس تھا اور میرے
ہاتھ پاؤں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں باقاعدہ صاف کیا
گیا ہو۔ لباس معمول کے مطابق تھا اس کے باوجود مجھے سردی
نہیں لگ رہی تھی کیونکہ کمرے میں درجہ حرارت نارمل تھا۔
میں فوری طور پر اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ میں کہاں آگیا
تھا؟ میں اسی وادی کے آس پاس تھا یا مجھے نیچے کسی شہری
ملائے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہاں دن رات کا بھی پتا
نہیں چل رہا تھا۔ کمرے میں کوئی گھڑی جو نہیں تھی اور میری
گلائی پر موجود گھڑی بھی غائب تھی۔ بلکہ سوائے لباس کے اور
کچھ نہیں تھا۔ شاہانہ بیڈ کے سرہانے شیشے کی میز پر ایک
بلوریں جگ اور گلاس رکھا تھا۔ جس میں کوئی گلابی رنگ کا
مشروب موجود تھا۔ میں نے اسے تھوڑا سا گلاس میں ڈالا،
سوگھ کر دیکھا۔ اس میں بڑی مسکون کن مہک آ رہی تھی۔ پیٹنے
سے پہلے احتیاطاً اسے چکھا۔ ذائقہ بھی بہترین تھا مجھے الکوحل کا
شہ تھا لیکن اس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ پیاس شدت کی تھی
اس لیے میں یکے بعد دیگرے دو گلاس پی گیا۔ اگر اس میں
کوئی بے ہوشی کی دوا شامل تھی تب بھی میں مجبور تھا۔ مگر اس
میں کوئی ایسی دوا شامل نہیں تھی بلکہ اسے پی کر مجھے اپنے اندر
ناتانی محسوس ہوئی تھی۔

بستر سے نیچے فرار چڑے کے خوب صورت، نرم و
کرم سلپر رکھے تھے۔ میں سلپر پہن کر دروازے تک آیا۔
میرا خیال تھا کہ وہ بند ہوگا لیکن خلاف توقع وہ کھلا ہوا ملا۔ جیسے
ہی میں نے دروازہ کھولا کہیں گھنٹی کی مترنم آواز آئی اور اس
سے پہلے میں باہر جاتا۔ دروازے پر ایک لڑکی نمودار ہوئی۔
اس نے بہت خوب صورت کڑھائی کیا ہوا لباس پہن رکھا تھا
اور اس کی ذاتی دلکشی کا کیا کہنا۔ یوں لگا جیسے کوئی پری زمین پر
اُڑ آئی۔ لیکن وہ بے چاری ایک معمولی خادمہ تھی۔ میں گہری
مائل لے کر رہ گیا۔ وہ راجا عمر دراز کے محل کی ایک خادمہ تھی

اس انجام کو پہنچنے میں میرا بھی کچھ ہاتھ تھا۔ میں نے اس کے
کپڑے جمع کر کے اسے پہنائے البتہ اس کی جگہ تبدیل نہیں
کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ فتح خان کے ساتھی کے پاس کچھ بھی
نہیں ہوگا پھر بھی میں نے اس کی تلاشی لی۔ فتح خان کام کی
تمام چیزیں نکال کر لے گیا تھا۔ میں اندر غار میں آیا وہاں
سے کھانے پینے کی چیزیں جمع کر کے بیک میں رکھنے لگا۔

اسی گتے مجھے محسوس ہوا کہ باہر کہیں آہٹ ہوئی ہے میں
نے تیزی سے مارچ بجا دی اور خود پینے کے بکلیٹ کر رہ گیا
ہو ا غار سے باہر آگیا۔ چاندنی کا اثر یہاں کم تھا دیسے بھی چاند
مغرب کے افق کی طرف جھک گیا تھا اور روشنی پہلے جیسی نہیں
رہی تھی۔ سائے طویل ہو رہے تھے۔ میں رینگتے ہوئے ایک
چٹان تک آیا اور پھر اس سے لگ کر سائے کھڑا ہو گیا۔ میں نے
حتی الامکان کوشش کی تھی کہ کوئی آواز نہ ہو۔ میرے کان کسی
آواز پر مرکوز تھے۔ اس پہلی آہٹ کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں
دی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہونے لگا وہ آہٹ میرا وہم تھی۔
میں جس جگہ دبا بیٹھا تھا وہ چٹانوں کے اندر تھی اور یہاں
چاروں طرف بلند چٹانیں تھیں۔ یہاں درجنوں افراد بھی
آجائے تو مجھ پر آسانی سے قابو نہیں پاسکتے تھے۔

لیکن اس موقع پر وہ ہوا جس کا میں نے سوچا ہی نہیں
تھا۔ اچانک ہی چٹانوں کے اوپر سے کوئی چیز ٹٹن کر ٹپکی ہوئی
نیچے آئی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر گری گئی اس سے دھواں
خارج ہو رہا تھا۔ میں بدک کر پیچھے ہٹا لیکن فوراً ہی ایسی کئی
چیزیں آس پاس چٹانوں میں آکر گر گئیں۔ یہ کیس بم تھے جو
بغیر کسی آواز کے پھٹ گئے تھے۔ میں سانس روک کر وہاں
سے بھاگا مگر غلٹ میں میرا پاؤں نہ جانے کس چیز سے اٹکا تھا
اور میں اوندھے منہ گرا۔ گرتے ہوئے بے اختیار میں نے
سانس لی اور فوراً ہی میرا ذہن چکرانے لگا تھا۔ اُنھنے کی کوشش
کی پر کیس اتنی سریع الاثر تھی کہ اس نے مجھے لمحوں میں بے
دست دبا کر دیا۔ وہ لوگ یقیناً وہاں گھات لگائے بیٹھے تھے
اور جیسے ہی میں ان کے گھیرے میں آیا انہوں نے بے ہوش
کرنے والی کیس کے بم پھینک دیے۔ یہ سوچتے ہوئے میں
نہ چاہتے ہوئے بھی دوسرا سانس لینے پر مجبور ہوا اور فوراً ہی
میرا ذہن تاریکی میں ڈوبا چلا گیا تھا۔ آخری احساس یہ تھا کہ
کچھ لوگ میرے آس پاس چل رہے ہیں۔ وہ دھیمی آواز میں
بول رہے تھے اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

☆ ☆ ☆
مجھے ہوش آیا تو میں ناقابل یقین حد تک نرم و ملائم بستر
اور نہایت پرورش انداز میں بچے کمرے میں تھا۔ جب میں

رہی تھی لیکن ان گرم کپڑوں میں یہ قابل برداشت بھی تھی۔ میں
جھاڑیوں میں مزید گھس گیا یہاں سردی کا اثر کم تھا۔
اعلان کرنے والے نے آخری بار دھمکی دی کہ اگر فتح
خان ان کے سامنے نہیں آیا تو اسے صبح تلاش کر کے مار دیا
جائے گا۔ لیکن فتح خان یقیناً اتنا احتی نہیں تھا کہ صبح کا انتظار کر
تا وہ روشنی ہونے سے پہلے یہاں سے کہیں دور نکل جاتا۔
اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے جیکٹ کے کالر میں لگی چپ
انگلیوں سے دبا کر توڑ دی۔ اب یہ بیکار تھی۔ فتح خان نہ تو
میری پوزیشن معلوم کر سکتا تھا اور نہ میری باتیں سن سکتا
تھا۔ مشکل سے دو گھنٹے میں وادی میں حالات بالکل بدل گئے
تھے۔ فتح خان کی کمانڈنگ پوزیشن ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھی
مارے گئے۔ برٹ شاہ مارا گیا تھا اور اس سارے فساد کی جڑ
یعنی ہیرے بدستور غائب تھے۔ لیکن کا مجھے نہیں معلوم تھا
ممکن ہے وہ بھی اس تند و تیز حملے میں ماری گئی ہو کیونکہ
فائرنگ مشکل سے چند منٹ جاری رہی تھی اور حملہ آوروں
نے یقیناً فیصلہ کن پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ اب مجھے سویرا کی
فکر تھی۔ فتح خان یہاں سے نکل ہی جاتا اور سویرا اسی کے قبضے
میں تھی۔ گو یا میرے صوبہ حال میں صرف اتنی تبدیلی آئی
تھی کہ میں فتح خان کی جسمانی قید میں نہیں رہا تھا۔ مگر سویرا
کے حوالے سے میں بدستور اس کا قیدی تھا۔

اعلان کرنے والا ایک گھنٹے کے بعد خاموش ہو گیا۔
چاند مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور کچھ بادل بھی نمودار ہو
رہے تھے جب وہ چاند کے سامنے آتے تو وادی تاریکی میں
ڈوب جاتی تھی۔ میں ادگھ رہا تھا کہ مجھے اچانک ہی فتح خان
کے بارے جانے والے ساتھی کی رائفل کا خیال آیا۔ وہ وہیں
پڑی تھی اور امکان یہی تھا کہ اب بھی وہیں پڑی ہوگی۔ اس کا
خیال آتے ہی میں جھاڑی سے نکلا اور درختوں، پتھروں اور
چٹانوں کی آڑ لیتا اس طرف روانہ ہو گیا۔ تقریباً بیس منٹ
بعد میں چٹانوں کے درمیان تھا لیکن میں نے اس طرف سے
داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ دوسری طرف سے اندر
گیا۔ جب بادل آجائے اور تاریکی چھا جاتی تب میں حرکت
کرتا۔ چٹانوں کے اندر سے ہوتا ہوا میں اس جگہ آیا جہاں فتح
خان کے ساتھی اور برٹ شاہ لاشیں پڑی تھیں۔

یہ دیکھ کر میرے منہ سے ناگفتنی نکل گئی کہ فتح خان کے
ساتھی کی رائفل اور دوسرے ہتھیار غائب تھے اور یہ یقیناً فتح
خان کا کام تھا۔ برٹ شاہ کی لاش ایسے ہی پڑی تھی اسے
کپڑے پہننے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ
اس کی لاش تقریباً برہنہ پڑی رہے۔ وہ ایک انسان تھا اور

جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں راجا عمر دراز کے محل میں تھا۔ تعجب ہے یہ خیال مجھے کمراد کیسے ہی کیوں نہیں آیا تھا۔

”جی جناب۔“ لڑکی نے احترام سے کہا۔

”مجھے بیک صاحب سے ملنا ہے۔“ میں نے سوال کرنے کے بجائے سیدھی بات کی۔

اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان کو بتاتی ہوں اس کے علاوہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا اور واپس آ گیا۔ راجا عمر دراز کے محل میں ہونے کا مطلب تھا کہ مہر و نہی کیا جو میں نے اسے سمجھایا تھا اور وہ اپنے طور پر کہیں نہیں لگی تھی۔ اسے یہیں محل میں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں ملازمہ سے اس کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ بہر حال کچھ دیر میں ساری صورت حال سامنے آ جاتی۔ یقیناً مہر و کوراجا عمر دراز کے محل تک پہنچنے میں کئی دن لگے تھے۔ اس کے بعد اس کے آدمیوں نے فوری کارروائی کی اور وادی میں پہنچ کر فتح خان کے آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ یہ اتفاق ہی ہو سکتا تھا کہ وہ اس وقت وہاں پہنچے جب فتح خان برٹ شا کو بچانے کے لیے میرے پاس دوڑا آیا تھا۔ اس طرح وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ مارے جانے یا پکڑے جانے سے بچ گیا تھا۔ دیکھا جائے تو اسے بچانے کا سہرا میرے سر جاتا تھا، نہ میں اسے بلانے کے لیے برٹ شا کے کپڑے اُتارتا اور نہ وہ وہاں آتا اور یقیناً راجا عمر دراز کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا جاتا۔ لیکن وہ بد بخت میرا دشمن ہو رہا تھا۔ میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا یہ بہت نرم اور گرم بستر تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں واٹر بیڈ پر لیٹا ہوں جس میں گرم پانی بھرا ہو۔ دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ وہی خادمہ بھی اس نے ادب سے کہا۔ ”بیک صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔“

خادمہ کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اسے اردو بولنے کی خاصی پریکٹس کرائی گئی تھی اور وہ شاید وادی سے باہر سے آنے والے مہمانوں کی خدمت کے لیے مخصوص تھی۔ میں اس کے ساتھ باہر آیا۔ بیک اسی چھوٹی نشست گاہ میں میرا منظر تھا جہاں میں اس سے پہلے بھی ایک بار مل چکا تھا۔ وہ اپنے ڈھیلے چوڑے میں ملفوف کسی موی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اس مجسمے میں جان پڑ گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن یہ ساری گرم جوشی اس کے ہاتھوں میں تھی اس کا چہرہ حسب معمول تاثرات سے عاری تھا۔ چہرے کی طرح اس کا لہجہ بھی سپاٹ

تھا۔ ”شہباز صاحب اب آپ کیسے ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے ویسے کیا میری طبیعت خراب تھی؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”جس کیس کے اثر سے آپ بے ہوش ہوئے تھے ہوش میں آنے کے بعد طبیعت بہت خراب ہوئی ہے اس لیے آپ کو بے ہوش رکھا گیا۔ کیس کا اثر زائل ہونے میں کم سے کم بارہ گھنٹے لگتے ہیں۔“

”گویا مجھے بارہ گھنٹے بعد ہوش آیا ہے۔“

”سولہ گھنٹے بعد۔“ اس نے صحیح کی۔ ”اس دوران میں آپ کو انجکشن سے خوراک اور ادویات دی جاتی رہی ہے۔“

”میں خود کو بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا ہوں اور اگر کوئی کمی تھی تو وہ اس شربت کو پینے سے دور ہو گئی جو میرے سر ہانے رکھا تھا۔“

”وہ خاص جڑی بوٹیوں اور عرقیات سے تیار کردہ شربت ہے۔ حکیم قادس کی ایجاد ہے۔“ بیک نے یوں فخر سے کہا جیسے شربت کی تیاری میں اس کا بھی عمل دخل ہو۔

”راجا صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟“

”حکیم قادس کے علاج سے بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ آپ ان کو پہلے سے بہتر پائیں گے۔“

”بیک صاحب فتح خان کے ٹھکانے پر حملہ کرنے والے راجا صاحب کے آدمی تھے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بالکل اور مجھے افسوس ہے فتح خان ایک بار پھر نکلنے میں کامیاب رہا۔“

”اس کی جگہ آپ مجھے پکڑ لائے۔“

”اس وقت وہ لوگ یہی سمجھتے تھے کہ فتح خان وہاں چھپا ہوا ہے، وہ تو بعد میں پتا چلا کہ وہاں آپ تھے۔“

”بیک صاحب فتح خان کے آدمیوں نے برٹ شا کی لڑکی ایمین شا کو پکڑ رکھا تھا۔“

”وہ اب یہاں ہے اور اس کی حیثیت ایک مہمان کی سی ہے لیکن فی الحال کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔“

بیک نے نئے نئے الفاظ میں کہا، اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ایمین شا کے بارے میں کسی ذمے دار آدمی کو علم نہیں تھا اور یقیناً اس کی یہاں سے واپسی مخصوص شرائط کے تحت ہوئی۔ میں نے سر ہلایا۔

”کیا اسے اپنے باپ کی موت کا علم ہو گیا ہے؟“

بیک نے سر ہلایا۔ ”راجا صاحب نے غیر سرکاری طور پر برٹ شا کی لاش مقامی حکام کے حوالے کر دی ہے۔“

”یعنی وہ یا ان کے آدمی خود سامنے نہیں آئے ہیں؟“

”یہی بات ہے، ورنہ اس کی وضاحت بھی کرنا پڑتی

کہ ایک دور دراز وادی میں موجود لاش کا علم ہمیں کس طرح ہوا۔ دیے بھی راجا صاحب اس معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتے۔“

”ایمن کا کیا حال ہے؟“

”کل تک بہت رو رہی تھی لیکن بعد میں سنبھل گئی۔ یہیں مہمان خانے میں موجود ہے، آپ چاہیں تو اس سے مل سکتے ہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی ہے۔“

”ہاں.... لیکن شہباز صاحب یہ آپ نے کیا چیز سمجھی ہے۔“

میں چونکا۔ ”کون.... وہ خانہ بدوش لڑکی مہرو۔“

بیک نے بد مزگی سے کہا۔ ”لڑکی تو نہیں بڑے کار عورت ہے اور اس نے پتا نہیں کیا چکر چلایا ہے کہ اس کا بیشتر وقت راجا صاحب کے ساتھ گزرتا ہے، ان کی دیکھ بھال بھی اسی نے سنبھال لی ہے۔ راجا صاحب کی نرس تو فارغ بیٹھی رہتی ہے۔“

”وہ بہت ہوشیار عورت ہے اور اس نے فتح خان کے آدمیوں کے ہاتھوں بہت ذلت بھی اٹھائی ہے اور پھر ان آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل بھی کیا ہے۔ فتح خان نے مجھ پر نظر رکھنے کے لیے اسے میرے ساتھ کیا تھا۔ لیکن میں جان گیا کہ وہ کس طرح ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے اور میں نے مہرو کو اس امید پر آپ کی طرف روانہ کیا تھا کہ وہ راجا صاحب تک پہنچ سکے گی اور ویسے مجھے یقین تھا کہ پھر وہ اپنی راہ لے لے گی۔“

”وہ پہاڑوں میں بھٹک گئی تھی۔ تین دن پہلے یہاں پہنچی تھی۔“ بیک بولا۔ ”ویسے مس شاسے ملنے سے پہلے مناسب ہو گا آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتادیں کہ وہاں ہوا کیا تھا؟“

میرے اغوا والے واقعے سے وہ یقیناً واقف تھا کیونکہ عبداللہ اسے رپورٹ دے چکا ہوگا۔ میں نے اسے وادی میں آمد اور پھر یہاں برٹ شا اور فتح خان کی آمد سے لے کر بعد تک آنے والے واقعات اختصار سے سنائے لیکن تمام ضروری تفصیلات بھی بیان کیں۔ وہ غور سے سن رہا تھا میری بات ختم ہوئی تو اس نے سوال کیا۔ ”برٹ شانے مرنے سے پہلے آپ کو کچھ بتانے یا ہیروں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی تھی؟“

اس کی بات پر میں حیران ہوا تھا لیکن حیرت تاثرات تک نہیں آنے دی تھی۔ میں نے سوچ کر کہا۔ ”یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟“

”شہباز صاحب میری عمر راجا صاحب سے کچھ ہی کم

ہے اور میں نے دنیا دیکھی ہے۔ برٹ شا جیسے لوگ انا کے مارے ہوتے ہیں اور اگر وقت اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا تو اس نے یقیناً آپ کو بتانے کی کوشش کی ہوگی کہ ہیرے کہاں ہیں؟ وہ اب بھی اس فکر میں ہوگا کہ ہیرے پارتی تک پہنچ جائیں تاکہ اس کی ساکھ پر آنے والا دھماکا سکے۔“

بیک کی سمجھ بوجھ واقعی وزیروں والی تھی۔ میں نے جواب دیا۔ ”برٹ شانے کچھ کہا تو تھا لیکن فائرنگ کا شور وادی میں گونج رہا تھا اس لیے میں صحیح طور پر نہیں سن سکا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ شاید اس نے شمال کا لفظ کہا تھا۔“

بیک چونکا۔ ”آپ کا مطلب ہے وادی کا شمال؟“

”مطلب تو برٹ شا جانے کہ اس کی مراد کس شمال سے تھی۔“

بیک نے اپنے سوال کا خود جواب دیا۔ ”یقیناً اس کی مراد وادی کے شمال سے ہوگی ورنہ صرف شمال کی سمت کہنے سے تو ہیروں کا سراغ نہیں ملتا اس کا مطلب ہے ہیرے وادی میں شمال کی طرف چھپائے گئے ہیں۔“

”اس کا پتا تو مجھے بھی ہے کہ اس نے ہیرے شمالی ڈھلان میں کہیں چھپائے تھے۔ لیکن یہ شمالی ڈھلان بھی بہت بڑی ہے اور ہیرے کہاں ہیں؟ یہ جانتا تقریباً ناممکن ہے۔ ویسے کیا آپ ہیرے تلاش کرنا چاہتے ہیں؟“

بیک کھسیا گیا۔ ”ارے نہیں شہباز صاحب ہم ان چکروں میں پڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔“

”فتح خان کا ہاتھ سے نکلنا میرا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کے آدمیوں نے بہت اچھے انداز میں ان لوگوں کو ٹیک اور کیا لیکن بد قسمتی سے فتح خان اس وقت وہاں نہیں تھا۔ اس کے قبضے میں میری ہونے والی بیوی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”عبداللہ کی طرف سے خبر یہ ہے کہ وہ اور آپ کے دوسرے ساتھی انہیں تلاش کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔“

میرا دل دھڑکا تھا۔ ”وہ کیسے....؟ اور آپ کو کیسے علم ہوا کہ سویرا فتح خان کے قبضے میں ہے؟“

”مہرو سے پتا چلا۔ میں نے فوری طور پر عبداللہ اور آپ کے ساتھیوں کو اس کی اطلاع دی تھی اور انہوں نے اسی وقت سے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔“

”کیا میں ان سے بات کر سکتا ہوں؟“

”کچھ دیر بعد۔“ بیک نے اپنے ہاتھ پر ہنسی گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”کسی وجہ سے سیٹلائٹ انٹرنیٹ کنکشن ٹوٹ گیا ہے اسے دوبارہ ملانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

راجا عمر دراز کا محل دور دراز تھا اس لیے یہاں مواصلات کے لیے سیٹلائٹ انٹرنیٹ کا سہارا لیا گیا تھا اس کے علاوہ یہاں سیٹلائٹ فون بھی تھا۔ شاید دونوں ایک ہی کنکشن سے کام کرتے تھے۔ میں نے بیک سے کہا کہ جب تک کنکشن درست کیا جا رہا ہے میں ایمن سے مل لوں۔ کچھ دیر بعد میں اسی دلکش خادمہ کی دلکش چال کا تعاقب کرتے ہوئے ایمن کے مخصوص کمرے تک پہنچا۔ دستک کے جواب میں اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”میں کم ان۔“

میں اندر آیا تو ایمن مجھے دیکھتے ہی تیزی سے میری طرف آئی پھر اسے خادمہ کا خیال آیا اور اس نے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ خادمہ کے جاتے ہی وہ میرے سینے سے لگ کر رونے لگی تھی۔ اس نے بھی متحای طرز کا ڈھیلا لباس پہن رکھا تھا اس کے باوجود وہ اس پر چڑھ رہا تھا۔ اس کے آنسو میری قمیص بھگونے لگے تھے۔ میں نے اسے نرمی سے شانے سے تمام کر الگ کیا اور بستر کے کنارے بٹھایا اور پھر خود کرسی سمجھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”ایمن مجھے افسوس ہے۔“
”پاپا۔“ وہ سسکی۔ ”انہوں نے مجھے پہچانا بھی نہیں تھا۔“

میں اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے پہچان لیا تھا لیکن اس کی جان بچانے کے لیے وہ بدستور دیوانہ بنا رہا تھا اگر وہ اسے پہچان لیتا تو فتح خان کے ہاتھ ایک ترب کا بیٹنی پتا آ جاتا اور وہ اسے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت اسے کچھ نہیں بتاؤں گا ہاں بعد میں بھی موقع آیا تو میں اسے حقیقت سے آگاہ کر سکتا تھا۔ ”فتح خان کی مسلسل قید نے اس کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا۔“

”پاپا کو کس نے مارا؟“
”فتح خان کے ایک ساتھی اور فتح خان نے غصے میں اسے بھی وہیں گولی مار دی تھی۔ برٹ شا کی موت اس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔“ میں نے کہا اور اس بار بھی اسے پوری بات بتانے سے گریز کیا۔
ایمن کے چہرے پر غصہ آ گیا۔ ”لیکن پاپا کی موت کا ذمہ دار وہی ہے۔“
”اس میں کیا شک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بد قسمتی سے وہ نکل جانے میں کامیاب رہا۔“
”وہ کس طرح نکلا؟“

میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میں نے فتح خان کو

بلوانے کے لیے برٹ شا کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ ایمن کو بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جو ہوا تھا وہ میں جانتا تھا یا فتح خان جانتا تھا۔ میں نے ایمن کو یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کا باپ ڈراما کر رہا تھا بے شک اس کا مقصد جو بھی ہو لیکن اسے یہ مقصد اپنی جان اور اپنی اولاد سے بڑھ کر تھا۔ ایمن برٹ شا کی باتیں کرتی رہی۔ میں منتارہا اور درمیان میں اسے تسلیاں بھی دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت سنبھل گئی اور میرے مسائل کی طرف توجہ دی۔

”سویرا کا پتا چلا؟“
”میرے ساتھی کو شش کر رہے ہیں کیونکہ وہ شہر میں کہیں ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ انہیں کسی حد تک کامیابی بھی ملی ہے لیکن کسی وجہ سے یہاں مواصلاتی رابطہ ٹوٹ گیا ہے، اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“
”پاپا نے ان ہیروں کے لیے جان دے دی۔“ اسے پھر باپ کی یاد ستانے لگی۔

”ہم نہیں کہہ سکتے کہ برٹ شا کے ذہن میں کیا تھا کیونکہ کوئی شخص دولت کی خاطر اتنی تکلیفیں اور اتنی طویل قید برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔“
”پاپا کی ذیل بھی انہیں یہ ہیرے ہر صورت پارتی تک پہنچانے تھے، یہ صرف ان کی نہیں ہمارے خاندان کی ساکھ اور عزت کا معاملہ بھی تھا۔ برطانیہ میں کہتے ہیں کہ شا خاندان بات کر کے پیچھے نہیں ہٹتا ہے۔ اگر ہیرے نہیں بچتے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔“

”ہیرے تو اب بھی نہیں بچتے۔“ میں مسکرایا۔
”دوسرے اسی خاندان کے ایک فرد ڈیوڈ شانے بارہا اس اصول کی دھجیاں اڑا رہی ہیں۔“

”وہ ایک الگ بات ہے وہ ہیرے کہیں مارکیٹ میں آئے نہیں ہیں کیونکہ ان کی ساخت اور صورت کا سب کو علم ہے اگر ان کی ساخت چھپانے کے لیے ان کو دوبارہ تراشا جاتا تو ان کی وہ قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ یوں سمجھ لو کہ شکل بدلنے سے پچاس ملین ڈالر کے ہیرے پانچ ملین ڈالر کے بھی نہیں رہ جاتے۔ پھر پاپا بھی غائب تھے اس لیے بات ہماری عزت پر نہیں آئی۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ پاپا ہیروں سمیت کسی کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ وہ خود ہیروں سمیت کہیں روپوش نہیں ہو سکتے تھے۔“

میں نے سوچا اور ایمن سے پوچھا۔ ”اب کیا صورت حال ہوگی کیونکہ برٹ شا دنیا میں نہیں رہا ہے اور ہیرے بدستور غائب ہیں۔ اس بارے میں کیا کہتی ہو؟“

”پارٹی معاملات دیکھ رہی ہوگی۔ اس کا تعلق اٹلی سے ہے۔ اگر اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کہیں دھوکا کیا جا رہا ہے تو وہ پاپا کے وارث کو پکڑے گی اور اس سے ہیروں کا ہالہ کرے گی۔“

”یعنی تم سے؟“
ایمن پہلی بار مسکرائی۔ ”نہیں ڈیوڈ شانے سے۔۔۔ پاپا کی ہامیر اور خطاب اسی کے حصے میں آیا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں اچانک انہیں انکار بھی نہیں کر سکتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ جہاں تک میں نے جانا ہے یہ مافیا والے ہیں کیونکہ اس پارٹی کا سب سے اہم آدمی سیسلو منڈانی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اٹلی کا سب سے طاقتور مافیا چیف ہے۔ اس پر کئی بار مقدمہ بھی چلا ہے لیکن یہ عدالت سے بری ہو گیا۔ ویسے وہ اٹلی کی پارلیمنٹ کا نمبر اور معروف بزنس مین ہے۔“

”سن کر خوشی ہوئی کہ اٹلی جیسے مہذب یورپی ملک میں بھی مجرم اور قاتل پارلیمنٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔“ میں ہنسا۔ ”یہ ہیرے کس ذیل کا حصہ تھے؟“

”تم نہیں جانتے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”افغان وار کے دوران یہاں اسلحے کی سپلائی کے ادائیگی ان ہیروں سے کی جاتی تھی۔ اسلحہ پہنچانے اور بعد میں ہیرے لے کر پارٹی تک لے جانے کی ذمہ داری پاپا کی تھی۔ وہ سرکاری طور پر اس ذمہ داری کے لیے چنے گئے تھے۔“

”شاید پہلے بھی اس کا ذکر ہوا تھا لیکن یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”اگر پارٹی کو شبہ ہو جائے کہ ہیروں کے معاملے میں دھوکا ہوا ہے تو وہ ڈیوڈ شا سے باز پرس کرے گی اور پھر اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ ان کا نقصان پورا کرے۔“

”بالکل یہی بات ہے۔“ ایمن بولی۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ ایسا ہوگا کیونکہ اس دوران میں جب پاپا غائب تھے تو ڈیوڈ شا متعدد بار پاکستان آیا جبکہ یہ ظاہر یہاں اس کا کوئی بزنس نہیں ہے۔“

”بزنس تو ہے، تم نہیں جانتیں کہ وہ ان لوگوں کا ایجنٹ بن کر آتا تھا جو مافیاؤں کی بھی مافیا ہیں۔ جن کے حکم سے سرٹانی کی خجالی کسی میں نہیں ہے۔ اس لیے میرا نہیں خیال۔۔۔ کہ کوئی مافیا چاہے وہ کتنی طاقتور کیوں نہ ہو ڈیوڈ شا سے سوال جواب کرنے کی ہمت کرے گی۔“

ایمن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم مافیا کے بارے میں

نہیں جانتے ہو یہ بہت طاقتور ہیں۔ اٹلی کا شمار دنیا کی بڑی طاقتوں میں ہوتا ہے لیکن اندر سے یہ بھی مافیا کے سامنے کمزور پڑ جاتا ہے۔ خود امریکا میں مافیا طاقتور ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کا طریقہ کار چھپا ہوا ہوتا ہے یہ نہ کھل کر کسی کو چیلنج کرتی ہیں اور نہ کسی پر کھلا وار کرتی ہیں۔ یہ چھپ کر وارننگ دیتی ہیں اور اگر مخالف پھر بھی نہ مانے تو یہ چھپ کر وار کر کے اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ صرف اٹلی میں ہر سال ایک ہزار سے زیادہ قتل مافیا کے اشارے پر ہوتے ہیں اور ان کے قاتل بہت کم پکڑے جاتے ہیں۔“

”پھر بھی فرض کر لیا جائے کہ مافیا والے کسی وجہ سے ڈیوڈ شا پر ہاتھ نہیں ڈال پاتے تو کیا اس صورت میں ان کا رخ تمہاری طرف نہیں ہوگا؟“
”اصولی طور پر تو نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر کسی مرنے والے سے قرض وصول ہوتا تو اس کے وارث سے رجوع کیا جاتا ہے۔ میں پاپا کی وارث نہیں ہوں۔“

”ڈیوڈ شا ایک نظام کے تحت اس کا وارث بنا ہے اس لیے ممکن ہے مافیا اسے عمومی منوں میں وارث نہ لے۔“
میری بات سن کر ایمن سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم بلاوجہ بحث کرنے والے آدمی نہیں ہو کیا تمہارے ذہن کو کوئی خاص بات ہے؟“
”ہاں میرے ذہن میں ایک بات ہے لیکن میں راجا عمر دراز سے بات کر کے اسے واضح کروں گا۔“

”راجا۔“ ایمن نے گہری سانس لی۔ ”میں کل سے یہاں ہوں اور ابھی تک مجھے کسی سے رابطہ کرنے کا موقع نہیں دیا گیا ہے۔“

”مثلاً کس سے رابطہ؟“
”میں اپنی ایکسی سے رابطہ کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے فی الحال محل سے کہیں بھی رابطہ ممکن نہیں ہے۔ کیا میں یہاں نظر بند ہوں۔“

”تقریباً ایسا ہی سمجھو بلکہ یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ تم راجا عمر دراز کے پاس نہیں ہو۔ وہ اس معاملے میں کسی طرح سے ملوث نہیں ہونا چاہتا۔“

”حالانکہ یہ اسی کے آدمی تھے جنہوں نے فتح خان کے کیمپ پر حملہ کیا تھا۔ میرے خداداد اتنی تیزی سے آئے کہ فتح خان کے آدمیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور انہوں نے ایک منٹ میں سب کو شوٹ کر دیا تھا۔“

”کوئی نہیں بچا؟“
ایمن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”انہوں نے شوٹ فورکل کیا

تھا۔ فتح خان کے پانچ آدمیوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنا ہتھیار استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حملہ آوروں کی قیادت ایک دشمن کر رہا تھا۔

”دشمن۔“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں وہ دشمن ہی تھا میں نے تصدیق کے لیے اسے دشمن میں چند جملے کہے تو اس نے جواب بھی دیا تھا۔ مجھے توڑی بہت دشمن آتی ہے۔“

میں نے اس سے پہلے راجا عمر دراز کے محل یا آدمیوں میں کوئی دشمن نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے اسے حال ہی میں ہار کیا گیا ہو۔ جب سے ڈیوڈ شاوالا چکر شروع ہوا تھا اور راجا عمر دراز کے محل سے تصویر اور پتھر چوری ہوئے تھے تب سے اس نے اپنی سیکورٹی بڑھانے پر توجہ دی تھی۔ شہر میں اس کے پاس عبد اللہ جیسا آدمی تھا اور یہاں محل میں بھی مجھے نہایت تربیت یافتہ سیکورٹی گارڈز نظر آئے تھے۔ راجا عمر دراز کے آدمی جنہیں براہ راست یہاں لے آئے تھے؟

اس نے سر ہلایا۔ ”صرف چند گھنٹوں کے اندر ان پہاڑوں پر بھی یہ بہت تیزی سے سفر کرتے ہیں۔“ اس نے کہتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”شہباز مجھے یہاں سے جانا ہے ابھی پایا کی لاش لے کر واپس جانا ہے اور ان کی آخری رسومات ادا کرنی ہیں۔“

”میرا خیال ہے تم کل صبح ہوتے ہی جا سکو گی۔ اگر موسم بہتر ہوا تو پہلی کا پٹر آ جائے گا۔ لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ اس معاملے میں تم کہیں بھی راجا عمر دراز کا نام نہیں لو گی بلکہ تمہیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ تم کہاں سے آرہی ہو۔ اگر برٹ شا کی موت سے بھی بے خبری ظاہر کرو تو اچھا ہے یہ اطلاع یقیناً کسی کو دی جا چکی ہو گی اور تم وہاں سے رابطہ کرو گی تو تمہیں خود پتا چل جائے گا۔“

”تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے میں ایسا ہی کروں گی۔“

مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ ایمن نے بتایا کہ شام کے ساڑھے سات بج رہے ہیں۔ پھر اس نے مہرہ کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کون ہے اور تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“

”پتا نہیں کیا مسئلہ ہے جہاں جاؤ کوئی نہ کوئی لڑکی کوئی مسئلہ لیے موجود ہوتی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور پھر اسے مہرہ کی مختصر کہانی سنائی۔ ایمن کو فوراً اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

”یہ بے چاری تو بہت مظلوم ہے۔“

”ہاں لیکن راجا کا سیکرٹری بیک اس کے بارے میں

فکر مند ہے، سنا ہے اس نے آتے ہی راجا عمر دراز کو متاثر کر لیا ہے اور اب اس کی تیار داری وہی کر رہی ہے۔“

”میں نے محسوس کیا ہے کہ خود بیک راجا کے بارے میں بہت حساس ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی راجا سے ایک حد سے زیادہ قریب نہ ہونے پائے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک محسوس کیا ہے اور میں نے بار بار دیکھا ہے۔ بہر حال یہ ان دونوں کا مسئلہ ہے۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم برٹ شا کی میت انگلینڈ لے جانا چاہتی ہو اور میں جلد از جلد اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”تا کہ سویرا کو فتح خان سے چمڑا سکو۔“ ایمن کا لہجہ بدل گیا تھا۔

”ظاہر ہے، یہ میری عزت کا معاملہ ہے اور ہمارے ہاں ایسی باتوں پر قتل کرنا یا ہوجانا معمولی بات ہے۔“

ایمن کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی پھر اس نے دھمے لہجے میں کہا۔ ”ایک بات پوچھوں سچ بتاؤ گے؟“

”مجھے اندازہ تھا کہ وہ کیا بات پوچھے گی۔“ ہاں تم پوچھ سکتی ہو۔“

”سویرا سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ایمن تمہارے لیے یہ بات جاننا ضروری ہے؟“

”میں نے پوچھا ہے۔“ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ ”اگر تم جواب نہیں دیتا چاہتے تو تمہاری مرضی۔“

”ایمن تم نے سچ کی شرط رکھی ہے اس لیے بتا رہا ہوں سویرا میری محبت ہے اب سے نہیں بلکہ اس وقت سے جب میں محبت کا مفہوم بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر تقدیر نے ہمارے ساتھ مذاق کیا اور سویرا میرے بھائی کا مقدر بن گئی۔ تمہیں علم ہو گا کہ مرشد نے سازش کر کے میرے بھائی کو قتل کر دیا اور سویرا بیوہ ہو گئی۔ اب میرے والد نے اپنی غلطی کی تلافی کے لیے سویرا اور میری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

ایمن نے گہری سانس لی۔ ”تب تو تم خوش قسمت ہو جو اپنی محبت پالو گے۔“

”ہاں اور تم اندازہ کر سکتی ہو کہ میں سویرا کے لیے کس قدر فکر مند ہو سکتا ہوں۔“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”مجھے اندازہ ہے اور مجھے اس بات پر بھی رشک آ رہا ہے کہ تم کسی بھی پریشانی کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔“

”مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

ماہنامہ سرگزشت مئی 2012ء

دروازے پر دستک ہوئی اور ایمن کی اجازت سے مادہ اندر آئی۔ ”کچھ دیر میں کھانا لگنے والا ہے۔ آپ دنوں تشریف لے چلے۔“

میں اور ایمن اس کے ساتھ محل کے چھوٹے ڈائننگ ہال میں آئے۔ وہاں راجا عمر دراز موجود تھا۔ اس نے گرم برقی سے مجھے سینے سے لگایا۔ بیک ٹھیک کہہ رہا تھا حکیم قاذوس کے علاج سے اس کی صحت پہلے سے بہتر لگ رہی تھی۔ میں نے یہ بات کہی۔ ”راجا صاحب اب آپ پہلے سے بہتر نظر آ رہے ہیں۔“

”ہاں لیکن بس یہ اوپر سے ہے میں جانتا ہوں اندر کینسر اپنے پاؤں پھیلا رہا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

ایمن گونجی بار پتا چلا تھا کہ راجا عمر دراز کو کینسر ہے اس نے رمی انداز میں افسوس ظاہر کیا اور راجا نے رمی انداز میں اس سے باپ کی موت کی تعزیت کی۔ ہم کھانے کی میز پر آگئے۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ راجا عمر دراز کے لیے مخصوص پر ہیزی کھانا تھا۔ لیکن میرے اور ایمن کے لیے کئی بہترین اور لذیذ ڈشز تھیں۔ میں چوبیس گھنٹے بعد کھانا کھا رہا تھا اس لیے بھوک ذرا کھل گئی تھی۔ کھانے کے فوراً بعد راجا عمر دراز کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایمن سے کہا۔ ”تم آرام کرو جلد تمہیں اسلام آباد پہنچا دیا جائے گا۔“

”شکر یہ راجا صاحب۔“ ایمن نے کہا تو میں نے اس کے لہجے میں خفیف سا طنز محسوس کیا تھا۔ وہ خادمہ کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد راجا عمر دراز نے میری طرف دیکھا۔

”شہباز میرے ساتھ آؤ۔“

راجا عمر دراز مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ پہلے یہ کمرہ سوچ و بچار کے لیے مخصوص تھا اور یہاں سوائے ایک شاہانہ قسم کی آرام گری کے اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن جب راجا عمر دراز کی طبیعت خراب ہوئی تو اس نے اپنا بیڈروم اوپر سے یہاں منتقل کر لیا تھا۔ کیونکہ کھانے کے بعد حکیم قاذوس نے اسے آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ مجھ سے بات بھی کرنا چاہتا تھا اور یہ صرف بیڈروم میں ممکن تھا۔ راجا بستر پر لیٹ گیا اور اس نے مجھے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔

”راجا صاحب سب سے پہلے تو میں بروقت مدد کا شکریہ ادا کروں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔“

ماہنامہ سرگزشت مئی 2012ء

”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایک ٹری ہات یہ ہوئی کہ فتح خان نکل گیا اور سویرا اس کے قبضے میں ہے۔“

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں شہر میں تمہارے ساتھی اسے تلاش کر رہے ہیں اور سنا ہے انہوں نے کچھ پیش رفت بھی کی ہے۔“

”میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی تک انٹر نیٹ کا رابطہ بحال نہیں ہوا ہے۔“

راجا عمر دراز نے ایک چھوٹا سا جدید موبائل ساخت کا واکی ٹاک کی اٹھایا اور بیک سے رابطہ کیا۔ ”رابطہ بحال ہوا؟“

دوسری طرف سے کچھ سن کر راجا نے واکی ٹاک رکھ دیا اور میری طرف دیکھا۔ ”رابطہ ابھی تک بحال نہیں ہوا ہے۔ یہاں سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سروس سیٹلائٹ کا مسئلہ ہے۔ اس کی طرف سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔“

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ”اس صورت میں راجا صاحب میں فوری طور پر واپس اسلام آباد جانا چاہوں گا۔ ایمن شا بھی اپنے باپ کی میت لے کر جلد از جلد واپس جانا چاہتی ہے۔“

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے میں بیک سے کہتا ہوں وہ کل صبح تمہاری روائی کا بندوبست کر دے۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“

”یہ بات دوبارہ مت کہنا ورنہ تمہیں مار دوں گا۔“ اس نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں تمہارے لیے جو کر سکتا ہوں کروں اور تمہارے مسائل حل ہو جائیں۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ راجا عمر دراز کیوں جلد از جلد میرے مسائل کا خاتمہ چاہتا ہے۔ میں اس کی نیت پر شک نہیں کر رہا تھا وہ پہلے بھی کئی بار بے لوث میرے کام آچکا تھا اور سوائے ایک دفعہ کے اس نے صلہ بھی نہیں مانگا تھا۔ مگر اسے بھی مجھ سے غرض تو تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”راجا صاحب مجھ سے بھی آپ کے لیے جو ہوا میں ضرور کروں گا لیکن پہلے میں اپنے یہ کام نپاؤں۔ اگر فتح خان درمیان میں نہ آتا تو میں اور میرے ساتھی مرشد کے گرد گھومتے والے تھے۔“

”یہ بریف کیس کا مسئلہ کیا ہے؟“

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

ماہنامہ سرگزشت مئی 2012ء

یا کہیں اور چلا گیا تھا۔ وہ شہر میں پڑھ رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ وہیں کہیں سیٹ ہو گیا ہو ویسے بھی وہ مقامی رسم و رواج سے نالاں تھا خاص طور سے لڑکیوں کی خرید و فروخت سے جو شادی کے نام پر کی جاتی تھی۔ اس کا باپ اپنے لڑکیوں سے بھی کم عمر بیویاں رکھتا تھا۔ اس مقصد کے لیے روپیہ حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی بیٹیاں فروخت کرتا تھا۔

سرد کے گاؤں کے پاس سے گزر کر ہم اس درے کی طرف جانے لگے جو باہر سڑک تک پہنچتا تھا۔ میں عبدالرحمن سے بات کرتا رہا۔ اسے راج خان کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اس کے بارے میں بتایا۔ اسے حیرت ہوئی کہ راج خان اتنا خطرناک آدمی تھا جس سے راجا عمر دراز جیسا طاقتور شخص بھی پریشان تھا۔ میں نے کہا۔ ”اس سے صرف راجا صاحب ہی نہیں، میں اور میرا ایک دشمن مرشد بھی پریشان ہے۔ وہ کسی کی بھی پروا نہ کرنے والا شخص ہے۔“

”میں راجا صاحب کے آدمیوں کو جسمانی تربیت کے ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی کر رہا ہوں اور کچھ مقامی لوگوں کو اس طرح تربیت دے رہا ہوں کہ وہ اس پاس کے علاقے پر نظر رکھیں اور کوئی غیر معمولی بات ہو تو ہمیں فوری اطلاع مل جائے۔“

”یعنی تم جاسوسی کا نظام قائم کر رہے ہو؟“

”یہ بہت ضروری ہے، راجا صاحب جس حیثیت کے آدمی ہیں ان کو اپنے آس پاس سے لازمی باخبر رہنا چاہیے۔“

”بہت مناسب بات ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

خچر درے کی بلندی تک پہنچ گئے تھے یہاں سے پانچ سڑک دکھائی دے رہی تھی وہاں ایک بڑی لکڑی جیب کھڑی تھی۔ اس سفر کے دوران امین ذرا پیچھے اور بالکل خاموش رہی تھی۔ مشکل سے دس منٹ بعد ہم ڈھلان سے اتر کر جیب تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے ساتھ دونوں محافظ بھی موجود تھے۔ عبدالرحمن نے کہا۔ ”اس موسم میں گاڑیاں وادی میں نہیں آ سکتی ہیں اس لیے انہیں سڑک کے پاس ہی ایک گیراج میں رکھا جاتا ہے۔“

”اگر راجا صاحب کو کہیں جانا ہو تو؟“

”وہ گھوڑے پر سفر کرتے ہیں۔ اس موسم میں کچے راستوں پر گاڑیاں چلانا ممکن نہیں ہوتا۔“ عبدالرحمن نے کہا اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”اب آپ کو روانہ ہو جانا چاہیے۔ وقت بہت کم ہے کیونکہ آپ کورات سے پہلے اسلام آباد پہنچنا ہے۔“

اس دوران میں اوپر پہاڑ پوری طرح روشنی میں آچکے تھے لیکن نیچے گھاٹیوں اور ڈھلوانوں پر ابھی سایہ تھا۔ میں نے

عبدالرحمن سے ہاتھ ملایا اور امین کے ساتھ جیب کی نشست پر آگیا۔ وہ راجا عمر دراز سے الوداعی ملاقات اور سفر کے دوران خاموشی رہی تھی۔ جیب بہت کشادہ اور سہولتوں سے آراستہ تھی۔ میں نے اس کا طاقتور لائزل انجن رہا تھا۔ عبدالرحمن نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی وہ ہا خیال رکھیں اور میرے ہر حکم کی تعمیل یہ سمجھ کر کریں کہ یہ راجا صاحب کا حکم ہے۔ یہ سن کر دونوں محافظ الٹ ہو گئے۔ ہمارے بیٹھے ہی جیب آگے بڑھ گئی اور عبدالرحمن اس کا ساتھی خچر لے کر واپس روانہ ہو گئے۔ وہ بلاوجہ ضائع کرنے والے لوگ نہیں تھے۔

ذرا سی دیر میں جیب وادی سے آگے نکل کھاتی ہوئی آلود اور سلی سڑک پر سوات کی طرف جا رہی تھی۔ اب اس علاقے میں متعدد نئی سڑکیں بن گئی تھیں اس سے آمد و رفت آسان ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ موسم اور بے پناہ ہولناکی والی لینڈ سلائیڈنگ نے سفر کو دوسرے انداز میں دشوار بنا دیا تھا۔ جیب میں خاص طور سے برف اور بیلے راستوں پر سفر کے قابل بنائے گئے تھے۔ اس لیے یہ بہت آسانی سے چل رہی تھی ورنہ اس رفتار پر کوئی دوسری گاڑی اتنی آسانی سے سفر نہیں کر سکتی تھی۔ ایک محافظ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور دوسرا اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ اس نے سڑک کہا۔

”جناب اگر آپ چاہیں تو ہمارے پاس تھرماس میں چائے اور کافی دونوں ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے، ایسا کرو کافی نکالو۔“ میں خوش ہو گیا۔

اس نے چلتی جیب میں ہمارے لیے بہترین قسم کے گوں میں کافی نکالی۔ میں نے صرف کافی لی تھی۔ امین نے اس کے ساتھ شوگر کیوب بھی لیے تھے۔ کریم ہم دونوں کو پیسند نہیں تھی۔ امین اب تک چپ تھی اس نے کافی کا پہلا گھونٹ لیا اور بولی۔

”شہباز تمہیں یقین ہے ہمیں راستے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی؟“ اس کا انداز پُر فکر تھا۔

”میرا خیال ہے ایسا نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا۔

”ہماری روانگی خفیہ رکھی گئی ہے۔“

وہ مسکرائی۔ ”یہ لکڑی جیب دیکھنے والوں کو متوجہ کرتی ہے چھپاتی نہیں ہے اگر دشمن تاک میں ہو تو اسے جانے میں دشواری نہیں ہوگی کہ اس جیب میں کون ہے؟“

”تم زیادہ ہی پریشان ہو رہی ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ایسی جیمیں یہاں بہت سارے لوگوں کے پاس

ہم ایک ہم اسلام آباد پہنچ جائیں گے۔“

”شاید۔“ اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت ہم بڑے پہاڑ سے گزر رہے تھے نیچے بہت ہی گہری نل لہکائی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

”گاڑی روکو اور میرے کچھ سوالوں کے جوابات دو۔“

ڈرائیور نے جیب سڑک کے ایک طرف لگا دی میں نے اتار دو بھی نیچے اتر آئے۔ میں نے امین کو اترنے سے روک دیا اس لیے وہ جیب کے اندر بیٹھی رہی۔ ”تم دونوں ابھارج کون ہے؟“

”میں ہوں جناب۔“ ڈرائیور کے ساتھی نے جواب دیا۔

”تم دونوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

”آپ نے پوچھا نہیں تھا جناب۔“ وہ ادب سے

”لا۔“ میرا نام انعام علی اور یہ میرا ساتھی آدل خان ہے۔“

”میرا نام تم نے سن لیا ہو گا انعام علی۔ یہ بتاؤ کہ اگر

میں نے تم کوئی دشمن نہیں روکے یا حملہ کر کے ختم کرنے کی

”ہم تربیت یافتہ ہیں جناب دشمن کا مقابلہ کریں

۔“ انعام علی نے کہا اس کے پاس اے کے سیونٹی فور رائفل

تھی۔ ریفٹ کے پاس بھی ایسی ہی رائفل تھی لیکن میں نہبتا تھا۔

”تمہارے پاس مزید کوئی ہتھیار ہے۔“

انعام علی جیب کے پچھلے حصے کی طرف آیا۔ اس نے

ایک ہولڈر نکالا اور اس حصے میں رکھے ایک چھوٹے دھاتی بکس

نکالا۔ بکس کھولا اور جب اس نے بکس کھولا تو اس میں کئی

دھاتی گولیاں آتشیں اسلحہ دکھائی دیا تھا، اس میں دو عدد پستول بھی

تھے۔ دو شاٹ گنز بھی ایک عدد طویل فاصلے پر مار کرنے والی

رائفل اور ایک چھوٹا پستول اور ان کے اضافی میگزین

فائل لیے۔ انعام علی نے بکس بند کیا اور ہم دوبارہ جیب میں

کریں نے یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات پوری فوج بھی کام

نہیں آتی اور۔۔۔ بعض دفعہ تم اکیلے ہی کام کر جاتے ہو۔“

میں ہنس دیا۔ ”ذرا لواری ہے تمہاری۔“

ہم انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ وہ میرے پاس

کھسک آئی۔ ”شہباز کبھی کبھی تم بہت شدت سے یاد آتے

ہو۔ میری خواہش ہے تم کچھ دن کے لیے ہی سہی لیکن میرے

پاس انگلینڈ آ کر رہو، بس میں اور تم ہوں کوئی تیسرا فرد نہ ہو۔“

میں نے کن انکھیوں سے گارڈز کی طرف دیکھا۔ میں

نہیں جانتا تھا کہ وہ انگریزی سے واقف تھے یا نہیں۔ وہ بہر

حال راجا عمر دراز کے آدمی تھے اور ممکن ہے انگریزی جانتے

ہوں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”راستے میں اس قسم کی گفتگو

مناسب نہیں ہے ہم بعد میں بات کریں گے۔“

”کیوں۔۔۔؟“

اس نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات

کاٹی۔ ”پلیز۔“

امین منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔ میں نے انعام علی سے

پوچھا۔ ”اگر تم اس روٹ پر سفر کرتے رہے ہو تو تمہیں اندازہ

ہے کہ ہم کتنی دیر میں اسلام آباد پہنچ سکتے ہیں؟“

”سات سے دس گھنٹے میں۔“ اس نے جواب

دیا۔ ”موسم اور راستے پر منحصر ہے۔ پر کہیں لینڈ سلائیڈنگ ہو

گئی تو بہت دیر بھی لگ سکتی ہے۔“

اس موسم میں عام طور سے زمین سخت ہو جاتی ہے اس

کے باوجود لینڈ سلائیڈنگ ہوتی رہتی ہے کیونکہ درخت کم

ہونے سے چٹانوں پر مٹی کی گرفت کم ہو جاتی ہے۔ ہماری

عافیت اسی میں تھی کہ کہیں لینڈ سلائیڈنگ سے واسطہ نہ

پڑے۔ ورنہ سفر اگلے دن بھی جاری رہ سکتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم

سوات میں داخل ہو رہے تھے۔ اس بار پورا شہر برف سے

ڈھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا یہاں چند دنوں میں شدید برف باری

ہوئی ہے۔ انعام علی نے پوچھا کہ اگر ہم چاہیں تو یہاں کسی

ہوٹل میں رک کر چائے کافی پی سکتے ہیں لیکن میں نے سفر

جاری رکھنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد ہم سوات شہر کو چھوڑ کر

وادی میں سفر کر رہے تھے۔

اول خان اچھا ڈرائیور تھا اور پوری توجہ سے اور

مناسب انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا، ایسا لگتا تھا وہ اس

راستے سے اچھی طرح واقف ہے اور اسے معلوم ہے کہ کہاں

رفتار تیز رکھنی ہے اور کہاں کم رفتار رہی مناسب ہوگی۔ امین

بور ہو رہی تھی ایک بار اس نے فتح خان اور سویرا کا ذکر چھیڑنا

چاہا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ وہ جھنجھلائی۔

”پھر میں کیا کروں؟“

”تم اپنی بات کرو، تم ان سالوں میں کیا کرتی رہیں مجھے کبھی سکون سے بیٹھ کر بات کرنے اور تمہارے بارے میں جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ تو کیوں نہ ابھی جان لوں۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”یہ لمبی کہانی ہے۔ پاپا کی گم شدگی کے وقت میں سولہ سال کی تھی اور دو سال مجھے ڈیوڈ شا کی نگرانی میں گزارنے پڑے تھے اس دوران میں وہ پاپا کی جاگیر اور خطاب ہتھیلے میں کامیاب رہا تھا۔“

”میرا خیال ہے انگلینڈ جیسے قانون پرست ملک میں اس قسم کا کام ممکن نہیں ہے۔ ڈیوڈ شا کو یہ دونوں چیزیں کسی نہ کسی قانونی راستے سے ملی ہوں گی۔“

ایمن ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر بولی۔ ”اصل میں اس نے اس سلسلے میں رائج ایک وصیت سے فائدہ اٹھایا ہے جو جاگیر کے سلسلے میں چلی آ رہی ہے۔ اگر جاگیر اور خطاب کا مالک بغیر اولاد نہ چھوڑے غائب ہو جائے تو اس کی موت یا واپسی تک جاگیر اس کے بھائی یا سب سے قریبی کزن کو ملے گی۔ ڈیوڈ شا پاپا کا سب سے نزدیک کزن ہے۔ اس نے اس حق کا فائدہ اٹھا کر جاگیر اور جائداد پر قبضہ کر لیا۔“

میں نے ایمن کی بات پر غور کیا۔ ”گم شدہ آدمی کی واپسی یا اس کی موت کی تصدیق تک۔ اب برٹش شا کی موت کی تصدیق ہو جائے گی۔ اس کا مطلب ہے اس سے آگے بھی جاگیر اور خطاب کے سلسلے میں وصیت کی کوئی نہ کوئی حق ہوگی؟“

”بالکل ہے اس صورت میں یہ جاگیر اور خطاب گم شدہ شخص کو واپس یا اس کی اولاد کو ملے گی۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ جاگیر اور خطاب اب واپس تمہیں مل جائے گا۔“

”شاید۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”لیکن ڈیوڈ شا نہایت چالاک آدمی ہے، مجھے ڈر ہے وہ کوئی چال چل کر اپنا قبضہ برقرار رکھے گا۔ اس کے پاس دولت بھی ہے اور وہ بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا ہے۔“

”تم وکیل نہیں کر سکتی ہو؟“

”اس کے پائے کا نہیں کر سکتی۔ تم جانتے ہو میں اچھا کماتی ہوں لیکن ہوں تو ایک ملازم پیشہ لڑکی اور میرے پاس زیادہ جمع پونجی نہیں ہے۔ میں بہت اچھا وکیل نہیں کر سکتی۔۔۔۔ اور آج کل انصاف عدالت کے بجائے اچھے وکیل سے ملتا ہے۔“

ہے چاہے وہ حقدار نہ ہو اور غریب حق پر ہوتے ہوئے روتا بیٹا رہ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی برٹش عدالتی نظام فرق اتنا ہے کہ ہمارے کرپٹ ہو چکا ہے اور تمہارے ہاں کرپٹ نہیں ہے۔“

”ہمارے ہاں بھی اس میں بہت خرابیاں آہیں۔“ اس نے سر د آہ بھری۔ ”میں نے کہا نا اب ہمارے ہاں بھی انصاف اسے ملتا ہے جو بڑا وکیل کر سکتا ہو۔“

ہم سوات کی وادی سے نکل آئے تھے اور اس دیرک اونچے نیچے پہاڑوں میں نکل کھاتی گزر رہی تھی۔ یہاں اکثر جگہوں پر برف صاف کر دی گئی تھی بعض مقامات پر برف موجود تھی اور جب کو برف پر سے گزرتا پڑتا تھا ایسی جگہوں پر اس کی رفتار بہت سست ہو

تھی۔ اول خان نے جب ایک ایسے راستے پر گھمادی تھی میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ شاید نیا راستہ تھا جو قاصد کم دیتا۔ مگر یہاں سڑک تنگ اور بعض مقامات سے خاصی خراب تھی۔ میں ایمن سے بات کر رہا تھا کہ اچانک اول خان۔ جب روک دی۔ ہم نے چونک کر سامنے دیکھا تو سڑک برف کا بہت بڑا تودا نما گرا نظر آیا اور اسے ہٹائے بغیر سڑک سے گزرتا ممکن نہیں تھا۔ یہ لینڈ سلائیڈنگ نہیں تھی بلکہ اس سے برف کا ڈھیر پھسل کر سڑک پر آ گیا تھا اور اس پر سے گزرتا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ انعام علی نے مڑ کر کہا ”جناب یہ برف ہٹانی پڑے گی۔“

”ہمارے پاس شیپے ہیں جناب۔“ اول خان بولا۔ ”ایسے سفر میں برف صاف کرنے کے لیے رکھنے پڑے ہیں۔“

”بس تو برف صاف کرو۔“ میں نے کہا۔ وہ دونوں نیچے اتر گئے۔ انہوں نے پچھلے حصے سے عدد شیپے برآمد کیے جو شاید برف ہٹانے کے لیے تھے کیونکہ ہلکے اور چوڑے پھل والے تھے۔ اندر گرائش کے لیے۔ کا انجن چلتا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایمن سے کہا۔ ”سنو ٹیمیں ڈیوڈ شا کے خلاف میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو تیار پاؤ گی۔ اس میں مالی مدد بھی شامل ہے۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”میں جانتی ہوں تمہارا تعلق کھاتے بیٹے خاندان سے ہے لیکن اس قسم کے مقدمات میں رقم پانی کی طرح استعمال ہوتی ہے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔ اس کا انتظام بھی ہو جا گا۔“

”اگر تمہارا اشارہ راجا عمر دراز کی طرف ہے تو میں ہا ہوں گی۔“ اس نے کہا۔ ”میرے ساتھ اس کا جو ہے اس کے بعد میں اس کی طرف سے کوئی مدد قبول نہیں کروں گی۔“

”میں راجا کی بات نہیں کر رہا ہوں میرے اپنے لیے ہی ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تو اپنے لیے کسی سے کچھ مانگنے کا قائل نہیں ہوں کسی اور کے لیے کیسے مانگوں۔“

”میں مسکرائی۔“ میں بھول جاتی ہوں تم کیسے شخص ہو کا ش۔“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر گہری سانس لی۔ ”کیا کا ش۔۔۔۔؟“

”چھوڑو اس بات۔۔۔۔۔“ اس کی بات اس بار بھی حیران کن تھی اور اس بار اس کا سبب ایک فائر تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر سامنے دیکھا۔ انعام علی کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ اچھل رہا تھا۔ اگلے ہی لمحہ وہ پیچھے جا گرا تھا۔ اول خان وحشت زدہ انداز میں دونوں طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ اوندھے منہ اتر کر آیا۔ میں نے خود کار انداز میں نیچے جھکتے ہوئے ایمن کو سیٹ کے نیچے دبایا۔

”سرمت اٹھانا۔“ میں نے کہا اور دورازہ کھولتے دے ڈھلان والی طرف اتر گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ فائر پہاڑ کی طرف سے ہوئے ہیں۔ میں نیچے اتر رہا تھا کہ میرے کانوں میں فتح خان کی منخوس آواز آئی۔

”شہباز خان سامنے آ جاؤ تمہارا دونوں آدمی ختم ہو گیا۔“

جب کا انجن چل رہا تھا اور مجھے خیال آیا کہ میں اسے لے جا سکتا تھا لیکن فتح خان کے سر میں شیطان کا داغ تھا۔ فوراً ہی وہ فائر اور ہوئے اور پہاڑ کی طرف والے پہاڑ کے دونوں بازو ختم ہو گئے۔ دھماکوں کے ساتھ جب اس طرف جھک گئی تھی۔ ایمن نے جیج ماری تو میں فکر مند ہو گیا۔

ایمن تم ٹھیک ہو؟

”ہاں میں ڈر گئی تھی۔“ وہ اندر سے بولی۔ ”فتح خان۔“ میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”تم کیوں ہمارے پیچھے بڑھ گئے ہو؟“

”شہباز خان کیا کرے اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ اب اگر تم میرے دس گھنٹے تک ہتھیار ڈال کر اور اٹھ کر سامنے نہیں آیا تو جب کورا کٹ لگے گا اور اس کے ساتھ تمہارا گلڑا بھی اڑ جائے گا۔ ایک۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ تین۔۔۔۔۔“

چار۔۔۔۔۔“

فتح خان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہی کرے گا جو کہہ رہا تھا۔ اس نے ایک منٹ کے اندر دو انسانوں کو مار کر اپنی سنجیدگی کا ثبوت بھی دے دیا تھا۔ وہ سات تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔

”فتح خان اگر میں سامنے آؤں تو کیا ضمانت ہے کہ تم گولی نہیں چلاؤ گے؟“

”میں پاگل نہیں ہوں۔“ وہ بولا۔ ”مارتا ہوتا تو سیدھا گاڑی پر راکٹ مارتا اور تم ابھی فرشتوں کو حساب دے رہا ہوتا۔“

پاگل تو وہ ہو رہا تھا اس لیے مستقل میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے۔“

میں نے رائفل پھینک دی اور ہاتھ اٹھا کر جب کے عقب سے نکل آیا فوراً ہی فتح خان نے کہا۔ ”مس شا کو باہر لاؤ۔“

”تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟“

”اسی سے تو مطلب ہے۔“ فتح خان بیہودہ لہجہ میں بولا۔ ”تم سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔“

”فتح خان تم جانتے میرے جیتے جی تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اس لیے بہتر ہوگا پہلے تم مجھے گولی مار دو۔“

”شہباز خان میں تم کو جانتا ہے اس لیے ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔“ اس نے گویا مجھے تسلی دی۔ ”پر ابھی میرے کو تم دونوں سے کام ہے۔ مس شا ابھی تک باہر نہیں آیا۔“

فتح خان کہیں دور تھا اور کسی ہلکی طاقت والے میکافون سے بات کر رہا تھا جس کی آواز میں زیادہ گونج نہیں تھی۔ اس لیے پہاڑ پر ہونے کے باوجود اس کی آواز گونج نہیں رہی تھی۔ اس کی وارننگ کے بعد ایمن بھی گاڑی سے باہر آ گئی تھی اس نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ فتح خان نے لٹکار کر کہا۔ ”مس شا اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ مجھے پتا ہے تم انگریز کتنا مکار ہوتا ہے۔“

اس کی بات پر ایمن نے ہنسا کر ہاتھ اٹھا لیے تھے اور دانت چیس کر زرب لب بولی۔ ”ذلیل کمینہ آدمی۔“

”تم دونوں ایسے ہی ہاتھ اٹھا کر رکھے گا۔“ میرے ہاتھ میں رائفل ہے اور میرا نشانہ تم دیکھ چکا ہے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ بھلا فتح خان کو الہام ہوا تھا کہ ہم یہیں سے گزریں گے۔ ہم کوئی اور روٹ بھی تو اختیار کر سکتے

ہیں۔

مئی 2012

تھے اور سب سے اہم بات کہ اس کا راجا عمر دراز کے محل میں کوئی جاسوس تھا جس نے اسے آگے اطلاع دی ہوگی۔ جاسوس کے بغیر یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ فتح خان اس طرح ہمیں روک لیتا۔ اچانک فتح خان نے کہا۔ ”اول خان ان کا تلاشی لو۔“

فتح خان کی آواز سن کر بہ ظاہر مرے پڑے اول خان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر ہماری طرف بڑھا اس نے اپنی رائفل اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایمن دم بہ خود رہ گئی اور میں نے گہری سانس لی تو یہ غدار اول خان تھا۔ انعام علی تو یقینی مارا گیا تھا۔ میں نے اس کے سر سے خون کا فوارہ اچھلتے دیکھا تھا۔ لیکن اول خان نے ڈراما کیا تھا تاکہ میں بے چوں چرا ہتھیار ڈال دوں اور میں نے واقعی ایسا ہی کیا تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے کہا۔ ”تم نے راجا عمر دراز سے غداری کی ہے؟“

”نہیں میں تو فتح خان کا آدمی ہوں۔“ اس نے بدلے لہجے میں کہا۔ ”راجا کے پاس بھرتی ہو گیا تھا۔ پر کام فتح خان کے لیے کرتا ہوں۔“

”تو غداری اور کسے کہتے ہیں؟“ ایمن خوف زدہ تھی۔ ”شہباز یہ سب کیا ہے؟“

”فتح خان۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”لگتا ہے یہ قبر میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

اول خان نے ہم دونوں کی تلاشی لی اور نہایت مفاہی سے ایمن کا پستول اور اضافی میگزین نکال لیے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم کتنے مسلح تھے۔ ہم اسے گھورتے رہے لیکن اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ایمن پھر منمنائی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا تاکہ راستے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیا تمہیں کوئی خدشہ تھا؟“ اس نے سر ہلایا۔ ”جب فتح خان کی قید میں تھی تو ایک بار اس نے مجھ سے کہا کہ اگر اسے ہیرے نہ ملے تو وہ ان کے برابر رقم پھر بھی حاصل کر لے گا اور میرے توسط سے حاصل کرے گا اس لیے مجھے شروع سے خدشہ تھا کہ فتح خان میرا اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ دیکھ لو اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“

کرکھائی میں لڑکھائی اور اس کے بعد نیلچے سے برف صاف کرنے لگا۔ اس کا یا فتح خان کا مقصد کیا تھا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کیا ہمیں اسی گاڑی میں آگے کی طرف سفر کرنا تھا۔ میں اور ایمن بدستور ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ میں فتح خان سے کہا۔

”ہمیں کب تک اسی طرح ہاتھ اٹھائے کھڑے رہنے پڑے گا۔“

”بس کچھ دیر اور۔“

”فتح خان کیا تم نے اپنی صورت نہ دکھانے کا فیصلہ لیا ہے اب دور دور سے بات کرو گے۔“

”ابھی تم سے دور سے ہی بات کر رہے گا۔“ وہ بولا۔

اول خان طاقتور شخص تھا اس نے دس منٹ میں سڑ سے اتنی برف صاف کر دی جس سے گاڑی گزر سکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا فتح خان اکیلا ہے اور اس وجہ سے وہ سامنے آنے سے گریز کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ صرف اول خان تھا اور وہ بھی ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اگر فتح خان نے صرف ایک آدمی کے ساتھ ہمیں روکا تھا تو اس کی عقل پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ صرف ایک آدمی کے ساتھ مجھے قابو رکھنا کتنا مشکل تھا۔ بات وہ بھی جانتا تھا۔ تب اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ بہ ظاہر مقصد وہ نہیں ہے جو نظر آ رہا ہے فتح خان کسی اور چکر میں تھا۔ بہر حال جو بھی تھا وہ جلد سامنے آنے والا تھا۔ اول خان سڑک صاف کر کے پھر اوپر کی طرف چلا گیا۔ اس نے یا فتح خان نے ہم سے نہ تو چلنے کو کہا تھا اور نہ ہی ان کا ایسا کوئی ارادہ لگ رہا تھا۔ اچانک فتح خان نے حکم دیا۔

”شہباز خان.... دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر گٹھنوں کے نیل کھڑے ہو جاؤ۔“

مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ ”وہ کیوں؟“

جواب میں ایک فائر ہوا اور گولی میرے پیروں سے چند انچ آگے سڑک پر لگی۔ میں بے ساختہ پیچھے ہوا تھا۔ فتح خان نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”شہباز خان میرے کو مجبور مت کرو کہ اگلا گولی تمہارے پاؤں میں مارے۔“

میں نے بادل ناخواستہ اس کے حکم کی تعمیل کی اس نے ایمن کے لیے کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ وہ بدستور کھڑی رہی۔ پھر اول خان اوپر سے آتا دکھائی دیا۔ وہ گاڑی کی طرف آیا اور اس نے پچھلے حصے سے جیک پاتا اور اضافی تائر نکال کر گاڑی کو جیک پر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس جگہ وہ نظر نہیں آ رہا تھا بس کبھی کبھی اس کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس نے پھرتی سے دس منٹ میں دونوں پیسے بدلے اور پھر پیچھے ہونے والے تائر اور

اپنی عقبی حصے میں رکھ دیا۔ پھر اس نے اسلحے والا بکس لے کر اوپر چلا گیا۔

میں اب بھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔ یہی تاؤ فتح خان کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ وہ کوئی پندرہ یا اسی سال کا لڑکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نہتا اسے مسلح ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس کا لباس بالکل لیے ہمارے سروں پر موجود تھا اور دوسرے اگر اسے قابو کر بھی لیتا تو فتح خان کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ نیچے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ واسکٹ نما چیز تھی۔ وہ اس نے ہم سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر رکھ دی اور فوری طور پر اسے پیچھے ہٹا اور گھوم کر سڑک کے بالکل کنارے پر اس کے ساتھ جا کھڑا ہوا تھا جہاں اس نے کچھ دیر پہلے انعام علی کی لاش اور برف گرائی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فتح خان اسے ایک ایک قدم کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا۔ ”وہ ان پر لفظ بہ لفظ عمل کر رہا تھا۔ اس معاملے میں فتح خان کوئی قسمت تھا کہ اسے مجرم ہوتے ہوئے بھی وقار اور ہٹا کر ساتھی مل جاتے تھے۔“

”فتح خان یہ کیا ہے؟“

”ابھی بتاتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے ایمن سے

اول خان جیکٹ اور شرٹ اتار کر اسے پہن لے۔“

فتح خان کے لہجے میں شرارت تھی۔ میں چونکا۔

”کیوں پہن لے؟“

”سوال مت کرو۔“ اس بار فتح خان غرایا۔ ”اس سے

اولو پہن لے ورنہ میں اس طرح گولی مار دے گا۔“

فتح خان نے اپنا جملہ عمل ہوتے ہی فائر کر دیا۔ پہلے میں سمجھا کہ اس نے مجھے اور ایمن کو ڈرانے کے لیے فائر کیا ہے لیکن پھر ایک چیخ سنائی دی میں نے گھوم کر دیکھا تو اول خان جو آرام سے سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور پھر لٹائی میں گر گیا۔ میرے یا ایمن کے وہم و گمان میں بھی نہیں لگا کہ وہ اپنے ہی ساتھی کو گولی مار دے۔ ایمن چلا اٹھی۔ ”یہ کیا تم نے؟“

”اب تم کو پتا چل گیا کہ میں کیا کر رہے گا۔“ فتح خان

لے مرد لہجے میں کہا۔ ”اگر تم نے دو منٹ کے اندر جیکٹ نہیں

پہنا تو میں شہباز کو بھی اسی طرح گولی مار دے گا۔“

”ایمن تم یہ نہیں پہنوں گی یہ بکواس کرتا ہے۔“ میں نے

کہا ایمن کا ہنسنے لگی تھی۔ شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ

مہلت میں کوئی خطرناک چیز تھی۔ فتح خان نے کچھ نہیں کہا تھا

البتہ نصف منٹ بعد اعلان کیا۔

”میں شہباز سے پاس ڈیڑھ منٹ باقی ہے۔“

”شہباز میں پہن رہی ہوں۔“ ایمن روہانے انداز

میں بولی۔ ”ورنہ یہ وحشی تمہیں بھی مار دے گا۔“

”تم نہیں پہنوں گی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ مجھے

مارنے کی جرات نہیں کر سکتا۔“

میری آواز فتح خان تک نہیں جاسکتی تھی لیکن اس نے

محسوس کر لیا کہ میں ایمن کو منع کر رہا ہوں اس نے پھر فائر کیا

اور اس بار بھی گولی مجھ سے چند انچ دور زمین میں لگی۔ اس

نے کہا۔ ”میں شہباز کو منٹ رہ گیا ہے۔“

ایمن تیزی سے جیکٹ کی طرف بڑھی اور اسے اٹھا

لیا۔ ”ایمن یہ کیا حماقت کر رہی ہو۔“ میں نے اسے روکنے کی

کوشش کی۔ جیکٹ اٹھا کر اس نے مجھے دیکھا۔

”شہباز میں تمہاری زندگی کا خطرہ مول نہیں

سکتی۔“

فتح خان بولا۔ ”تم عقل مند ہے مس شہباز اب اپنا

جیکٹ اور شرٹ اتار دو بس اندر والا کپڑا پہنے رہو اور اس پر یہ

پہن لو۔“

”فتح خان۔“ میں غرایا۔

”شہباز خان تم چپ رہے گا۔“

”ہاں پلیز تم مت بولو۔“ ایمن نے کہا اور جیب کی آڑ

میں آگئی۔ یہاں سے فتح خان اسے واضح نہیں دیکھ سکتا تھا

لیکن مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اسے

روکنے کی کوشش کی لیکن اول خان کی موت اور فتح خان کی

دھمکی نے اسے دھلا دیا تھا اس نے جیکٹ کے بعد شرٹ بھی

اتارنی شروع کی تو میں نے منہ موڑ لیا تھا۔ فتح خان کا مقصد

کسی حد تک میری سمجھ میں آ گیا تھا لیکن مجھے یا ایمن کو اتنی

مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ اس صورت حال سے عہدہ برا ہو

سکتے۔ فتح خان نے نہایت پلاننگ سے کام لیا اور اول خان کو

مار کر ایک تو اس نے ہمیں نفسیاتی لحاظ سے مرعوب کر لیا اور

دوسرے اس سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیا۔ وہ شاید راجا عمر

دراز کے محل کی حد تک اس کے لیے کارآمد تھا اور اس سے باہر

بیکار ہو گیا تھا۔ فتح خان بیکار چیز ٹھکانے لگانے کا قائل تھا۔

فتح خان نے کہا۔ ”میں شہباز کو بھی تم کپڑے نہیں پہنے گا

ہو۔ یہ کسی قدر پھولی ہوئی تھی اگر ایمن اپنے ملک میں اور مگری کے موسم میں ہوتی تو لوگ اسے نئے فیشن کی چیز سمجھتے۔ یہ ظاہر دیکھنے میں یہ خطرناک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے دودھیا بازو سیاہ جیکٹ میں بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ چند لمحوں میں بھولی گیا کہ چویشن کتنی سنگین ہو رہی ہے۔ اس طرح دیکھنے پر ایمن بھی پریشانی کے باوجود شرما گئی تھی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

یہ خاصا اکسانے والا سوال تھا کہ کیا دیکھ رہے ہو اور مزید کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بہت غلط موقع پر تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں۔“

”بس عاشق معشوقی کا کھیل نہیں چلے گا۔“ فتح خان کی آواز آئی اور اس بار میگا فون کے بغیر ہی پاس سے آئی تھی۔ وہ سڑک سے ذرا بلند ایک درخت سے ٹپک لگائے کھڑا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں وہ آخری بار مجھے نظر آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ فرار کے بعد وہ خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا اور اگر اس کے پاس کوئی ٹھکانہ تھا تو وہ صرف سر چھپانے کی حد تک تھا اس کا شیوہ بھی بڑھ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایمن نے جلدی سے اپنے بازو سمیٹ لیے۔ فتح خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”شہباز خان تم محبت کے معاملے خوش قسمت ہے۔ سویرا تم سے محبت کرتا ہے اور یہ بھی تمہاری خاطر موت کا جیکٹ پہننے کو تیار ہو گیا۔“

”موت کی جیکٹ۔“ میرے اور ایمن کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔ فتح خان نے سر ہلایا اور بولا۔

”مس شاتم نے جیکٹ کا نیچے والا یک نہیں لگایا ہے۔“ ایمن نے جیکٹ ہٹن لگا کر بند کر دی تھی لیکن نیچے ایک دھاتی بکلی ٹاپ کی چیز نظر آ رہی تھی۔ یہ ایسا بکلی تھا جو مخالف کھانچے میں فٹ ہو کر بند ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی ایمن نے ہک لگایا جیکٹ سے ایک عجیب سے سنسناتی سی آواز آئی اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی روشنی جلنے بجھنے لگی تھی۔ ایمن دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ ”یہ... یہ کیا ہے؟“

”مس شا یہ ایک بارودی جیکٹ ہے اور اس میں موجود بم اتنا طاقتور ہے کہ تمہارے آس پاس جو بھی ہو گا وہ مارا جائے گا۔ بکلی لگانے سے یہ ایٹمی ویٹ ہو گیا ہے۔“ فتح خان بولا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا جدید قسم کا ریموٹ نکالا۔ اس پر نمبر لگے تھے اور اوپر ایک سرخ ہٹن لگا تھا۔ اس نے ریموٹ اوپر کر کے اس کے کچھ ہٹن دبائے اور پھر اس کا رخ ایمن کی طرف کر کے سرخ ہٹن دبا دیا وہ بے ساختہ مجھ سے دور ہوئی تھی۔ لیکن ہٹن دبانے سے کچھ نہیں ہوا۔

تھا۔ فتح خان مسکرایا۔ ”ڈرومٹ مس شا، ابھی یہ صرف ایک ویٹ ہوا ہے برائے نہیں پچھے گا۔ اگر تم نے اب بکلی کھول جیکٹ کو کی جگہ سے کاٹو یہ پھٹ جائے گا۔ اسے صرف ایک ہی طریقے سے اتارنا جاسکتا ہے۔ اس ریموٹ کی مدد سے فتح خان نے کہا اور ریموٹ میری طرف اُچھال دیا۔ یہ اتارنا تھا کہ کسی موبائل جیسا لگتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے لیا۔ میں نے اس کا نمبر لگا دیا ہے اب وہ نمبر دبا کر سرخ ہٹن دباؤں گا تو جیکٹ ڈی ایٹمی ویٹ ہو جائے گا۔ اس کے بل کسی کا باپ بھی اسے ڈی ایٹمی ویٹ نہیں کر سکتا ہے چاہے دنیا بھر کا ماہر بھی آجائے۔ یہ بہت جدید جیکٹ ہے۔ یہ اگر پروف ہے اس سے ایکس رے کا شعاع نہیں گزر سکتا اور نہ کسی اور آلے سے اس کا اندر سے معائنہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک بات اور اگر غلط نمبر دبا کر سرخ ہٹن دبایا تو سوائے دھماکے کے کچھ نہیں ہوگا۔“

”اور اگر ایسے ہی کوئی ہٹن دب جائے تو؟“

”اس سے کچھ نہیں ہوگا بھلے سرخ ہٹن دبائے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک سات نمبر نہیں ملائے گا تب تک ریموٹ بھی کام نہیں کرے گا۔ ویسے تم چاہے تو احتیاط کے طور پر اس کا سیل نکال لے۔“

میں نے فوری طور پر یہی کیا تھا اور پھر ایمن سے کہا۔ ”کپڑے پہن لو۔“

میری جان خطرے میں پا کر اس نے بلا جھجک جیکٹ پہن لی تھی لیکن اب وہ کتے کے عالم میں تھی اسے اپنی بات سمجھانے کے لیے اسے ہلانا پڑا تھا۔ تب اس نے معمول کے سے انداز میں شرٹ اور پھر جیکٹ پہنی تھی۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ فتح خان نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ پھر بھی میں نے اس سے پوچھا۔ ”فتح خان تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”اب تم نے کام کا سوال کیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”ایمن شا اسلام آباد جائے گا اور اگر اسے زندہ رہنا ہے تو مجھے پانچ کروڑ ڈالر دے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ کہاں سے دے سکتی ہے پانچ کروڑ ڈالر۔“

”یہ دلوں کا معاملہ ہے۔ یہ نہیں دے سکتا تو اس کا حکومت دے۔“ فتح خان نے سکون سے کہا۔ ”ایک بات اور دے۔ جیکٹ ایٹمی ویٹ ہوتے ہی اب سات دن یا ایک سڑھ گھنٹے کا وقت ہے۔ اس کے بعد بم خود بہ خود پھٹ جائے گا۔ تم وقت نوٹ کر لو اور اس کا حساب رکھو۔“

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کا ایک بج کر

دس منٹ ہوئے تھے۔ فتح خان نے تقریباً دس منٹ پہلے ہی ایمن کو ویٹ کیا تھا۔ میں نے جی سے کہا۔ ”فتح خان آج کل لمبوں کی سطح پر اتر آئے ہو۔ اپنے زور بازو پر بھروسہ کر لے کی بجائے ایسے حربے استعمال کر رہے ہو۔“

اس نے بالکل غیر انہیں مانا تھا۔ ”تم چاہے تو ایسا کہہ رہے ہو۔ مجھ کو پانچ کروڑ ڈالر زل جائیں تو میں اس کے لیے نو بنے کو بھی تیار ہوں۔“

ہمارے درمیان گفتگو انگریزی اور اردو میں ہو رہی تھی۔ جب ایمن بھی شامل ہوتی تھی تو انگریزی میں بات ہوتی تھی۔ ورنہ اردو میں بات ہوتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ ایک عام سی لڑکی ہے اور اب تو اس کا لارڈ باپ بھی نہیں ہے اس لیے حکومت اس کے بدلے پانچ کروڑ ڈالر نہیں دے گی تم بلاوجہ ایک انسان کو اپنی لالچ کی بجھٹ چڑھا رہے ہو۔“

”اگر پانچ کروڑ ڈالر نہیں دے گا تو ساری دنیا میں ہتھیار سیٹے گا کہ اپنے ایک شہری کو نہیں بچا سکا۔“

”فتح خان....“

میں نے کہنا چاہا لیکن فتح خان نے میری بات کاٹ کر اشارہ کیا۔ ”شہباز خان اب تم جاسکتا ہے۔“

وہ پیچھے ہٹا تھا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”سویرا کہاں ہے؟“

”وہ شہلا کے پاس ہے اب میرا اور اس کا معاملہ ختم ہو گیا ہے تم جا کر اس سے سویرا کو لے لو۔“

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ ”فتح خان اسے تم نے افوا کیا ہے اور مجھے تم سے ہی چاہیے۔“

”میرا اشاری لے لو میرے پاس نہیں ہے۔“ اس نے استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”شہباز خان ہوش سے کام لو شہلا نے اس کا کیا کرنا ہے وہ اسے چھوڑ دے گا یا چھوڑ دیا ہو گا اس کا مجھے نہیں معلوم۔“

”وہ تمہارے حکم کے بغیر اسے نہیں چھوڑ سکتی۔“

”میں نے کل اسے بتا دیا ہے کہ ہیرا نہیں ملا اس لیے میرا اور اس کا راہ اب الگ ہے۔“

”اچھا مجھے اس کا پتا بتا دو میں خود....“

”نہیں فتح خان زبان دے چکا ہے شہلا کا پتا نہیں بتا سکتا تم خود تلاش کر لو۔“ وہ بولا اور رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”اب جاؤ رکومت ورنہ میں کم سے کم ایک گولی تو مار دے گا۔ جیب مس شا بھی ڈرائیو کر سکتا ہے یہ تم کو پہلے ہسپتال لے جائے گا اور وہاں سے تمہیں پولیس لے جائے گا۔“

حالات نے ایک بار پھر مجھے فتح خان کے سامنے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے نہایت مکاری سے کام لیا تھا اور اس طرح سے وار کیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہیں تھا جب جیب یہاں رکی اور فتح خان کی آواز آئی تو میرا خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر اس کے قیدی بن گئے ہیں لیکن اس بار اس نے حکمت عملی بدل دی تھی۔ اس نے ہمیں جسانی قیدی نہیں بنایا تھا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی گرفت میں آ گئے تھے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مجبور تھے۔ اسے بہر صورت ہیرے یا ان کی مالیت کی رقم درکار تھی اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد کو جانے کے لیے تیار تھا۔ ایمن بدستور تنویری کیفیت میں تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر جیب میں بٹھایا اور فتح خان سے کہا۔

”اب جیب کیسے اشارت کروں چاہی تو اول خان کے ساتھ ہی کھائی میں جا چکی ہے۔“

فتح خان ہنسا اور چاہی میری طرف اُچھال دی۔ ”میں اجس نہیں ہے کہ اس سے چاہی نہ لیتا۔“

”تم نے اسے کیوں مار دیا؟“

”بیکار تھا اس لیے ضائع کر دیا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ میں ایک بار پھر اندر سے سلگ اٹھا تھا وہ انسانی جان کے لیے یوں بات کر رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”فتح خان ہو سکتا ہے کبھی تم بھی کسی کے لیے بیکار چیز بن جاؤ۔“

وہ مکاری سے مسکرایا۔ ”تو بے شک ضائع کر دے مجھے۔ اب تم فور سے سنو اس لڑکی کو انٹیکسی تک پہنچانا تمہارا کام ہے اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے۔ جتنا جلدی یہ اپنوں کے پاس جائے گا اس کا جان بچنے کا اتنا ہی امکان ہوگا۔“

”میں کس خوشی میں یہ کام کر دوں جبکہ تم میرے معاملے سے ہاتھ اٹھا چکے ہو؟“ میں نے جی سے کہا۔

”ایمن تمہارا بھی کچھ لگتا ہے۔ اس لیے تم یہ کام کرے گا۔ ویسے تمہارا مرضی ہے تم اسے یہاں چھوڑ جائے میں خود اسے انٹیکسی تک پہنچا سکتا ہے۔ اب تم جیب میں بیٹھ کر چل دو تمہارے پاس وقت کم ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میرے پاس وقت کم تھا۔ میں پیچھے آیا اور جیب کی ڈرائیو تک سیٹ سنبھال لی۔ جب تک میں جیب اشارت کرتا اور فتح خان اتنی دیر میں درختوں میں کھنڈ غائب ہو چکا تھا۔ ایمن کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر وہ اب بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اسے حوصلہ دینے کے لیے میں

ہو۔ یہ کسی قدر پھولی ہوئی تھی اگر ایمن اپنے ملک میں گری کے موسم میں ہوتی تو لوگ اسے نئے فیشن کی چیز سمجھتے۔ یہ ظاہر دیکھنے میں یہ خطرناک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے دودھیا بازو سیاہ جیکٹ میں بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ چند لمحوں میں بھول گیا کہ چویشن کتنی سنگین ہو رہی ہے۔ اس طرح دیکھنے پر ایمن بھی پریشانی کے باوجود شرما گئی تھی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

یہ خاصاً اکسانے والا سوال تھا کہ کیا دیکھ رہے ہو اور مزید کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بہت غلط موقع پر تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں۔“

”بس عاشق معشوقی کا ٹھیکل نہیں چلے گا۔“ فتح خان کی آواز آئی اور اس بار میکا فون کے بغیر ہی پاس سے آئی تھی۔ وہ سڑک سے ڈرا بلند ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں وہ آخری بار مجھے نظر آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ فرار کے بعد وہ خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا اور اگر اس کے پاس کوئی ٹھکانہ تھا تو وہ صرف سر چھپانے کی حد تک تھا اس کا شیوہ بھی بڑھ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایمن نے جلدی سے اپنے بازو سمیٹ لیے۔ فتح خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”شہباز خان تم محبت کے معاملے خوش قسمت ہے۔ سویرا تم سے محبت کرتا ہے اور یہ بھی تمہاری خاطر موت کا جیکٹ پہننے کو تیار ہو گیا۔“

”موت کی جیکٹ۔“ میرے اور ایمن کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔ فتح خان نے سر ہلایا اور بولا۔

”مس شام نے جیکٹ کا نیچے والا ٹیک نہیں لگایا ہے۔“ ایمن نے جیکٹ ہٹ لگا کر بند کر دی تھی لیکن نیچے ایک دھاتی بکلی ٹائپ کی چیز نظر آ رہی تھی۔ یہ ایسا بکلی تھا جو مخالف کھانچے میں ٹٹ ہو کر بند ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی ایمن نے ہک لگایا جیکٹ سے ایک عجیب سے سنسنائی سی آواز آئی اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی روشنی جلنے بجھنے لگی تھی۔ ایمن دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ ”یہ.... یہ کیا ہے؟“

”مس شام یہ ایک بارودی جیکٹ ہے اور اس میں موجود بم اتنا طاقتور ہے کہ تمہارے آس پاس جو بھی ہو گا وہ مارا جائے گا۔ بکلی لگانے سے یہ ایٹمی ویٹ ہو گیا ہے۔“ فتح خان بولا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا جدید قسم کا ریموٹ نکالا۔ اس پر نمبر لگے تھے اور اوپر ایک سرخ ہٹن لگا تھا۔ اس نے ریموٹ اوپر کر کے اس کے کچھ ہٹن دبائے اور پھر اس کا رخ ایمن کی طرف کر کے سرخ ہٹن دبا دیا وہ بے ساختہ مجھ سے دور ہوئی تھی۔ لیکن ہٹن دبانے سے کچھ نہیں ہوا۔

تھا۔ فتح خان مسکرایا۔ ”ڈرومٹ مس شام ابھی یہ صرف ویٹ دیتا ہوا ہے پر ایسے نہیں پھٹے گا۔ اگر تم نے اب بکلی کم جیکٹ کو کسی جگہ سے کاٹا تو یہ پھٹ جائے گا۔ اسے صرف ہی طریقے سے اُتارا جاسکتا ہے۔ اس ریموٹ کی مدد سے فتح خان نے کہا اور ریموٹ میری طرف اُچھال دیا۔ یہ اتنا تھا کہ کسی موبائل جیسا لگتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے لیا۔“ میں نے اس کا نمبر لگا دیا ہے اب وہ نمبر دبا کر سرخ دبائے گا تو جیکٹ ڈی ایٹمی ویٹ ہو جائے گا۔ اس کے کسی کا باپ بھی اسے ڈی ایٹمی ویٹ نہیں کر سکتا ہے چاہے دنیا بھر کا ماہر بھی آجائے۔ یہ بہت جدید جیکٹ ہے۔ یہ پردف ہے اس سے ایکس رے کا شعاع نہیں گزر سکتا اور نہ کسی اور آلے سے اس کا اندر سے معائنہ کیا جاسکتا ہے۔ بات اور اگر غلط نمبر دبا کر سرخ ہٹن دبا یا تو سوائے دھماکے کچھ نہیں ہوگا۔“

”اور اگر ایسے ہی کوئی ہٹن دب جائے تو؟“

”اس سے کچھ نہیں ہوگا بھلے سرخ ہٹن دبائے تب کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک سات نمبر نہیں ملائے گا تب ریموٹ بھی کام نہیں کرے گا۔ ویسے تم چاہے تو احتیاط طور پر اس کا سیل نکال لے۔“

میں نے فوری طور پر یہی کیا تھا اور پھر ایمن کہا۔ ”کپڑے پہن لو۔“

میری جان خطرے میں پا کر اس نے بلا جھجک جیکٹ پہن لی تھی لیکن اب وہ سکتے کے عالم میں تھی اسے اپنی بات سمجھانے کے لیے اسے ہلا پڑا تھا۔ تب اس نے معمول سے انداز میں شرٹ اور پھر جیکٹ پہنی تھی۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ فتح خان نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ پھر بھی نے اس سے پوچھا۔ ”فتح خان تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”اب تم نے کام کا سوال کیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اے شا اسلام آباد جائے گا اور اگر اسے زندہ رہتا ہے تو مجھے بار کروڑ ڈالر دے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ کہاں سے دے سکتی ہے پانچ کروڑ ڈالر۔“

”یہ دلواسکتا ہے۔ یہ نہیں دے سکتا تو اس کا حکومت دے۔“ فتح خان نے سکون سے کہا۔ ”ایک بات اور دے۔ جیکٹ ایٹمی ویٹ ہوتے ہی اب سات دن یا ایک اڑھائی گھنٹے کا وقت ہے۔ اس کے بعد بم خود بہ خود پھٹ جائے گا۔ تم وقت نوٹ کر لو اور اس کا حساب رکھو۔“

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔

معد ہوتے تھے۔ فتح خان نے تقریباً دس منٹ پہلے ہی امالائی ویٹ کیا تھا۔ میں نے سچی سے کہا۔ ”فتح خان آج کل تم لوگوں کی سطح پر اُتر آئے ہو۔ اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے کی بجائے ایسے حربے استعمال کر رہے ہو۔“

اس نے بالکل برا نہیں مانا تھا۔ ”تم چاہے تو ایسا کہہ سکتے ہو۔ مجھ کو پانچ کروڑ ڈالر زل جائیں تو میں اس کے لیے نو بٹن بھی تیار ہوں۔“

ہمارے درمیان گفتگو انگریزی اور اردو میں ہو رہی تھی۔ جب ایمن بھی شامل ہوتی تھی تو انگریزی میں بات ہوتی تھی۔ ورنہ اردو میں بات ہوتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ ایک عام سی لڑکی ہے اور اب تو اس کا لارڈ باپ بھی نہیں ہے اس لیے حکومت اس کے بدلے کا کروڑ ڈالر نہیں دے گی تم بلاوجہ ایک انسان کو اپنی لالچ کی بیسٹ چڑھا رہے ہو۔“

”اگر پانچ کروڑ ڈالر نہیں دے گا تو ساری دنیا میں ہتھیار بیٹے گا کہ اپنے ایک شہری کو نہیں بچا سکا۔“

”فتح خان....“

میں نے کہنا چاہا لیکن فتح خان نے میری بات کاٹ کر مار دیا۔ ”شہباز خان اب تم جاسکتا ہے۔“

وہ پیچھے ہٹا تھا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”سویرا کہاں جا رہا ہے؟“

”وہ شہلا کے پاس ہے اب میرا اور اس کا معاملہ ختم ہو گیا ہے تم جا کر اس سے سویرا کو لے لو۔“

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ ”فتح خان اسے تم نے اغوا کیا ہے اور مجھے تم سے ہی چاہیے۔“

”میرا تلاش لے لو میرے پاس نہیں ہے۔“ اس نے انداز میں کہا۔ ”شہباز خان ہوش سے کام لو شہلا نے اس کا کیا کرنا ہے وہ اسے چھوڑ دے گا یا چھوڑ دیا ہوگا اس کا مجھے نہیں معلوم۔“

”وہ تمہارے حکم کے بغیر اسے نہیں چھوڑ سکتی؟“

”میں نے کل اسے بتا دیا ہے کہ میرا نہیں ملا اس لیے میرا اور اس کا راہ اب الگ ہے۔“

”اچھا مجھے اس کا پتا دو میں خود....“

”نہیں فتح خان زبان دے چکا ہے شہلا کا پتا نہیں بتا سکتا تم خود تلاش کر لو۔“ وہ بولا اور رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”اب جاؤ حکومت ورنہ میں کم سے کم ایک گولی تو مار دے گا۔ جیب مس شام بھی ڈرائیو کر سکتا ہے یہ تم کو پہلے اسپتال لے جائے گا اور وہاں سے تمہیں پولیس لے جائے گا۔“

حالات نے ایک بار پھر مجھے غلے مان سکے ماہر بس کر دیا تھا۔ اس نے نہایت مکاری سے کام لیا تھا اور اس طرح سے دار کیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا تھا کہ جیب جیب یہاں رکی اور فتح خان کی آواز آئی تو میرا خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر اس کے قیدی بن گئے ہیں لیکن اس بار اس نے حکمت عملی بدل دی تھی۔ اس نے ہمیں جسمانی قیدی نہیں بنایا تھا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی گرفت میں آ گئے تھے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مجبور تھے۔ اسے بہر صورت ہیرے یا ان کی مالیت کی رقم درکار تھی اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد کو جانے کے لیے تیار تھا۔ ایمن بدستور تنویری کیفیت میں تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر جیب میں بٹھایا اور فتح خان سے کہا۔

”اب جیب کیسے اشارت کروں چابی تو اول خان کے ساتھ ہی کھائی میں جا چکی ہے۔“

فتح خان ہنسا اور چابی میری طرف اُچھال دی۔ ”میں اسے نہیں ہے کہ اس سے چابی نہ لیتا۔“

”تم نے اسے کیوں مار دیا؟“

”بیکار تھا اس لیے ضائع کر دیا۔“ وہ بیہ پروائی سے بولا۔ میں ایک بار پھر اندر سے سلگ اٹھا تھا وہ انسانی جان کے لیے یوں بات کر رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”فتح خان ہو سکتا ہے کہ تم بھی کسی کے لیے بیکار چیز بن جاؤ۔“

وہ مکاری سے مسکرایا۔ ”تو بے شک ضائع کر دے مجھے۔ اب تم غور سے سنو اس لڑکی کو انہیسی تک پہنچانا تمہارا کام ہے اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے۔ جتنا جلدی یہ اپنوں کے پاس جائے گا اس کا جان بچنے کا اتنا ہی امکان ہوگا۔“

”میں کس خوبی میں یہ کام کروں جبکہ تم میرے معاملے سے ہاتھ اٹھا چکے ہو؟“ میں نے سچی سے کہا۔

”ایمن تمہارا بھی کچھ لگتا ہے۔ اس لیے تم یہ کام کرے گا۔ دیے تمہارا مرضی ہے تم اسے یہاں چھوڑ جائے میں خود اسے انہیسی تک پہنچا سکتا ہے۔ اب تم جیب میں بیٹھ کر چل دو تمہارے پاس وقت کم ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میرے پاس وقت کم تھا۔ میں پیچھے آیا اور جیب کی ڈرائیو تک سیٹ سنبھال لی۔ جب تک میں جیب اشارت کرتا اور فتح خان اتنی دیر میں درختوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ایمن کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر وہ اب بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اسے حوصلہ دینے کے لیے میں

ہو۔ یہ کسی قدر پھونی ہوئی تھی اگر ایمن اپنے ملک میں اور گرمی کے موسم میں ہوتی تو لوگ اسے نئے فیشن کی چیز سمجھتے۔ یہ ظاہر دیکھنے میں یہ خطرناک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے دو دھیا بازو سیاہ جیکٹ میں بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ چند لمبے کوس میں بھول گیا کہ پھویشن کتنی سنگین ہو رہی ہے۔ اس طرح دیکھنے پر ایمن بھی پریشانی کے باوجود شرما گئی تھی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

یہ خاصا اکسانے والا سوال تھا کہ کیا دیکھ رہے ہو اور مزید کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بہت غلط موقع پر تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں۔“

”بس عاشق معشوقی کا کھیل نہیں چلے گا۔“ فتح خان کی آواز آئی اور اس بار میگا فون کے بغیر ہی پاس سے آئی تھی۔ وہ سڑک سے ذرا بلند ایک درخت سے ٹپک لگائے کھڑا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں وہ آخری بار مجھے نظر آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ فرار کے بعد وہ خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا اور اگر اس کے پاس کوئی ٹھکانہ تھا تو وہ صرف سر چھپانے کی حد تک تھا اس کا شیوہ بھی بڑھ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایمن نے جلدی سے اپنے بازو سیٹ لیے۔ فتح خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”شہباز خان تم محبت کے معاملے خوش قسمت ہے۔ سویرا تم سے محبت کرتا ہے اور یہ بھی تمہاری خاطر موت کا جیکٹ پہننے کو تیار ہو گیا۔“

”موت کی جیکٹ۔“ میرے اور ایمن کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔ فتح خان نے سر ہلایا اور بولا۔

”مس شاتم نے جیکٹ کا نیچے والا ٹک نہیں لگایا ہے۔“ ایمن نے جیکٹ ہٹن لگا کر بند کر دی تھی لیکن نیچے ایک دھاتی بکل ٹاپ کی چیز نظر آ رہی تھی۔ یہ ایسا بکل تھا جو مخالف کھانچے میں فٹ ہو کر بند ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی ایمن نے بکل لگایا جیکٹ سے ایک عجیب سے سنسناتی سی آواز آئی اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی روشنی جلنے بجھنے لگی تھی۔ ایمن دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ ”یہ.... یہ کیا ہے؟“

”مس شایہ ایک بارودی جیکٹ ہے اور اس میں موجود بم اتنا طاقتور ہے کہ تمہارے آس پاس جو بھی ہوگا وہ مارا جائے گا۔ بکل لگانے سے یہ ایٹمی ویٹ ہو گیا ہے۔“ فتح خان بولا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا جدید قسم کا ریموٹ نکالا۔ اس پر نمبر لگے تھے اور اوپر ایک سرخ ہٹن لگا تھا۔ اس نے ریموٹ اوپر کر کے اس کے کچھ ہٹن دبائے اور پھر اس کا رخ ایمن کی طرف کر کے سرخ ہٹن دبا دیا وہ بے ساختہ مجھ سے دور ہوئی تھی۔ لیکن ہٹن دبانے سے کچھ نہیں ہوا۔

تھا۔ فتح خان مسکرایا۔ ”ڈرومٹ مس شایہ ابھی یہ صرف ویٹ ہوا ہے پر ایسے نہیں بچنے گا۔ اگر تم نے اب بکل کم جیکٹ کو کسی جگہ سے کاٹا تو یہ پھٹ جائے گا۔ اسے صرف اسی طریقے سے اُتارا جاسکتا ہے۔ اس ریموٹ کی مدد سے فتح خان نے کہا اور ریموٹ میری طرف اُچھال دیا۔ یہ آگ تھا کہ کسی موبائل جیسا لگتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے لیا۔“ میں نے اس کا نمبر لگا دیا ہے اب وہ نمبر دبا کر سرخ دبائے گا تو جیکٹ ڈی ایٹمی ویٹ ہو جائے گا۔ اس کے کسی کا باپ بھی اسے ڈی ایٹمی ویٹ نہیں کر سکتا ہے چاہے دنیا بھر کا ماہر بھی آجائے۔ یہ بہت جدید جیکٹ ہے۔ یہ پروف ہے اس سے ایکس رے کا شعاع نہیں گزر سکتا اور کسی اور آلے سے اس کا اندر سے معائنہ کیا جاسکتا ہے۔ بات اور اگر غلط نمبر دبا کر سرخ ہٹن دبا یا تو سوائے دھماکے کچھ نہیں ہوگا۔“

”اور اگر ایسے ہی کوئی ہٹن دب جائے تو؟“

”اس سے کچھ نہیں ہوگا بھلے سرخ ہٹن دبائے تب کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک سات نمبر نہیں ملائے گا تب ریموٹ بھی کام نہیں کرے گا۔ ویسے تم چاہے تو احتیاط طور پر اس کا سیل نکال لے۔“

میں نے فوری طور پر یہی کیا تھا اور پھر ایمن کہا۔ ”کپڑے پہن لو۔“

میری جان خطرے میں پا کر اس نے بلا جھجک جیکٹ پہن لی تھی لیکن اب وہ سکتے کے عالم میں تھی اسے اپنی بات سمجھانے کے لیے اسے ہلانا پڑا تھا۔ جب اس نے معمول سے انداز میں شرٹ اور پھر جیکٹ پہنی تھی۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ فتح خان نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ پھر بھی میں نے اس سے پوچھا۔ ”فتح خان تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”اب تم نے کام کا سوال کیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اکم شایہ اسلام آباد جائے گا اور اگر اسے زندہ رہنا ہے تو مجھے پار کروڑ ڈالر دے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ کہاں سے دے سکتی ہے پانچ کروڑ ڈالر؟“

”یہ دلوں کا معاملہ ہے۔ یہ نہیں دے سکتا تو اس کا حکم دے۔“ فتح خان نے سکون سے کہا۔ ”ایک بات اور دے۔ جیکٹ ایٹمی ویٹ ہوتے ہی اب سات دن یا ایک اڑسٹھ گھنٹے کا وقت ہے۔ اس کے بعد ہم خود بہ خود پھٹ جائے گا۔ تم وقت نوٹ کر لو اور اس کا حساب رکھو۔“

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔

معد ہوئے تھے۔ فتح خان نے تقریباً دس منٹ پہلے ہی امالائی ویٹ کیا تھا۔ میں نے سچی سے کہا۔ ”فتح خان آج کل لمبائی کی سٹیل پر اتر آئے ہو۔ اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے کی بجائے ایسے حربے استعمال کر رہے ہو۔“

اس نے بالکل برائیاں نہیں مانا تھا۔ ”تم چاہے تو ایسا کہہ سکتے ہو۔ مجھ کو پانچ کروڑ ڈالر زل جانیں تو میں اس کے لیے دہشت کو بھی تیار ہوں۔“

ہمارے درمیان گفتگو انگریزی اور اردو میں ہو رہی تھی۔ جب ایمن بھی شامل ہوتی تھی تو انگریزی میں بات ہوتی تھی۔ ورنہ اردو میں بات ہوتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ ایک عام سی لڑکی ہے اور اب تو آپ فلاں رڈ باب بھی نہیں ہے اس لیے حکومت اس کے بدلے پانچ کروڑ ڈالر نہیں دے گی تم بلاوجہ ایک انسان کو اپنی لالچ کی جینٹ چڑھا رہے ہو۔“

”اگر پانچ کروڑ ڈالر نہیں دے گا تو ساری دنیا میں ہٹنای سہنے گا کہ اپنے ایک شہری کو نہیں بچا سکا۔“

”فتح خان....“

میں نے کہنا چاہا لیکن فتح خان نے میری بات کاٹ کر اٹھارہ گیا۔ ”شہباز خان اب تم جاسکتا ہے۔“

وہ پیچھے ہٹا تھا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”سویرا کہاں ہے؟“

”وہ شہلا کے پاس ہے اب میرا اور اس کا معاملہ ختم ہو گیا ہے تم جا کر اس سے سویرا کو لے لو۔“

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ ”فتح خان اسے تم نے اغوا کیا ہے اور مجھے تم سے ہی چاہیے۔“

”میرا تلاشی لے لو میرے پاس نہیں ہے۔“ اس نے اٹھارہ ایسے انداز میں کہا۔ ”شہباز خان ہوش سے کام لو شہلا نے اس کا کیا کرنا ہے وہ اسے چھوڑ دے گا یا چھوڑ دیا ہوگا اس کا مجھے نہیں معلوم۔“

”وہ تمہارے حکم کے بغیر اسے نہیں چھوڑ سکتی۔“

”میں نے کل اسے بتا دیا ہے کہ ہیرا نہیں ملا اس لیے تمہارا اس کا راہ اب الگ ہے۔“

”اچھا مجھے اس کا پتا بتا دو میں خود....“

”نہیں فتح خان زبان دے چکا ہے شہلا کا پتا نہیں بتا سکتا تم خود تلاش کر لو۔“ وہ بولا اور رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”اب جاؤ رکو مت ورنہ میں کم سے کم ایک گولی تو مار دے گا۔ جیب مس شایہ ڈرائیو کر سکتا ہے یہ تم کو پہلے اسپتال لے جائے گا اور وہاں سے تمہیں پولیس لے جائے گا۔“

حالات نے ایک بار پھر مجھے فتح خان کے سامنے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے نہایت مکاری سے کام لیا تھا اور اس طرح سے وار کیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہیں تھا جب جیب یہاں رکی اور فتح خان کی آواز آئی تو میرا خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر اس کے قیدی بن گئے ہیں لیکن اس بار اس نے حکمت عملی بدل دی تھی۔ اس نے ہمیں جسمانی قیدی نہیں بنایا تھا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی گرفت میں آ گئے تھے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مجبور تھے۔ اسے بہر صورت ہیرے یا ان کی مالیت کی رقم درکار تھی اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد کو جانے کے لیے تیار تھا۔ ایمن بدستور تنویری کیفیت میں تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر جیب میں بٹھایا اور فتح خان سے کہا۔

”اب جیب کیسے اشارت کروں چاہی تو اول خان کے ساتھ ہی کھائی میں جا چکی ہے۔“

فتح خان ہنسا اور چابی میری طرف اُچھال دی۔ ”میں احمق نہیں ہے کہ اس سے چابی نہ لیتا۔“

”تم نے اسے کیوں مار دیا؟“

”بیکار تھا اس لیے ضائع کر دیا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ میں ایک بار پھر اندر سے سلگ اٹھا تھا وہ انسانی جان کے لیے یوں بات کر رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”فتح خان ہو سکتا ہے کبھی تم بھی کسی کے لیے بیکار چیز بن جاؤ۔“

وہ مکاری سے مسکرایا۔ ”تو بے شک ضائع کر دے مجھے۔ اب تم غور سے سنو اس لڑکی کو ایٹمی تک پہنچانا تمہارا کام ہے اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے۔ جتنا جلدی یہ اپنوں کے پاس جائے گا اس کا جان بچنے کا اتنا ہی امکان ہوگا۔“

”میں کس خوشی میں یہ کام کروں جبکہ تم میرے معاملے سے ہاتھ اٹھا چکے ہو؟“ میں نے سچی سے کہا۔

”ایمیں تمہارا بھی کچھ لگتا ہے۔ اس لیے تم یہ کام کرے گا۔ ویسے تمہارا مرضی ہے تم اسے یہاں چھوڑ جائے میں خود اسے ایٹمی تک پہنچا سکتا ہے۔ اب تم جیب میں بیٹھ کر چل دو تمہارے پاس وقت کم ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میرے پاس وقت کم تھا۔ میں پیچھے آیا اور جیب کی ڈرائیو تک سیٹ سنبھال لی۔ جب تک میں جیب اشارت کرتا اور فتح خان اتنی دیر میں درختوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ایمن کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر وہ اب بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اسے حوصلہ دینے کے لیے میں

ہنس۔ ”اس وقت تو اتنی بہادری سے جیکٹ پہن لی تھی اور اب یہ حالت ہو گئی۔“

اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ ”اس وقت میں تمہارے لیے فکر مند تھی مجھے لگ رہا تھا کہ فتح خان کہیں تمہیں گولی ہی نہ مار دے۔“

”تم نے بہت محنت دکھائی۔“ میں نے توجہ سامنے رکھتے ہوئے کہا، یہاں سڑک بہت تنگ اور خراب تھی۔ درحقیقت میں نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں تھا اور اس سڑک پر سفر کرتے رہنے کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا ہم یہاں رکے رہے اور فائرنگ بھی ہوئی مگر اس دوران میں یہاں کوئی اور گاڑی یا آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ شاید یہ مکمل طور پر ویران جگہ تھی۔ ممکن ہے آگے چل کر کوئی آبادی مل جاتی اور پھر میں درست راستے کا تعین کر سکتا۔ تو ملے تھا کہ اول خان ہمیں جان بوجھ کر اس راستے پر لایا تھا کیونکہ وہ ڈرائیور تھا اس لیے راستے کا تعین اس پر چھوڑ دیا گیا تھا اور اس نے نہ صرف ہمیں لا پھنسیا بلکہ اپنی جان سے بھی گیا مجھے افسوس انعام علی کا ہو رہا تھا جو اول خان کی سازش کی بھیجٹ چڑھ گیا۔ ان دونوں کی لاشیں یہاں بے گور و کفن پڑی تھیں اور انہیں ان کے لواحقین تک پہنچانا لازمی تھا لیکن میں راستے میں بھی راجا عمر دراز کے محل سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں عبداللہ ہی اس معاملے میں کچھ کر سکتا تھا۔

ایمن بولی۔ ”اول خان کی موت نے مجھے ہلا دیا تھا۔ فتح خان حد سے زیادہ سفاک ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اس نے بہت ترقی کر لی ہے خاص طور سے جب سے ڈیوڈ شا کے زیر سایہ آیا ہے۔“

”ڈیوڈ شا۔“ ایمن چونکی۔ ”شہباز کہیں یہ اس کی سازش تو نہیں ہے؟“

”ممکن ہے لیکن میرا خیال یہی ہے کہ فتح خان اصل میں ہیروں کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ اسے ہیرے نہیں ملے اس لیے وہ ان کے مساوی دولت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے یہ طریقہ کار استعمال کیا ہے۔ آج کل اس کا دماغ بہت شیطانی رفتار سے کام کر رہا ہے اور وہ مجھے بھی حیران کر رہا ہے۔ جیسے یہی اس جیکٹ کا خیال۔ اس نے شاید پہلے ہی ملے کر لیا تھا کہ وہ اگر ہیرے حاصل نہ کر سکا تو تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔ ممکن ہے اس صورت میں برٹ شاہی نہ مارا جاتا اور فتح خان تمہیں اسی طرح چھوڑ دیتا۔“

”شاید۔“ اس نے سرد آہ بھری۔ ”لیکن اب پاپا اس دنیا میں نہیں ہیں اور میں....“ اس نے جیکٹ کو ہاتھ لگایا جو

لباس تلے تھی۔ ”شہباز اگر برٹش حکومت تاوان دینے کو تیار نہ ہوگی تو سات دن بعد میرا جو داس دنیا میں نہیں ہوگا۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”یہ برٹش گورنمنٹ کی ساکھ کا معاملہ بھی ہے اس لیے میرا خیال ہے وہ فتح خان کو قہر ادا کر دے گی۔“

”اور اگر نہیں دی؟“

”تب بھی اس کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔“

”کاش ایسا ہو میرا سر چکر رہا ہے۔“ اس نے پشت سے سر نکالیا۔

”بہتر ہو گا تم آرام کرو، میں جلد از جلد اسلام آباد پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

ایمن نے سر ہلایا اور سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے سیٹ کو ذرا اچھا کیا۔ میں نے جیب کی رفتار تیز کی اب سڑک کشادہ تھی اور آس پاس دور پہاڑوں پر آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جلد مجھے سڑک کے ساتھ بھی کوئی آبادی یا بازار ملے گا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا کچھ دیر بعد سڑک کے ساتھ دکانیں اور مکانات نظر آنے لگے۔ موسم کی وجہ سے بیشتر دکانیں بند تھیں اور صرف ایک چائے خانہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس ہی جیب روکی اور انجن بند کر کے چابی سمیت نیچے اتر آیا۔ ایمن آنکھیں بند کر کے لٹکی تھی میں نے اسے ڈمٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جیب کے شیشے اس قسم کے تھے کہ باہر سے اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا اور دروازے لاک تھے اس لیے کوئی اندر نہیں آسکتا تھا۔

میں اتر کر چائے خانے میں آیا جو غیر معمولی طور پر آباد تھا۔ مقامی لوگ ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے چائے کے پیالے پر پیالے اٹھیل رہے تھے۔ اصل چیز گری تھی چاہے وہ چائے میں تھی یا چائے خانے میں تھی۔ وہاں دھواں بھرا تھا اس کے باوجود مجھے اندر آ کر بہت سکون ملا تھا ہر غضب کی سردی تھی۔ میرے لباس کی وجہ سے چائے خانے کے مالک نے مجھے خصوصی پروٹوکول دیا اور ایک غلیظ سطح والی میز پر میلا کپڑا مار کر اسے مزید غلیظ کر دیا۔

”بٹھو صاحب چائے نکالے۔“

”کیوں نہیں دوست۔“ میں بلا تکلف کری پر بیٹھ گیا تو اس کا چہرہ مکمل اٹھا تھا اس نے جلدی سے اپنا بہترین کپ نکالا اور چیلے سے اُبلتی چائے نکال کر اس میں چینی ملانے لگا لیکن میں نے منع کر دیا۔ ”شکر ہے دودھ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اسے دودھ پتی کہا جاتا۔ میں نے پہلا گھونٹ لے کر کہا۔“ میں اپنی بیوی کے ساتھ سوات سے اسلام آباد جا رہا ہوں لیکن شاید غلط

ستے پر آ نکلا ہوں کیا کوئی مجھے راستہ بتا سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں صاحب۔“ چائے خانے کا مالک کہیں سے ایک میلا لیکن بہترین قسم کا نقشہ نکال لایا اور اسے میز پر پھلا کر مجھے سمجھانے لگا کہ میں کس طرح جلد از جلد اسلام آباد پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے راستہ سمجھ لیا بلکہ سمجھ گیا لیا۔ اس سڑک سے نکلا تو باقی راستہ میرا جانا پہنچانا تھا اس پر درجنوں بار سفر کر چکا تھا بس اس سڑک پر پہلی بار آیا تھا۔ شکر ہے کہ ساتھ میں نے ایک نوٹ میز پر رکھا اور باہر نکل آیا۔ ایمن جاگ گئی تھی اور عقبی آئینے میں دیکھ کر بال بتا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے

ہال میں بیٹے اور بیٹہ سے پوچھی باندھ لی۔ اس کی ریشمی بال زیادہ لمبے نہیں تھے انہیں کھلا چھوڑتی تو مشکل سے شانوں سے نیچے آتے تھے۔ لیکن بہت گھنے اور ریشم کی سی نرمی اور ساخت لیے ہوئے تھے۔ مجھے سویرا کے اخرونی رنگ کے بال یاد آئے جو اتنے لمبے تھے کہ اس کی کمر سے بھی نیچے آتے تھے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ ایمن نے کہا تو میں چونکا

میں یہ ظاہر ایک تنگ اسے دیکھ رہا تھا حالانکہ میرا ذہن کہیں اور تھا میں نے مسکرا کر کہا۔

”دیکھ رہا ہوں اب تم زیادہ خوب صورت ہوتی جا رہی ہو۔“

”اچھا۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”مجھ میں کیا اچھا لگا؟“

وہ مغربی عورت تھی اور اگر میں اسے کھل کر بھی بتاتا کہ مجھے اس میں کیا اچھا لگ رہا ہے تو وہ بالکل بُرا نہیں مناتی اور اسے اپنے حسن کا خراج سمجھ کر قبول کرتی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ”سب کچھ۔“

”کیا سب کچھ؟“

”سب کچھ سے مراد سب کچھ ہی ہوتا ہے۔ یعنی تم میں کوئی کمی یا خرابی نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو وہ سمجھ گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہ رہا۔ اس لیے اس نے بات بدل دی۔

”راستہ معلوم کیا؟“

”ہاں بس یہی ایک راستہ ہے جو میرے لیے انجان ہے یہاں سے نکلیں گے تو پھر اسلام آباد تک میں آنکھ بند کر کے بھی ڈرائیونگ کر سکتا ہوں۔“

”ایسا مت کرنا۔“ وہ ہنسی۔ ”میں تمہیں زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میرا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو صرف مثال دے رہا تھا کہ راستے سے اتنا واقف ہوں۔“

میں نے جیب آگے بڑھا دی۔ ایمن اب بہتر نظر آ رہی تھی اس نے ابتدائی خوف پر خاصی حد تک قابو پالیا تھا۔ اس نے عقبی حصے میں دیکھا جہاں ایک ہاٹ پاٹ رکھا تھا اس کے ساتھ چائے اور کافی کے قہر ماس بھی تھے۔ دو بج رہے تھے اور اگر درمیان میں فتح خان والا معاملہ نہ آ جاتا تو اس وقت مجھے بھوک لگ رہی ہوتی۔ ایمن نے کھانے کا پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ ”نہیں تم کھاؤ میں ذرا دیر بعد کھاؤں گا۔“

”کافی نکال دوں۔“

”نہیں میں توجہ سے ڈرائیونگ کرنا چاہتا ہوں۔“

سڑک ایک بار پھر تنگ اور موڑ والی ہو رہی تھی۔ یہ بڑی اونچی پُر پیچ پہاڑیاں تھیں جن سے گزرتی سڑک بھی بار بار گھومنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ یہاں ذرا سی بے پروائی حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔ میں پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ایمن کھانے بننے میں مصروف تھی مجھے ایک بار پھر اس کے اعصاب کی مضبوطی پر حیرت ہوئی۔ اگر کوئی عام عورت ہوتی تو اس وقت اس پر فحشی یا ہسٹریا کے دورے پڑ رہے ہوتے۔

اسے بھی شروع میں سکوت ہوا تھا لیکن اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور سکون سے سینڈو چز کھا رہی تھی۔ ایسا لگا جیسے اس نے بارود کی جیکٹ کو اپنا لباس سمجھ کر قبول کر لیا ہو۔ سینڈو چز کھا کر اس نے اپنے لیے کافی نکالی اور میری طرف دیکھا۔

”شہباز میرا خیال ہے اس معاملے میں تمہارا سامنے آنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ میں پولیس کو اور اس سے بھی زیادہ مرشد کو مطلوب ہوں اس لیے میرا منظر عام پر آنا مناسب نہیں ہوگا دوسرے اگر میں تمہارے ساتھ تھی ہوا تو ممکن ہے اس سے تمہارا یہ معاملہ کوئی اور رخ اختیار کر جائے۔

میرا خیال ہے ڈیوڈ شا اس معاملے میں اپنا اثر بھی استعمال کرے گا کہ تاوان کی ادائیگی نہ ہونے پائے۔“

”اسے کیسے پتا چلے گا؟“

”اسے معلوم ہو جائے گا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ اس خطے میں مغربی طاقتوں کا ایجنٹ ہے اور کچھ مخصوص مقاصد کے تحت یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔“

”مجھے یاد ہے لیکن میں نے کبھی اس بارے میں غور نہیں کیا۔“

”اس کے یہاں تعلقات بھی ہیں اور برٹش حکام پر اثر بھی رکھتا ہے اس کے لیے معلوم کرنا دشوار نہیں ہوگا۔ کم سے کم اسے برٹ شا کی موت کی اطلاع ضرور ملے گی اور وہ لازمی

مئی 2012ء

ماہنامہ سرگزشت

213

ماہنامہ سرگزشت

212

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

ماہنامہ سرگزشت

یہاں سے معلومات حاصل کرے گا۔ پورا امکان ہے کہ تمہارا معاملہ بھی اس کی نظر میں آجائے گا۔ اس کے بعد وہ اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ ”ہو سکتا ہے۔“ اس نے تسلیم کیا۔ ”واقعی وہ مجھ سے چھٹکارے کے لیے تاوان کی ادائیگی کی مخالفت کرے گا۔ اس طرح پایا کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی نجات مل جائے گی اور وہ بدستور جاگیر اور خطاب پر قابض رہے گا۔“

”جاگیر کی مالیت کیا بنتی ہے؟“

”جاگیر اور پٹیل ہی تقریباً بیس ملین پاؤنڈز مالیت کے ہیں۔“ ایمن نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اور میں چالیس ہزار پاؤنڈز سالانہ کی ملازمت کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے پاس لندن میں کرائے کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے۔“

میں نے اسے تسلی دی۔ ”فکرمات کرو اس مسئلے سے نمٹ لیں اس کے بعد تمہاری جاگیر کا بھی کچھ کرتے ہیں۔ اب ڈیوڈ شا اس پر اتنی آسانی سے قابض نہیں رہ سکے گا۔“

اس نے سر آہ بھری۔ ”کاش ایسا ہی ہو، مجھے جاگیر کی اتنی پروا نہیں ہے لیکن میں اسے ڈیوڈ شا کے قبضے میں بھی نہیں دیکھ سکتی ہوں۔“

”تمہیں معلوم ہے ڈیوڈ شانے مجھے ایک پیشکش کی تھی اور میں اسے قبول کرنے پر مجبور بھی ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے آدی نے بد عہدی کی اور اس کی وجہ سے میں ڈیوڈ شا کے معاہدے سے آزاد ہو گیا۔“

”کیسا معاہدہ؟“

”ڈیوڈ شانے میری مرشد سے دشمنی ختم کرانے کا معاہدہ کیا اور اس کے بدلے مجھے اس کے ساتھ مالیائی وادی تک جانا تھا۔ جس کا بھی تمہارے دادا ولیم شانے سفر کیا تمہارا جاعمر دراز کے ساتھ۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”ڈیوڈ شا کے دماغ میں بھی خاندانی پاگل پن آ گیا ہے۔ مجھے تو یہ وادی کا چکر دیوانگی ہی لگتا ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں تم سے متفق ہوں اگر مالیہ میں کچھ لوگ ساری دنیا سے الگ ایک جگہ سکون سے بیٹھے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ ان کو زبردستی باقی دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ اس سے کئی طرح کی بین الاقوامی مسائل بھی کھڑے ہو سکتے ہیں کیونکہ صرف چین اور بھارت کے درمیان کئی ہزار میل تنازعہ سرحد ہے اور مغربی طاقتیں ان دونوں ممالک کو لڑا کر اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ممکن ہے وادی کی دریافت دونوں ملکوں میں موجود تنازعے کو جنگ کی حد تک

لے جائے۔“

ایمن نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”تم اس معاملے کو اتنی گہرائی سے دیکھتے ہو؟“

”ہاں کیونکہ میں دونوں ممالک کی باہمی آویزش خود دیکھ اور بھگت چکا ہوں۔ یہ ایک لاوا ہے جو اندر ہی اندر پک رہا ہے اور بانی دنیا کو اس کا عکس اس وقت ہوگا جب یہ پھٹ پڑے گا۔“ میں نے کہا اور ایمن کو بھارت اور پھر چین میں گزارے وقت کے بارے میں مختصر بتایا۔ ایمن حیرت زدہ سی بن رہی تھی۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔

”میرا خدا یہ تو لگ رہا ہے جیسے میں جیس بائبلزم کا کوئی منظر بن رہی ہوں۔“

میں نے اسے بھارتی فوج کے ساتھ کشمکش کے واقعات تو سنائے ہی نہیں تھے ورنہ وہ ماننے سے انکار کر دیتی۔ وہ واقعات ایسے تھے کہ اب میں سوچتا ہوں تو خود مجھے خواب جیسے لگتے ہیں۔ میں نے ایمن کو بریف کیس کے بارے میں نہیں بتایا تھا یہ اس کے لیے غیر متعلق چیز تھی اس لیے تذکرہ فضول تھا۔ بریف کیس اور سویرا دونوں شہلا کے پاس تھے اور میرا اپنے ساتھیوں سے رابطے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا تھا میں جس آبادی میں رکھا تھا وہاں نہ تو بجلی تھی نہ فون اور نہ ہی کوئی دوسری سہولت تھی۔ لازمی بات ہے جب بجلی ہی نہیں ہے تو موبائل سروس بھی دستیاب نہیں ہوگی اب مجھے آگے جا کر ہی ایسی جگہ ملے گی جہاں فون یا موبائل سروس ہوتی۔

اس دوران میں اس تنگ اور انجانے راستے سے نکل کر میں اپنے جانے پہنچانے راستے پر آ گیا تھا۔ یہاں سے اسلام آباد کا سفر تقریباً پانچ گھنٹے کا تھا اور اس وقت تین بج رہے تھے تقریباً تین گھنٹے بعد یہاں روشنی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی، لیکن اس سے آگے سفر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کیا جا سکتا تھا۔ ایک جگہ دس منٹ کے لیے رک کر میں نے پیٹ پوجا کی اور تقریباً ٹھنڈی ہو جانے والی کافی پی اور آگے روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے مزید سفر کے بعد مجھے پہلی آبادی ملی جس میں بجلی اور فون کی سہولت موجود تھی۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک پی سی او بھی کھلا دکھائی دیا تھا۔ میں نے جیب اس کے سامنے روک دی۔ پی سی او کے مالک نے چارج ریٹ لگا رکھے تھے جو تارل سے کئی گنا زیادہ تھے۔ بہر حال وہ دور دراز ہونے کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ میں نے اسے عبداللہ والی کوٹھی کا نمبر دیا اور اس نے نمبر ملا کر ریسیور مجھے تھما دیا۔ دوسری بیل پر کسی نے کال ریسیو کی۔ میں نے کہا۔

”عبداللہ سے بات کراؤ۔“

”آپ کون ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”یہ میں عبداللہ کو بتاؤں گا تم کہہ دو کہ ہاتھ والا فون پر آ۔“

عبداللہ جانتا تھا کہ ہاتھ والا میں ہوں میرا ہاتھ حکیم لاؤس کے علاج سے بچ گیا تھا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ لاؤس پر تھا وہ ڈوڑتا ہوا آتا تھا اس کی سانس پھولی ہوئی تھی لیکن اس نے میرا نام لینے سے گریز کیا۔ ”آپ.... کہاں ہیں؟“

”فی الحال راستے میں ہوں اور تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ یہ سناؤ کہ وہاں کیا احوال ہے؟“

”آپ کے لیے خوشخبری ہے۔“ عبداللہ کے لہجے میں چمک تھی۔ ”بھائی مل گئی ہیں۔ یہیں کوٹھی میں ہیں۔“

”شکر اللہ کا۔“ میں نے سکون کا طویل ترین سانس لیا۔ ”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں مسئلہ نہیں ہوا باقی آپ آئیں گے تو معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں تقریباً پانچ گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔ دوسروں کے ساتھ مجھے وہیں ملنا جہاں مجھے گورے کے آدمیوں سے چھڑایا تھا۔“

”سمجھ گیا جناب۔“ عبداللہ نے کہا اور میں نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ اگرچہ کوٹھی کے فون محفوظ تھے لیکن احتیاط لازمی تھی۔ پی سی او کا مالک مجھے ڈرائنگ سے دیکھ رہا تھا کیونکہ میں نے تقریباً ساری ہی گنگو گول سول انداز میں کی تھی۔ مگر مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی مجھے خوشخبری ہی اتنی بڑی ملی تھی۔ سویرا فتح خان اور شہلا کی قید سے نکل آئی تھی۔ میں پی سی او والے کو ادائیگی کر کے واپس آیا تو ایمن میرے چہرے سے بھانپ گئی۔

”لگتا ہے اچھی خبر ہے؟“

”ہاں سویرا مل گئی ہے اور اب محفوظ جگہ ہے۔“ میں نے چمک کر کہا تو میرے والہانہ انداز پر اس کا رنگ ایک لمحے کو بدل گیا لیکن فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ”مبارک ہو یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“

”ہاں ایک مسئلہ تو حل ہوا مگر تمہارا مسئلہ ابھی باقی ہے۔“

”تم میری فکر مت کرو، میرا مسئلہ حل ہو جائے گا اور اگر نہ ہوا تو....“ اس نے جان کر بات آدھوری چھوڑ دی۔ ”ایسا نہیں ہوگا ایمن۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”بے شک فتح خان ہیروں کے پیچھے پاگل ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ اپنے پیچھے ہمیشہ کے لیے دشمن لگا لے۔ وہ اچھی

طرح جانتا ہے کہ اس کی وجہ سے میرے کسی بھی ساتھی کو ذرا نقصان ہوا تو میں ساری زندگی اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس مسئلے کا کوئی درمیانی حل نکل آئے گا۔“

”درمیانی حل؟“ اس نے میری طرف دیکھا۔

”ممکن ہے فتح خان تاوان کی رقم کو نیچے لے آئے یا کوئی اور راستہ نکل آئے۔“

”تاوان کی رقم سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اگر برٹش حکومت نے اسے اتنا کا مسئلہ بنالیا تو وہ پانچ ڈالرز تاوان بھی نہیں دے گی۔ خاص طور سے ایسا کوئی مسئلہ میڈیا میں آجائے تو حکومتیں اسے اتنا کا مسئلہ بنالیتی ہیں اگر خاموشی سے معاملہ نمٹ رہا ہو تو مان جاتی ہیں۔“

ایمن ٹھیک کہہ رہی تھی اگر ایسے معاملات اندرون خانہ ملے ہو جائیں تو حکومتیں آسانی سے تاوان ادا کر دیتی ہیں لیکن بات کھل جائے تو پھر معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ یہاں بات عزت اور ساکھ کی آجاتی ہے اور ایسے مواقعوں پر حکومتیں اپنے شہریوں کو قربان کر دیتی ہیں۔ میں نے کہا۔ ”اگر ڈیوڈ شا درمیان میں آیا تو امکان ہے کہ معاملہ خاموشی سے ملے نہیں ہوگا۔ وہ اسے کسی طریقے سے پک بھی کر سکتا ہے۔“

ایمن نے گہری سانس لی۔ ”شہباز مجھے سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا ہے وہ میرا دشمن بنا ہوا ہے۔“

مجھے ایک خیال آیا۔ ”ایمن تم فکر مت کرو امید ہے کہ ڈیوڈ شا ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے بات کرے گا۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”تم سے کیا بات کرے گا وہ؟“

”بس کرے گا ابھی میں وضاحت نہیں کر سکتا کیونکہ خود میرے ذہن میں بھی واضح نہیں ہے۔“

لیکن ایمن سچ بہت ذہین لگی وہ سمجھ گئی۔ ”شاید تم ڈیوڈ شا سے ہونے والی ڈیل کی طرف اشارہ کر رہے ہو۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تم سے دوبارہ ڈیل کی بات کرے گا۔“

”اور ممکن ہے وہ تم سے جاگیر اور خطاب سے مستقل دست برداری کا معاہدہ بھی کر لے کیونکہ یہ اب اس کی عزت کا معاملہ بھی بن گیا ہوگا۔ اگر اس سے جاگیر اور خطاب چھین گیا تو وہ سوسائٹی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ دوسری بات فتح خان اس کے لیے کام کرتا رہا ہے اور ڈیوڈ شا اس پر اتنا اثر رکھتا ہے کہ یہ مسئلہ حل کرادے۔ اگر وہ فتح خان کو حکم دے گا تو اس میں انکار کی مجال نہیں ہوگی۔“

ایمن حیران ہوئی تھی۔ ”فتح خان اس سے اتنا دہ

ہے؟“

”فرض کرو کہ اگر ڈیوڈ شام سے معاہدہ کرنا چاہے کہ تم اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو جاگیر اور خطاب سے دست بردار ہو جاؤ تو تمہارا کیا رد عمل ہوگا؟“

”جاگیر اور خطاب واپس حاصل کرنا میری بھی خواہش ہے لیکن فی الوقت میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اگر وہ مجھ سے جاگیر اور خطاب سے دست بردار ہونے کو کہے گا تو میرے پاس اس کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔“

”مگر اس معاملے میں غلط رہنا میرا خیال ہے ڈیوڈ شام دے دیے تو بڑا بادل قاربتا ہے لیکن موقع کی مناسبت سے اپنی بات سے پھر جانا اس کے لیے انوکھی بات نہیں ہوگی۔“

”تم نے اسے بالکل ٹھیک پہنچانا ہے شہباز وہ ایسا ہی ہے اس کے قول و فعل پر ذرا بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

”بہر حال یہ معاملہ اس وقت دیکھا جائے گا جب ڈیوڈ شام اس میں ملوث ہوگا۔“

پیٹ بھرنے کے بعد ایمین کو اگٹھ آنے لگی تھی دوران گفتگو ہی اس کی آنکھیں خمار آلود ہونے لگی تھیں۔ میں نے اسے آرام کرنے کو کہا اور خود ڈرائیو پر توجہ دینے لگا۔ بعض مقامات پر سڑک کھلی اور سیدھی ہو جاتی تھی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں تیز ڈرائیو بھی کر رہا تھا لیکن اتنی تیز بھی نہیں جس میں حادثے کا خطرہ ہو۔ پانچ بجے کے بعد اندھیرا چھانے لگا تھا اور ہم مری کے پاس تھے۔ ایک ہوٹل پر راک کر جو برف باری کا سیزن دکھانے کے لیے کھلا تھا ہم نے چائے پی اور منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوئے تھے۔ حیرت انگیز طور پر ہوٹل پوری طرح بک تھا جب سے اس علاقے میں سڑکوں کا نظام بہتر ہوا تھا مری اور اس کے آس پاس مل اسٹیشن پر تقریباً سارے سال رش رہنے لگا تھا۔ یہاں بھی برف باری ہوئی تھی بلکہ آسمان پر بادل تھے اور شاید مزید برف گرنے والی تھی۔ تازہ دم ہو کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ ایمین نے اصرار کیا کہ وہ ڈرائیو کر لیتی ہے میں تھک گیا ہوں لیکن میں نے منہ نہ منا کر دیا۔

”میں ٹھیک ہوں تم فکر مت کرو۔ ویسے بھی کچھ دیر کا سفر رہ گیا ہے ہم شاید ایک گھنٹے بعد اسلام آباد میں ہوں گے۔“

آدھے گھنٹے بعد ہی اوپر سے اسلام آباد اور پنڈی کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ درمیان میں مارگھ آیا تو یہ روشنیاں چھپ گئیں۔ ساڑھے سات بجے ہم راول چوک کے پاس تھے۔ مجھے امید تھی کہ عبداللہ اور میرے دوسرے ساتھی راول جمیل کے اس کنارے موجود ہوں گے جہاں

مارشل مجھے مرشد کے آدمیوں کے حوالے کرنے کے لیے لایا تھا۔ راول چوک سے میں اس طرف مڑا تو ایمین چوٹک گئی۔ ”اس طرف کہاں جا رہے ہو؟“

”ایمین تمہیں جلد از جلد سفارت خانے پہنچانا ہے تاکہ برٹش حکام اس مسئلے کا حل نکالیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم انہیں کیا کہانی سناؤ گی؟“

”بہت سادہ کہانی ہوگی۔ فتح خان نامی بد معاش نے مجھے دھوکے سے میرے باپ کا حوالہ دے کر انگلینڈ سے بلایا اور یہاں بلا کر میری مدد سے میرے باپ سے ہیرے

نکلوانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں میرا باپ اپنی جان سے گیا تو اس نے رقم حاصل کرنے کا یہ دوسرا طریقہ سوچا اور مجھے بارودی جیکٹ پہنا کر چھوڑ دیا۔“

”مناسب کہانی ہے“ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن اس کی جزئیات کا خیال رکھنا ممکن اسکاٹ لینڈ یا کسی دوسری انجینی کے اہلکار تم سے پوچھ گچھ کرنے آجائیں۔“

”اس کی فکر مت کرو کہانی بنانی مجھے آتی ہے اس میں کسی غیر متعلق فرد کا ذکر نہیں آئے گا۔ تم بھول رہے ہو کہ میں بنیادی صحافی ہوں اور کہانی بنانا مجھے آتی ہے۔“

”واقعی میں بھول گیا تھا۔ اصل میں ہمارے ہاں صحافیوں کی بس ایک ہی قسم ہوتی ہے اور ہم ان کے سوا کسی کو صحافی نہیں سمجھتے۔“

”مغرب میں ماحولیاتی صحافیوں کا رتبہ بڑا ہوتا ہے جہاں عام صحافی قدم بھی نہیں رکھ سکتا ہے وہاں ہم بڑی آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ مخصوص قوانین کے تحت ہمیں سرکاری دستاویزات تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔“

ہم جمیل کے پاس پہنچ گئے تھے۔ رات ہونے پر جمیل کے پانی سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ سردی کی بنا پر جبک سنسان تھی۔ ورنہ گرمیوں میں یہاں شام کے وقت بھی خاصی روشنی ہوتی ہے۔ میں نے جیب ایک نمایاں جگہ روکی اور اس کی ہیڈ لائٹس جلتے چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ رات چھا چکی تھی اور ابھی دھند کا آغاز تھا اس لیے میں دور سے بھی دیکھا جاسکتا تھا مزید نمایاں ہونے کے لیے میں ہیڈ لائٹس کے سامنے آگیا اور اس کا فوری رد عمل ہوا۔ کہیں پاس سے ہی ایک گاڑی اشارت ہوئی اور تیزی سے جیب کے پاس آ کر رکی اور اس سے وسیم اور سفیر اتر کر میری طرف جھپٹے اور پھر دونوں بیک وقت لپٹ گئے۔

”بد معاش..... غائب ہونے کے عادی مجرم۔“ سفیر نے مجھے مکارا۔ وسیم ہنستے ہوئے بولا۔

”میں اس جیسی بے تکلفی نہیں دکھا سکتا لیکن جذبات مہرے بھی کم نہیں ہیں۔“

”ہاں بھائی دھکے کھا کر آنے والے کو تم لوگ بھی مار دو۔“ میں نے سرد آواز بھری۔ ”لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ عبداللہ کہاں ہے؟“

”آج او یار یہ تمہارے فراق میں تڑپ رہا ہے۔“ سفیر نے بلند آواز سے کہا تو ایک طرف سے رائفل بدست عبداللہ آگیا۔ وہ آواز میرے گلے لگ گیا۔

”آپ کو ٹھیک دیکھ کر خوشی ہوئی۔“

”لیکن سب ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے پہلے تو راجا صاحب کو اطلاع دینی ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ جو محافظہ روانہ کیے تھے ان میں سے ایک غدار لگا اور اس نے دوسرے کو مروا دیا وہ فتح خان کے لیے کام کر رہا تھا۔“

”فتح خان۔“ وہ تینوں چوٹکے وسیم نے کہا۔ ”یہ حرازدہ کہاں سے آگیا؟“

”آپ نہیں گیا میں مستقل اسی کی قید میں تھا اور صرف دو دن پہلے مجھے راجا صاحب کے آدمیوں نے آزاد کرایا تھا۔ وہ مجھے اور مہر کو اس وادی کی طرف لے گیا تھا جہاں برٹش شام نے ہیرے چھپا رکھے تھے۔ صرف ہیروں کے حصول کے لیے اس نے سویرا کو جو جلی سے انگو کیا۔“

”ہم نے اسے شہلا سے حاصل کر لیا ہے لیکن وہ خود فرار ہونے میں کامیاب رہی۔“ سفیر نے کہا۔

”مجھے عبداللہ سے پتا چل گیا ہے۔ بہر حال فتح خان برٹش شام کو بھی لے آیا اور اس نے دھوکے سے ایمین شا کو انگلینڈ سے بلوایا مقصد برٹش شام پر دباؤ ڈالنا تھا۔ مگر ایک موقع پر برٹش شام کو اس کے ساتھی نے گولی مار دی اور فتح خان ناکام رہا پھر راجا صاحب کے آدمیوں نے ہمیں آزاد۔۔۔

کر لیا۔ فتح خان نے ہمارے مالی اور جب میں اور ایمین یہاں آنے کے لیے نکلے تو اس نے راستے میں راجا صاحب کے غدار کی مدد سے ہمیں ٹریپ کر لیا اور پھر ایمین کو بارودی جیکٹ پہنا دی۔ اس وقت وہ میرے ساتھ ہے اور اسے سامنے آئے ہنیر برٹش ایمین تک پہنچانا ہے۔“

”میرے خدا۔“ عبداللہ کے منہ سے نکلا۔

”اس معاملے میں وقت محدود ہے کیونکہ جیکٹ نہایت ہمدرد قسم کی ہے اسے نہ تو کسی اور طریقے سے کھولا جاسکتا ہے نہ اس کا ٹکڑے لیا جاسکتا ہے اور نہ کسی اور طریقے سے اس کا اندر سے معائنہ کیا جاسکتا ہے۔ سات دن بعد یہ خود بہ خود

بلاست ہو جائے گی۔“

”پھر یہ کیسے اترے گی؟“ سفیر نے پوچھا۔

میں نے جیکٹ کو ناکارہ کرنے والا ریموٹ دکھایا۔ ”فتح خان کا کہنا ہے کہ اسے پانچ کروڑ ڈالر ادا کر دیے جائیں تو وہ اس ریموٹ کا کوڈ نمبر بتا دے گا نمبر دبا کر ریموٹ کا سرخ بٹن دہانے سے جیکٹ ڈی ایکٹیو دیت ہو جائے گی اور اسے اُتارا جاسکے گا۔“

”پانچ کروڑ ڈالر۔“ سفیر نے کہا۔ ”اس کا دماغ خراب ہے؟“

”لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔“ میں نے کہا اور جیب کی طرف دیکھا۔ ”اب ایمین کو اس طرح سفارت خانے پہنچانا ہے کہ کوئی اسے کسی غیر متعلق آدمی کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ یعنی اس سے ہمارا ذرا سا تعلق بھی ثابت نہ ہو۔“

”میں سمجھ گیا۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”اس کا سب سے آسان طریقہ ہے کہ مس ایمین کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جہاں سے یہ سفارت خانے سے رابطہ کر سکے اور وہ خود آ کر اسے لے جائیں۔“

”یہی مناسب ہوگا۔“ میں نے کہا۔ اس دوران....

ایمین بھی اتر کر نیچے آگئی۔ سب نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے باپ کی موت کا افسوس کیا اور اس مشکل پر بھرپوری کا اظہار کیا۔

”میں تم سب کی شکر گزار ہوں۔“ ایمین نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ ”میں ایمین تک چلی جاؤں گی بس تم مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دو جہاں میں فون پر رابطہ کر سکوں۔“

”اتفاق سے ہم بھی یہی سوچ رہے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم تمہیں اکیلا چھوڑیں گے لیکن تم سے دور نہیں رہیں گے جب تک تم محفوظ ہاتھوں میں نہیں پہنچ جاتیں۔“

ایمین نے سر ہلایا۔ فیصلہ ہوتے ہی ہم وہاں سے واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ عبداللہ، سفیر اور وسیم کے ساتھ مزید کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک گاڑی میں آئے تھے۔ ایک معروف جگہ پہنچ کر ہم نے ایمین کو اُتار دیا اور اس نے ایک ٹیکسی کی۔ جب وہ ٹیکسی روانہ ہوئی تو میری جیب اور سفیر کی گاڑی اس کے پیچھے تھی۔ ایمین ٹیکسی میں جناح سہر پہنچی۔ وہاں اس نے ایک گارمنٹ سینٹر کے سامنے ٹیکسی روکوائی اور اتر کر اندر چلی گئی۔ اس کے پاس مقامی کرنسی تھی۔ اسے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہم بھی کچھ دور رک گئے تھے۔ سفیر میرے پاس آگیا۔ وہ کہانی سننے کے لیے بے چین تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

منی 2012

217

ماہنامہ سرگزشت

منی 2012

216

ماہنامہ سرگزشت

منی 2012

منی 2012

منی 2012

منی 2012

منی 2012

”مجھے معاف کر دیجئے سے ڈرائیونگ کر رہا ہوں اور کہانی ایک ہی بار سناؤں گا۔ ہاں تم بتاؤ کہ سویرا تک رسائی کیسے حاصل کی؟“

”تمہارے عائب ہوتے ہی ہم نے شہلا کی تلاش شروع کر دی تھی۔ پھر عبداللہ کہیں سے ایک ہونق نوجوان کو پکڑ لایا جس کا وزن پچاس کلو گرام ہو گا اس میں نصف وزن اس کے بالوں اور عینک کا ہے۔ لیکن وہ کمپیوٹر مینس ہے۔ اسے تم عرف عام میں ہمکڑ کہہ سکتے ہو۔ اس نے شہلا کے بینک اکاؤنٹ کا نمبر اور پھر اس کا کریڈٹ کارڈ نمبر حاصل کر لیا۔ وہ جان لیتا تھا کہ کریڈٹ کارڈ کہاں استعمال ہو رہا ہے۔ دو تین بار شہلا نے ایک ہی جگہ اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کیا تو ہم ٹھنک گئے اور اس سپراسٹور کی نگرانی شروع کر دی۔ جلد شہلا وہاں پھر آئی اور ہم نے اس کے ٹھکانے کا پتا چلا لیا۔ یہ کل رات کی بات تھی۔ صبح وسم اور عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سمیت وہاں چھاپہ مارا اور سویرا مل گئی لیکن شہلا فرار ہونے میں کامیاب رہی۔“

”لعنت بھیجو اس پر، اس عورت سے دور رہنا ہی اچھا ہے ہماری قید میں ہوتے ہی ہمارے لیے مصیبت بنتی ہے۔“

”بھائی عورت نام ہی مصیبت کا ہے۔“ سفیر ہنسنا۔ ”بجال ہے صبح سے جولفت کرائی ہو، دونوں سویرا کے ساتھ لگی ہیں۔“

”تو بیٹے سویرا کا احسان مانو کہ کچھ دیر کے لیے جان چھڑا دی۔“ میں نے کہا پھر ہچکچا کر پوچھا۔ ”وہ ٹھیک تو ہے نا اسے کوئی تکلیف تو نہیں دی ان لوگوں نے؟“

”سفیر ہنسنا۔“ بیٹے تو بھی کم زن مرید نہیں نکلے گا ابھی سے اس کی گنتی لکھ رہی ہے تجھے؟“

”تو کیا نہیں ہو گی فکر۔“ میں نے بتا کر کہا۔ ”وہ فتح خان جیسے دشمن کی قید سے آئی ہے۔“

”اچھا نا... ٹھیک ہے پر فی الحال بھابی کا لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”کیونکہ ابھی وہ بھابی بنی نہیں ہے۔“ میں نے ملاحت سے کہا۔ ”یہ بتا کہ شہلا کے ٹھکانے پر بریف کیس ملایا نہیں؟“

”نہیں بریف کیس وہاں نہیں تھا حالانکہ ہم اس کے چکر میں پورا ایک گھنٹہ وہاں رکے تھے۔“

”یعنی وہ شہلا کے قبضے میں ہے؟“ میں نے کہا اور اسی لمحے میری توجہ گارمنٹ اسٹور کے سامنے رکنے والی ایک سیاہ اور بڑی لکڑی گاڑی کی طرف گئی اس سے دو سفید فام اترے اور کسی طرف دیکھے بغیر سیدھے اسٹور میں چلے گئے۔

چند منٹ بعد وہ ایمن کو لیے اندر سے برآمد ہوئے اور اسے گاڑی میں بٹھا کر رخصت ہو گئے۔ مجھے ایک لمحے کو بے چینی ہوئی تھی لیکن پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ ایمن کے لیے یہی بہتر تھا۔ اس کے اپنے اسے بہتر تحفظ دے سکتے تھے۔ وہ جس مشکل میں پھنس گئی تھی اس میں سے یہی لوگ اسے نکال سکتے تھے بس ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں ڈیوڈ شامعالے میں نہ کود پڑے۔ وہ اسے بگاڑ کر رکھ دیتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ موت ہی ایمن کا مقدر بن جاتی۔ یہی سوچ کر میں ہچکچا گیا تھا۔ سفیر نے میرا خیال بھانپ لیا اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”پریشان مت ہو پار یہ گورے بڑے حرامی ہوتے ہیں اس مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔“

”مجھے خوف ہے کہ ڈیوڈ شامعالے میں آگیا تو ایمن کے لیے اچھا نہیں ہو گا کیونکہ برٹ شا کی لاش ملنے سے جاگیر اور خطاب اس سے چھین جانے کا امکان ہے۔ گویا ایمن اس کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے بہر صورت چھٹکارا حاصل کرنا چاہے گا۔“

”میرا نہیں خیال کہ وہ اتنی آسانی سے کچھ کر سکے گا۔“ سفیر نے کہا۔ ”بے شک وہ برطانیہ کا ایجنٹ ہے لیکن وہاں رول آف لاء ہے اور اس سے ہٹ کر تو کچھ نہیں ہوتا۔“

”خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں ڈیوڈ شامعالے کو پبلک نہ کر دے اس صورت میں برٹس حکومت پر دباؤ آ جائے گا کہ وہ تاوان ادا نہ کرے کیونکہ یہ قوم کی عزت کا معاملہ ہے اور جہاں قوم کی بات آ جائے وہاں عام طور سے فرد واحد قربان ہو جاتا ہے۔“ میں نے اسے اصل خدشے سے آگاہ کیا۔

”دیکھتے ہیں بھابی ابھی تو سات دن ہیں کیا سات دن تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔“ سفیر نے کہا تو میں چونکا اور گاڑی اشارت کر دی۔

”آج کل کہاں بسیرا ہے؟“

”عبداللہ کی کوٹھی میں کیونکہ جناب کے اغوا کے بعد ہمیں وہ ٹھکانہ بھی مشکوک لگنے لگا تھا۔ اس لیے اسے خالی کر دیا۔ ویسے وسم نے جی ٹی روڈ پر ایک فارم ہاؤس کرائے پر لے لیا ہے۔ کوئی چھ کنال کا ہے، اس میں تین بیڑ کی چھوٹی سی کوٹھی بھی ہے۔ ایک چوکیدار ہے۔ دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے اس لیے چھپنے کے لیے بہترین جگہ ہے اور پھر روڈ کے بالکل ساتھ ہے اس لیے آنے جانے میں بھی سہولت رہے گی۔“

”تو اس میں منتقل کیوں نہیں ہوئے؟“

”آج ہونے کا ارادہ تھا لیکن پتا چلا کہ جناب کی تحریف آوری ہو رہی ہے اس لیے ارادہ کل تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ اب تم ہی فیصلہ کرو گے۔“

وسم اور عبداللہ دوسری گاڑی میں بیچھے تھے۔ بیس منٹ بعد ہم کوٹھی پر تھے۔ اندر آتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہوئی تھی۔ مونا اور سعد یہ باہر آگئی تھیں۔ اترتے ہی انہوں نے دونوں طرف سے دبوچ لیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”آرام سے... آرام سے اصل بندے دوسری گاڑی میں ہیں آپ نے غلط بندہ پکڑ لیا ہے اور کمال ہے دونوں نے پکڑ لیا ہے۔“

”بات مت کرو۔“ مونا روہانے انداز میں بولی۔ ”کتنا تنگ کرتے ہو ہمیں۔“

”ارے تو کیا میں نے کہا تھا آئیل مجھے لے جا۔“ میں نے کہا۔ ”دوسرے میں چوڑیاں پہن کر تمہاری طرح گھر تو نہیں بیٹھ سکتا۔“

”بے چارے کو اندر تو آنے دو۔“ وسم نے اپنی بیگم سے کہا جو صرف رو رہی تھی۔ یوں میری گلو خلاصی ہوئی اور ہم اندر آئے میرا خیال تھا کہ سویرا اندر موجود ہو گی لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ سفیر میری بے چینی بھانپ گیا۔

”کیا بات ہے دوست یہ نظر کس کو تلاش کر رہی ہے۔“

”کسی کو نہیں۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔

”مونا نے سفیر کو گھورا۔“ تمہیں کیا اگر شوبی کسی کو تلاش کر رہا ہے ہو گا کوئی ایسا اپنا جو ہم سے بھی زیادہ اپنا ہو۔“

”میں نے سر پکڑ لیا۔“ یہاں آ کر غلطی کی، رہتا فتح خان کی قید میں تو زیادہ سکون سے رہتا۔“

”بھئی تم سب ان کے پیچھے نہ پڑو، آپ میرے ساتھ آئیے۔“ سعد یہ نے حقیقی ہمدرد کا کردار ادا کیا اور میں فوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک کمرے تک لائی اور مسکرا کر بولی۔

”یہاں ہیں وہ محترمہ جنہیں آپ یہاں وہاں تلاش کر رہے تھے۔“

”برٹس یونٹ۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور دروازے پر دستک دی۔ جب کوئی جواب نہیں ملا تو میں کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سعد یہ جا چکی تھی۔ میں نے دروازہ بند کیا تو آئینے کے سامنے کھڑی سویرا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر جیسے اڑ کر آئی تھی۔ ایک رنگ خوشبو کا جہاں تھا جو میرے بازوؤں میں سمٹ آیا اور اس کے آنسو میرا سینہ بھگو رہے تھے۔ میں نے پیار سے اس کے بال سہلائے۔

”تم ٹھیک ہو نا انہوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی؟“

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ”اس سے زیادہ تکلیف کی بات اور کیا ہوتی کہ میں آپ سے دور گئی اور آپ بھی ان کے قیدی تھے۔“

”شکر ہے اللہ کا میں تمہیں اپنے سامنے صبح سلامت دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے اسے الگ کیا۔ وہ میرے لیے مقدس ہستی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اتنے قریب سے میرے اندر اس کے لیے ذرا سا بھی کوئی جذباتی خیال آئے۔ اس نے سردی کی مناسبت سے ہلکی سبز ویلٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ ذرا گہرے سبز رنگ کا سویٹر تھا۔ کھلے بال شانوں اور پشت پر پھیلے تھے اور اس کے پاس سے مسکور کن خوشبو آرہی تھی۔ پتا نہیں اس نے کوئی خوشبو لگائی تھی یا یہ اس کی اپنی خوشبو تھی۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ میں اسے کتنے والہانہ انداز میں دیکھ رہا ہوں اس کا رنگ شبنم کی طرح گہرا ہونے لگا اور پھر اس نے شرمائے لہجے میں کہا۔

”پلیز مجھے اس طرح مت دیکھیں۔“

”میں چونکا اور گہری سانس لی۔“ میں نے آج تک تمہیں اس طرح نہیں دیکھا جس طرح میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ ٹھیک ہیں نا؟“ اس نے میرا بازو تھام لیا۔ ”کتنے کمزور ہو گئے ہیں اور آپ کی شیو بھی بڑھی ہوئی ہے۔“

”بس یہ نو دس دن بھٹکتے ہوئے گزر گئے۔“ میں نے کہا۔

اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے کرسی پر بٹھایا اور خود میرے سامنے بیٹھتا لیکن پر بیٹھ گئی۔ میں بے چین ہو گیا۔ ”یہ کیا تم نیچے کیوں بیٹھ گئی ہو؟... اور پر بیٹھو۔“

”مجھے اس طرح اچھا لگ رہا ہے۔“

”پھر بھی...“

”نہیں آپ بتائیں آپ پر کیا گزری؟“

اس کا لہجہ بتا رہا تھا وہ نہیں اٹھے گی۔ ”سویرا مجھ پر جو گزری اور تمہارے بارے میں جو سوچیں آتی تھیں وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا ہو۔“

اس نے اپنی نازک انگلیوں سے میرے کمرے سے ہاتھ سہلائے۔ ”پھر بھی میں جاننا چاہوں گی۔“

وہ میرا ہاتھ سہلاتی رہی اور میں اسے بتاتا رہا کہ ان نو دس دنوں میں مجھ پر کیا گزری تھی۔ درحقیقت یہ نصف مہینے سے زیادہ کا عرصہ تھا کیونکہ فتح خان نے مجھے چھ دن بے ہوش



..... ہے۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام.....

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سپنس □ پاکیزہ □ سرگزشت □ بھجوا دیا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

بکریں کے برقرار رہنے کیلئے 30 مئی 2012 تک علمی آزمائش 80 بہت کم بڑے 982 کراچی 74200 ہمارے سال کریں۔



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت ایکسپریس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

بدالدین سرکولیشن مینجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C
35895313 فیکس 35802551



قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام.....

پتا.....

محترم / محترمہ..... کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعرا لگ کا غز پر ہے) **41**



بہت کم بڑے 982 کراچی 74200 ہمارے سال کریں۔

(ملک ثاقب شاد تنولی، حویلیاں کا جواب)

شاید خیال..... لڈن وہاڑی
یہ آنکھیں خواب دکھاتی ہیں اس بشر کی مجھے
جو دیکھتا بھی نہیں ہے نگاہ بھر کے مجھے
علی حیدر..... خانوال
یہاں تو پہل میں بدل لیتے ہیں خدا بھی کئی
وہ ساری عمر ہی میرا طواف کیا کرتا
(عصمت آراء، حیدر آباد کا جواب)

راجا ثاقب نواز ثاقب..... رتی ٹبی ساہیوال
زرد پتے جب شاخوں سے گرتے ہیں روتے ہوئے
سوچتا ہوں کتنی آوازوں کا مدفن ہے ہوا
آفتاب منظر..... حاصل پور
زندگی موت کے طوفان سے ٹکرائی ہے
تب کہیں جا کے کوئی شکل نظر آئی ہے
نازش سلطانی..... رحیم یار خان
زندگی کی رقت سے عاری ہے
موت کو بھی ترس رہا ہے جسم
نعمان فرحت..... چنیوٹ
زہے لطافت غم میں وہاں ہوں اب راغب
جہاں تصویر عشرت گناہ ہوتا ہے
(محترمہ قاطرہ نسیم، جہلم کا جواب)
محمد اختر..... رحیم یار خان
یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی نچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
(تابش نبی، ملتان ٹنگ کا جواب)

خالد یوسفی..... لیہ
یاران رفتگاں کا تھکے حال کس طرح
بیجا نہیں کسی نے بھی لکھ کر عدم سے خط
(محمد سعید قاسمی، ڈلوال کا جواب)
نصرت جاوید..... جوبلی لکھاں
نہ دل نے مانی کوئی بات لاکھ سمجھایا
کہ وہ زمانے میاں قیس و کوہکن کے گئے
☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

ملک ثاقب شاد تنولی، حویلیاں کا جواب

اے سوزِ عدو اپنا بہت دور تھا بیٹھا
اک دوسرے کا خون بہانے سے ملا کیا
فراز بیٹ..... نوشہرہ
افسانہ ہستی کو ترتیب تو سب دیں گے
یہ بات الگ سب کا انداز جدا ہوگا
محمد خادم حسین..... اوکاڑہ
افراد کے ذہنوں میں لپکتی ہے ریا کاری
مشروط ہے انسان سے انسان کی وفاداری
زاہد بخش..... پشاور

اس قدر صدے اٹھا کر مہتری
محو حیرت ہوں کہ زندہ رہ گیا
سلطان فتح علی..... بکمر (گلگت)
آج کوئی پتھروں کے مول بھی لیتا نہیں
ورنہ محسن ہم بھی کل تک بے بہا ہیروں میں تھے
ابو ذر محسن..... لڈن
ابھی تو ضد ہے اسے راستہ بدلنے کی
کبھی وہ روئے گا خود میری چاہتوں کے لیے
فرحانہ سعید قاسمی..... ڈلوال چکوال
اے حسرت نگاہ یہ کیا راز ہے آخر
وہ نہانے آتے ہیں تو دیکھا نہیں جاتا
(فصاحت اللہ، اوسلو، تاروے کا جواب)

منظر علی خان..... لاہور
اب ہوائیں ہی کرس گئی روشنی کا فیصلہ
جس دپے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا
نذر محمد گل..... چنیوٹ
اس اُجڑتی بستی میں آنکھ رکھنے والا میں
آنکھ رکھنے والے کو دیکھنا تو ہوتا ہے
آفتاب قیصر..... جھنگ
ان دیوں کے ساتھ میرا نام بھی لکھتا جنہیں
بچتے بچتے روشنی تقسیم کرنی پڑگئی
انعم رفیق..... گجرات
اب تجھے کیسے بتائیں کہ کسی کا اپنا
شہر کی بھیڑ میں کھو جائے تو کیا ہوتا ہے
(زیرینہ جوینجو، لاڑکانہ کا جواب)

سعید احمد چاند..... کراچی
یہ میرا پیارا اتنا بھی بے اثر نہ ہو
میں تجھے ٹوٹ کے چاہوں تجھے خبر نہ ہو
ماہنامہ سرگزشت

علی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعہ آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ کارکن گوماہنامہ سرگزشت، سیمپنسن ڈائجسٹ، جاموسسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔
ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک مٹی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے؟ اس کے بعد خود شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ آک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 مئی 2012ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

298ھ بمطابق 1875ء میں ٹکسوادور کانپور کے درمیان واقع اناؤ ضلع کے قصبہ موہان میں ایک صاحب علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ علم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ ادبی دنیا کو زیر و زبر کر رہے تھے کہ صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اخبار سے وابستگی ہوئی تو ایسے اے مضامین لکھے کہ حکمران طبقے میں پھل رچ گئی۔ ارباب اقتدار نے گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ ایسے وقت میں گرفتاری عمل میں آئی جب شیر خوار بیٹی نعیمہ سخت علیل تھی۔ انہیں لے جا کر پھل کی مشقت پر لگا دیا گیا۔ ہر روز ایک من گیہوں ہاتھ کی چکی سے پیستے۔ اس دور میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ادب میں شہکار کہلایا۔ ان کی تقسیم زبان زبور عام ہوتی گئیں۔ 13 مئی 1951ء کو انہوں نے دنیا سے کوچ کیا۔

علمی آزمائش 78 کا جواب

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سرزمینِ دہلی پر 1703ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت مغل اقتدار چراغِ سحر کی طرح ٹٹھارہا تھا۔ اس دور میں گمراہی اور فتنوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ ان فتنوں کے سبب باب کے لیے علمی و فکری ضرب لگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بہت ساری اہم کتب تالیف کیں۔ تصنیفات کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ برصغیر میں قرآن مجید کا پہلا با محاورہ سلیس فارسی میں ترجمہ کیا اور واقعی دلی اللہ کے منصب پر نظر آئے۔

۱. انعام یافتگان

- 1۔ نصرت شاہ، جہلم - 2۔ شاہنواز، رحیم یار خان - 3۔ نصیری، تول، لاہور
4۔ نعمان خان، حیدر آباد - 5۔ نصیب الحسن، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

ان کا راجہ جیسے تھا وہ اس کو دوسرے درجہ پر لے کر آئے۔
 کراچی سے نصرت فاروقی، وجہہ الحسن، کاوش اختر، یاسر توفیق، محمد مناف فاضلانی، فرزانہ پروین، منور علی، ناصر افروز، انصار حسین،
 و جب علی مرزا علی احمد، خلش مضطر، الطاف بی بی، یاسر توفیق، محمد نصرت ایاز، کلیم اللہ نبی، عنایت مسیح، تنویر حسین زیدی، جبار علی، کبکشاں نسیم،
 ابرار احمد، نور احمد، بختاورد شاہ، نجیب اللہ فاروقی، نواز علی شاہ، ملک سرفراز گوہل، نگار صہبائی، نجم الدین حیدر - لاہور سے: ممتاز الحسن، ارشاد علی، شہار
 اختر، گل نرگس، برق فیاضی، حمیرا تبسم، الحاج کریم الہی اعوان، تابش عطاری، نیاز احمد، اکرام صدیقی، نبیم مرزا، احمد بشیر بٹ، عقیل سندھو، نازش

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

۱۔ پر کمزری رہوں اور تیرے مجھے آنکھ باریق ہے میں
۲۔ زور سے بند کیا اور اندر چلی آئی تیرے جیسے کر لیا کر لیا
۳۔ پر کمزری نہیں ہوا کروں کی یہ کیا دیوانگی ہے جو
۴۔ اور جلی ہے۔ دھلا جب میں نہیں جائے گا اور خواہ
۵۔ مای خواروں کی۔ کسی دن ایسی بھی ہو جائے گی کہ
۶۔ کیا آؤں گا اسے جو جانتے ہی چٹک جاتی ہے۔
۷۔ زمین بڑوں کو بھی چاہتی تھی جن کا کام ہی اڑھتے

اوجھڑا تھا۔ انہوں نے انکارا ہوتا ہے کہ یہ کیا کرنا ہے
دروازے پر بہت کمزری ہوئے گی ہے تو قیامت آجائے
میں زیارت میں تیرے کہ جسے سوتی تھی کہ جب دروازے
پر کمزری نہیں ہوں گی لیکن دوسرے دن کاٹنے سے آتے ہی
دروازے پر پہنچ گئی تھی اور پھر وقت و وقت سے دروازے پر
جا کر صاف کیا تھی کہ شاید وہ نظر نہ آئے لیکن پھر وہی



انتقام

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!

میں مقدر کی ستائی ہوئی ایک دکھی عورت ہوں لیکن اس میں
قسمت سے زیادہ میری یہ وقوفی کا ہاتھ ہے۔ انسان سوچتا کچھ ہے
اور ہوتا کچھ اور ہے۔ میرے منگیتر نے کس طرح میری زندگی میں
انگارے بھرے ہیں! آپ قارئین بھی ملاحظہ کریں پھر فیصلہ کریں کہ
میری غلطی کی اتنی بڑی سزا کیا صحیح ہے؟
طلعت
(لاہور)

بادرچی خانے میں گئی اور واقعی اس لڑکے کے بارے میں
سوچنے لگی۔ کچھ سوتے، کچھ جاگتے جیسے تیسے چائے بنائی اور
ای کو لا کر دے دی۔

اپنے کمرے میں جا کر پھر سوچنے لگی۔ شہزادوں جیسی
چال والا یہ لڑکا کون تھا؟ کاش وہ دوبارہ نظر آ جائے بلکہ
بار بار نظر آتا رہے۔ پھر میں تمام تر سنجیدگی کے باوجود اپنی
بے وقوفی پر ہنس پڑی تھی۔ وہ کوئی اس محلے میں رہتا تھوڑی
ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ گزرنے کے لیے ہمیشہ اسی گلی کا
انتخاب کرے۔ یہ سوچے ہی میں بچھری گئی تھی۔

میں نہ تو آوارہ مزاج تھی اور نہ ایسی حسن پرست۔ اس
سے پہلے بھی ایسا ہوا بھی نہیں تھا کہ کوئی لڑکا مجھے اچھا لگا ہو۔
میں تو لڑکیوں میں مشہور تھی کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر
دیکھتی ہی نہیں ہوں۔ اس لڑکے میں نہ جانے ایسی کیا کشش
تھی کہ جی چاہتا تھا وہ پھر گزرے۔ میں پھر اسے دیکھوں۔
میں چپکے سے پھر دروازے پر گئی کہ شاید وہ جہاں آیا ہو وہاں
سے واپس جا رہا ہو اور نظر آ جائے۔ بہت دیر کھڑی رہی، اس
کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا کہ ایک ادبаш سا لڑکا میری طرف
دیکھ کر آنکھ مارے ہوئے گزر گیا۔ میں اپنی نظروں میں خود
گر گئی۔ میں اب ایسی ہو گئی کہ آوارہ لڑکیوں کی طرح

عارف سے میری منگنی ہو چکی تھی لیکن میرا گناہ یہ تھا کہ
میں کسی اور لڑکے کا پیچھا کرنے لگی تھی جس کا نام مجھے بعد میں
ذیشان معلوم ہوا تھا۔ اس لڑکے کو میں نے پہلے پہل اپنے
دروازے پر کھڑے ہو کر گلی سے گزرتے دیکھا تھا۔ یہ لڑکا
میرے محلے کا نہیں تھا لیکن یہ بند گلی نہیں تھی کہ کوئی اور گزر رہی
نہ سکتا ہو۔ مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ کوئی راہ گیر ہوگا اس طرف
سے گزرا ہوگا، لیکن اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میں
دروازے سے ہٹنا بھول گئی تھی۔ وہ کب کا نظروں سے اوجھل
ہو گیا تھا لیکن میری نظریں تو جیسے واپس آنا ہی بھول گئی تھیں۔
ای مجھے آواز نہ دیتیں تو شاید میں دروازے پر کھڑے
کھڑے سوکھ جاتی۔

”کیا کر رہی تھیں تم دروازے پر اتنی دیر سے؟“
”ای، دو بچوں کی لڑائی ہو رہی تھی، وہ دیکھ رہی تھی۔ قسم
سے ایسا دلچسپ تماشا تھا کہ بس۔“
”کالج میں پہنچ گئی لیکن بچپنا نہیں گیا۔ چل جائے کا
وقت ہو گیا ہے، چائے بنا لے۔“
”اچھا ای!“

میں تو خود یہ چاہتی تھی کہ ای کے سامنے سے ہٹ
جاؤں اور آنکھیں بند کر کے اس لڑکے کو دیکھتی رہوں۔ میں

کے سوا باہر کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا کوئی وقت تو مقرر تھا نہیں کہ میں دروازے پر ہوں اور وہ گزر رہا ہوتا۔ دو تین دن میں دروازے کا طواف کرتی رہی اور پھر صبر کر کے بیٹھ گئی اور سوچ لیا کہ دنیا بہت چھوٹی ہے لیکن یہاں جو ایک بار نظر آتا ہے دوبارہ نظر نہیں آتا۔

دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ اس کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا تھا کہ ایک شمع پھر جل گئی۔

امتحان کے دن نزدیک آرہے تھے اور میری انگلیں بہت کمزور تھیں خاص طور پر گرامر۔ محلے میں ایک اسکول ٹیچر رہتی تھیں۔ وہ تھیں تو اسکول ٹیچر لیکن انگریزی میں ایم اے کیا ہوا تھا۔ تھرڈ ڈویژن تھیں اس لیے کالج میں ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے ان کی ڈویژن سے کیا تھا، مجھے تو ابتدائی گرامر پڑھنی تھی۔ میں نے امی سے ذکر کیا۔ اگر شہلا باجی مجھے گھر آکر انگریزی پڑھا جایا کریں۔ امی نے ان سے ذکر کیا۔ شہلا باجی بیوہ تھیں اور اکیلی رہتی تھیں۔ اس لیے امی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ابو کے سامنے ذکر آیا تو انہوں نے بھی اجازت دے دی۔

”کیا حرج ہے۔ وہ بے چاری اکیلی تو رہتی ہے۔ نہ میاں ہے اور نہ کوئی جوان بیٹا۔ کالج سے آنے کے بعد چلی جایا کر دو۔“

میں شہلا باجی کے گھر ٹیوشن پڑھنے جانے لگی۔ ابھی دو دن گزرے تھے۔ تیسرے دن میں گئی تو ڈرائنگ روم کے صوفے پر اسی لڑکے کو بیٹھے ہوئے دیکھا جسے دیکھنے کی خواہش مجھے دروازے پر لے جاتی تھی۔ میری تو سانس بند ہونے لگی لیکن فوراً یہ خیال آیا کہ یہ لڑکا شہلا باجی کے گھر کیوں بیٹھا ہے؟ کیا شہلا باجی نے پارسانی کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا اور آج رات گئے ہاتھوں پکڑی گئیں۔

”ذیشان! تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔“

”یہ پردہ تو نہیں کرتیں۔“

”پھر تم بھی..... اچھا نہیں لگتا کہ تم یہاں بیٹھے رہو۔“

”لیجے صاحب، چلا جاتا ہوں۔“

وہ لڑکا میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھتا ہوا ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔

اسے یوں اچانک دیکھ کر خوشی بھی ہوئی تھی لیکن یہ دکھ بھی ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں ہے؟ میں تو صرف منگتر ہوں، کسی کی..... شہلا باجی تو بیوہ ہوتے ہوئے اپنے بیٹے کے برابر والے کے ساتھ رنگ رلیاں منارہی ہیں۔“

شہلا باجی نے میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہا ”میرا چھوٹا بھائی ہے ذیشان۔“

”کبھی دیکھا نہیں۔ میں نے تو سنا تھا آپ اکیلی رات ہیں۔“ میرے لہجے میں یقیناً طنز چھپا ہوا تھا۔

”یہ بڑی لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گی۔“ انہوں نے کہا اور پڑھانا شروع کر دیا۔

میں دل ہی دل میں ان کی چالاکی پر ہنس رہی تھی۔ کئی جوان لڑکے کو گھیر گھاڑ کر لے آئی ہیں اور دنیا کو سمجھانے کے لیے بھائی مشہور کر دیا ہے۔

کچھ دیر میں وہ لڑکا پھر اندر آیا ”باجی، ایک پچاس روپے دے دو۔ میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔“

”جب یہ پچاس روپے خرچ ہو جائیں گے۔“

شہلا باجی اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ یقیناً ذیشان کو پچاس روپے دیے گئی ہوں گی۔ کچھ دیر میں آئیں اور پھر پڑھانے بیٹھ گئیں۔ میرا دل آج کتابوں سے زیادہ کہیں اور تھا۔ میں ساری صورت حال پر غور کر رہی تھی۔ شہلا باجی اچانک میری نظروں سے گزرتی تھیں۔ اس لیے کہ انہوں نے ایک غیر لڑکے کی اپنے گھر میں جگہ دی تھی اور اس سے بھی زیادہ اس لیے کہ انہوں نے اس لڑکے کا انتخاب کیا تھا جو میرے دل میں اتر گیا تھا۔

میں وہاں سے لوٹی تھی تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ اب ٹیوشن ختم۔ اب شہلا باجی کے گھر نہیں جاؤں گی۔ لیکن مجھے میں تو تھیں فیصلہ تھی ہی کم۔ دوسرے دن میں پھر شہلا باجی کے گھر پہنچی گئی۔ میں جانتی تھی کہ مجھے شہلا باجی سے زیادہ ذیشان کی کشش یہاں لائی ہے۔ اندر پہنچتے ہی گھر کی ویرانی نے مجھے دبوچ لیا۔ ذیشان کی خوشبو سے گھر خالی تھا۔

”آپ کے بھائی نظر نہیں آرہے ہیں۔“ میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”ابھی تو کہیں نکلا ہے، آجائے گا۔“

”آپ ان کے متعلق کچھ بتانے والی تھیں۔“

”ارے ہاں، صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ تمہارا تجسس دور ہو جائے۔ یہ بہت چھوٹا تھا۔ کوئی آٹھ دس سال کا ہو گا کہ اس کو کسی نے اغوا کر لیا تھا۔“

”اچھا..... اغوا کر لیا تھا؟“

”ہاں، لیکن وہ کوئی بُرے لوگ نہیں تھے۔ بے اولاد تھے اور یہ بچپن میں بہت خوبصورت تھا۔“

”خوبصورت تو اب بھی ہیں۔“

”جن لوگوں نے اسے اغوا کیا تھا وہ اسے دعویٰ لے گئے۔ ذیشان کے کہنے کے مطابق وہ میاں بیوی تھے۔ ان لوگوں نے اسے اولاد کی طرح پالا۔ یہ تو وہاں آرام سے تھا

یہاں ہم سب کی جان پر بن گئی۔ اس کے غم میں پہلے ابا چارے ہوئے پھر اماں چلی گئیں۔ ایک ہم سب سے بھائی ہیں، وہ اسے تلاش کرتے رہے اور پھر تھک ہار بیٹھ گئے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ ذیشان کہاں گیا؟ ان ہم سب کو بھولا نہیں تھا لیکن دعویٰ میں تھا بھاگ آئیں سکتا تھا۔ برسوں بعد اسے اب موقع ملا۔ دعویٰ سے ہار گیا آیا۔ ابھی کوئی پندرہ بیس دن پہلے تو آیا ہے۔ بڑے حالی کے پاس رہ رہا ہے۔ ابھی کل کہہ رہا تھا کہ باجی مستقل ہمارے پاس رہنے آ جاؤں گا۔

میں اپنی کامیابی پر مسکرا دی۔ وہ میری وجہ سے شہلا باجی کے پاس مستقل رہنے آ رہا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ شہلا باجی کو میں نے ہار کھ لیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ذیشان ان کا واقعی بھائی ہے۔ اس کی کہانی سن کر افسوس بھی ہوا کہ اس بے چارے کا ہمیں ماں باپ، بہن بھائیوں سے دور گزر گیا۔

میں وہاں دیر تک بیٹھی رہی۔ باجی نے کہہ دیا تھا کہ اے والا ہے۔ شاید وہ آجائے۔ کل تو شہلا باجی پر غصہ تھا، میں نے اسے صحیح طور پر دیکھا بھی نہیں تھا۔

میری قسمت اچھی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”لو شیطان کا نام لیا اور آ گیا شیطان!“ باجی نے کہا اور دروازہ کھولنے چلی گئیں۔ وہی تھا اور بے تکلفی سے ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔

”دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھو۔“ باجی نے سرزنش کی۔

”باجی، مجھے کیا کوئی خطرناک بیماری ہے جو آپ کی ناکر دو لگ جائے گی۔ یہ جب آتی ہیں آپ مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیتی ہیں۔“

”بیماری کیا خطرناک ہوگی، تم تو خود ہی خطرناک ہو۔ چلو اٹھو یہاں سے۔“ باجی نے اس کا کان مروڑتے ہوئے کہا۔

”کیا کر رہی ہیں باجی! ان کے سامنے تو بے عزتی نہ کریں۔ بس ایک چائے پلوادیں۔ اس کے بعد جہاں کہیں گی، چلا جاؤں گا۔“ اس نے نہایت ہوشیاری سے باجی کو کچن میں بھیج دیا۔

”ہماری باجی کی شاگرد کا نام کیا ہے؟“

”طلعت۔“

”میرا نام نہیں پوچھیں گی؟“

”مجھے باجی نے بتا دیا ہے۔“

”پھر تو یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ میں آپ کی وجہ سے باجی کے

ڈاکٹر ہاشمی

شاعری نہ اخلاقیات کی سیل ہے، نہ کسی سیاسی جماعت کا دستور، شاعری تو ایسی چیز ہے جسے کسی معینہ تعریف میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ شاعر کی نظر میں قدرت اور اس کا مشاہدہ جس قدر حقیقت پسندانہ ہوگا اس کے ذہنی اور وجدانی تجزیوں کی کیفیت اسی قدر شفاف اور لطیف ہوگی۔ زندہ شعر کہنے کے لیے بڑے کرب تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

(شاعری از ڈاکٹر ہاشمی)

مرسلہ: نوازش علی زیدی، پشاور

پاس مستقل رہنے آ گیا ہوں۔“

”امتحان ختم ہوتے ہی میری ٹیوشن بھی ختم ہو جائے گی۔“

”بھئی جب امتحان میں مل ہو جاؤ گی تو پھر آؤ گی پڑھنے، یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا۔“

”توبہ کریں، میں کیوں مل ہونے لگی تھی۔“

”بات یہ ہے طلعت صاحبہ۔ ہماری باجی نے آج تک جس کو بھی پڑھایا ہے، وہ پاس تو ہوا ہی نہیں ہے۔ میری مائیں تو ٹیوٹر بدل گئیں، مجھ سے پڑھیں، مجھ سے۔“

”ہاں، تاکہ نہ صرف مل ہو جاؤں بلکہ کالج سے بھی نکالی جاؤں۔“

”بات یہیں تک پہنچی تھی کہ باجی چائے لے کر آ گئیں۔ اب ظاہر ہے چائے ختم ہونے تک مجھے وہاں بیٹھنا تھا۔ اس دوران ذیشان کی خوش مذاقی جاری رہی۔ چپل لڑکے کس لڑکی کو پسند نہیں ہوتے اور اس کا ہر جملہ ہنسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صورت تو خیر بے مثال تھی ہی، باتیں بھی لا جواب کرتا تھا۔

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ باجی چائے لے کر آ گئیں۔ اب ظاہر ہے چائے ختم ہونے تک مجھے وہاں بیٹھنا تھا۔ اس دوران ذیشان کی خوش مذاقی جاری رہی۔ چپل لڑکے کس لڑکی کو پسند نہیں ہوتے اور اس کا ہر جملہ ہنسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صورت تو خیر بے مثال تھی ہی، باتیں بھی لا جواب کرتا تھا۔ اسی دوران ایک واقعہ نے تو مجھے اس کا گردیدہ ہی بنادیا۔ ہوا یہ کہ میں کالج میں تھی، پیریڈ آف تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں اپنی دوست نسرین کے ساتھ کینٹین میں آ گئی تھی۔ ابھی ہم نے آرڈر دیا ہی تھا کہ باہر شور مچا ہوا۔ ایسا

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے ویسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

ای۔ او۔ اس کا بھائی ہے۔ رہتا کہاں ہے، ملنے آ جاتا میں نے اسے ایک مرتبہ دیکھا ہے۔
ایسی عورتیں بھائی بنا کر ہی تو کام نکالتی ہیں۔ کوئی مال والی نہیں ہے۔
یہ ان کا معاملہ ہے، ہمیں کیا؟
ہمیں کوئی سروکار کیوں نہ ہو؟ تم وہاں جاتی ہو، جانا۔ کل کلاں کو بائیں نہیں گی۔
ای۔ او۔ میں وہاں پڑھنے جاتی ہوں۔ میری پڑھائی کا کیا ہوگا۔
کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زبیدہ بھی کہہ رہی تھی کہ ہمت کو وہاں جانے سے روکو۔
زبیدہ خالہ کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟
آج یہ بات زبیدہ کی زبان پر آئی ہے، کل پورا محلہ کہہ گا۔ بس کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں جانے کی۔
اگر انی نے یہ بات مجھے پہلے بتا دی ہوتی تو میں سمجھ بھی جاتی لیکن اب تو بات بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ اب میں ماننے والی نہیں تھی لیکن میں بظاہر چپ ہو گئی۔ میرے دل میں چور تھا اس لیے زیادہ احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بس موقع کی تلاش میں تھی کہ کسی طرح ایک مرتبہ ڈیٹاں سے مل لوں۔ اس موقع جلد ہی مل گیا۔ ای نہیں گئی ہوئی تھیں۔ میں گھر سے اُٹھ کر شہلا باجی کے گھر پہنچ گئی۔ اتفاق یہ ہوا کہ ڈیٹاں بھی وہاں موجود تھا۔
تمہاری پڑھائی اچھی خاصی چل رہی تھی، تم نے آنا میں چھوڑ دیا؟
ای کو اعتراض ہے کہ ڈیٹاں یہاں ہوتا ہے اس لیے نہیں آنا چاہیے۔ اس وقت بھی ای کہیں گئی ہوئی تھیں اس لیے آ گئی۔
ٹھیک ہے طلعت۔ جیسا تمہاری ای کہیں دیا کرو۔ مت آیا کرو یہاں۔
شہلا باجی کسی کام سے اُٹھ کر کمرے سے باہر گئیں تو میں نے ڈیٹاں سے بات کی۔
ڈیٹاں، اب میں یہاں نہیں آ سکتی۔ ہم لوگ کہیں باہر لیا کریں گے۔
یہاں تک نہیں آ سکتیں، باہر کیسے ملوگی؟
یہاں کی اور بات ہے۔ سب کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ ہم کہیں باہر لیا کریں گے، کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا۔ ہم نے

دن سے میں اس کی تلاش میں تھی۔ میرا گوہر مقصود مجھے مل گیا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ صبح کے وقت شہلا باجی اسکول گئی ہوئی ہیں۔ میں کالج جانے کے لیے گھر سے نکلوں اور شہلا باجی کے گھر پہنچ جاؤں۔ اکیلے بیٹھ کر خود باتیں کریں گے۔ میرے لیے کیا مشکل تھا۔ کالج کے لیے ہر اسٹاپ تک جاتے ہوئے شہلا باجی کا گھر راستے ہی میں ہوتا تھا۔ ڈیٹاں دروازے پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ دروازہ پار کر لیا۔ ڈیٹاں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔
دوپہر ہوئی تو شہلا باجی کے آنے سے پہلے میں وہاں سے نکل آئی۔ مجھے خوشی تھی کہ ڈیٹاں دوسرے لڑکوں کی طرح ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ شادی نام آتے ہی مجھے خیال آیا تھا کہ میری تو منگنی ہو چکی ہے لیکن میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ منگنی ہوئی تھی، کوئی نکاح تو نہیں ہو گیا تھا۔ سوچتی تھی جب وقت آئے گا، منگنی تو زردوں کی۔ امتحانوں سے پہلے کالج حسب روایت بند ہو گئے تھے لیکن میں نے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ روز اس طرح کالج جاتی تھی اور شہلا باجی کے گھر پہنچ جاتی تھی۔
اس دوران وہ دوسرے لڑکوں کی طرح ثابت بھی ہو چکا تھا لیکن مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ میں تو اس کی محبت میں پاگل ہو رہی تھی۔ ایمان کی حد تک یہ یقین بھی ہو چکا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔
ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ ایک عورت ای کے پاس آئی۔ میں گھر پر ہی تھی لیکن میں ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر کچھ کرتی۔ اُنھ کو دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ کیا باتیں کر رہی ہیں؟
میں سو گئی تھی۔ سو کر اُنھی تو ای میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور بڑی ترکیب سے شہلا باجی کا تذکرہ نکال لیا۔ مجھے کیا معلوم تھا، انہیں ڈیٹاں کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ ای نے پوچھا تو میں نے اس وقت بھی یہی بتایا کہ شہلا باجی اکیلی رہتی ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ ای کو شاید مجھ سے یہ امید نہیں تھی۔
مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ جھوٹ بولوگی۔ آدی جھوٹ اس وقت بولتا ہے جب اس کی چوری پکڑی جا رہی ہو۔ زبیدہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔
کیا بتا دیا ہے اس نے؟
یہ کہ شہلا نے کوئی لڑکا پھانس لیا ہے جو اس کے ساتھ

لگا جیسے کچھ لوگ لڑ پڑے ہوں۔ میں گھبرا کر باہر نکل آئی۔ بس یہی غلطی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ گئی ہے کیونکہ اسی وقت کہیں دور سے فار ہوا تھا۔ بس ایک فار ہوا تھا کہ ایسا لگا جیسے پورا کالج میدان جنگ بن گیا ہو۔ ہر طرف سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ گولیاں جب چلتی ہیں تو کسی کو پہچان کر نہیں لگتی ہیں۔ ایسی ہی جھنگی ہوئی ایک گولی آئی اور میرے بازو کو چھوئی ہوئی گزرنی۔ خون دیکھ کر مجھ پر غشی طاری ہوئی اور میں در کو بھی بھولتی چلی گئی۔
جب ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔ وہاں میرے گھر والوں کے ساتھ ڈیٹاں بھی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ اتفاقاً قاذوہ کالج کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اندر فائرنگ ہوئی تو وہ سامنے کی ایک دکان میں پناہ کے لیے کھس گیا پھر جب پولیس آئی اور زخمیوں کو باہر لایا گیا تو اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اسی نے گھر والوں کو خبر دی تھی۔
تین دن بعد اسپتال سے گھر لوٹ آئی۔
میں گھر آئی تو لا محالہ اپنے منگیتار عارف اور ڈیٹاں کے درمیان موازنہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ دونوں میں بڑا فرق تھا جو میں نے اب تک محسوس نہیں کیا تھا لیکن ڈیٹاں سے ملاقات کے بعد محسوس کر رہی تھی۔ عارف بزرگوں کی طرح سنجیدہ تھا۔ شکل صورت بھی بس انسانوں جیسی تھی۔ منگیتار تھا اور رشتے دار بھی۔ چاہتا تو کھمانے لے جاسکتا تھا۔ صبح شام ملنے آ سکتا تھا لیکن تو بہ گرو، کبھی تو فٹنس نہیں ہوئی۔ مینے دو مینے میں چکر لگایا کرتا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ میری خیریت ایسے دریافت کرتا تھا جیسے میری بیماری کا سن کر آیا ہو۔
خیریت ہے طلعت، طبیعت تو ٹھیک ہے؟
جان ہی تو جل کر رہ جاتی تھی۔ یہ سمجھ کر صبر کر لیتی تھی کہ سارے ہی لڑکے ایسے ہوتے ہوں گے۔ گر لڑکا کالج تھا اس لیے لڑکوں سے واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ گھر میں کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔
ڈیٹاں سے صرف دو ملاقاتوں ہی نے مجھے بتا دیا کہ عارف میں کوئی بوڑھی روح ہے۔ عارف کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ دولت مند باپ کا بیٹا تھا اور کسی وقت خود بھی بڑا بزنس مین بن سکتا تھا۔
میں اگلے دن باجی کے گھر گئی تو ڈیٹاں کی بے تکلفی مزید بڑھ گئی تھی۔ اس کے جملوں میں مزید شوخی آ گئی تھی بلکہ موقع ملنے ہی اظہار عشق بھی کر بیٹھا تھا۔ اس کے عشق میں تو پہلے ہی جتا جی لہذا میں بھی اپنی پسندیدگی کیوں چھپاتی؟ میں نے یہ تک بتا دیا کہ میں نے اسے کلی سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی

اسی وقت ایک پارک میں ملنے کا وقت مقرر کر لیا۔
دوسرے دن میں کالج کے لیے نکلی مگر کالج نہیں گئی۔
پارک میں ذیشان میرا منتظر تھا۔ ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے پھر
ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ہم نے آئندہ
ملاقات کے لیے دن اور وقت طے کر لیا۔ میں گھر چلی آئی۔
کسی کو ذرا بھی شک نہیں ہوا۔ ہم اسی طرح ملتے رہے۔
پھر ذیشان نے ایک دوست تلاش کر لیا جو اکیلا رہتا تھا۔
ہماری ملاقاتیں اس کے ہاں ہونے لگیں۔

اسی دوران عارف کئی مرتبہ آیا لیکن میں نے اس سے
سیدھی طرح بات بھی نہیں کی۔ اس سرورمہری کو ای نے بھی
محسوس کیا، عارف نے بھی لیکن کوئی بات کسی کے ہاتھ میں
نہیں تھی۔ میرا کوئی راز معلوم نہیں تھا اس لیے سب نے
خاموشی اختیار کر رکھی لیکن مجھے تو معلوم تھا کہ اس سرورمہری کا
نتیجہ بلاخر کیا نکلے گا۔ ذیشان سے جتنی جلدی میری شادی
ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں نے ذیشان پر زور دینا شروع
کر دیا کہ وہ شادی کرے۔ اسے اور مجھے پہلی مرتبہ احساس
ہوا کہ وہ شادی کیسے کرے گا؟ وہ تو کہیں نوکر بھی نہیں۔ بڑے
بھائی اور شہلا باجی کے پیسوں پر عیش کر رہا ہے۔ اس نے مجھ
سے وعدہ کیا کہ وہ کہیں نوکری ڈھونڈے گا، میں خوش ہو گئی۔
کئی مہینے گزر گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ نوکری
ڈھونڈنے میں سنجیدہ نہیں۔ شاید کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتا۔
جب شادی کے بغیر ہی اس سے مل رہی ہوں تو اسے نوکری
ڈھونڈنے اور شادی کرنے کی کیا ضرورت ہوگی۔ یہ سوچ کر
میں نے اس سے ملنا بند کر دیا۔ ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کے
ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ایک دن میں کالج جا رہی تھی کہ وہ میرے
سامنے آ گیا۔ میں نے بھی کچھ نہیں سوچا اور اس کے ساتھ شہلا
باجی کے گھر چلی گئی۔ اس وقت شہلا باجی گھر پر نہیں تھیں۔

”طلعت، تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یوں ملنا جلتا بند
کر دو گی تو مجھ پر کیا گزرے گی۔“

”میں تو آپ کو یہ موقع دے رہی تھی کہ آپ آرام سے
نوکری ڈھونڈ لیں۔“

”نوکری کوئی ہاتھ میں رکھی ہے، میں ڈھونڈ تو رہا ہوں۔“
”دیکھو ذیشان! اب میرے گھر والے میری شادی کا
سوچ رہے ہیں۔ میں اگر تمہارا نام پیش کروں تو کس سہارے
پر کروں؟“

”بس کچھ دن ٹالتی رہو، میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ
کوئی نوکری پکڑ لوں۔ پھر شہلا باجی کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔“
وہ مجھے چھوڑنے لگی تک آیا اور بس یہی غصہ ہو گیا۔

اس مرتبہ کسی اور نے نہیں، خود ای نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میرا
ساری احتیاط دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ تو یہی بھی ہوں گی کہ
میں شہلا باجی کے گھر جاتی ہوں اور ذیشان وہاں ہوتا ہے۔
یہ بات ایسی نہیں تھی جسے وہ نظر انداز کر دیتیں۔ مگر
گھر پہنچی تو وہ تیار ہی نہیں تھیں۔
”کہاں گئی تھیں تم؟“

”شہلا باجی سے ایک سوال پوچھتا تھا اس لیے چلی گئی
تھی۔“

”نہیں تمہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ صبح کے وقت گھر پر نہیں
ہوتی ہیں۔“

”وہ تبھی کبھی جلدی گھر آ جاتی ہیں۔ میں نے کہا پوچھ
لوں۔ گھر پر ان کا بھائی تھا۔ اس نے بتایا شہلا باجی نہیں ہیں
میں اسی وقت باہر آ گئی۔“

میرا اکھڑا ہوا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ میں جھوٹ بول
رہی ہوں۔ ای نے میری چٹیا پکڑ لی۔

”مجھے بے وقوف بنانی ہے۔ سچ بتاؤ ذیشان سے تیر
کیا تعلق ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں ای۔ تمہاری قسم، میرا ذیشان سے کوئی
تعلق نہیں۔“

”کم بخت، یہ تو سوچ تیری منگنی ہو چکی ہے۔ عارف
باہر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے شادی کر کے
تمہیں بھی ساتھ لے جائے۔ ذرا سوچو، وہاں تک بات پہنچی
گئی تو کیا ہوگا؟“

”اماں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ذیشان سے میرا کوئی
تعلق نہیں۔“

”طلعت، میری لاج رکھ لیجو۔ جو تو کہہ رہی ہے خد
کرے وہ سچ ہو۔ ذیشان سے تیرا کوئی تعلق نہ ہو۔“ ای نے
میرے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

اللہ قسم مجھے اس وقت ای بہت رحم آیا تھا لیکن میں دل
کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اس وقت تو شکر ادا کیا کہ بات کل گئی۔
ای نے میری قسموں پر یقین کر لیا لیکن میں عارف کی طرف
سے پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے اگر شادی میں جلدی کی تو
بھاغا پھوٹ جائے گا۔ عارف کی کوئی ایسی کمزوری بھی
میرے ہاتھوں میں نہیں تھی کہ میں منگنی توڑ دوں۔ ذیشان کو بھی
ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔

اب میرا شہلا باجی کے گھر جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں
دوسرے دن ایک جنرل اسٹور پر گئی اور شہلا باجی کے گھرنون
کیا۔ ظاہر ہے ذیشان ہی کو فون اٹھاتا تھا۔ اسے میں نے ایک

الہا اور ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔ یہ
میں نہیں بتایا کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ
لی کے لیے کوشش کر رہا ہے۔
ہم پھر سے باہر ملنے لگے تھے۔

اس نے ایک روز یہ خوش خبری سنائی کہ اسے ایک آفس
لارک کی نوکری مل گئی ہے۔ یہ کوئی جاذب نظر ملازمت
نہیں تھی لیکن ملازمت تو تھی۔ اب کوئی بات نکلتی تو میں ذیشان
کا ام نہیں کر سکتی تھی۔

اب میں نہیں، وہ ضد کر رہا تھا کہ شہلا باجی کو میرے گھر
4۔ میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میری منگنی ہو گئی
میں پہلے منگنی ختم کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔
اس لیے اسے ٹالتی رہی۔ وہ اتنی جلدی میں تھا کہ اس نے مجھ
کا ہاتھ بغیر ایک روز شہلا باجی کو میرے گھر بھیج دیا۔ میں
ابھی دیکھ کر کھنکی تو ضرور تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ
دلے کر آ گئی ہیں۔

انہوں نے ای سے بات کی ”بہن! طلعت مجھے بہت
امی لگتی ہے، میرا بھائی دینی سے آ گیا ہے۔ یہاں اس نے
ای بھی کر لی ہے۔ اگر آپ ہمیں کسی قابل سمجھیں تو میں یہ
ہوں گی، میرے بھائی ذیشان سے طلعت کی شادی
ہو جائے۔ اگر آپ یہ رشتہ قبول کر لیں گی تو میری عزت
ا ا ا ہوگی۔ ذیشان میرے پاس ہی رہتا ہے۔ طلعت
جائے گی تو میرے گھر میں رونق ہو جائے گی۔“

ای سکون سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ مسکراہٹ ان
لے ہونٹوں پر تھی۔ میں دوسرے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ
رہی تھی۔ سن بھی رہی تھی اور دل ہی دل میں دل بھی رہی تھی
کتاب بات کھلنے والی ہے۔

”بہن، جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پھر آتے ہی
ہیں۔“ ای نے کہا ”تمہارا شکریہ کہ تم نے ہمیں اس قابل سمجھا
’مان بات یہ ہے کہ طلعت کی منگنی ہو چکی ہے۔ ہمارے رشتے
’ارد میں ایک لڑکا ہے، اسی سے ہوئی ہے۔“

”بہن، مجھے یہ معلوم نہیں تھا ورنہ میں ہرگز نہ آتی۔“
”تمہیں معلوم بھی کیسے ہوتا، تمہارا ہمارا اتنا ملنا جلتا تو
ہو نہیں۔“

اس سے زیادہ شہلا باجی کیا کہتیں۔ کچھ دیر بیٹھیں اور
ہر اٹھ کر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد ای نے مجھے بتایا کہ وہ کیوں
1 میں تھیں۔ میں پہلے ہی سن چکی تھی لیکن انجان بنی رہی۔ پھر
ای کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

”مجھے جس بات کا ڈر تھا، آخرو ہی ہوا۔“

”کیا ہوا ای!“

”شہلا باجی تو نہیں آ گئی ہو گی؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم نے اسے یہاں آنے کو کہا ہوگا۔“

”میں اگر کہتی تو منگنی کا انہیں معلوم ہوتا۔“

”ہاں یہ بھی ہے۔“ امی سوچ میں پڑ گئیں۔

میں نے امی کو اس وقت تو مطمئن کر دیا تھا لیکن اب

بات وہاں آ گئی تھی کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ پھر میں نے وہ
قدم اٹھایا جس کی توقع میں خود سے بھی کبھی نہیں کر سکتی تھی۔

میں میڈیکل اسٹور پر گئی اور عارف کو فون ملا دیا۔ ایسی دیوانگی
طاری تھی کہ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں کسی اور
سے محبت کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنے والی ہوں اس

لیے اس منگنی کو ختم سمجھو۔ چاہو تو امی کو بتا دو۔ اگر میری عزت
رکھنا چاہتے ہو تو الزام اپنے سر لے لو۔ مجھے ٹھکرا دو اور منگنی ختم

کر دو۔ میں آزاد ہو جاؤں گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا
کہ وہ یہ منگنی ختم کر دے گا۔

اس کے دل پر جو گزری ہو گی اس کا احساس مجھے اب
ہوتا ہے، اس وقت نہیں ہوا تھا۔

وہ وعدے کا پکا ٹکڑا۔ دو تین دن بعد اس کی والدہ
ہمارے گھر آئیں۔ اتنی شرمندہ تھیں کہ بات کرتے کرتے
آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔

”بہن، کیا بتاؤں..... لڑکا میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں۔
کتنے شوق سے منگنی کی تھی اور اب کہتا ہے مجھے طلعت سے
شادی نہیں کرنی۔ منگنی ختم کر دو۔“

”آپ لوگوں نے مذاق سمجھا ہوا ہے۔ میری بچی کے
چار سال برباد کر دیے اور اب تم چلی آئیں کہ منگنی ختم کر دو۔“

”جب کرنے والا ہی نہیں مانتا تو میں کیا کر سکتی ہوں؟“
”تم لوگوں نے جو کچھ میری بچی کے ساتھ کیا ہے،
تمہارے آگے آئے گا۔“

”اے بہن، کو سننے تو مت دو۔ منگنیاں کیا ٹوٹی نہیں
ہیں۔ میں نے تو اسی وقت کہا تھا نکاح کر دو۔ رخصتی بعد میں
ہو جائے گی۔“

”اچھا ہوا نکاح نہیں کیا تھا۔ میری بچی پر تو طلاق کا داغ
لگ جاتا۔“

مختصر یہ کہ دونوں میں خوب جھڑپ ہوئی۔ عارف کی
والدہ اٹھ کر چلی گئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ عارف نے ان سے
کیا کہا تھا بہر حال وہ منگنی ختم کر کے چلی گئیں۔

امی کو دکھانے کے لیے میں امی کے کندھے پر سر رکھ کر خوب روئی۔ میں یہی ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ منگنی ٹوٹنے کا مجھے افسوس ہوا ہے۔ امی کو یہ شک ہوئی نہیں سکتا تھا کہ منگنی ٹوٹنے میں میرا ہاتھ ہے۔ یہ تو میرے دل کا چور تھا جو مجھے رُلا رہا تھا۔ شام میں ابو گھر آئے اور امی نے انہیں بتایا تو افسوس انہیں بھی ہوا لیکن انہوں نے امی کو سمجھایا۔

”خدا جو کرتا ہے اس میں بہتری ہوتی ہے۔ اچھا ہوا یہ لوگ ابھی کھل گئے۔ ابھی کیا گیا تھا، منگنی ہی تو ہوئی تھی۔“
دل کو کتنی ہی تسلی دے لی جائے۔ یہ کوئی معمولی حادثہ تو تھا نہیں۔ گھر میں سوگ کی سی کیفیت تھی۔ امی بھی چپ تھیں، ابو بھی خاموش تھے۔
جب کچھ صدمہ کم ہوا تو امی نے مجھ سے ذیشان کا ذکر کیا۔
”مجھے یاد ہے، ایک دن شہلا آئی تھی؟“
”ہاں، یاد تو ہے۔“

”وہ اپنے بھائی کا رشتہ لائی تھی۔ میں نے لڑکا دیکھا ہے۔ ہے تو خوبصورت، اس وقت میں نے منع کر دیا تھا۔ عارف جو بچہ میں تھا۔ اگر تیری مرضی ہو تو شہلا سے بات کروں؟“

”امی، آپ کی مرضی ہے۔ میں تو وہاں شادی کروں گی جہاں آپ لوگ نہیں گئے۔“
”مجھے تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ اکیلا ٹھیلہ ہے۔ شہلا کے ساتھ رہتا ہے۔ شہلا اپنا خود کمانی ہے۔ چار پیسے تم ہی پر خرچ کر دے گی۔ تمہاری محتاج نہیں ہوگی۔“

”امی، عادت کی بھی اچھی ہیں۔ میری تو وہ دوست بن گئی تھیں۔ آپ ہی نے ان کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔“
”اس وقت میں نے ٹھیک کیا تھا۔ اب کی بات اور ہے۔ وہاں جانے کو تو میں اب بھی نہیں کہوں گی۔ شہلا کو بلا کر بات کرنی ہوں۔ لڑکیوں کی منگنی ٹوٹ جاتی ہے تو ہزار باتیں بنتی ہیں۔ شہلا خود آئی تھی اس لیے شاید وہ منگنی ٹوٹنے پر بھی رشتے پر تیار ہو جائے۔“
”جیسی آپ کی مرضی۔“

امی کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ میں ذیشان سے برابر مل رہی ہوں۔ اسے میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں نے منگنی توڑ دی ہے۔

امی نے ابو سے بات کی۔ وہ بھی منگنی ٹوٹنے کے بعد اتنے فیذاپ ہو گئے تھے کہ تھوڑی سی جیل و جت کے بعد ذیشان کے رشتے پر تیار ہو گئے۔ انہیں بس ایک اعتراض تھا کہ عارف کے مقابلے میں ذیشان کی آمدنی کم ہے لیکن امی

نے یہ کہہ کر انہیں راضی کر لیا کہ طلعت کی قسمت اچھی ہو وہ ترقی بھی کر لے گا۔ ابھی وہ جو کچھ کماتا ہے، ان دونوں لیے بہت ہے۔

شہلا باجی کو ایک مرتبہ پھر بلا لیا گیا۔ رشتہ طے ہو گیا یہ شگون بھی لے لیا گیا کہ طلعت ذیشان کی قسمت کی تھی اللہ نے کیسا بندوبست کیا۔ ابھی بھلی منگنی ٹوٹ گئی۔
میں دہن بن کر شہلا باجی کے گھر آ گئی۔ مجھے ذیشان ہو رہا تھا کہ وہ واقعی دوسرے لڑکوں کی طرح ثابت نہیں ہوا۔
میرے ساتھ وقت نہیں گزارا بلکہ شادی کی۔ پھر یہ وہ لڑکا جسے ایک نظر دیکھ کر میں سب کچھ بھول گئی تھی اور میں نے حاصل کر لیا۔ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتی، کم تھا۔

ذیشان کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ میرے ساتھ اسی محبت سے پیش آ رہا تھا جس طرح شادی سے ملتا تھا۔ شہلا باجی بھی دوستوں کی طرح چھیڑ چھاڑ میں لگی رہیں۔ میرا گھر جنت بنا ہوا تھا لیکن پھر کسی کی نظر لگ گئی۔
ابھی چھ مہینے گزرے تھے کہ شہلا باجی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اچھی بھلی سوئی تھیں۔ رات میں کسی وقت ہارٹ ہو گیا۔ جوانی کی موت ہی سمجھ لو۔ زیادہ سے زیادہ 45 ہوں گی۔ اتنا اچانک انتقال ہوا تھا کہ پورا محلہ سہم کر رہا تھا۔ ذیشان کی حالت تو بہت ہی غیر ہو گئی تھی۔ صدمہ مجھے کچھ کم نہیں ہوا تھا۔

شہلا باجی کے صدمے سے نکلنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آنے لگے۔ ذیشان دل لگا کر کام کر رہے تھے لیکن اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ زندگی صرف محبت سے نہیں گزرتی۔ اچھی آمدنی بھی ضروری ہو رہی ہے۔ ذیشان کی آمدنی محدود تھی۔ اتنی محدود کہ مہینے میں ایک مرتبہ بھی محل کر شاپنگ نہیں کر سکتے تھے۔ کسی مہینے ایک لے لی تو دوسری چیز کے لیے اگلے مہینے کا انتظار۔ میں ذیشان سے کہتی رہتی تھی کہ اپنی آمدنی بڑھائے۔ کہیں پارٹ ٹائم کر لے یا اپنا کاروبار کرنے کے بارے میں سوچے۔
ذیشان ان مردوں میں سے تھا جنہیں کام سے زیادہ آرام پسند ہوتا ہے۔ اس کے کان پر جوں ہی نہیں رہتی تھی ہمارے جھگڑے شروع ہو گئے۔ اس کے باوجود وہ سنجیدہ ہوتا تھا۔ اب تو وہ یہ بھی کہنے لگا تھا کہ یہ تو تمہیں شادی سے پہلے سوچنا تھا کہ میری آمدنی کتنی ہے۔ کہتا وہ ٹھیک ہی تھا لیکن میں نے تو یہ سوچا تھا کہ آہستہ آہستہ ترقی کر لے گا۔ یہ کہ معلوم تھا کہ پھر بنا ایک جگہ پڑا رہے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ اب مجھے عارف کا خیال آنے لگا تھا۔ اس کے بارے میں کئی

میں کہ اس نے اپنا الگ بزنس شروع کر دیا ہے۔ لاکھوں ملتا رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مجھے پچھتاوا تو نہیں تھا لیکن یہ ضرور تھی کہ ذیشان بھی ترقی کرے۔ میں عارف کو اس کے میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔

میں سوچتی ضرور تھی لیکن سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کو دو سال ہو گئے تھے لیکن ہم وہیں کے وہیں تھے۔ ماہوں جیب میں پیسے نہ ہوں تو آدمی وقت سے پہلے مارتا جاتا ہے۔ یہی حال ہمارا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں روایتی انسان کی طرح گھر میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ ذیشان میں وہ پہلے دلی شوخی نہیں رہی تھی بلکہ چڑچڑاہو گیا تھا۔ اب وہ غمازوں پر وہ کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا تھا۔ میں نے رات بھر کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔

اس روز ذیشان کا موڈ نہ جانے کیوں ضرورت سے اچھا ہو گیا تھا۔ اس نے صبح ہی سے کہہ دیا تھا کہ شاپنگ لے چلیں گے۔ ابھی تنخواہ کا دن نہیں آیا تھا اور وہ شاپنگ لے کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔
”خیریت تو ہے، آج کیا راستے میں حاتم طائی مل گیا اس نے کہا لو بھائی، یہ رقم لے لو اور بیوی کو شاپنگ لے۔“

”کیوں مذاق کرتی ہو۔ مجھے بونس ملا ہے، پوری ایک“

”ہاں، ہم اسی قابل رہ گئے ہیں کہ جب بونس ملے تو ہم کو چلے جائیں۔“
”یار، اس وقت تو طحمت کر دو۔“
”طرح کی کیا بات ہے، سچ تو کہہ رہی ہوں۔ تنخواہ اتنی“

”تنخواہ بھی اتنی کر لوں گا۔ ابھی جو ہے اسی میں گزار دو۔ آفس چلا گیا۔ میں اکیلے گھر میں اکیلی رہ گئی۔ کوئی آدمی نہیں تھی کہ جی بہلا رہتا۔ اس وقت جی کچھ زیادہ ہی اچھا لگا تھا لہذا امی کی طرف چلی گئی۔ وہاں عارف آیا ہوا تھا۔ حالہ سامنا کرنا پڑا۔

”طلعت، کیسی ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس نے دبی دبی جملہ دہرایا جو وہ اکثر کہا کرتا تھا لیکن اس وقت بہت سب معلوم ہوا۔ اس وقت وہ یہی پوچھ سکتا تھا۔
”اللہ کا شکر ہے۔ میں اپنے گھر میں ٹھیک ہوں۔“
”ذیشان صاحب کیسے ہیں؟“
”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ ضروری نہیں جس کے پاس گاڑی

ہو وہی ٹھیک ہوتا ہے۔“
”میں نے یہ تو نہیں کہا۔ تمہارا ہمدرد ہوں اسی لیے خیریت پوچھ لی۔“
”آپ کا شکر یہ؟“ میں نے کہا اور کمرے میں چلی گئی۔
امی نے مجھے بتایا کہ وہ منگنی ٹوٹنے پر معافی مانگنے آیا ہے۔ شرمندہ ہے اپنے کیے پر۔
”وہ شرمندہ ہو رہا ہے تو تم بھی غصہ تھوک دو۔ سیدھی طرح بات کر اس سے۔ آخر رشتے داری ہے ہماری۔“
”اس آدمی کی وجہ سے میں جہنم میں جھونکی گئی ہوں۔“
”کیا پھر کوئی بات ہوئی ہے؟“
”بات کیا ہوئی ہے۔ دبی چند روپے اور پورا مہینہ۔“
”بیٹی، یہ تو تیرا نصیب ہے۔ نہیں تھا تیرے مقدر میں عیش۔ ذیشان تیرے ساتھ تو ٹھیک ہے؟“
”ایسے ٹھیک ہونے کا کیا کروں؟“

”بیٹا، وہ تیرا خیال رکھتا ہے، یہی بہت ہے۔ ذرا سوچ اس کے پاس دولت ہوتی اور تجھے منہ نہ لگاتا۔۔۔۔۔ پھر تو کیا کرتی؟ دولت سے پیٹ بھر جاتا ہے، روح تشہ رہ جاتی ہے۔“
”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ عارف کو دیکھو کیسا شاندار سوٹ پہنے ہوئے ہے اور باہر کیسی شاندار گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔“

”ہاں بیٹا!“ اماں نے ایسی ٹھنڈی سانس بھری کہ میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ میں اپنی پریشانیاں سنا کر امی کو کیوں ادا کرتی ہوں۔ میں دل پر پھر رکھ کر عارف کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور اس سے ہنس کر باتیں کرنے لگی تاکہ امی خوش ہو جائیں۔ عارف ان کا رشتہ دار بھی تو تھا۔
گھر آئی تو ذیشان آنس سے آچکے تھے۔ میں جلدی جلدی تیار ہوئی۔ رکشا کے بجائے آج انہوں نے ٹیکسی کی تھی۔ ہم مارکیٹ پہنچ گئے۔

یہ ایک سپر مارکیٹ تھی۔ یہاں ہر چیز کی دکانیں تھیں۔ ذیشان نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے سوٹ پس، فینسی چپل اور کچھ اکسسریز جیولری دلائے گا۔ وہ واقعی آج حاتم طائی بنا ہوا تھا۔

ہم بہت سی شاپنگ کر چکے تھے، صرف سوٹ پس خریدنا رہ گیا تھا۔ ذیشان ان مردوں میں سے نہیں تھے جو بازار میں گھوم کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تو یہ تھا کہ بس ایک دکان پر بیٹھو اور جو خریدنا ہے خرید لو۔ اس وقت بھی وہ میرے ساتھ گھومتے گھومتے تھک گئے تھے بلکہ پورے ہو گئے تھے۔ جب میں کپڑے کی دکان میں داخل ہوئی تو ان کا پارہ یکا یک چڑھ گیا۔

”یہ کپڑے کی چوتھی دکان ہے جس میں تم ایک معمولی سا سوٹ پیس خریدنے کے لیے داخل ہو رہی ہو۔“

”اب کہیں کوئی کپڑا پسند نہیں آ رہا ہے تو میں کیا کروں؟“

”ہر دکان پر ایک ہی سا کپڑا ہے مگر تمہیں تو شوق ہے وقت ضائع کرنے کا۔“

”آپ کو جلدی ہو رہی ہے تو رہنے دیں، پھر کبھی آ جائیں گے۔“

”پھر کسی دن بھی یہی ہوگا۔ جب اتنا وقت گزارا ہے تو کچھ اور سکی۔ چلو یہاں بھی دیکھ لو۔“

وہ میرے ساتھ ہی دکان میں داخل ہوا تھا لیکن بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم ابھی طرح بھاڑتا دکھ لو۔ میں سگریٹ لے کر آتا ہوں۔“

میں نے شکر بھیجا کہ اب میں آرام سے خریداری کر سکوں گی۔

اس کے جاتے ہی مارکیٹ میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ میں صرف اتنا ہی دیکھ سکی تھی کہ دکاندار ہوا میں اچھلتا تھا۔ خود مجھ پر کیا جیتی مجھے کچھ یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ بے پناہ شور کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھی۔ ڈیشان کے مطابق مجھے دوسرے دن ہوش آیا تھا۔

میرا آدھا چہرہ اور بازو جیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر کیا گزری ہے اور کیوں گزری ہے لیکن جلد ہی معلوم بھی ہو گیا کہ مارکیٹ میں بم دھماکا ہوا تھا۔ ڈیشان مارکیٹ سے باہر نکل چکے تھے اور میں اس کی زد میں آ گئی تھی۔

یہ ایک حادثہ تھا۔ یہ حکومت کی ذمہ داری تھی کہ اس میں زخمی ہونے والوں کا بہتر سے بہتر علاج کرایا جائے لیکن ان زخمیوں کو جن میں، میں بھی شامل تھی، سرکاری اسپتال میں ڈال دیا گیا تھا۔ اعلانات بہت سے ہو چکے تھے۔ عمل کسی پر بھی نہیں ہوا۔ کوئی سرکاری اہلکار پلٹ کر بھی نہیں آیا کہ اسے زخمیو، تم پر کیا گزری۔ معاوضہ دینے کا اعلان ہوا، وہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

میں ایک مہینے بعد گھر آئی تو اس حال میں تھی کہ میرا آدھا چہرہ بڑی طرح سخ ہو چکا تھا۔ ایسا کہ دیکھنے والا فوراً منہ پھیر لے۔ میرا بازو بھی جلا تھا لیکن..... بازو تو آستین میں چھپا رہتا تھا، چہرے کو کیا کرتی؟

ڈیشان کا رد عمل فطری تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے سے کترارہے تھے۔ بیڈ روم میں آتے تھے تو فوراً لائٹ آف کر دیتے تھے۔ کوشش کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر رہیں۔ میں اس صورت حال سے اُلجھنے لگی تھی۔

”ڈیشان! مجھے احساس ہے کہ میرا چہرہ بگڑ گیا ہے۔ آپ میری طرف دیکھنے سے بھی گریزاں ہیں۔ آپ میری پلاسٹک سرجری کیوں نہیں کرادیتے؟“

”تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے یہ کوئی معمولی بات ہے۔ جلد اتنی زیادہ خراب ہوگئی ہے کہ اس کے لیے بیرون ملک جانا پڑے گا۔ تمہارے پاس تو اتنے زیور بھی نہیں ہیں کہ بیچ کر چلی جاؤ۔“

مجھے ایک مرتبہ پھر احساس ہوا کہ میں نے ڈیشان سے شادی کر کے غلطی کی۔ تلاش شوہر محبت دے سکتا ہے، علا نہیں کر سکتا۔

وہ یہی کہتے رہے تھے کہ پیسوں کا انتظام کر رہا ہوں لیکن مجھے معلوم تھا کہ مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ تو پھیر سکتے ہیں، پیسوں کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اب تو وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہنے لگے تھے۔

ایک دن دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر عارف کھڑا تھا۔

”ڈیشان گھر پر ہیں؟“

”وہ تو نہیں ہیں۔“

”میں نے تمہارا سنا تھا۔ دیکھنے چلا آیا۔ جب ڈیشان ہوگا اس وقت آ جاؤں گا۔“

”آئیے، اندر آ جائیے۔ وہ بھی آ جائیں گے۔“

”نہیں، میں چلتا ہوں۔ وہ نہ جانے کیا سوچے؟“

”کچھ نہیں سوچیں گے۔ میرے رشتے دار کیا آتے نہیں ہیں۔“

”میں بزنس ٹور پر امریکا گیا ہوا تھا۔ پرسوں آیا ہوں ورنہ پہلے آ گیا ہوتا تمہیں دیکھنے۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ!“

”تم نے پلاسٹک سرجری کیوں نہیں کرائی؟ آج کل بہت سے جدید طریقے آ گئے ہیں۔“

”ڈیشان کہہ رہے ہیں اس کے لیے بیرون ملک جانا پڑے گا۔ وہ پیسوں کا انتظام کرتے تو پھر رہے ہیں، دیکھو کہا ہوتا ہے؟“

ہم دونوں حکومت کی بے حسی اور ڈیشان کے طرز عمل وغیرہ پر باتیں کرتے رہے پھر وہ یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ کسی دن

ہمان کی موجودگی میں آئے گا اور اس سے بات کرے گا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں اپنے ماضی کی طرف لے گئی۔ ایک عارف ہے جو گھومنے پھرنے کے لیے امریکا لپکتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ علاج کے لیے بھی نہیں جاسکتے۔ گھر کی شادی عارف سے ہوگئی ہوئی تو میرا علاج کب کا ہوتا۔“

چار چھ روز بعد عارف پھر آیا۔ اس دن بھی اتفاق سے امان گھر پر نہیں تھے۔

”طلعت، تم نے مجھے ٹھکرایا تھا لیکن میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟“

”میں فائدے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نے تو یہ بات اس لیے کہی کہ میری محبت کا تقاضا ہے کہ میں تمہیں وہاں ملک لے جا کر تمہارا علاج کراؤں۔“

”آپ پر میرا کیا حق ہے؟“

”بقول تمہارے میں تمہارا رشتے دار بھی تو ہوں۔“

”میں ڈیشان سے بات کر کے دیکھوں گی۔“

میں نے ڈیشان سے بات کی تو ان کے چہرے پر عجیب طرح کی حقارت اُبھر آئی۔ لب لباب یہ کہ میرا سابق منگیتر نے علاج کرائے، یہ ان کی غیرت کے منافی تھا۔ اس روز ڈیشان سے میری خوب جھڑپ ہوئی۔

عارف پھر آیا تو میں نے یہ تجویز رکھی کہ اگر ڈیشان بھی ہمارے ساتھ چلے تو ہم چل سکتے ہیں۔

”اسے تمہاری پروا نہیں اور تم اسے ساتھ لے جانے کی بات کر رہی ہو۔“

”وہ جیسا بھی ہے، میرا شوہر تو ہے۔“

”وہ تمہاری بد صورتی کو بہانہ بنا کر دوسری لڑکیوں کے ہاتھ میں کرنا پھر رہا ہے اور تم اسے شوہر کہہ رہی ہو۔“

”دوسری لڑکیوں کے ساتھ.....؟“

”ہاں، میں نے خود اسے دیکھا ہے لیکن اس سے مت کہنا ورنہ وہ تمہارا جینا دو بھر کر دے گا۔“

عارف بیٹھا تھا کہ ڈیشان آ گیا۔ یہ ظاہر اچھی طرح ملا، لیکن اس کے چلے جانے کے بعد اس نے مجھ پر الزامات کی، ہمارا کردی۔ میں نے بھی بے نقط سنائیں۔ اسے ان کیوں کا بھی طعنہ دے دیا جن کے ساتھ وہ گھومتا پھرتا ہے۔ اسی دن کے بعد سے ہم میں فاصلے بڑھتے چلے گئے تھے۔

عارف کو میں نے گھر آنے سے منع کر دیا تھا لیکن معاملہ

علاج اور اس کی تیاریوں کا تھا لہذا میں اس سے باہر جا کر ملنے لگی۔ وہ مجھے فون کر دیتا اور میں اس کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ جاتی۔

معاملہ وہیں کا وہیں تھا۔ ڈیشان مجھے اس کے ساتھ بھیجے پر تیار نہیں تھے اور عارف، ڈیشان کو ساتھ لے جانے پر رضامند نہیں تھا۔

ان ملاقاتوں میں، میں عارف کے بہت قریب آ گئی تھی۔ یہ سوچنے لگی تھی کہ عارف میری بد صورتی کے باوجود مجھ سے محبت کرتا ہے جبکہ ڈیشان کی محبت نفرت میں بدل گئی ہے۔ پھر ایک دن عارف کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

”اگر تم ڈیشان سے پیچھا چھڑالو تو میں اب بھی تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہوں۔ تمہیں امریکا لے جا کر تمہارا علاج بھی کراؤں گا اور تم سے شادی بھی کر لوں گا۔“

یہ ایسا مضبوط سہارا مجھے مل گیا تھا کہ ڈیشان مٹی کا ڈھیر معلوم ہونے لگا۔ میں نے اس سے جان بوجھ کر لڑنا شروع کر دیا۔ جواب میں وہ بھی لڑتا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ وہ تو شاید خود بھی یہی چاہتا تھا۔ میں اسی کے گھر آئی۔ انہوں نے بھی مجھے سمجھایا لیکن میں کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ ڈیشان نے مجھے طلاق دے دی۔

میں نے عارف کو یہ خبر اسی طرح سنائی جیسے کوئی بہت بڑی خوش خبری ہو۔ وہ بھی ٹھل اٹھا۔

”میں یہ خبر سننے کے لیے کب سے بے تاب تھا۔ آج تم نے دل خوش کر دیا۔ بس عدت کے دن پورے کر لو۔ پھر ہم امریکا چلیں گے۔“

”میں نے تمہیں ٹھکرا کر غلطی کی تھی عارف، مجھے معاف کر دو۔“

”تم میری تھیں، مجھے مل گئیں بس تیاری کر دو۔“

میری عدت کے دن پورے ہوئے تو میں نے عارف کو فون کیا۔ ایک مرتبہ پھر پچھتاوا میرے سامنے کھڑا تھا۔

”میں کل مستقل قیام کے لیے امریکا روانہ ہو رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں اب شادی بھی کر لوں۔“

”تم نے.....؟“

”دیکھو طلعت، تم نے منگنی توڑ کر میری توہین کی تھی۔ میرا انتقام پورا ہو گیا۔ تم میری نہیں ہوئیں، میں نے تمہیں ڈیشان کا بھی نہیں رہنے دیا۔ معاف کرنا، تم جیسی بد صورت لڑکی سے میں شادی نہیں کر سکتا۔“

میرے ہاتھ سے فون چھوٹ گیا۔

میری زندگی میں اب دھول بھرے سنائے کراچ ہے۔ میں نے جو بویا وہی کاٹ رہا ہوں۔ زندگی کو پر تعیش بنانے کے لیے میں نے جو کوشش کی تھی وہ چور راستے کی تھی اسی لیے خداوند تعالیٰ نے ایسی سزا دی ہے کہ میں سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔

انور علی
(کراچی)

میں نے کال بیل کا بٹن دبایا تو تھوڑی دیر بعد ایک ملازم نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے میرے خوبصورت کپڑوں اور چمک والے جوتوں پر ایک نظر ڈالی اور ادب سے بولا ”آئیے، انور صاحب! اندر آ جائیے۔“

اس نے مجھے ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا جو خوشبو سے مہک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم میں رمشا داخل ہوئی۔ اس نے بہت شوخ رنگ کی فرائڈ پہن رکھی تھی۔ اس کے خوبصورت براؤن بال پونی کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ منہ پھلا کر بولی ”انور! آج تم پھر دیر سے آئے ہو۔ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟“

”سوری!“ میں نے کہا ”میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا۔“ میری عمر اس وقت صرف چودہ سال تھی اور رمشا دس گیارہ سال کی ہوئی لیکن وہ روشنی تھی تو بالکل الہڑدو شیرہ لگتی تھی۔

”رمشا! اب اپنا موڈ درست کر لو، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ رمشا کھلکھلا کر باہر کی طرف بھاگی۔ میں اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ وہ لان میں پہنچ گئی اور اچانک مانی سے پانی کا بائب چھین لیا۔ پھر اس نے پانی مجھ پر پھینکا تو ایک دم میری آنکھ کھل گئی۔

میں اپنے غلیظ اور بوسیدہ بستر پر تھا اور سر پر اماں کھڑی تھیں اور چیخ رہی تھیں ”کیا نشہ کر کے سوتا ہے؟ میں کب سے تجھے آوازیں دے رہی ہوں۔ جلدی سے اٹھو، ورنہ اب استاد ویر برداشت نہیں کرے گا۔“

”اٹھتا ہوں اماں!“ میں نے منہ بنا کر کہا اور بڑبڑا ہوا غسل خانے کی طرف چلا گیا جہاں پرائی اور میکی سی پانی ٹنگی رکھی تھی۔ میں نے وہیں بیٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور سوچا کہ اماں نے فضول میں مجھے خیند سے بیدار کر دیا۔ میں حسین خواب دیکھ رہا تھا۔

پھر میں نے بیل اور میل میں ڈوبے ہوئے کپڑے پہنے، جائے کے ساتھ باسی روٹی کھائی اور ورکشاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں گزشتہ چار سال سے اس ورکشاپ میں کام تھا۔ میں دس سال کا تھا تو ایسا انتقال ہو گیا تھا اور گھر ساری ذمے داری مجھ پر آ پڑی تھی۔

میں اُن دنوں چھٹی جماعت میں پڑھ رہا تھا اور میرے ٹیچر کا خیال تھا کہ میں بہت ذہین ہوں اور ایک دن اسکول نام ضرور روشن کروں گا لیکن اسکول کا نام روشن کرنے پہلے ہی میری امیدوں کے تمام دیے گل ہو گئے۔

ابا ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ ہم افراد کے لیے کافی ہوتی تھی۔ مگر بھی اپنا تھا اور ابا کا ارادہ کہ وہ ماؤس بلڈنگ سے قرض لے کر اس گھر کو ڈراڈ سے تعمیر کرائیں گے لیکن وقت نے انہیں اتنی مہلت ہی دی۔ یوں مجھے اس ورکشاپ پر کام کرنا پڑا۔

ورکشاپ کا مالک جبار بہت غصیلہ اور جتھ جھٹ تھا گالیاں تو اس کی زبان پر رہتی تھیں۔

ہمارے محلے کے چاچا اکرام سے اس کی دوستی تھی۔ مجھے جبار کے پاس لے گئے تھے۔

استاد نے سر سے جیر تک میرا جائزہ لیا، پھر بولا ”بھئی! اگر تجھے کام سیکھنا ہے تو بہت محنت کرنا پڑے گی۔“

کوئی چھٹی برداشت نہیں کرتا ہوں، چوری چکاری بھی مجھے نہیں ہے۔“

”استاد!“ میں نے پُراعتاد لہجے میں کہا ”نہ میں چور ہوں اور نہ کام سے جی چراتا ہوں۔ پہلے جس طرح اسکول میں محنت سے پڑھتا تھا، اسی طرح یہاں بھی محنت سے کام لے گا۔“

”ابے، تیری تو زبان بھی بہت چلتی ہے مگر یہاں اپنی زبان پر قابو رکھنا، یہاں کاریگروں میں مجید مہب سے ہے، اس کے بعد احمد ہے۔ ان دونوں سے زبان درازی نہ کرنا ورنہ نقصان میں رہے گا۔ مجید تو غصے کا اتنا تیز ہے کہ ہاتھ میں ہو، سچ مارتا ہے۔“ پھر وہ اکرام چچا سے بولا ”ابھی تو میں اسے دس روپے روز دوں گا اور صبح شام دو وقت پکارتے بھی لے گی۔ ہاں کھانا اسے گھر سے لانا پڑے گا۔“

”تمہاری بہت مہربانی استاد!“ اکرام چچا نے کہا ”بے چارہ جیم تچہ ہے۔ کوئی ہنر ہاتھ میں آیا تو اس کا مستقبل بھی بن جائے گا۔“

”ٹھیک ہے بے!“ استاد جبار نے مجھ سے کہا ”کل سے آ جاؤ اور ہاں، اپنے یہ اُچلے کپڑے اتار کر کوئی میلا سوٹ پہن کر آنا۔ یہاں ایسے کپڑوں کا کوئی کام نہیں ہے۔“ میں نے دیکھا، وہاں ہر لڑکا میل اور تیل میں لتھڑے ہوئے کپڑوں میں ملبوس تھا، ان کے ہاتھوں پر بھی کالک تھی جو بے خیالی میں ان کے چہرے پر بھی لگ گئی تھی۔

محبید اس وقت کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے

استاد اور مجید دونوں میرے کام سے بہت خوش تھے
مجید کے خیال میں مجھے اب مزید سیکھنے کے بجائے پریکٹس
ضرورت تھی۔ استاد کا کہنا تھا کہ ابھی پورا ملکینک بننے کے
ایک آج کی نہیں بلکہ کئی آج کی کسر تھی۔ اس نے اب میرے
دھڑی میں بھی اضافہ کروا دیا تھا۔ اب وہ مجھے تیس روپے

”ایک منٹ!“ استاد نے چابی لگا کر گنیشن آن کر دیا، رالٹس بورڈ کی طرف دیکھ کر بولا ”ابے ہار! گاڑی میں بدول تو ہے عین نہیں، یہ کیا ہوا سے اشارٹ ہوگی؟“

”فول کا کچ خراب ہے استاد!“ میں نے بے زاری سے کہا ”میں نے بھی گاڑی کے مالک سے یہی پوچھا تھا، اس

”اے گاڑی میں پیٹرول ہے ہی نہیں، جب مالک

یہاں لایا تو گاڑی کے دوپٹے کام نہیں کر رہے تھے۔ اس وجہ سے.....

”میں سمجھ گیا استاد!“ میں نے کہا ”یہاں تک پہنچنے پہنچنے گاڑی کا پیٹرول ختم ہو گیا۔ گاڑی کے پلگ خراب ہوں تو وہ دو گھنٹے سے زیادہ پیٹرول کھاتی ہے۔“

”اب کسٹمر اس بات کو تو مانے گا نہیں اس لیے گاڑی میں پیٹرول ڈلو۔ اس کی قیمت بھی سروس میں لگا دینا۔“

پھر استاد خود مجھے کام سکھانے لگا۔ اس کے ساتھ کام کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی اپنے فن کا ماہر تھا۔ اس نے گاڑی کے انجن کی مختلف اوزاروں کے بارے میں بتایا کہ کس طرح کی آواز میں گاڑی میں کیا خرابی ہو سکتی ہے۔

میں دو ہی مہینے میں آواز سن کر اندازہ لگا لیتا تھا کہ گاڑی میں کیا خرابی ہو سکتی ہے؟

اس ورکشاپ پر میں نے پہلی دفعہ رشتہ کو دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت سی نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والی لڑکی مجھے پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔ اس کا باپ البتہ انتہائی مغرور اور بد اخلاق تھا۔

اس دن اتفاق سے استاد اور مجید دونوں ہی نہیں تھے۔ اس کی چمکتی دھنکی ہنڈا سوک وہاں آ کر رکی تو میری نظر اس خوبصورت لڑکی پر پڑی۔ میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بھی بہت دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

جب لڑکی کے باپ نے دو تین دفعہ ہارن بجایا تو مجھے ہوش آیا اور میں اس کے نزدیک پہنچ کر بولا ”جی صاحب، گاڑی میں کوئی پرابلم ہے؟“

”جبار کہاں ہے؟“ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”استاد تو کام سے گئے ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اور مجید؟“ اس نے پھر حقیر آئیز لہجے میں پوچھا۔

”وہ بھی نہیں ہیں۔ آپ مجھے بتائیں سر! گاڑی میں کیا پرابلم ہے؟“

”مجھے بتاؤ؟“ اس نے حقارت سے مجھے دیکھا ”یہ پندرہ لاکھ کی گاڑی ہے، تو تو اس کا بیڑا غرق کر دے گا۔“

”آپ گاڑی کو اشارت تو کریں سر!“ میں نے اس کی کڑی سیلی باتیں پیتے ہوئے کہا۔

”اچھا!“ اس نے پھر حقارت سے کہا اور گاڑی اشارت کر دی۔

میں نے گاڑی کی آواز غور سے سنی، پھر اپنی تسلی کے لیے یونٹ کھول کر میں نے آواز سنی اور اس سے کہا ”جناب، انجن بند کر دیں۔“

اس نے انجن بند کر دیا۔

”آپ کی گاڑی کی کچھ پلیٹیں ختم ہو گئی ہیں سر! گاڑی گرم بھی ہو رہی ہوگی، اس کے ریڈی ایٹر میں بھی خرابی ہے۔ پانی انجن میں پوری طرح سرکولیت نہیں کر رہا ہے۔“

”تیرا کیا دماغ خراب ہے؟“ وہ انتہائی درشت لہجے میں بولا۔

”میرا دماغ بالکل صحیح ہے سر! میں تو.....“

”اوائے بس کر!“ وہ حقارت سے بولا ”میں تم ملکیوں کے ہتھکنڈوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے یہ گاڑی چھ مہینے پہلے شوروم سے نکلوائی ہے، زبردستی..... اور مجھے بے وقوف بنانا ہے کہ گاڑی کی کچھ پلیٹیں کام نہیں کر رہی ہیں۔“

”اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو گاڑی کو کمپنی ورکشاپ میں کیوں نہیں لے جاتے؟“

”اچھا تو بکواس بند کر۔ مجھے مشورے مت دے سمجھا۔“

”ملکیو جی پلیز سر!“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ میں اُلوں میٹرک میں پڑھ رہا تھا اور میری انگلش کلاس میں سے اچھی تھی۔

”وہاٹ!“ وہ درشت لہجے میں بولا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

وہ خاصا دراز قد آدمی تھا۔

”تو..... تو مجھے کہہ رہا ہے کہ میں زبان سنبھال کر بات کروں یو باسٹرڈ! یہ جملہ تو نے کہاں سے سیکھ لیا؟“

میں نے اسے انگریزی میں جواب دیا ”اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ اگر تمہیں کام نہیں کرانا ہے تو یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ، باسٹرڈ!“

اسے مجھ سے اس لہجے اور اس جملے کی توقع نہیں تھی۔ اس کے جواب میں نہ صرف مجھے ماں کی گالی دی بلکہ ایک زوردار پھٹک بھی میرے چہرے پر رسید کر دیا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نزدیک پڑا ہوا بیماری رونا اٹھالیا اور اس کے سر پر مارنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے کسی نے ریچ پکڑ لیا۔

میں تھملا کر پلکا تو مجھے مجید نظر آیا۔ اسی نے میرا ہاتھ روک دیا۔

”کسٹمر کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرتے انو!“ اس سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”چاہے کسٹمر تمہیں انتہائی غلیظ گالیاں دے، مارے

پٹے؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

”تو بہت بڑا بد معاش ہے؟“ گاڑی والا چیخ کر بولا

”میں ابھی تیری ساری بد معاشی نکالوں۔“

گاڑی کو جذباتی انداز میں ریورس کرنے کے بعد وہ میری سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

”اپنے غصے پر قابو پانا سیکھ انو!“ مجید نے کہا ”جانتے ہو یہ..... کون تھا؟“ اس نے حسب عادت جملے کے درمیان میں ایک موٹی سی گالی فٹ کرتے ہوئے کہا ”یہ شہر کا معروف بزنس مین جاوید اکی ہے۔“

”یار، وہ بزنس مین ہو یا سرکاری ملازم۔“ میں نے کہا

”اسے گالم گلوچ اور مار پیٹ کا حق کس نے دیا ہے؟“

”اچھا چھوڑا“ مجید نے کہا ”یہ ہمارا بہت پرانا کسٹمر ہے۔ یہ پھر آئے گا۔ استاد اس کا غصہ ٹھنڈا کر دے گا۔ چل یار، کھانا کھا لیں۔ استاد تو پتا نہیں کب آئے؟“

ہم دونوں استاد کے کیمین میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ ہم نے کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ ورکشاپ میں پولیس کی ایک موبائل داخل ہوئی۔

”یہ آگئے منفعے!“ مجید نے کہا۔ پولیس والے اکثر اپنی موبائلیں ٹھیک کر دینے آتے تھے لیکن پیسے نہیں دیتے تھے۔

”یار! تو دیکھ.....“ مجید نے کہا ”میں تو بہت تھک گیا ہوں۔“

میں کیمین سے باہر نکلا تو انسپکٹر نے مجھے آواز دی ”اے لڑکے! ادھر آ۔“ وہ شاید نیا تھا اور مجھے پہچانتا نہیں تھا۔

”جی سر!“ میں نے نزدیک جا کر کہا۔

”انوکون ہے؟“ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”انوکینی ہے صاحب!“ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے لارینڈر نے کہا۔

”تم ذرا تھانے چلو۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”سر، وہاں کوئی گاڑی خراب ہو گئی ہے کیا؟“ میں نے اس پر پوچھا۔

”موبائل میں بیٹھ۔“ انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا

”وہاں چل کر معلوم ہوگا کہ گاڑی خراب ہوئی ہے یا تیرا دماغ!“

مجید بھی کیمین سے نکل آیا اور بولا ”کیا بات ہے صاحب! کیا انوکے خلاف کوئی رپورٹ ہے؟“

”تو زیادہ بکواس مت کر۔“ انسپکٹر نے اسے جھڑک دیا۔

میں خاموشی سے موبائل میں بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

موبائل جب تھانے پہنچی تو میری نظر اس گاڑی پر پڑی جس کے مالک سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اچانک سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ گویا پولیس اس شخص کی شکایت پر مجھے تھانے۔ اٹھالائی تھی۔

تھانے پہنچ کر ایک سپاہی نے مجھے بے دردی سے مکیٹ کر دین سے باہر نکالا اور میری گردن پر ایک زوردار ہاتھ جما کر بولا ”اندر انچارج صاحب کے کمرے میں چل!“

تھانے کا انچارج انتہائی خراش قسم کا رشوت خور افسر تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ اس کی ذاتی گاڑی بھی ’منفعے‘ میں ٹھیک کی تھی۔

”کیوں اوائے!“ اس نے مجھے دیکھ کر کہا ”اب تیرے اتنے دماغ ہو گئے ہیں کہ تو کسٹمر پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا ہے۔“ انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔

”غلطی ان صاحب کی ہے سر!“ میں نے کہا ”پہلے انہوں نے مجھے گالی دی اور پھر مارا!“ میں نے کہا۔

”پھر تو نے کیا کیا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”اس نے تو مجھے مارنے کے لیے ایک دزنی پانا اٹھالیا تھا۔ اگر اس کا ساتھی اسے پکڑ نہ لیتا تو اب تک وہاں میری لاش پڑی ہوتی۔“ اس شخص نے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!“ انسپکٹر نے کہا ”میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ یہ دوبارہ کسی کسٹمر سے بدتمیزی کرنا بھول جائے گا۔“

”پاپا!“ لڑکی نے پہلی دفعہ زبان کھولی ”آپ نے پہلے اسے گالیاں دینا شروع کیں، پھر گاڑی سے اتر کے اسے پھینک مارا۔“

”تم چپ رہو رشتا!“ ملک نے اسے جھڑک دیا۔

یوں مجھے معلوم ہوا کہ اس نازک اندام سی حسین لڑکی کا نام رشتا ہے۔

”اسے بند کر دو۔“ انسپکٹر نے ایک سنتری سے کہا۔ ”ایک دو دن یہاں رہے گا تو اس کے دماغ کی ساری اڑنکل جائے گی۔“

سنتری مجھے پھنڈا اور ٹھنڈے مارتا ہوا حوالات کی طرف لے گیا اور گردن پکڑ کر مجھے اندر رکھ لیا۔

اپنی توہین اور بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مجھے امید تھی کہ ابھی تھوڑی دیر میں استاد آ کر مجھے چھڑا لے گا لیکن شام سے رات ہو گئی۔ وہاں نہ استاد آیا، نہ

میرے دل میں ان دونوں کے خلاف بھی نفرت کی اک لہر اٹھی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد میں استاد کے ساتھ کام نہیں کروں گا لیکن اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ میں وہاں سے نکلوں گا کیسے؟

رات کو پولیس والوں نے مجھ پر تشدد کیا۔ میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھ سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی پاداش میں مجھ پر اتنا تشدد کیا جا رہا ہے؟ رات بھر تشدد کرنے کے بعد مجھے ان لوگوں نے پھر حوالات میں بند کر دیا۔

موبائل کا ڈرائیور بھلا آدی تھا۔ وہ خاموشی سے میرے پاس آیا اور بولا "الو! تو فکر مت کر۔ تیرا استاد تجھے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر آج ان لوگوں نے تجھے نہیں چھوڑا تو وہ شام تک کسی وکیل کو لے کر آئے گا۔"

"لیکن میں نے کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ملک نے اسپیکٹر کو دس ہزار روپے دیے ہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"مجھے مارنے پینے کے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں، تو نے اس کی بے عزتی جو کی تھی۔" پھر وہ آہستہ سے بولا "اب میری بات غور سے سن۔ ابھی تک تیری گرفتاری کا کوئی ثبوت ہی نہیں ہے اور پرچہ بھی نہیں کٹا ہے۔ اگر تیرا استاد پولیس والوں کو کچھ رقم دے دے تو تیری جان چھوٹ سکتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میرے ذہن میں آنندھیاں ہی چلنے لگیں۔ اس ملک نے محض اس وجہ سے مجھے حوالات میں بند کروا کے تشدد کیا کہ میں نے اس کی گالیوں کے جواب میں گالی دی تھی۔ میرے جسم کا رواں رواں انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔

شام کو ایک سنتری حوالات کے دروازے پر آیا اور بولا "الو! چل تجھے صاحب نے بلایا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ صاحب، ملک سے ملے ہوئے رشوت کے دس ہزار روپے کو حلال کرنا چاہتا ہے۔ شاید مجھ پر تشدد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔

انچارج کے کمرے میں استاد کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"لیں جی جبار صاحب! آپ اپنے بندے کو لے جائیں۔ آپ ناحق ایس ایس پی صاحب کے پاس گئے۔ میں نے اسے شے میں گرفتار کیا تھا لیکن وہ شہر ہی تھا۔ میں تو آج خود اسے چھوڑنے والا تھا۔"

"چلو! استاد نے کہا۔"

میں اس کے ساتھ اٹھ کر خاموشی سے باہر آ گیا۔ استاد ایک گاڑی بھی لایا تھا۔ مجھ سے چلنا دو بھر ہوا تھا۔ میں جیسے تیسے گاڑی تک پہنچا اور اس میں بہت مشکل سے بیٹھا۔ پولیس والوں نے مجھے بہت بے دردی سے مارا تھا۔

استاد نے مجھے بتایا کہ میں نے ایس ایچ او سے پہلے ہی بات کی تھی لیکن اس وقت اس نے مصروفیت کی وجہ سے بات کرنے سے انکار کر دیا، ایس ایس پی صاحب کی گاڑی بھی اکثر آتی رہتی ہے ہماری ورکشاپ میں۔ ان سے بھی میری اچھی سلام دعا ہے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچ گیا۔ پھر ان کے ایک ہی فون پر اسپیکٹر نے تمہیں چھوڑ دیا۔ "استاد! یہ فون تم کل بھی تو کر سکتے تھے؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"میں نے تو کوشش کی تھی لیکن ایس ایس پی صاحب کراچی سے باہر تھے۔ وہ آج صبح ہی تو پہنچے ہیں۔"

"اماں پتا نہیں کیا سوچ رہی ہوں گی؟" میں نے کہا۔ "تم ان کی فکر مت کرو۔ ورکشاپ کا ایک لڑکا تمہارے گھر اطلاع دے آیا تھا کہ آج کام بہت ہے۔ الو آج نہیں آئے گا۔"

ایسا ایک دودھ پہلے بھی ہوا تھا اس لیے اماں نے یقین کر لیا ہوگا۔

استاد وہاں سے سیدھا مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن لگایا اور کچھ دواؤں لکھ دیں اور تاکید کی کہ انہیں تین دن تک پابندی سے استعمال کرنا۔ اب میرے ذہن میں اُنٹے بیٹے صرف ایک ہی خیال رہتا تھا، ملک سے انتقام!

پھر وقت خوش گوار اور ناخوشگوار یادیں سیٹھ بیت گیا۔

میں نے بی اے کر لیا۔ اب میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ میں دعویٰ یا سودی حرب لکل جاؤں لیکن وہاں بھی حالات اب وہ نہیں رہے تھے جو اب سے بیس سال پہلے تھے۔ وہاں سے تو لوگ واپس آ رہے تھے۔

ایک دن میں شائنگ کر رہا تھا کہ مجھے ایک انتہائی حسین لڑکی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر میں پہچان گیا کہ وہ رمشا ہے۔ وہ اس وقت اپنی کسی دوست کے ساتھ تھی۔

اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور مجھے اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی جھلک نظر آئی۔ پھر وہ مسکرا کر میری طرف بڑھی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"آپ..... الو..... ہیں نا وہی ملکینک..... جو....."

"جی ہاں، میں الو ہوں، انور علی!" میں نے کہا "آپ کیسی ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں بھی ایک نفسی آگئی تھی۔

"آپ کیا ابھی تک اسی ورکشاپ میں ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا "میں اسی ورکشاپ میں ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے بی اے بھی کر لیا ہے....."

"ارے، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" رمشا مسکرا کر بولی۔

"یہ کون صاحب ہیں رمشا؟" اس کی دوست مسکرا کر بولی "ذرا ہم سے بھی تو تعارف کراؤ۔"

"بھئی یہ انور علی صاحب ہیں، یہ بہت اچھے ملکینک ہیں۔"

"اگر ہمارے ملک کے سارے ملکینک اتنے پینڈسم اور امارت ہو جائیں تو....."

"تو کیا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا "یہ آپ مجھ پر طنز کر رہی ہیں یا میری تعریف کر رہی ہیں؟"

"نہیں، میں آپ کی تعریف کر رہی ہوں۔ ایسا ملکینک میں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔"

"آپ کی تعریف کا بہت شکریہ!" میں نے ہنس کر کہا۔ اب میری آمدنی ابھی خاصی تھی، مجید نے اپنی الگ ورکشاپ کھول لی تھی۔ استاد نے مجھے ورکشاپ میں تین فی صد کا پارٹنر بنا لیا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں میں بھی اسے چھوڑ کر نہ چلا جاؤں۔

میرے گھر کی حالت بھی سدھرنی تھی۔ اب میرے گھر میں کافی زدہ غسل خانہ نہیں بلکہ کمروں کے ساتھ خوبصورت ٹائلز والے باتھ روم تھے۔

مجھے ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ اماں کی صحت بھی قابل رشک تھی۔ بس میرے دل میں ایک ہی غلغلہ تھی۔ ملک سے بدلہ لینے کی غلغلہ! میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اس سے اپنی توہین کا بدلہ ضرور لوں گا۔

رمشا ایک مرتبہ پھر مجھے اسی شائنگ سینٹر میں ملی۔ اس مرتبہ وہ تنہا تھی۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگی۔

میں نے ہنس کر کہا "محترمہ رمشا ملک صاحبہ! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لیں۔"

"مجھے اعتراض ہے۔" رمشا نے کہا "میں تمہارے ساتھ چائے نہیں پی سکتی۔"

مجھے شدید مایوسی نے گھیر لیا۔ "جیسے آپ کی مرضی!" میں نے کہا۔

"لیکن مجھے تمہارے ساتھ کافی پینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اصل میں چائے مجھے پسند نہیں ہے۔ میں آئس کریم کافی پیتی ہوں یا پھر کوئلڈ ڈرنک۔"

"تو پھر تشریف لائیے۔"

میرے پاس ہمیشہ ورکشاپ میں آئی ہوئی کوئی نہ کوئی گاڑی ہوتی تھی۔ اس دن بھی میرے پاس جدید ماڈل کی ایک کرولا تھی۔ میں اسے گاڑی میں بٹھا کر ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہاں کے خوابناک ماحول میں ہم نے کافی تو کم ہی پی، ایک دوسرے کو زیادہ دیکھا۔ پھر تو رمشا اکثر مجھے ملنے لگی۔ میں اسے کبھی لاٹنگ ڈرائیو پر لے جاتا، کبھی سی سائڈ پر۔

ایک دن میں نے ہمت کر کے کہا "رمشا! ایک بات کہوں، پُرانا تو نہیں مانو گی؟"

"ایسی کون سی بات ہے الو!" اس نے ہنس کر کہا "کہ تمہیں میرے پُرمانے کا خطرہ ہے؟"

"ایسی ہی بات ہے۔" میں نے کہا "لیکن میری ایک ریکورڈسٹ ہے، اگر پُرمانی مانو تو پلیز..... مجھ سے ملنا مت چھوڑنا۔"

"فار کا ڈسک..... الو!" رمشا نے کہا "اتنی مسٹری کی کیا ضرورت ہے؟"

"رمشا..... بات..... اصل میں..... یہ ہے کہ..... میں..... تمہیں پسند..... کرنے لگا ہوں۔" میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

رمشا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی پلکیں جھک گئیں اور وہ چند لمحے کو بالکل خاموش ہو گئی۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ ابھی رمشا کہے گی۔ دو ٹکے کے ملکینک! تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ بات منہ سے نکالنے کی۔ میں نے ہنس کر دہرائیں کیا کر لیں کہ تم تو آپے سے باہر ہو گئے۔

رمشا نے آہستہ آہستہ اپنی گھٹی پلکیں اٹھائیں اور تھمرتھراتے ہوئے لہجہ میں بولی "تم نے یہ بات کہنے میں اتنی دیر کیوں لگی؟"

"رمشا! میں اکثر سوچتا تھا کہ اگر میں نے یہ بات کہی اور تم ناراض ہو گئیں تو میں اس ملاقات سے بھی جاؤں گا۔ میں تمہیں کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا رمشا!"

”میں بھی تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتی“
 ”لو! رمشا نے جذباتی لہجے میں کہا۔“
 ”آج کا دن ہماری زندگی کا بہت یادگار دن ہے۔ آج میں اس کے ایک ایک پل کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسے سٹی بریٹ کرنا چاہتا ہوں۔“
 پھر ہم لاٹک ڈرائیو پر نکل گئے۔ پھر رمشا نے سی فوڈ کھانے کا پروگرام بنالیا۔ ہم سی ویو پر واقع ایک ریسٹورانٹ کے لان میں جا بیٹھے۔
 میں نے کھانا کھاتے ہوئے اس سے کہا ”رمشا، کیا تمہارے والد مجھے قبول کر لیں گے؟“
 ”انہیں قبول کرنا پڑے گا۔“ رمشا نے ہنس کر کہا ”میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ میری بات ہر صورت میں مانیں گے۔ الو۔ تم ابھی سے اس کی فکر مت کرو۔“
 ”رمشا، تمہیں یاد ہے، جب تمہارے والد ہماری ورکشاپ میں گاڑی لائے تھے تو.....“
 ”مجھے سب کچھ یاد ہے، تمہاری بے بسی اور توہین کے احساس سے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں نے مجھے بھی رولا دیا تھا۔ میں نے تو پولیس اسٹیشن میں بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ پہل ڈیڑی نے کی تھی۔“
 ”لیکن تم جانتی ہو، اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“
 ”اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
 ”تمہارے والد نے پولیس انسپکٹر کو دس ہزار روپے دیے تھے۔ اس لیے کہ وہ دو دن تک مجھ پر بدترین تشدد کرے، پولیس نے ساری رات مجھ پر بہت تشدد کیا۔ اس کے نشانات آج بھی میرے جسم پر موجود ہیں۔ دوسرے دن اگر میرے استاد ایس ایس پی سے ٹیلی فون نہ کراتے تو میں پھر ساری رات پولیس کے ہاتھوں پھرتا رہتا۔“
 ”ارے..... ڈیڑی نے ایسا کیا؟“ رمشا نے حیرت سے پوچھا ”میں تو سمجھ رہی تھی کہ پولیس نے تمہیں چھوڑ دیا ہوگا۔ انو! بات بہت پرانی ہے لیکن اس کے باوجود میں ڈیڑی کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔“ اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ جوڑ دیے۔
 ”ارے ارے! یہ خوبصورت ہاتھ معافی مانگنے کے لیے نہیں ہیں۔“ میں نے کہا ”میں تو اس بات کو بھول بھی گیا تھا۔“ میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا ”تم اگر دوبارہ مجھے نہ ملتیں تو شاید مجھے یاد بھی نہ آتا کہ بھی کسی ملک نے مجھ پر پولیس کے ذریعے تشدد بھی کرایا تھا۔“
 ”واقعی ایسا ہوا تھا؟“ رمشا نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا ”لیکن میں نے کہا تھا کہ میں اس بات کو بھول چکا ہوں۔ اب ذرا اچھی اچھی باتیں کرو۔“
 پھر میں نے جان بوجھ کر موضوع تبدیل کر دیا۔
 ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رمشا نے کہا ”ویسے ایک بات ہے، تمہارے پاس روز ایک نئی گاڑی ہوتی ہے۔“
 ”یہ گاڑیاں تو کسٹرز کی ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا ”تمہارے باپ کے پاس تو اتنی دولت ہے کہ وہ دنیا کی کوئی بھی کار خرید سکتا ہے۔ وہ پراڈو ہو یا بی ایم ڈبلیو یا پھر مرسیڈیز، بنز..... وغیرہ۔“
 ”مجھے طعنہ دے رہے ہو؟“ رمشا نے منہ پھلا کر کہا۔
 ”طعنہ؟“ میں نے حیرت سے کہا ”طعنہ کیا؟ میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ تم نے ابھی تک اپنی ذاتی گاڑی نہیں خریدی۔“
 ”میرے پاس ذاتی گاڑی ہے۔“ رمشا نے کہا ”مجھے ڈرائیونگ بھی آتی ہے لیکن مجھے ڈرائیو کرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔“
 ”کیوں کہیں؟“ میں نے کہا ”ڈرائیونگ تو آج کل ہر وہ لڑکی کر لیتی ہے جس کے پاس گاڑی موجود ہو۔“
 ”یہ کئی برس پرانی بات ہے۔“ رمشا نے کہا ”میں نے اُن دنوں نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی تھی اور بہت اعتماد اور مہارت سے ڈرائیونگ کرتی بھی تھی۔ ایک دفعہ میں ماموں جان کو لے کر اتر پورٹ جا رہی تھی۔ وہ اسلام آباد میں رہتے تھے اور انہیں فلائٹ پکڑنی تھی۔ وقت کم تھا اس لیے میں بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ میں اسٹار گیٹ کے سگنل کے پاس پہنچی تو وہ ایک دم زرد ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ میں سگنل کے سرخ ہونے تک نکل جاؤں گی۔ بس یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ بائیں جانب سے آنے والی ایک ”بجیر“ کا ڈرائیور بھی بہت جلدی میں تھا۔ وہ سگنل زرد ہوتے ہی گولی کی رفتار سے میرے سامنے آ گیا۔ میں تو بھی ہی بہت اسپید میں۔ پھر ایک دھماکا ہوا، خوفناک دھماکا۔ دھماکے کے ساتھ ہی مجھے گاڑی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی، پھر سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔
 مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔ میرے سر اور پسلیوں میں شدید چوٹ آئی تھی لیکن کوئی چوٹ بھی زیادہ سنگین نہیں تھی۔
 اس حادثے میں ماموں جان اپنی زندگی سے ہاتھ

دھبیٹھے تھے۔ گاڑی کچھ ایسے رخ سے ٹکرائی تھی کہ ماموں جان اور ”بجیر“ کا ڈرائیور دونوں ہی اپنی زندگی مار چکے تھے۔ میں نہ جانے کیسے اس خوفناک حادثے میں بچ گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد سے میں نے کبھی ڈرائیونگ نہیں کی۔ میرے اہن پر ایسا خوف سوار ہو گیا کہ گاڑی کے اسٹیرنگ پر بیٹھتے ہی میرے ہاتھ جھڑپنے لگتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے دھندلی جھانپ جاتی ہے۔“
 ”یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے رمشا!“ میں نے کہا ”بس تمہارے ذہن پر ایک خوف طاری ہو گیا ہے اور کچھ نہیں ہے۔ میں تمہیں اس خوف سے بھی نجات دلا دوں گا۔“ میں نے کہا۔
 میں اس دن گھر پہنچا تو بہت خوش تھا۔ میری اس خوشی کو اماں نے بھی بھانپ لیا اور پولیس ”کیا بات ہے انو! آج تو زیادہ ہی خوش ہے۔“
 ”اماں، بات ہی ایسی ہے۔“ میں نے کہا ”بس تم اب تیاری کر لو۔“
 ”کس بات کی؟“ اماں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”بہولانے کی اور کس بات کی؟“ میں نے ہنس کر کہا۔
 ”اس کا مطلب ہے کہ تو نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے؟“
 ”ہاں اماں! تمہیں بھی تو مجھ سے یہی شکایت تھی نا کہ میں شادی نہیں کر رہا۔“
 ”وہ تو سب ٹھیک ہے بیٹا!“ اماں نے کہا ”لیکن لڑکی کون ہے، کیسی ہے، کس خاندان کی ہے؟ یہ سب تو دیکھنا ہی پڑے گا۔“
 ”ضرور دیکھو اماں!“ میں نے کہا ”لڑکی بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ خوبصورت اور تعلیم یافتہ ہے۔ میں کل لڑکی کو یہاں لے آؤں گا۔ تم خود اس سے مل لیتا۔“
 ”لڑکی کو یہاں لے آئے گا؟“ اماں نے حیرت سے کہا ”پھر میرا کان کڑ لیا اور کہتے ہوئے بولیں ”جیتا انو! کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟“
 ”اماں، کان تو چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔
 اماں نے ہنستے ہوئے کان چھوڑ دیا۔
 ”اماں! اس لڑکی کو میں بچپن سے جانتا ہوں لیکن ابھی ایک مہینے پہلے ہی اس سے ملاقات میں شروع ہوئی ہیں۔“
 ”انو بیٹا!“ اماں نے کہا ”لڑکی اگر اچھے خاندان کی ہے، خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے اور تجھے پسند بھی ہے تو میں اعتراض کیوں کروں گی؟“ پھر وہ ہنس کر بولیں ”چل، تو ہاتھ منہ دھو لے، میں تیرے لیے کھانا نکالتی ہوں۔“

”اماں، آج شام کو استاد نے چائے کے ساتھ اتنے سمو سے، سینڈویچز اور دوسری چیزیں کھلا دی ہیں کہ اب پیٹ میں گنجائش ہی نہیں ہے۔ تم بس مجھے اپنے ہاتھوں کی گرما گرم اور مزے دار چائے پلا دو۔“ یہ کہہ کر میں ہنستا ہوا ہاتھ روم میں چلا گیا۔
 دوسرے دن رمشا ملی تو پھر ہم ساحل سمندر کی طرف نکل گئے۔ میں نے ہنس کر کہا ”رمشا! میں نے تو اپنی اماں سے بات بھی کر لی ہے، وہ تم سے ملنے کو بے تاب ہیں۔“
 ”تم نے ان سے کیا کہا انو! وہ نہ جانے کیا سوچ رہی ہوں گی کہ کیسی لڑکی ہے جو شادی سے پہلے ہی لڑکوں سے ملتی ہے۔ مجھے تو بہت شرم آئے گی ان سے ملنے ہوئے۔“
 ”میری اماں نہایت سادہ اور معصوم ہیں رمشا!“ میں نے کہا ”جو لڑکی میری نظروں میں اچھی ہے، وہ اس کے بارے میں کوئی غلط بات کیسے سوچ سکتی ہیں؟“
 میں زبردستی اسے اماں سے ملوانے لے گیا۔
 گھر کے سامنے گاڑی روک کر میں نے اترتے ہوئے کہا ”رمشا! یہ میرا غریب خانہ ہے۔ میں اس گھر میں پیدا ہوا اور جوان ہوا ہوں، یہ چھوٹا سا گھر میری جنت ہے۔“
 ”جنت کے لیے کسی محل کی ضرورت نہیں ہے انو!“ رمشا نے کہا۔
 ”میں تمہیں اس لیے بھی اپنے گھر لایا ہوں کہ تم میرا گھر دیکھ سکو، میرا رہن سہن دیکھ سکو، میرے گھر میں نہ تو ملازموں کی فوج ہے، نہ کسی بھی کمرے میں ائر کنڈیشنر ہے، میرے گھر کا فرنیچر.....“
 ”انوپکیز.....!“ رمشا نے بُرا مان کے کہا ”ایسی باتیں کرو گے تو میں یہیں سے لوٹ جاؤں گی۔ میں نے تمہارے اسٹیشن اور گھر سے نہیں بلکہ تم سے محبت کی ہے۔“
 اس کی بات سن کر میرے اندر اطمینان سا اتر آیا۔ میں اسے گھر میں لے گیا۔
 اماں اسے میرے ساتھ دیکھ کر ہی سمجھ گئیں کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا ذکر میں نے ان سے کیا تھا۔
 ”اماں! یہ رمشا ہے۔“ میں نے تعارف کرایا۔
 اماں نے جھٹ اسے سینے سے لگا کر پیار کیا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ ”ماشاء اللہ، لڑکی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔“ اماں نے تعریفی نظروں سے رمشا کا جائزہ لیا ”خوبصورت، بھولی بھالی اور معصوم۔“
 رمشا اس وقت شرم سے دُہری ہوئی جا رہی تھی۔
 ”تم کہاں رہتی ہو بیٹی؟“ اماں نے پوچھا۔

”اماں..... سوری..... آنٹی! میں ڈیفنس میں رہتی ہوں۔“ رمشانے کہا۔

”تم بھی مجھے اماں ہی کہو۔“ اماں نے کہا ”تمہارے منہ سے یہ لفظ بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ پھر اماں مسکرا کر بولیں ”تم لوگ بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے اماں!“ رمشانے کہا ”مجھے چائے پینا ہوگی تو میں خود ہی بنا لوں گی۔“

”کام تو بیٹا تم ساری زندگی کرو گی۔“ اماں نے کہا ”اس وقت تو میرے ہاتھوں کی چائے پی لو۔“ اماں مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئیں۔

”اٹو! تمہاری اماں تو بہت اچھی ہیں، بہت محبت کرنے والی اور.....“

”بس بس۔“ میں نے کہا ”کہیں میری اماں کو نظر نہ لگا دینا۔“

اماں نے رمشا کو بہت پسند کیا تھا۔ اب وہ اُٹتے بیٹھتے اسی کے گن گاتی تھیں۔

ایک دن میں گھر سے نکل رہا تھا تو اماں نے کہا ”اٹو! تو مجھے رمشا بیٹی کے گھر کب لے جائے گا۔ بھی، میں اس کے ماں باپ سے مل کر تیری شادی کی بات تو پکی کر دوں۔“

”اماں، کچھ دن صبر سے کام لو۔ رمشا کے ڈیڈی بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کے لوٹنے ہی میں تمہیں ان کے گھر لے چلوں گا۔“

حقیقت بھی یہی تھی۔ رمشا کے ڈیڈی ان دنوں پاکستان سے باہر تھے۔ اس لیے رمشا اپنے گھر میں بات نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے نہ جانے کیوں ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ ملک اس رشتے پر راضی نہیں ہوگا۔ ویسے بھی وہ مجھے بھولا نہیں ہوگا۔

رمشا کو یقین تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی کو ہر حال میں راضی کر لے گی۔

”اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو؟“ میں نے ایک دن رمشا سے پوچھا۔

”انہیں راضی ہونا پڑے گا اٹو!“ رمشانے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”لیکن فرض کرو وہ راضی نہ ہوئے تو؟“

”تو.....؟“ رمشانے اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

”تو میں تو شاید زندہ نہ رہ سکوں۔“ میں نے کہا۔

”بزدلوں والی بات مت کرو اٹو۔“ رمشانے کہا۔

”اس میں بزدلی اور بہادری کا کیا سوال؟“ میں نے

کہا ”میں تو تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”تو کیا میں کر سکتی ہوں؟“ رمشا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اگر ڈیڈی راضی نہ ہوئے تو نہ ہوں، میں ہر حال میں تمہاری ہوں۔ میں ان کے فیصلے کے خلاف بغاوت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہوں اور حق بھی۔ وہ کل واپس آ رہے ہیں۔“ رمشانے کہا ”میں شاید دو تین دن تک تم سے نہ ملوں۔“

”کیوں؟“ میں نے کہا۔

”ارے بابا! تمہارا مقدمہ لڑنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے نا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

☆☆☆

اس دن صبح ہی سے میری طبیعت کچھ بوجھل بوجھل سی تھی۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے صرف ایک کپ چائے پی اور گھر سے روانہ ہو گیا۔

اب میں خود کسی بھی گاڑی کا کام نہیں کرتا تھا، میرے اور استاد کے تربیت یافتہ لڑکے ہی سارا کام کرتے تھے۔ ہاں کبھی کسی کی بجھ میں گاڑی کی خرابی نہ آئے تو میں یا استاد اس گاڑی کو دیکھ لیتے تھے۔

اس دن میں استاد کے ساتھ کیمین میں بیٹھا تھا کہ ایک ہنڈا اسی ورکشاپ میں آ کر رکی۔ وہ بالکل نئی گاڑی تھی۔ اس میں سے جو شخص باہر نکلا، اسے دیکھ کر میں بھی حیران رہ گیا اور استاد بھی۔

استاد زیر لب بڑبڑایا ”یہ یہاں کیسے آ گیا؟“

وہ ملک تھا، رمشا کا باپ!

”تم بیٹھو، میں دیکھتا ہوں۔“ استاد نے کہا اور کیمین سے باہر نکل گیا۔

”کیسے ہو جبار!“ ملک کی آواز آئی۔

گز رہے ماہ و سال نے اس پر ذرا بھی اثر نہیں کیا تھا۔ بس اس کے بال کپنیوں کے پاس سے کچھ سفید ہو گئے تھے۔ اس کی صحت اب بھی پہلے کی طرح قابل رشک تھی۔

”میں ٹھیک ہوں ملک صاحب!“ استاد نے کہا ”آپ آج ادھر کاراستہ کیسے بھول گئے۔“

”یار! میری گاڑی چلتے چلتے، ایک دم بہت گرم ہو رہی ہے۔ یا تو اس کا ریڈی ایٹر لیک ہے یا پھر کوئی اور خرابی ہے۔“

”میں ابھی دیکھتا ہوں۔“ استاد نے کہا۔

”ابھی مجھے ایک بہت ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔“ ملک نے کہا ”میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔ میرا ڈرائیور بھی ایک منٹ کی چٹھی پر ہے ورنہ گاڑی وہی لے جاتا۔ میں شام

کو ایسی میں گاڑی لے جاؤں گا۔“

”آپ ٹیکسی کی زحمت مت کریں ملک صاحب!“

استاد نے کہا ”میری گاڑی لے جائیں، یہ کسی کسٹر کی نہیں، بلکہ میری ذاتی گاڑی ہے۔“ استاد نے اپنی کردلا کی طرف اشارہ کیا ”آپ کی گاڑی کی طرح نئی تو نہیں ہے لیکن یہ آپ کو دھوکا نہیں دے گی۔“

ملک استاد کی گاڑی لے کر چلا گیا۔

استاد نے گاڑی کا ہونٹ کھولا ہی تھا کہ اچانک اس کے ہیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ہیل فون جیب سے نکالا اور اسے کان سے لگا کر بولا ”ہیلو!..... کیا..... اچھا۔ میں..... میں آ رہا ہوں۔“

استاد کو حواس باختہ دیکھ کر میں بھی کیمین سے باہر نکل آیا اور بولا ”استاد، خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے اٹو!“ استاد نے کہا ”میری بیوی کا فون تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ میرے چھوٹے بیٹے کو بہت زبردست کرنٹ لگا ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔“

”میں بھی چلتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ارے یار، اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔“ پھر وہ پریشان ہو کر بولا ”یار! میری گاڑی تو ملک صاحب لے گئے۔“

”واہ استاد!“ میں نے ہنس کر کہا ”ہمیں گاڑیوں کی کیا کمی۔ تم وہ کلش لے جاؤ جو نصیر نے ابھی ابھی تیار کی ہے۔ اس کا مالک آیا بھی تو میں کہہ دوں گا کہ استاد گاڑی کی خرابی لینے گیا ہے۔ ویسے وہ آیا بھی تو شام ہی کو آئے گا۔“

استاد وہ گاڑی لے کر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہا کہ تم ذرا ملک صاحب کی گاڑی دیکھ لینا، کسی لڑکے پر مت چھوڑنا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی گاڑی میں وہی قصص تھا جو اب سے برسوں پہلے ہوا تھا۔ اس کی کچھ پلیٹس تو ٹھیک تھیں، ریڈی ایٹر کا پانی انجن میں سر کو لٹ نہیں کر رہا تھا۔

میں نے امیر سے کہا کہ اس گاڑی کا ریڈی ایٹر کھولو۔

اس نے ریڈی ایٹر کھولا۔ میں نے دیکھا، اس کا پائپ چوک ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی کی وہ خرابی دس منٹ میں دور کر دی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا۔ اگر میں ملک کی گاڑی کا بریک ناکارہ کر دوں تو.....؟ تو میرا انتقام بھی پورا ہو جائے گا اور میرے راستے کی سب سے بڑی دیوار بھی ہٹ جائے گی۔

میرے ذہن میں آمدنیاں سی چلنے لگیں۔ پھر مجھے سوائے انتقام کے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

وہ بالکل نئی گاڑی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے بریک ناکارہ کیسے کیے جاسکتے ہیں؟ بریک ایک دم ناکارہ نہیں ہوتے بلکہ ایک دن، دو دن یا پھر بعض اوقات چار پانچ دن بعد بھی ناکارہ ہو سکتے ہیں۔

گاڑی کے بریک ناکارہ کرتے ہوئے میرا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔ میں ایک انسان کی جان لینے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ پھر میں نے خود کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ ملک نے میرے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے پھنسا رہا تھا بلکہ پولیس والوں کو پیسے کھلا کر مجھے تشدد کا نشانہ بھی بنوایا تھا۔ ایک مرتبہ پھر انتقام کا جذبہ مجھ پر حاوی ہو گیا۔

میں نے گاڑی کے بریک مخصوص اعزاز میں ناکارہ کر دیا۔

میں ہونٹ بند کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ استاد کی گاڑی ورکشاپ میں داخل ہوئی۔

”خیریت تو ہے استاد!“ میں نے اپنے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے پوچھا ”ہاں یار! سب خیریت ہے، بیٹے کو معمولی سا کرنٹ لگا تھا جسے میری بیوی نے اتنا بڑا مسئلہ بنا دیا۔ میں گھر پہنچا تو وہ اطمینان سے بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔“

پھر وہ چونک کر بولا ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ تمہیں اس موسم میں اتنا پسینا کیوں آ رہا ہے؟“

”آں.....“ میں نے چونک کر کہا ”ہاں استاد..... میری طبیعت کو کیا ہوا، تم تو جانتے ہو کہ مجھے کچھ زیادہ ہی پسینا آتا ہے۔ ویسے بھی اب کام کرنے کی عادت نہیں رہی ہے نا۔“ میں نے بات بتائی۔

”ملک کی گاڑی ٹھیک کر دی؟“ استاد نے پوچھا۔

”ہاں استاد!“ میں نے جواب دیا ”وہ ریڈی ایٹر کا ایک پائپ چوک ہو گیا تھا، اس لیے گاڑی گرم ہو رہی تھی۔“

”ذرا اشارت کرو۔“ استاد نے کہا۔

میں نے نصیر سے کہا ”گاڑی اشارت کرو۔“

نصیر نے گاڑی اشارت کی، استاد نے آواز سی پھر ہونٹ اٹھا کر اس کے ریڈی ایٹر کا جائزہ لیا۔

اس وقت میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے گاڑی کے بریکوں میں گڑبڑ کی تھی۔ یہی نظر میں تو استاد کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اسے تو اس وقت معلوم ہوتا جیسے گاڑی کا بریک بالکل ناکارہ ہو جاتا۔ میرے دل کا چور مجھے خوف زدہ کر رہا تھا۔

استاد نے اپنا اطمینان کرنے کے بعد ہونٹ بند کر دیا۔

شام کو ملک آیا تو میں جان بوجھ کر کیمین سے باہر نہیں نکلا۔ استاد نے اسے گاڑی کی چابی دی اور اسے رخصت کر دیا۔

یہ بات بھی میرے حق میں تھی کہ ملک کا ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ وہ کافی تجربے کا آدمی تھا۔ گاڑی کے بریک کی گڑبڑ کا احساس اسے وقت سے پہلے ہو جاتا۔

اب میں دن رات یہ خبر سننے کے لیے بے تاب تھا کہ ملک کی گاڑی کا ایکسٹنٹ ہو گیا اور ملک جہنم رسید ہو گیا۔

اس وقت جانے مجھے کیا ہو گیا تھا؟ وہ اس لڑکی کا باپ تھا جس سے میں محبت کا دعوے دار تھا لیکن انتقام کی آگ میں رمشا کی محبت بھی نہیں گم ہو گئی تھی۔

تین دن بعد رمشا مجھے ملی تو وہ بہت افسردہ تھی۔

”کیا ہوا رمشا؟“ میں نے پوچھا ”خیریت تو ہے؟“

”تم ٹھیک ہی کہتے تھے الو!“ رمشانے کہا ”ڈیڈی نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے۔“

”کیا!“ میں نے صرف اتنا کہا۔ میرا دل گویا ڈوب رہا تھا۔

”میں نے ہر طرح سے ڈیڈی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کی ایک ہی رٹ ہے کہ وہ کنکلا تم سے نہیں، تمہاری دولت سے پیار کرتا ہے اور پھر تم خود سوچو، ایک گھنیا موٹر

ملکین کو میں اپنا داماد کیسے بنا سکتا ہوں۔“

”پھر..... پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا فیصلہ تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ میں تمہاری ہوں اور تمہاری رہوں گی۔“ رمشانے اٹل لہجے میں کہا۔

”لیکن کیسے؟“

”شادی کرنے کے دوسرے طریقے بھی تو ہیں۔“ رمشا نے کہا ”ہم کورٹ میرج کر سکتے ہیں۔“

”تم اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہمت رکھتی ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

”رمشا! ملک صاحب اس شادی کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ وہ اپنی دولت کے ذریعے مجھے قصور دار ٹھہرا دیں گے۔ جب وہ بغیر کسی وجہ کے ایسا کر سکتے ہیں تو اب تو یہ ان کی

عزت و انا کا مسئلہ ہوگا۔“

”ہوا کرے۔“ رمشانے کہا ”یہ میری بھی انا کا مسئلہ ہے الو!“

”اچھی طرح سوچ لو رمشا!“ میں نے کہا۔

”میں نے بہت اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ ہاں، اگر تم میرے اس فیصلے سے خوف زدہ ہو تو بات دوسری ہے۔ پھر تو میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گی..... کچھ بھی نہیں کر سکوں گی الو!“ وہ ہلکے ہلکے کر رہنے لگی۔

”پاگل لڑکی!“ میں نے کہا ”تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں اس فیصلے سے خوف زدہ ہوں۔ میں تیار ہوں، بولو..... کب چلنا ہے کورٹ؟“

”اب ایسی بھی جلدی نہیں ہے۔“ رمشا پہلی دفعہ مسکرائی ”اگلے ہفتے تک انشاء اللہ میں اپنا گھر چھوڑ دوں گی۔“ رمشا نے کہا ”میں.....“

اس کا جملہ ادھر رادہ گیا کیونکہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

اس نے سیل فون کان سے لگایا اور بولی ”جی ماما!..... کیا..... کب..... اب ڈیڈی کیسے ہیں..... اچھا میں آرہی ہوں۔“

میں سمجھ گیا کہ ملک کسی خوفناک حادثے کا شکار ہو گیا ہے اور اس کی ماں اسے یہی اطلاع دے رہی ہے۔

”کیا ہوا رمشا؟“ میں نے اپنے بے قابو دل پر قابو پا کر پوچھا۔

”ڈیڈی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔“ اس نے کہا ”طبیعت تو ان کی صبح ہی سے خراب تھی۔ اس لیے وہ آج آفس بھی نہیں گئے تھے۔“

”چلو، میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“ میں نے کہا ”پریشان مت ہو، انہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ میں نے رکی طور پر کہا لیکن میں جانتا تھا کہ انہیں آج کچھ نہیں ہوا تو کل ہوگا۔

رمشا کو اس کے گھر چھوڑ کر میں بھی اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن میں درکشاپ پہنچا تو درکشاپ میں کام کرنے والے ایک لڑکے نصیر نے ایک اندوہناک خبر سنا لی

”الو بھائی! وہ ملک صاحب کی گاڑی کا بہت زبردست ایکسٹنٹ ہو گیا ہے۔“

”کیا.....؟“ میں نے بناوٹی حیرت کا مظاہرہ کیا اور نہ میں تو جانے کب سے یہ خبر سننے کو بے چین تھا۔ ”کب ہوا ہے ایکسٹنٹ؟“

”کل رات کو۔“ اس نے جواب دیا۔

اسی وقت استاد آ گیا اور بولا ”یار الو! تمہیں معلوم ہوا، وہ ملک صاحب کی گاڑی کا ایکسٹنٹ ہو گیا ہے؟“

”ہاں، مجھے ابھی نصیر نے بتایا ہے۔“

”کل شام ملک صاحب کو دل کا دورہ پڑا تھا۔“ استاد

نے بتایا ”ان کا ڈرائیور بھی موجود نہیں تھا اس لیے گاڑی ان کی بیٹی چلا رہی تھی۔“

”کیا؟“ میں نے چیخ کر پوچھا ”گاڑی رمشا چلا رہی تھی؟“

”ہاں یار!“ استاد نے افسردگی سے جواب دیا ”وہ شاید بہت تیز رفتاری سے جا رہی تھی یا پھر دوسرے ڈرائیور کی غلطی تھی۔ ان کی گاڑی ایک وین سے ٹکرائی تھی۔“

”اب ان کا کیا حال ہے؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں معلوم!“ استاد نے کہا۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کہا ”ملک صاحب کس اپارٹمنٹ میں ہیں؟“

”وہ جناح اسپتال میں ہیں۔“ نصیر نے بتایا۔

میں نے گاڑی نکالی اور جناح اسپتال کی طرف دوڑا دی۔

میں گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے پاگلوں کی طرح اہر جیسی وارڈ کی طرف بھاگا۔

میں نے استقبال پر پہنچی ہوئی لڑکی سے پوچھا ”کل یہاں ایکسٹنٹ کا ایک کیس آیا تھا۔ ملک صاحب، ان کی بیٹی اور بیٹی رمشا تھیں اس گاڑی میں۔“

”کیا نام بتایا آپ نے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”رمشا!“ میں نے بیجانی انداز میں کہا۔

”جی..... ملک آفتاب..... رمشا ملک اور مسز ملک!“ اس نے مانیٹر پر دیکھتے ہوئے کہا ”ملک صاحب تو اس وقت کارڈیو میں ہیں۔“

”اور ان کی بیگم اور بیٹی؟“

”ان کے ہارے میں ڈاکٹر اجاز کو معلوم ہوگا۔ وہی اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔“

میں پاگلوں کی طرح ڈاکٹر اجاز کو تلاش کرنے لگا۔ وہ مجھے وہاں مل ہی گئے۔ میں نے ان سے پوچھا

”ڈاکٹر صاحب، کل ملک صاحب اور ان کی بیگم.....“

”ہاں، میں ملک صاحب کو جانتا ہوں۔“ ڈاکٹر اجاز نے کہا ”وہ اس وقت کارڈیو میں ہیں۔ انہیں بہت شدید ہارٹ ایکٹک ہوا تھا۔“ پھر وہ افسردگی سے بولا ”لیکن میں ان کی بیگم اور بیٹی کو نہ بچا سکا..... وہ دونوں بہت بُری طرح زخمی تھیں۔ بیگم ملک تو راستے ہی میں ایکسپائر ہو گئی تھیں۔ ان کی بیٹی تین گھنٹے تک موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہی، پھر.....“

”وہ بھی.....“

”نہیں ڈاکٹر صاحب!“ میں نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا ”رمشا نہیں مر سکتی.....“ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال ہی کے کسی کمرے میں تھا۔ ایک نرس نے جھک کر پوچھا ”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے مسز الور؟“

”میں ابھی تک زخمی کیوں ہوں؟“ میں نے گلو کیر لہجے میں کہا۔

”تجھے کیا ہو گیا ہے الو!“ استاد کی آواز پر میں نے سر جھکا کر اسے دیکھا ”تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟“

”مجھے تیرے دکھ کا اندازہ ہے بیٹا!“ اماں کی آواز آئی ”لیکن اللہ کی مرضی یہی تھی۔“

اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ اس میں میری مرضی کا بھی دخل ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کو مار دیا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھوں پر خون کے چھینٹے نظر آتے تھے۔

میں رمشا کی قبر پر پہنچا اور ہلکے ہلکے کر روتے ہوئے بولا ”رمشا! تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں، تم نے بہت اچھا کیا۔ میرے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ میں اسی قافلہ ہوں رمشا! میں اسی قافلہ ہوں.....“ میں پھر ہلکے ہلکے کر روتے لگا۔

اچانک کسی نے پشت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا تو سکتے میں رہ گیا۔ وہ ملک صاحب تھے۔ وہ بھی آلسو بہا رہے تھے۔ وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے اور بولے ”مجھے معاف کر دینا الور!.....“

مجھے معاف کر دینا بیٹا، میں نے تمہیں سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی..... مجھے معاف کر دینا۔“

معافی تو مجھے مانگنا چاہیے تھی کہ میں نے ان کی بیٹی اور بیوی کی جان لے لی تھی۔ وہ بے چارے اپنی بیٹی کے قاتل سے معافی مانگ رہے تھے۔

میں نے جلتے ہوئے کہا ”آپ بھی مجھے معاف کر دیجئے گا اگل!“..... آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔“

وہ مجھے معاف بھی کر دیتے تو کیا اللہ بھی مجھے معاف کرے گا؟ کاش..... کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا.....

کاش..... اللہ بھی مجھے معاف کر دے..... کاش!“

لیکن میری سزا اتنی جلدی پوری کیسے ہوگی؟ لگتا ہے میری پکار آسمانوں تک جانی ہی نہیں۔ اب تو بس آنکھیں ہیں اور دھول بھرا سناٹا ہے۔

☆☆☆

منی 2012ء

دوسری شادی

جناب مدیر اعلیٰ
سلام خلوص!

یہ میری اپنی آپ بیٹی نہیں ہے۔ بس اتفاقیہ طور پر میں اس کا ایک کردار بن گیا۔ مگر میرے داخلے کے بعد کہانی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ ہمارے معاشرے میں اکیلی عورت کو کیسی کیسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، آپ بھی ملاحظہ کریں۔

نوید احسن
(کراچی)

تھا۔ ”کوئی نہیں اٹکل۔ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا

ہی جا رہا ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر سے بھاگ کر جا رہے ہو۔“ میرا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا تھا۔ جو اس کے لیے بہت ضروری تھا۔

”جی۔“ اس نے اپنی گردن جھکائی تھی۔

”کراچی میں کہاں رہتے ہو؟“

”ناظم آباد۔“ اس نے بتایا۔

ناظم آباد کراچی کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں متوسط طبقے کے کھاتے بیٹے لوگ رہا کرتے ہیں۔ گویا میں نے اس کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست ثابت ہوا تھا۔

اس نے پھر اپنی کہانی بتائی۔ عام سی کہانی تھی۔ لڑکے ان ہی حالات میں گھروں سے فرار ہوا کرتے ہیں۔ اس کا باپ مرچکا تھا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی تھی جبکہ سوچا باپ اسے پسند نہیں تھا۔ بس اسی بنا پر کاشان گھر سے بھاگ لکھا تھا۔ کاشان اس بچے کا نام تھا۔

”پوچھا۔“ بتاؤ کیا تمہارا دوسرا باپ تم پر سختی کرتا ہے؟“ میں ”نہیں۔“ اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ”نہیں۔“

”تو نہیں کرتے۔“ ”پھر کیوں بھاگ رہے ہو؟“

”بہر حال فقہ مختصر یہ کہ حیدر آباد اتر کر میں نے اس بچے کو بھی اتارا حالانکہ میرے ٹکٹ کا نقصان ہو گیا تھا لیکن یہ ثواب کا کام تھا اور یہ مجھے کرتا تھا۔“

ہم واپسی کی گاڑی میں بیٹھے اور میں اس بچے کو داپس اس کے گھر لے آیا۔

اس کی ماں کا رورور کر رہا حال تھا۔ میں جب کاشان کو لے کر پہنچا تو ایک ہنگامہ ساچ گیا تھا۔ میں نے کاشان کو اس کی ماں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کا سوچا باپ مجھے ڈرائنگ روم

مئی 2012ء

وہ مجھے ریل کے سفر میں ملتا تھا۔

میں کراچی سے لاہور جا رہا تھا کہ حیدر آباد کے اسٹیشن پر وہ ڈبے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر یہ مشکل گیارہ بارہ برس کی ہوگی۔ بہت معصوم اور خوبصورت شکل۔ صاف سحرالباس، کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا تھا۔

وہ کچھ خوفزدہ اور اپنے آپ سے نظر چراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

غذے بد معاش قسم کے لوگ ایسے لڑکوں کو تاڑ لیا کرتے ہیں اور یا تو انہیں بھلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے جا کر جرائم پیشہ بنادیتے ہیں یا پھر کسی اور انداز سے انہیں برباد کر دیا جاتا ہے۔

اس لیے مجھے اس لڑکے کی طرف سے فکر ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ لڑکا میرے برابر میں ہی آکر بیٹھ گیا تھا۔ شاید اس پورے ڈبے میں ایک میں ہی اسے شریف دکھائی دیا ہوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”بیٹا۔ تم کہاں جاؤ گے؟“

”جی۔ لاہور۔“ اس نے گھبراتے ہوئے بتایا۔

”کیا اکیلے جا رہے ہو؟“ میرا دوسرا سوال تھا۔

اس پر وہ اور زیادہ گھبرا گیا تھا۔ ”جی۔ جی نہیں۔ وہ

ای برادر والے ڈبے میں ہیں۔“

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر اس کی ماں اس کے ساتھ ہوتی تو اسے بھی ماں کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ مجھے اس کی طرف سے صرف یہ پریشانی تھی کہ وہ کہیں غلط لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ اس لیے میں نے اس سے

کہا۔ ”بیٹا۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سچ بتا دو تم کس کے ساتھ جا رہے ہو۔“

وہ اندر سے ویسے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ میرے سخت لہجے نے اسے اور بھی خوفزدہ کر دیا۔ اس لیے اس نے ڈر کر بتا دیا

252

ماہنامہ سرگزشت



کم اسے میرے پیار کا احساس تو ہے۔ اب اس بے وقوف سے یہ معلوم تو کریں کہ وہ گھر سے کیوں بھاگا تھا؟“ ”ابھی نہیں۔ ابھی اس سے کچھ نہ کہیں۔ اس کے ساتھ بالکل نارمل ہو جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ باتیں میں اس سے معلوم کر دوں گا۔ آپ لوگ اپنے رویے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیں۔ میں اس کا دوست بن کر آہستہ آہستہ اس سے سب معلوم کر لوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ کوئی دشمنی چھپی ہوئی ہے۔“

اس دوران میں اس کی بیوی یعنی کاشان کی ماں بھی آگئی تھی۔ وہ ایک دبلی پتلی خوبصورت عورت تھی جو بار بار میرا شکریہ ادا کئے جا رہی تھی۔ کاشان بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس نے اپنا لباس بدل لیا تھا۔ اب وہ سہا سہا نہیں بلکہ خاصا پُر اعتماد و کھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ مستقل تمام رکھا تھا جیسے اپنی ماں سے اسے واقعی پیار ہو جبکہ سوچا باپ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں سرد مہری سی دکھائی دینے لگتی۔

میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ان لوگوں سے اجازت لے کر آ گیا۔

مجھے لاہور جانا بہت ضروری تھا۔ اس لیے دوسری شام

میں لے آیا تھا۔ ”آپ کی بہت مہربانی جو آپ کاشان کو ساتھ لے آئے۔ ورنہ اس کی ماں رورور کر اپنی جان دے دیتی۔“

”یہ بہت نازک پھونش ہوئی ہے فریڈ صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”اس بچے کی زندگی جاہ ہو سکتی تھی۔ لیکن خدا نے مجھے بھیج دیا۔ اب میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے آپ سے کچھ سوالات کر دوں گا۔ امید ہے آپ برا نہیں مانیں گے۔“

”نہیں۔ نہیں آپ ضرور پوچھیں۔“

”آپ کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہے؟“

”مجھے اندازہ تھا کہ آپ کو یہی پوچھتا ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کیونکہ ہمارے معاشرے میں سوچا

ماں یا سوچا باپ کا ایج بہت ہی خالمانہ ہوا کرتا ہے۔ یہ خونخوار قسم کی مخلوق ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے ہی ہوں۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے کاشان کو ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ بہت پیار دیا ہے اس کو۔ آپ چاہیں تو اس سے پوچھ سکتے ہیں۔“

”جی ہاں۔ وہ اس کا اعتراف کر چکا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اس نے بتایا ہے کہ آپ اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔“

”شکر ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کم از

253

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی گاڑی سے لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ میری واپسی ایک ہفتے کے بعد ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد میں پھر ان لوگوں کے کمر پہنچ گیا۔

کاشان کا باپ نوید اس وقت نہیں تھا۔ کاشان تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا تھا۔ ”آئیں اگلے آئیں۔ آپ تو اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں۔“

”میں نے لاہور چلا گیا تھا۔“

میرے آنے کا سن کر اس کی ماں بھی چلی آئی۔ ہمارے درمیان بہت دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ کاشان کو خود سے قریب کرنے کے لیے میں نے کئی اٹلے سیدھے لطفے بھی سنائے۔ پھر میں نے اس کی ماں سے کہا۔ ”اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کاشان میاں کو ٹھکانے پر لانے کے لیے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

وہ سمجھ گئی کہ میں کاشان کو کیوں لے جانا چاہتا ہوں۔ ”کیوں نہیں بھائی صاحب۔ آپ لے جائیں اس کو۔ آپ پر تو پورا بھروسہ ہے۔“

میں کاشان کو اپنے ساتھ لے آیا۔ خوب تفریح کرتا رہا۔ کھانا کھلایا۔ آئس کریم کھلائی۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ”بیٹے۔ ایک بات بتاؤ لیکن سچ سچ بتانا۔“

”جی اگلے بولیں۔“

”جہیں اپنے نئے ابو کیوں پسند نہیں ہیں۔“

”اس لیے کہ وہ ماما کے ساتھ ہوتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں سمجھ گیا کہ یہی پرابلم ہو سکتی ہے۔ ایسے بے شمار بچے ہیں جو اپنے باپ کے علاوہ اپنی ماں کے پاس کسی اور کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ ایک نفسیاتی رد عمل ہوتا ہے اور کبھی کبھی بہت شدید بھی ہو جاتا ہے۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دیکھو بیٹا۔ بات یہ ہے کہ جب تمہارے اپنے ابو اس دنیا میں نہیں رہے تو نئے ابو آگئے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ تمہاری امی کو کسی سہارے کی ضرورت تھی نا۔ ورنہ تم لوگ کہاں رہتے۔ کون تمہاری پرورش کرتا؟“

”امجد اگلے تو بہت اچھے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کون امجد اگلے۔“ یہ ایک نیا نام میرے سامنے آیا تھا۔

اس نے بتایا کہ امجد بھی اس کی ماں سے شادی کا خواہش مند تھا۔ وہ لوگ اس کی دکان سے سودا لیا کرتے تھے لیکن اس کی ماں نے نوید سے شادی کر لی تھی۔ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس لیے میں نے اب اس قصے کو اس کے اختتام تک پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس کی ماں سے بات کروں گا۔

”یہ موقع بھی چار پانچ دنوں کے بعد ملا تھا۔“

”یہ بتائیں۔ یہ امجد کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”امجد۔“ وہ چونک پڑی۔ ”اس کے بارے میں کاشان نے بتایا ہوگا۔“

”جی ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا کوئی دکاندار ہے۔“

”جی ہاں۔ ایک خبیث قسم کا انسان ہے۔“ اس نے بتایا ”میں پہلے اس کی دکان سے سودا لیا کرتی تھی۔ یہ اتفاق ہے کہ میں اپنے پہلے شوہر کے ساتھ بھی اسی محلے میں رہ کر رہی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد نوید سے میری شادی ہوئی اور آج تک یہیں ہوں۔“

”امجد کی کیا کہانی ہے۔“

”کوئی خاص نہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس آدمی نے دو تین بار مجھ سے شادی کی بات کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ ایک کمینہ مفت انسان ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ پھر نوید سے میری شادی ہو گئی۔“

”کیا امجد شادی شدہ ہے۔“

”جی ہاں۔ شادی ہو چکی تھی۔ بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس آدمی سے اور کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ کاشان میاں اس سے ملاقات کرتے رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ وہ امجد کی بہت تعریف کر رہے تھے۔“

”ہاں نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں تو یہ سن کر پریشان ہو گئی ہوں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ اب یہ معاملہ میرے پاس ہے۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔“

ایک بار میں نے کاشان سے کہا کہ وہ مجھے دور سے امجد کی دکان دکھا دے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتا دیا تھا کہ وہ امجد کے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے بارے میں امجد کو کچھ نہیں بتائے۔

کاشان نے مجھے امجد کی دکان دکھادی۔ ایک دوپہر جب اس کی دکان خالی نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ ایک خبیث صورت انسان تھا جس کی آنکھوں سے مکاری ظاہر ہو رہی تھی۔

میں نے یوں ہی اس سے دو چار چیزیں خرید لیں اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کچھ باتوں ہی واضح ہوا تھا۔ اس دن اس سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی لیکن اس کی فطرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

دو دنوں کے بعد میں کچھ خریدنے کے بہانے اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس سے پھر باتیں ہونے لگیں۔ ”کیا بات ہے صاحب۔ کیا آپ اس محلے میں رہنے لگے ہیں۔“

”ہاں یار۔ یہی سمجھ لو۔ یہاں سے دو گلی چھوڑ کر۔“

میں نے یوں ہی ایک چٹا بتا دیا۔ ”نئی نئی جگہ ہے نا۔ اسی لیے گپ شپ کرنے تمہارے پاس آ جایا کرتا ہوں۔“

”یار۔ ضرور آ جایا کرو۔“ وہ بھی بے تکلف ہو گیا تھا۔

”امجد تم تو اس محلے کے دکاندار ہو۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ تم سے تو ہر ایک کی دوستی ہوگی۔“

”یار۔ دوستی بھی ہے اور سب کے حالات بھی جانتا ہوں۔“ اس نے اپنی آنکھوں کو نچاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کون ہے جو مجھ سے چھپا ہوا ہے۔“

”ہاں بھی مزے ہیں تمہارے۔“

”مزے کیا۔ بس لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خون جگر رہتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ایک سے ایک نام نہاد شریف۔ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔ ہمارا پورا معاشرہ ہی ایسا ہو گیا ہے۔“ میں نے اس کی بات پر تبصرہ کیا۔

”اب یہی دیکھیں صاحب۔ ہمارے محلے میں ایک عورت رہتی ہے۔“ اس نے بتایا ”اس کا شوہر ہر چکا ہے۔ تو میں نے سوچا چلو۔ اس کو سہارا دینے کے لیے اس سے شادی کر لیتے ہیں لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق کسی اور سے ہو۔“

”ہاں جی۔ یہ تعلق کچھ دنوں کے بعد سامنے آ گیا۔“

وہ بڑا سامنے بنا کر بولا۔ ”اس نے ایک اور بندے سے شادی کر لی حالانکہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ پھر بھی میں نے سوچا چلو شادی ہو گئی تو اس کو سہارا مل جائے گا۔ بیٹے کو اپنی دکان میں لگا دوں گا۔“

”چلو یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔“ میں نے تسلی دی۔

”اب وہ تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اب کسی اور کو ڈھونڈ لو۔“

”ابھی کہاں نکلی ہے جی۔“ وہ مکاری سے فس پڑا۔

”ابھی تو میں نے اپنا کیس شروع کیا ہے۔ دیکھ لینا وہ مجبور ہو کر پھر میرے پاس آئے گی۔“

”ایسا کون سا کیس شروع کر دیا ہے؟“

پھر اس نے مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے کاشان کو اس کے نئے باپ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ وہ دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنانے میں لگا ہوا تھا اور بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتا جا رہا تھا۔ یعنی کاشان کی حد تک اس کی سازش کامیاب جا رہی تھی۔ ”لیکن یار۔ اس سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ لوجی۔“ وہ فس پڑا۔ ”تم بھی بہت بھولے آدمی ہو۔ دونوں میں جب نفرت بڑھے گی تو پھر اس عورت کو دونوں میں سے ایک کا ساتھ دینا پڑے گا۔ شوہر کا یا پھر بیٹے کا اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ بیٹے کے لیے شوہر کو چھوڑ دے گی کیونکہ بیٹہ اس کے پہلے شوہر کی یادگار ہے۔“

”اوہ اب سمجھا۔“ میں نے گردن ہلائی۔ ”یعنی تم یہ سمجھتے ہو کہ طلاق ہو جائے گی۔“

”ہاں بھئی۔ صاف صاف طلاق۔ کیس ختم۔ وہ ایک بار پھر بے سہارا ہو جائے گی اور اس بار اسے کوئی نہیں پوچھے گا۔“

”اور تم آگے بڑھ کر اسے سہارا دو گے۔“

”بالکل۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نے تو جی جڑ پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے کس طرح بھاگتی ہے۔“

دل تو چاہ رہا تھا کہ اس کمینے کو مارنا شروع کر دوں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سازشی انسان سے نمٹنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان لوگوں کو جب سے پہلے اس محلے سے ہٹا دیا جائے تاکہ کاشان اس سے نہ مل سکے۔

میں نے نوید کو یہ تو نہیں بتایا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کاشان کو بہکانے والا کون تھا لیکن اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر محلہ چھوڑ دے۔ دیے بھی وہ کرائے کا مکان تھا جسے آسانی سے چھوڑا جاسکتا تھا۔

نوید ایک سمجھ دار آدمی تھا اور بیٹے کے مستقبل کے لیے اس کی بیوی یعنی کاشان کی ماں بھی پوری طرح اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے اسی ہفتے اپنا مکان تبدیل کر دیا۔ وہ وہاں سے چلے گئے۔ اس وقت سب سے زیادہ اعتراض کاشان کو ہوا تھا لیکن بعد میں وہ بھی سیٹ ہو گیا۔

ایک ہفتے کے بعد میں پھر صورت حال جاننے کے لیے اس دکاندار امجد کے پاس پہنچ گیا۔ دو چار چیزیں خرید لیں اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دریافت کیا۔ ”ہاں بھئی۔ تمہارا معاملہ کہاں تک آگے بڑھا؟“

255

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



اپیل

مکرمی مدیر اعلیٰ
سلام مسنون!

میں ایک سوفیصد سچی روداد بھیج رہا ہوں۔ یہ صرف لفظی تصویر نہیں ایک سبق ہے۔ اس مادی دنیا کے انسانوں کے لیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا بس ہم تک محدود ہے۔ اگر آپ دیکھیں تو وسیلے کا ایک سلسلہ ہے جو لا محدود ہے۔ محمد سلیم اختر (راولپنڈی)

یہ ایک اتفاق ہے کہ میرا نام عابد ہے اور میری بیوی کا نام عابدہ۔ اس اتفاق پر ہم دونوں بہت ہی خوش ہوئے تھے اور اب بھی ہیں۔ مجھے شادی کے بعد معلوم ہوا عابدہ کو سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لینے کا بہت شوق ہے۔ وہ اپنی پڑھائی کے دوران ایک دو بار سیلاب زدگان کی امداد کے لیے اسکول کی طرف سے چند اکٹھا کرنے کی مہم میں بھی شریک ہوئی تھی۔ تب سے اس کا شوق بڑھ گیا تھا..... اور اب شادی کے بعد بھی وہ اس شوق کو جاری رکھے ہوئے تھی۔

مئی 2012ء

257

ماہنامہ سرگزشت

ہیں۔ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے جب نوید سے بات کی تو پھر بہت سی باتیں سامنے آئیں۔ کاشان کی ماں کو واقعی اپنے شوہر سے زیادہ اپنے بیٹے یعنی کاشان کی فکر رہتی تھی۔

کاشان کی خاطر وہ نوید کی طرف دھیان نہیں دے پارہی تھی کیونکہ اسے یہ خوف لگا رہتا تھا کہ وہ کہیں پھر بھاگ نہ جائے۔ یہ ایک اُلجھی ہوئی پچویشن تھی اور میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ضرور پیش آتی ہے جو دوسری شادی کرتے ہیں اور پہلی بیوی یا پہلے شوہر کی اولاد بھی ہوتی ہے۔

ایڈ جسٹ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر عورت دورا ہے پر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کاشان کی ماں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔

میں نے نوید کو اپنے طور پر بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح کاشان کو اپنے پیار کے ذریعے قابو میں کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن وہ بد دل ہو رہا تھا۔ ”نہیں جناب۔ اب یہ بہت مشکل ہو رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں اپنی سی کوشش کر کے تھک چکا ہوں۔“

نوید کے لہجے میں بہت کچھ تھی۔

”تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟“

”اب ہم سب ایک دورا ہے پر آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ایک طرف تو میں ہوں۔ اور دوسری طرف کاشان ہے۔ اب اس بے چاری کے لیے یہ مسئلہ ہے کہ وہ میرا ساتھ دے یا اپنے بیٹے کا ساتھ دے۔ اس کی نفسیاتی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی نیندیں اُڑ گئی ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ سوچا ہے کہ میں اپنے آپ کو اس سے الگ کر لوں۔ وہ میرے بغیر تو زندگی گزار سکتی ہے۔ لیکن اپنے بیٹے کے بغیر مر جائے گی۔“

یہ بہت تلخ فیصلہ تھا اس کا۔ بے رحم۔ لیکن شاید فیصلے میں ان سب کی بھلائی تھی۔ ورنہ سب کے سب تباہ ہو جاتے۔

دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ یہ ایسا دکھ تھا کہ جس کے لیے ہمدردی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ دنیا پر یہ ایک عام سا واقعہ ہے لیکن کیسی تلخیاں چٹھی ہوئی اور یہ کیسی بے رحم چٹائی ہے کہ اگر شوہر یا بیوی کا انتقال ہو جائے اور بچے بھی ہوں تو بچے دوسری شادی کو قبول نہیں کر پاتے۔ کیا یہ مسئلہ ہمارے این جی اوز کے لیے سوچنے کا نہیں ہے۔ کیا اس کے لیے کوئی نفسیاتی اسکول شروع نہیں کیا جاسکتا؟



مئی 2012ء

”کون سا معاملہ؟“

”وہی۔ اس عورت کا۔ جس کے بیٹے کو تم اپنی طرف کر رہے تھے۔“

”ارے لعنت بھیجوان لوگوں پر۔ کم بخت مخلد چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“ اس نے تلخ ہو کر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے انہیں میری پالیسی کا پتا چل گیا تھا۔ اسی لیے یہاں سے چلے گئے۔“

”تو اب کیا ارادے ہیں تمہارے۔“

”اب کیا ہونا ہے۔ اب تو میں نے ان کا دھیان ہی چھوڑ دیا ہے۔ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔“

کئی دنوں کے بعد میں کاشان اور اس کے گھر والوں سے ملنے گیا تھا۔ کاشان کی ماں بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ”بھائی صاحب۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔ اب شاید سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ کاشان کا رویہ اب نوید صاحب کے ساتھ بالکل ٹھیک ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں۔“

”ظاہر ہے کہ اب درمیان میں بہکانے والا نہیں رہا۔ اس لیے۔“

”جی ہاں بھائی صاحب۔“

”نوید صاحب سے کہیے گا کہ وہ کسی بھی حال میں کاشان کو اس پُرانے محلے کی طرف جانے نہ دیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ آدمی موقع پاتے ہی پھر سانپ کی طرح ڈس سکتا ہے۔“

”جی ہاں۔ اتنا تو اندازہ ہو گیا ہے۔“

میں وہاں سے چلا آیا۔ یہ ظاہر یہ کہانی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ایک دو تماشے اور ہونے تھے اور یہ تماشے اس وقت شروع ہوئے جب کاشان کی ماں کا فون آیا۔ میں اسے اپنا نمبر دے گیا۔ ”بھائی صاحب۔ مہربانی ہوگی۔ آپ ذرا آ جائیں۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

خدا جانے کیسی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ بہر حال میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ کاشان کی ماں بہت پریشان سی کھڑی تھی۔

”بھائی صاحب۔ اب ایک مسئلہ اور کھڑا ہو گیا ہے۔“

”وہ کیا؟“

کاشان کے ابو (نوید) مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔“

”ارے۔ وہ کیوں؟“

”ان کا یہ خیال ہے کہ میں ہر وقت کاشان کے پیچھے لگی رہتی ہوں۔ مجھے ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ بہت موڈ خراب ہے ان کا۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ نوید ایک معقول انسان

256

ماہنامہ سرگزشت

ہماری شادی ہوئے پانچ سال بیت گئے تھے مگر ہم اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ نقص عابدہ میں تھا۔ میں مسلسل اس کا علاج کر رہا تھا۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ سماجی بہبود کے سلسلے میں وقت نکال لیتی تھی۔ محلے میں کوئی عورت یا بچہ بیمار ہو جاتا تو وہ ان کے ساتھ اسپتال جاتی۔ کسی لڑکی کی شادی ہو رہی ہوتی تو وہ اس کے گھر والوں کا ہاتھ بٹاتی۔ کسی کے بچے بچتی کا کوئی اسکول کا مسئلہ ہوتا تو عابدہ وہاں بھی موجود ہوتی۔ کوئی فونگلی ہو جاتی..... تو ان لوگوں کے دکھ میں برابر کی شریک ہوتی۔ محلے کی عورتیں اور بچیاں اسے بہت چاہتی تھیں۔ محلے میں ہر طرف ”عابدہ، عابدہ“ ہی ہوتی۔ میں دفتر سے واپس آتا تو وہ کم ہی گھر پر ملتی۔ پوچھنے پر امی بتاتی کہ وہ فلاں کے ساتھ بازار یا اسپتال گئی ہوئی ہے۔ مجھے قصہ تو بہت آتا مگر ضبط کر جاتا کہ وہ تنگی کمانے لگی ہے۔ میں اسے تنگی کے کاموں سے اس لیے منع نہ کرتا تھا کہ وہ اپنی یا میری جیب سے کوئی رقم خرچ نہ کرتی تھی۔ بس وہ نام کی ہمدردی کرتی تھی۔ اس نے آج تک کسی بھی غرض مند کی مالی مدد نہ کی تھی۔ حالانکہ اکثر عورتیں مالی مدد کی غرض سے اس کے پاس آتی تھیں مگر وہ ہر ایک کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیتی تھی۔ میری تنخواہ بھی اتنی نہ تھی کہ میں کسی کی مالی مدد کرتا۔ بس گزارہ ہو جاتا تھا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کسی کی مالی مدد کروں، صدقہ اور خیرات دوں مگر جیب اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ مجھے عابدہ کی بھی ایسی ہمدردی اچھی نہ لگتی تھی۔ میں نے ایک دو بار اسے کہا بھی کہ اس کام کو چھوڑ دو اور گھر کی طرف توجہ دو۔ امی اب بوڑھی ہو گئی ہیں، تم ان کا ہاتھ بٹایا کرو۔ مگر وہ نہ مانی..... اور اپنی نمود کا سلسلہ جاری رکھا..... مگر آہستہ آہستہ مالی مدد نہ ملنے کی وجہ سے عورتیں اس سے دور ہوتی گئیں۔ جب عابدہ نے محسوس کیا کہ محلے میں اس کا وقار کم ہونے لگا ہے تو اس نے شہر کے قیم خانے میں جانا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی ”میں قیموں کی حالت زار کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔“

”کیوں نہ ہم قیم خانے سے کوئی بچہ گود لے لیں؟“ میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”نہیں، ہرگز نہیں..... میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ وہ میری گود ضرور ہری کرے گا۔“

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

ایک دفعہ وہ قیم خانے گئی تو اس نے دیکھا کہ کچھ بچے

ایک پھٹی پرانی کتاب کو ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں وہ لڑائی اور دھینکا مٹتی بھی کر رہے ہیں۔

عابدہ نے ان کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا ”تم کیوں شور مچا رہے ہو..... اور لڑ رہے ہو۔ شاید تم نہیں جانتے کہ تمہیں اس کی سزا بھی مل سکتی ہے۔“

”بیگم صاحبہ..... اس نے میری کتاب چھین لی ہے۔“ ایک لڑکا دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ جھوٹ بولتا ہے، کتاب اس نے چھینی ہے۔“ دوسرا لڑکا چلا یا۔

”بالکل غلط..... بیگم صاحبہ! کتاب میرے پاس تھی اور یہ دونوں مجھ سے چھین رہے تھے۔“ تیسرا لڑکا روٹے ہوئے بولا۔

قیم خانے کی منتظرہ سے عابدہ نے رابطہ کیا تو اس نے عابدہ کو بتایا کہ یہ لڑائی جھگڑا تو یہاں کاروز کا معمول ہے۔ ان بچوں کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے مگر ہمارے پاس کتابیں کم ہیں اور بچے زیادہ۔

اس بات کا عابدہ پر بہت اثر ہوا۔ مگر واپس گھر آنے تک وہ اس واقعے کو ذہن سے نکال چکی تھی..... پھر بھی اس نے مجھے اس بارے میں بتا دیا۔ میں نے بھی اُن سنی کر دی۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد ہمارے پڑوس میں ایک شادی تھی۔ اس شادی میں ہماری پوتہ کنسل کے چیئر مین ملک صاحب بھی مدعو تھے۔ جب عابدہ کو پتا چلا کہ ملک صاحب بھی آرہے ہیں تو اس نے مجھے اعتماد میں لے کر ملک صاحب سے ملاقات کی..... باتوں باتوں میں عابدہ نے ملک صاحب سے قیم خانے کی منتظرہ کی شکایت کی اور بچوں کے لیے کتابوں کا ذکر بھی کیا۔

”اچھا!“ چیئر مین صاحب بولے ”یہ تو افسوس کی بات ہے کہ بے چارے قیم بچے پڑھنے کا شوق رکھتے ہوئے بھی کتابوں کو ترسیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم قیم خانے کو کتابیں مہیا کرنے کا بندوبست کر دیں۔ ہاں یاد آ یا، میں نے اپنے بچوں کے لیے جب وہ چھوٹے تھے تو کہانیوں کی بہت سی کتابیں خریدی تھیں اور شاید اب کسی اسٹور میں پڑی ہوں گی، مگر کون کاٹھ کباڑ میں ان کو ڈھونڈے پھر بھی میں کچھ کروں گا۔“

یہ کہہ کر چیئر مین صاحب چلے گئے اور عابدہ منہ مٹائے گھر لوٹ آئی۔

لیکن پھر بھی اسے یقین تھا کہ چیئر مین صاحب کتابوں کا

ایک ضرور کریں گے، یوں اس کی شان میں بھی اضافہ۔

اگلے روز چیئر مین کو ضلعی ناظم سے ملنے جانا تھا۔ ناظم صاحب بھی بہت ہی بھلے مانس تھے۔ ان کی ساری زندگی کے ملازموں، قیموں اور بیواؤں کی فکر میں گزری تھی۔

ہر مین صاحب نے ان سے قیم خانے میں کتابوں کی کمی کا اکر کیا اور بڑے ہی درد بھرے لہجے میں کہنے لگے ”میں چاہتا ہوں کہ کہیں سے کتابوں کا بندوبست ہو جائے تو مجھے جین بھی آئے اور میری واہ واہ بھی ہو جائے۔“

”اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ملک صاحب!“ ناظم صاحب بولے۔ ”مجھے کل صبح روزنامہ ”رج“ کے دفتر جانا ہے۔ میں ایڈیٹر بخاری سے کہہ دوں گا کہ اس سلسلے میں اخبار میں اپیل شائع کرا دے۔“

چیئر مین صاحب مطمئن ہو کر لوٹ آئے۔ اگلے روز وہ ناظم صاحب اخبار کے دفتر گئے اور ایڈیٹر صاحب سے اہل کے سلسلے میں بات کی تو اس نے فوراً ایک رپورٹر کو بلا کر اہل لکھ ماری..... جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

”قیم بچے جو قوم کی امانت ہی نہیں، مستقبل بھی ہیں۔ محلوں کو ترس رہے ہیں۔ کیا آپ ان کی علمی پیاس نہیں بجھائیں گے؟ یقیناً بجھائیں گے..... ان قیموں کو زور پر تعلیم سے آراستہ کیجئے۔ ان کو کتابیں دیجئے..... نہ صرف ثواب کمائیں بلکہ جنت میں گھر بھی بنوائیں۔“

☆☆☆

اگلے روز اپیل شائع ہوئی جس میں قیم خانے کا پتا بھی درج تھا۔ عابدہ نے وہ اپیل پڑھی تو اخبار ساتھ لے کر قیم خانے چلی گئی۔ پورا دن گزر گیا مگر کوئی بھی شخص کتابیں دینے نہ آیا۔ یوں ہی تین دن گزر گئے۔ عابدہ روزانہ ہی جاتی، مگر اداسی ہو کر لوٹ آتی کہ کسی نے بھی اس اپیل پر کان نہ دھرے تھے۔

پانچویں دن چھٹی تھی۔ لہذا میں بھی عابدہ کے ساتھ چل پڑا۔ ہم قیم خانے کے مین گیٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص جس نے پھٹے پڑے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اس کے ساتھ ایک دہلی پٹی لڑکی تھی جس نے پرانی کتابوں کا بنڈل اٹھا رکھا تھا۔

”تم کون ہو اور کس سلسلے میں آئے ہو؟“ عابدہ نے ہلدی سے ان سے پوچھا۔

”بیگم صاحبہ! اخبار میں اپیل شائع ہوئی تھی کہ قیم خانے کے لیے کتابیں چاہئیں۔ ہم گاؤں میں رہتے تھے اس لیے

”عرب“ کا لفظ اعراب سے ہے جس کے معنی گنوار لوگ یا بادیہ نشیں ہے۔ اسلام سے قبل یہ لوگ قبائل کی صورت میں رہتے تھے۔ یہ خانہ بدوش قبائل تہذیب و تمدن کے اصولوں سے نا آشنا تھے اور وہ کسی منظم و منضبط معاشرے کے افراد نہ تھے بلکہ بدوی طرز حیات کے عادی تھے۔ اگرچہ شہروں میں بھی لوگ مستقل سکونت پذیر تھے مگر ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔

پرو فیسر ڈاکٹر فضل کریم کے مضامین سے اقتباس تلاش: اظہر جلیل صدیقی، کراچی

اخبار دیر سے پڑھا..... ہم یہ کتابیں لائے ہیں۔“ بچی نے کتابوں کا بنڈل عابدہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی جھلک تھی۔

”گاؤں میں پرائمری اسکول ہے۔ وہاں سے میں نے پانچ جماعتیں پڑھ لی ہیں۔“ اس نے وضاحت بھی کر دی۔

”تمہارا نام.....؟“ عابدہ نے دونوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”وہ کس لیے بیگم صاحبہ!“ لڑکی کا باپ بولا۔

”اس لیے کہ میں اخبار میں اس عطیے کے اعلان کے ساتھ تمہارا اور تمہاری بیٹی کا نام بھی شائع کراؤں گی۔“

”ہمارا نام رہنے دیں..... میں تو ایک معمولی اور غریب آدمی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ بچی کی انگلی پکڑے وہاں سے چل دیا۔

میں اور عابدہ ان باپ بیٹی کو دور تک جاتے دیکھتے رہے مجھے ”تار“ یاد آ گیا..... جب ایک طرف سے پیغام دیا کھنٹی کی صورت میں بجایا جاتا تھا اور دوسری طرف سے اسے وصول کیا جاتا تھا..... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ قیم خانے کے بچوں نے ایک پیغام دیا تھا، غریب شخص نے وہ پیغام سنا اور اپنا فرض نبھانے چل پڑا۔ باقی لوگ، چیئر مین صاحب اور ناظم صاحب، میں اور عابدہ..... سب کے سب تار کے نظام کے ان کمبوں کی مانند تھے..... جو صرف پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں..... اس کے علاوہ وہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتے..... کیونکہ ہم بے جان اور بے جس کعبے ہی تو ہیں۔



جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!

میں کوئی رائٹر نہیں ہوں لیکن سرگزشت بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔
دوسروں کی کہانی پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ اپنے ایک دوست کا
واقعہ بھی لکھ کر بھیج دوں۔ شاید آپ کو پسند آجائے اور وہ
سرگزشت میں جگہ حاصل کر لے۔ دولت خان کا یہ واقعہ سبق
آموز ہے اسی لیے بھیج رہا ہوں کہ کوئی اور اس لالچ میں نہ آجائے۔

محمد طفیل
(حیدرآباد)

اس کے والدین نے اس کا نام دولت خان اس لیے
رکھا تھا کہ وہ بڑا ہو کر دولت مند بن جائے۔

لیکن جب وہ بڑا ہوا تو دولت خان کے بھانجے عزیز خان
بن گیا۔۔۔ بد نصیب خان بن گیا۔ اس لیے کہ دولت ہمیشہ
اس سے دور بھاگتی تھی۔ اس نے جس دھندے میں بھی ہاتھ
ڈالا وہ چو پٹ ہو گیا، اس نہیں آیا۔ اس نے جہاں کہیں بھی
روپیہ لگایا وہ ڈوب گیا۔ کچھ لوگ ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں
کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں
تو وہ سونا بن جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ اس نے
سونے کو ہاتھ لگایا تو وہ مٹی بن گیا۔

دولت خان نے بہت سے سچے تجربوں اور گھانا اٹھانے
کے بعد تنگ آ کر سوچا کہ اسے دولت کمانے کے لیے کوئی
شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ کچھ ایسے تجربے اور راستے
ہیں جن میں محنت کم..... اور آمدنی بے پناہ ہوتی ہے اور
نقصان کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک خاص
کام کے پیش نظر وہ حیدرآباد سے کراچی آیا تھا۔ کراچی۔
میں وہ اپنا تاناکہ مستقل بناسکتا تھا۔

اس کا ایک دوست کراچی میں مستقل طور پر رہا تھا۔
اس نے دولت خان کو شہر کی ایک ایسی پارٹی کے سرغنہ کا نام
اور پتا بتا دیا تھا جس کی مدد سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ
کمانے کا اسے موقع..... مل سکتا تھا۔ اس کا دوست تین برس
پیشتر ایک معمولی آدمی تھا۔ کراچی آنے کے بعد امیر کبیر بن
گیا۔ اسے ایک شرط پر بتایا تھا کہ وہ پارٹی کا نام اور کاروبار
خفیہ رکھے گا۔ اسی میں اس کی سلامتی اور بقا ہے اور فائدہ
بھی۔ کیونکہ اس پارٹی کا بزنس ہی ایسا تھا۔ یہ انہماکی خفیہ طور

کریں گے۔ اس میں دونوں کا بھلا ہوگا..... لیکن ایک بات
آپ جانتے ہوں گے کہ بغیر بیج کے فصل نہیں اگتی ہے.....
اس لیے آپ کو اچھی فصل کے لیے بیج کی ضرورت ہوگی.....
..... دولت حاصل کرنے کے لیے آپ کو کچھ رقم بیج کے طور
پر استعمال کرنا پڑے گی اور کچھ محنت بھی کرنی ہوگی۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ دولت خان نے اسے سوالیہ
نظروں سے دیکھا۔

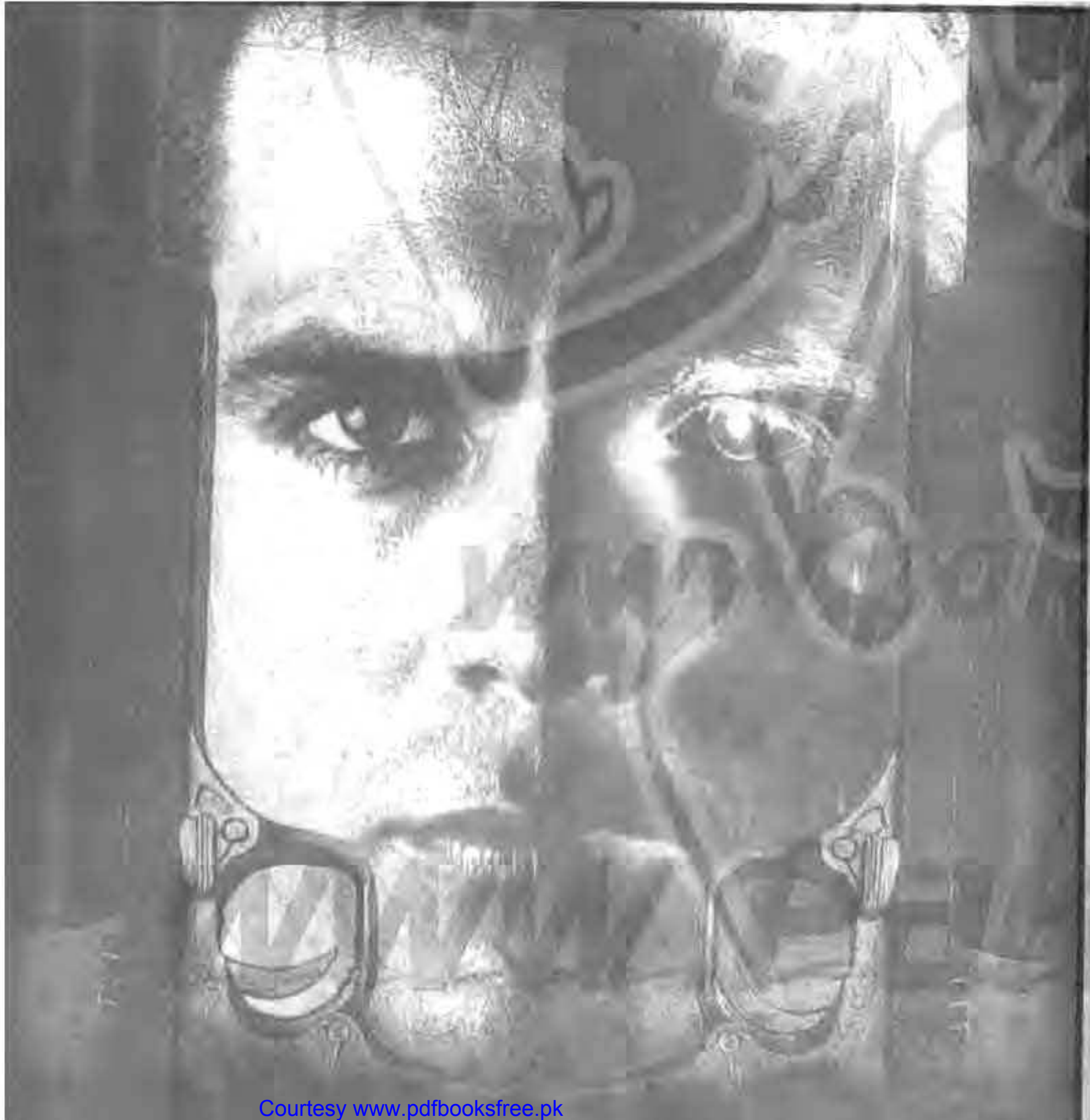
”سنئے..... میں تفصیل سے سب کچھ بتاتا ہوں۔“ وہ
کہنے لگا ”ہماری کمپنی کو آپ جیسے ہی ضرورت مند اور با حوصلہ
لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہم آپ پر اعتماد کریں گے اور آپ
ہم پر کریں گے۔ دراصل ہماری کمپنی جعلی نوٹ کا دھندا کرتی
ہے۔ پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں، ہمارا
طریقہ کار ایسا ہے کہ کوئی شخص یہ شناخت نہیں کر سکتا کہ نوٹ
اصل نہیں ہیں۔ ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی انہیں پہچان نہیں
سکتا..... اس کام میں تھوڑا بہت جو حکم تو ہے لیکن اس میں جو

پر ہی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

دولت خان نے اپنے دوست پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ
راتوں رات دولت مند بننے کے لیے ہر طرح کے پاپڑ بیلنے کو
تیار ہے۔ پھر وہ اپنے دوست سے اس پارٹی کا پتا لے کر
سہرا ب گھٹھ پہنچا تا کہ اس سے سودا ملے کیا جائے۔ ابوائسن
اصنہائی روڈ کی ایک عمارت میں جو دو کمروں کا قلیٹ تھا اس
میں پارٹی کا قیام تھا۔ دولت خان نے جب اپنے دوست کا
خط اسے دیا تو اس نے بڑی گرم جوشی سے دولت خان کو خوش
آمدید کہا۔

”آپ کے دوست ریاض مرزا نے فون پر بتا دیا تھا کہ
آپ کو دولت کی سخت ضرورت ہے۔“ پارٹی نے کہا۔
”جی ہاں۔“ دولت خان نے سر ہلا دیا ”دولت کی کس
ضرورت نہیں ہوتی، اس کے چکر میں ہی تو کراچی آیا ہوں۔“
”اس سلسلے میں..... ہم آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔“
پارٹی نے جواب دیا ”ہم آپ کو ایک ایسا شارٹ کٹ راستہ
بتائیں گے جو آپ کو راتوں رات دولت مند بنا سکتا ہے۔
راتوں رات نہ سبھی جلد از جلد بنا سکتا ہے۔“

”کیا آپ کے پاس کوئی جادو منتر ہے جس سے میں
ایک دولت مند آدمی بن جاؤں؟“ دولت خان نے پوچھا۔
”نہیں میرے دوست..... روپیہ ایسے حاصل نہیں کیا
جاسکتا۔“ پارٹی نے جواب دیا ”ایسا ہوتا تو دنیا میں سب سے
زیادہ اور بڑے دولت مند جادوگر ہوتے..... اس کے حصول
کے لیے محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم خود بھی محنت
کرتے ہیں اور اس لیے آپ کو بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ
محنت کریں..... ہم آپ کے مدد کریں گے۔ آپ سے تعاون



منافع کی شرح ہے وہ کسی کاروبار میں نہیں ہے۔ آپ سے صرف بیس ہزار کی رقم لے کر ہم اس کے بدلے آپ کو ایک لاکھ روپے کے جعلی نوٹ دیں گے۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ نوٹ ایسے ہیں کہ کوئی بھی انہیں جعلی سمجھ نہ سکے گا۔ آپ ہمیں صرف بیس ہزار روپے دیں گے اور ہم آپ کو ایک لاکھ روپے دیں گے..... آپ کو اسی ہزار روپے کا کھلا منافع ہوگا..... آپ کا کام یہ ہوگا کہ احتیاط سے ہمارے نوٹ نکال دیں۔ ذرا سی ہوشیاری اور محنت سے آپ اتنا بڑا منافع کما لیں گے..... ایک بار پھر میں یہ بات دُہرا دوں کہ ہمارے نوٹ بالکل سرکاری نوٹ جیسے ہوں گے۔“

کچھ دیر اور ان کے درمیان فیصلی گفتگو ہوئی اور پھر سودا طے ہو گیا۔ دولت خان کو اس کے دوست نواز شہ نے یہ اسکیم بتائی تھی۔ اب سب کچھ طے ہو جانے کے بعد دولت خان کو بیس ہزار کی رقم لے کر طے کی ہوئی جگہ جانا تھا جہاں اسے ایک لاکھ روپے کے جعلی نوٹ ملنے تھے۔

لیکن سامنے والے آدمی کے اصرار پر اسے گھٹنا پڑا۔ اس نے ہزار کے نوٹوں کا ایک بڈل اٹھایا اور اسے گھٹا۔ پچیس ہزار، پچیس ہزار کے دو بڈل تھے۔ اسی طرح پانچ پانچ سو کے بڈل بھی بتائے ہوئے تھے لیکن تمام نوٹوں کے بڈل ملے نہیں تھے۔ ان میں پُرانے نوٹ بھی تھے۔ جب وہ ان پُرانے نوٹوں کو دیکھنے لگا تو اس شخص نے کہا۔

”اے تیس چالیس قدموں کی مسافت طے کی ہوگی کہ عقب
 سے ایک تیز آواز گونجی۔
 ”ظہرہ..... رک جاؤ۔“

یہاں کسی غلط کام سے نہیں آیا ہوں بے وہ اپنا گل سہلا تے ہوئے بولا۔

گنگوٹیاں

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!

یہ دنیا ایک ایسا اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکاری کیے جا رہے ہیں۔ مگر کچھ لوگ انتہائی منفرد اداکاری بھی کرتے ہیں جو عام آدمی کے بس کی بات نہیں، تبھی تو وہ انفرادی تشخص حاصل کر لیتے ہیں۔ اب یہی دیکھیں، میرے دوست کے ساتھ جو کچھ ہوا، کیا عام طور پر ایسا ہوتا ہے؟ اسی لیے میں نے اس واقعے کو لکھا ہے تاکہ دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں۔

انصار حسین
(کراچی)



یہ کہانی میرے ایک دوست فرقان اسلم کی ہے اور اس نے یہ کہانی نہ صرف مجھے سنائی ہے بلکہ میں اس کا چشم دید گواہ بھی ہوں۔

میرا خیال ہے کہ ایسا واقعہ پاکستان کے کسی حصے میں بھی کسی کے ساتھ پیش نہیں آیا ہوگا، آپ چاہیں تو اسے غلط سمجھ سکتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ یہ منفرد انداز کی کہانی خود اسی کی زبانی سن لیں۔

”مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے اتنے بھائی بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھی جہاں اس کے بھائیوں سے ملاقات ہوئی وہ کل ملا کر نو تھے۔ اور سب کے سب انتہائی کچم کچم خطرناک انداز کے،



ماہنامہ سرگزشت

265

مئی 2012ء

اتنے میں ایک چہرہ چائے وغیرہ رکھ کر چلا گیا۔ دولت خان بڑی طرح ہنس گیا تھا۔ ایک سپاہی اور دوسرا ہزار اور پانچ کے نوٹوں کی گڈی، بریف کیس سے نکال کر چائے پینے ہوئے نوٹ گننے لگے تو دولت خان کو فرار کی ایک تدبیر سوچھی۔ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”داش روم کدھر ہے؟ بڑے زور کا پیشاب لگا ہے۔“
دردی پوش سپاہی نے بے پروائی سے باہر کی طرف اشارہ کیا ”کیٹ کے پاس داش روم ہے۔“

دولت خان کو امید نہیں تھی کہ اسے اکیلے جانے دیا جائے گا، وہ لڑکھڑاتے قدموں سے داش روم میں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ان تینوں میں سے کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا، احاطے سے باہر آ کر وہ ایک سمت بگٹ بھاگا۔ اس نے بہت دور آنے کے بعد پلٹ کر دیکھا، کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تھا۔ پھر اس نے تاریک گلی سے مین روڈ پر آ کر ایک رکشہ روکا اور اس سے بولا ”الاعظم پہنچا دو، جہاں حیدر آباد جانے والی بسوں کا اڈا ہے۔“
حیدر آباد پہنچ کر اسے یاد آیا کہ پچیس ہزار کی گڈی تو کر میں اڑی ہوئی ہے۔ اس نے نکال کر جیب میں رکھی اور میرے گھر آنے کے لیے رکشے میں بیٹھ گیا۔ جب مجھے اس نے خود پر گزری سنا تو میں نے کہا ”لالہ! تم بہت بڑے خطرے سے نکل آئے ہو۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے پوچھا۔
”یہ کام بہت ہورہا ہے۔ ابھی میرے ایک اور دوست کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ ہوا ہے۔“
”کیسا واقعہ؟“ اس نے سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ نقلی پولیس والے ہوتے ہیں۔ سب کچھ پری پلان ہوتا ہے۔ یہ دیکھو اخبار۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک پُرانا اخبار ڈھونڈ کر وہ خبر نکالی اور اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ خبر میں پکڑے گئے بھرموں کا بیان تھا کہ وہ لوگ اصلی نوٹ ہی دیتے ہیں پھر نقلی پولیس جا کر انہیں ایک نقلی پولیس چوکی میں لے آتی ہے جہاں سے خریدار کو فرار کر دیتے ہیں۔“

”او یار، یہ تو بہت خراب زمانہ آ گیا ہے۔“ دولت خان نے کہا۔

”واقعی زمانہ بڑا خراب آ گیا ہے۔ باپ پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اب تم یہیں رہو۔ حیدر آباد میں بہت سے کام ہیں۔ یہیں نوکری تلاش کر لو۔“ میں نے مشورہ دیا۔



مئی 2012ء

سے رومال نکال کر ہونٹوں سے خون صاف کرنے لگا۔
بریف کیس میں نوٹوں کے بٹل دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک سنسنی خیز چمک ابھر آئی۔ دردی پوش سپاہی نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔

”اچھا تو یہ معاملہ ہے۔۔۔۔۔؟ ہیر وٹن خریدنے آئے تھے تاکہ کسی امریکی یا یورپی سیاح کے ہاتھ فروخت کر دو۔“
”جی نہیں۔۔۔۔۔“ دولت خان نے ٹہنی میں سر ہلایا ”میں منشیات فروشی نہیں کرتا، میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک سیدھا سادہ بزنس مین ہوں۔“

ان میں سے تیسرے آدمی جس نے اس کی خاطر تواضع کی تھی، اس نے دولت خان کے ایک اور تھپڑ رسید کرنے کے بعد کہا۔

”جتنے منشیات فروش ہیں وہ اپنے آپ کو اسمگلر یا منشیات فروش توڑی کہتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ بزنس مین کہتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے کب انکار ہے کہ تم تاجر نہیں ہو۔۔۔۔۔ آپ تو جناب۔۔۔۔۔!“ اس کا لہجہ طعنیہ ہو گیا ”بین الاقوامی بزنس مین ہیں۔ انٹرنیشنل بزنس مین۔۔۔۔۔ تاجروں کے تاجر، بہت بڑے تاجر۔“

اس کی بات سن کر اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ دردی والا سپاہی بولا ”یار پو! تم نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا۔“
ڈنڈا بردار نے ہنسنے ہوئے کہا ”سنو۔۔۔۔۔ اپنی جان کی امان چاہتے ہو تو سب کچھ سچ سچ اٹھ دو۔۔۔۔۔ ورنہ ہمیں وہ سب طریقے آتے ہیں کہ بے زبان جانور کیا۔۔۔۔۔ مردے بھی بول اٹھتے ہیں اور اگل دیتے ہیں، تمہارا باپ بھی قبر سے آ کر بتا دے گا۔“

”یار، اتنی باتیں کرنے اور سمجھانے کی کیا ضرورت ہے؟“ دردی پوش سپاہی بولا ”ذرا اس بزنس مین کو ہمارا ایک سیکل تو دکھا دو۔“

”ایک منٹ۔۔۔۔۔ پلیز، ٹھہرو۔۔۔۔۔ میں بتاتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے؟ سختی اور تشدد کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات یہ ہے کہ میرے اس بریف کیس میں جو رقم ہے وہ جعلی نوٹ کی شکل میں ہے۔ میں نے بیس ہزار روپے میں ایک لاکھ روپے خریدے ہیں۔“

”واہ۔۔۔۔۔ پتر! تو تو استادوں کا بھی استاد نکلا۔۔۔۔۔ تو تو بہت بڑا مجرم ہے۔ یار بٹ! رجسٹر لاؤ اور اس کے خلاف کیس درج کرو۔“

دولت خان گڑغڑانے اور فٹیں کرنے لگا۔ دردی پوش نے رجسٹر لا کر اس کا بیان قلم بند کیا۔ دولت خان نے دیکھا کہ

264

ماہنامہ سرگزشت

ایسا لگتا تھا جیسے وارد حازان کی شخصیت میں شامل ہو۔ پتا چلا کہ ان لوگوں نے اپنے گھر کے آگن میں ایک اکھاڑہ بنا رکھا تھا جس میں صبح شام ورزش بھی کیا کرتے اور شام کے وقت ہارٹل آرٹ کی ٹریننگ بھی لیتے تھے۔

میں جس لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا نام شہناز ہے۔

میں نے اسے ایک مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ وہ ایک دکان سے سبزیاں خرید رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیا حسن تھا اس کا۔ رنگ گرچہ زیادہ صاف نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر ہلاکی ملاحظہ تھی۔

ایسی کشش بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

میں اس دکان سے کچھ قاصطے پر کھڑا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے بھی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں اسی لیے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

پھر یہ ہوا کہ وہ جب سودا خرید کر جانے لگی تو ایک مناسب قاصطے سے میں نے بھی تعاقب شروع کر دیا۔ نہ جانے کیوں میں اس کے لیے پاگل ہی ہو گیا تھا یا شاید محبت اسی کو کہتے ہیں کہ انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لڑکی نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔

وہ پیدل ہی ایک طرف جا رہی تھی اور میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اپنے انجام سے بے خبر کوئی طاقت تھی جو مجھے اس کی جانب کھینچ رہی تھی۔

پھر وہ ایک مکان میں داخل ہو گئی اور میں باہر کھڑا اس مکان کی طرف دیکھتا رہا، کچھ دیر بعد میں وہاں سے واپس آ گیا جہاں میں نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی (واضح رہے کہ میرا یہ دوست خوش حال انسان ہے)

رات بھر میں اس کے بارے میں سوچتا رہا اور دوسرے دن اپنی گاڑی لے کر اس کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے معمولات کیا ہیں۔ وہ کس وقت گھر سے نکلتی ہے۔ کہاں جاتی ہے، کس وقت واپس ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گھر سے نکلی تھی اور اس بار بھی اکیلی ہی تھی اور اس کا رخ مارکیٹ ہی کی طرف تھا۔

جب وہ خاص آگے بڑھ گئی تو میں آہستہ آہستہ گاڑی اس کے قریب لے گیا۔ اس نے گاڑی کی آواز پر مڑ کر میری

طرف دیکھا اور اس کی ہنسیوں تن گئیں۔ اس نے اپنی رٹا کر دی۔ وہ کترا کر ایک طرف نکل گئی تھی۔

بہر حال کئی دنوں تک یہی ہوتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ مسلسل جدوجہد سے پتھر بھی بک جاتے ہیں تو اس کی برف بھی پگھلنے لگی اور ایک دن اس مجھے مسکرا کر دیکھ لیا۔ اب میں اس ملاقات کی داستان کو طر نہیں کروں گا۔ بس اتنا جان لیں کہ ہم ایک دوسرے ملنے لگے تھے۔

پہلے ہی دن میں اسے ایک شاعر ہوٹل میں لے جہاں اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ ”میرا نام ہے۔“

”اور میں فیصل ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کر دیا۔

”کیا کرتے ہیں آپ؟“

”پہلے تم بتاؤ۔ تم کیا کرتی ہو۔“

”میں پرائیویٹ لی اے کر رہی ہوں۔“ اس نے بتایا

”ویسے آپ بہت ضدی اور دھن کے پکے انسان ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”آپ نے کسی نہ کسی طرح مجھے گھیر لی۔“ اس

کہا۔

”نہیں شہناز میں نے تمہیں نہیں بلکہ تم نے مجھے۔“

میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تو پہلی نظر میں ہی

بس ہو گیا تھا۔“

”آپ یقین کریں گے یہی میرا حال ہوا تھا۔“

مجھے دنیا کی شاید سب سے بڑی خوشی مل گئی تھی۔ مجھ

حاصل ہو جائے تو یہی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ انسان بادلوں

میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سکندر اعظم محسوس

کرتا ہے۔ جس نے آدمی دنیا فتح کر لی ہو۔

میں سکندر اعظم ہی تو تھا جس نے شہناز جیسی لڑکی کی

محبت اور توجہ حاصل کر لی تھی۔ اب ہم تقریباً روزانہ ملا کرتے

تھے۔ اس کے ساتھ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اسے جب

بلا تا وہ فوراً چلی آتی۔ اکثر ہم رات گئے تک گھومتے رہتے۔

ایسا لگتا تھا جیسے اس پر کوئی پابندی نہ ہو۔

ایک دن جب میں نے دریافت کیا تو اس نے جواب

دیا۔ ”کس بات کی پابندی! گھر والوں کو مجھ پر بہت بھروسہ

ہے۔ بس اور کیا چاہیے۔“

ایک شام اس نے کہا۔ ”آج مجھے ایک شرٹ چاہیے۔“

مردانہ۔“

”کیوں؟“

”بھائی کو دیتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کی برتھ

ڈے۔“

”پلو ابھی دلوائے دیتا ہوں۔“

میں اسے لے کر ایک اسٹور میں آ گیا۔ یہاں اس

ہا۔ ”بھیل ایک شرٹ لے گئی تو دوسرے بھائی ناراض

ہا میں گئے مجھے نو شرٹ لیتی ہوں گی۔“

”نو۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

نو شرٹس کی کیا ضرورت ہے؟“

”اس لیے کہ میرے نو بھائی ہیں۔“ اس نے مسکراتے

ہا۔

میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔ ”نو بھائی۔“

”ہاں صرف نو۔“ اس نے کہا۔ ”اور میں نے انہیں

ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”یہ کیا غضب کیا تم نے؟“

”کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ سب بھائی بہت کھلے ذہن کے

ہا۔ میں نے تمہارے بارے میں انہیں سب کچھ بتا دیا ہے

اور میری خوشی کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں۔ خود

میں اس طرح تمہارے بلانے پر میں گھر سے بے دھڑک نکل

آئی ہوں کوئی اور ہوتی تو آ سکتی تھی۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب میری خوشی میں خوش ہیں

اور لپے تمہیں مدد بھی کیا ہے کل چلنا ہے تمہیں۔“

بہر حال میں اس کے گھر پہنچ گیا جہاں اس کے نو بھائی

موجود تھے اور سب کے سب انتہائی خطرناک قسم کے ہاڈی

جن کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔

”دیکھ بھائی۔“ سب سے بڑے بھائی نے مجھے مخاطب

ہا۔ ”یہ جو ہماری بہن ہے نا۔ یہ ہم سب کی لاڈلی ہے، بہت

پارہیزگار ہے اس سے، اس لیے اس کو بھی دکھ مت دینا۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جناب۔ میں اس سے بے

محبت کرتا ہوں۔“

”اگر اس کی آنکھ میں آنسو آئے تو میں تمہاری گردن

داؤں گا۔“ ایک اور بھائی نے اپنے بازوؤں کی نمائش

کے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ میری طرف سے بے فکر رہیں میں اسے

لوں کی طرح رکھوں گا۔“

اس کے بعد کچھ دیر تک آپس میں باتیں ہوتی رہیں

جن ایک ایسی مخلوق ہے جس کا مادہ تخلیق آگ ہے۔ یہ مخلوق انسانوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہتی ہے۔ جن کے معنی ڈھانپنا اور پوشیدہ کرنا ہیں لہذا اس مادہ سے جو لفظ آتے ہیں ان میں پوشیدگی کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ جنین اس بچہ کو کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ میں ہو اور قبر کو بھی کہتے ہیں، جنہ کھنے باغ کو کہتے ہیں جو زمین کو ڈھانپ لے۔ جنوں اور جنہ اس بیماری کو کہتے ہیں جو عقل کو پوشیدہ کر دے وغیرہ۔

قرآن حکیم میں جن کا استعمال کبھی انس کے مقابلے پر ہوتا ہے اس صورت میں اس سے مراد ہر روحانی مخلوق ہوتی ہے خواہ وہ فرشتے ہیں یا شیطان ہوں یا جن۔ بعض مفسرین کے نزدیک تمام فرشتے بھی جن ہیں۔ علما نے روحانی مخلوق کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ نمبر ایک وہ جو نیک ہی نیک ہیں اور وہ فرشتے ہیں۔ نمبر 2 وہ جو بد ہی بد ہیں اور وہ شیطان ہیں اور تیسرے وہ جن میں نیک بھی ہیں اور بد بھی اور وہ جن ہیں۔ لیکن شیطانوں اور جنات کا مادہ تخلیق آگ ہے مگر فرشتوں کا مادہ تخلیق نور ہے۔ ان سب میں سے جنات میں عقل و شعور ہوتا ہے جن کو ”جن“ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ قرآن حکیم میں جنات اور شیاطین کا تقریباً 74 دفعہ ذکر ہوا ہے۔ جنات کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے پہلے پیدا کیا تھا۔

ملاح: نبیلہ اعظم، کراچی

پھر وہ سارے بھائی ورزش کے اکھاڑے کی طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شہناز نے پوچھا۔ ”دیکھ لیا نا، میرے بھائی جان دینے والے ہیں۔“

”جان لینے والے بھی دکھائی دیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے اس بات کی خوشی ہوئی کہ یہ سب تم سے اتنی محبت کرتے ہیں۔“

”خود پریشانیاں برداشت کر لیں گے لیکن مجھے پریشان نہیں ہونے دیتے۔“

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک طرف تو شہناز سے میرا تعلق اور بھی گہرا ہو گیا تھا اور دوسری طرف میرے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔

میں شہناز کے لیے کچھ خریدتا تو اسے اپنے بھائی یاد

بے گناہ گناہگار

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!

میرا پیشہ ایسا ہے کہ بے شمار دکھ بھری کہانیاں سامنے آتی رہتی ہیں مگر آج جس کہانی کے ساتھ میں حاضر ہوا ہوں، یہ میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ کتنا عجیب اور ضمیر پر بوجہ بن جانے والا واقعہ ہے یہ۔
شہزاد حسین زاہد
(لاہور)

میرا نام اسد حزرہ ہے، پٹے کے لحاظ سے میں منصف ہوں۔ حج کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے مجھے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ میری بیوی کا نام آسیہ ہے اور ہمارے دو بچے مقدس اور شہزاد ہیں۔

بنیادی طور پر میرا تعلق پاکپتن شریف کے ایک گاؤں فیروز پور چشتیاں سے ہے۔ میری شادی میری خالہ زاد سے ہوئی تھی جو لو میرج بھی تھی اور ارچ میرج بھی۔ میرے سرال والے بھی میرے ہی گاؤں میں رہتے تھے اس لیے گاؤں سے ہمارا رشتہ ٹوٹا نہ تھا۔ بس جاب کی وجہ سے میں اپنی بیوی کے ساتھ شہر میں رہتا تھا۔ ہر ایک دو ماہ بعد گاؤں کا چکر ضرور لگتا مگر ان دنوں مصروفیت عروج پر تھی اس لیے پچھلے پانچ ماہ سے ہم گاؤں نہ جاسکے۔ آسیہ جب بھی کہتی تو میں وعدہ کر لیتا مگر عین وقت پر کوئی ایسی مصروفیت آ جاتی کہ ارادہ تکمیل کرنا نہ ہوتا مگر آج اس کا غصہ اور بے چینی دیکھ کر میں لے لے لے لیا کہ آفتہ کو ہم چلے چلتے ہیں اور اتوار کا دن گزار کر آہٹاں آہٹیں گے۔

آفتہ والے دن کہا رہے ہم روانہ ہوئے۔ ڈھائی گھنٹے

میں یہ سن کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ چکر آنے لگے تھے اسیاتو کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

مرتا کیا نہ کرتا میں شہناز سے ملتا رہا اور اس کے اور کے بھائیوں کے اخراجات پورے کرتا رہا۔

میری زندگی عذاب بن کر رہ گئی تھی، ایک بار میں جب شہناز سے معذرت کرتی کہ اب میں اسے پیسے نہیں سکوں گا تو دوسرے دن اس کے سارے بھائی میرے دفتر گئے تھے۔

اور وہ اس طرح مطالبہ کر رہے تھے جیسے یہ ان کا ہو۔ بہت ہی خوفناک تیور تھے ان کے، میں نے گھبرا کر وظیفہ دو بارہ بحال کر دیا تھا۔

ایک دن میں نے پریشان ہو کر شہناز سے "ہماری محبت اپنی جگہ لیکن اب ہمارے درمیان بیوہ رشتہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"اگر یہ رشتہ نہ ہو تو پھر بھائی تم سے ملنے بھی نہیں گئے۔"

"دیکھو تمہارے بھائیوں نے تو شادی سے دو انکار کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ایک دو سے دور ہو جانا چاہیے۔"

لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکا اس کے سارے بھائی۔ گھر پہنچ گئے تھے۔ "تم میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی ہماری بہن کو چھوڑنے کا سوچ سکو۔"

"دیکھیں جناب ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔ جان پہچان اور دوستی ہے اور یہ تو کسی وقت بھی ختم ہے۔"

"ہمارے یہاں ایسا دستور نہیں ہے جس سے دو مٹی بس ہوگئی۔ اب تم نے اس دوستی کو ختم کرنے کی کوشش تو ہم سب مل کر تمہاری ٹانگیں توڑ دیں گے۔"

"تو میرے بھائیو میری کہانی کچھ یوں ہے کہ پانچ برسوں سے میں شہناز کے ساتھ اس کے پودے جھگت رہا ہوں۔ اب میں اس سے زبردستی ملتا ہوں۔ محبت ہوا ہوگئی ہے کاش اس دن وہ دکان پر مجھے دکھائی دیتی کاش میں اس کے حسن کے چکر میں آ کر اپنے آپ کو بے باق نہ کرتا۔"

اب میں اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں لیکن اس کو عدد بھائی میری ٹانگیں توڑنے کے لیے میرے آ جاتے ہیں، اب دیکھیں یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے؟

آ جاتے مجبوراً ان بھائیوں کے لیے کچھ نہ کچھ لینا پڑتا تھا۔ ایک دن وہ بہت پریشان تھی۔ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا "پریشانی یہ ہے کہ گھر میں پیسوں کی بہت تنگی ہو رہی ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو رہے۔"

"کیا تمہارے بھائی کام نہیں کرتے؟"

"نہیں بد قسمتی سے کوئی کام نہیں کرتا۔" اس نے بتایا۔ "سب کے سب ورزش ہی کرتے رہتے ہیں کچھ دنوں پہلے تک ایک چھوٹی سی دکان تھی جس کو سب مل کر چلا رہے تھے اب وہ دکان بھی نہیں رہی۔"

"تم بتاؤ میں تمہارے گھر کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"کوئی ایسا راستہ نکل آئے کہ مہینے کے پندرہ بیس ہزار روپے آنے لگیں تو سکون مل جائے۔"

"چلو مہینے کے بیس ہزار تم مجھ سے لے لیا کرو۔" میں نے کہا۔

تھوڑے انکار کے بعد وہ مان گئی۔ میں نے اسے ہر ماہ بیس ہزار دینا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ آٹھ مہینوں تک چلا رہا۔ تحفے تحائف وغیرہ اس کے علاوہ تھے۔ ان سٹنڈوں کو کھلا کھلا کر میری حالت خراب ہوگئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر میں کبھی شہناز کو ہوٹل میں مدعو کر لیتا تو وہ سارے بھائی بھی پہنچ جاتے اور جو مل ہزار بارہ سو کا بننا چاہیے وہ دس ہزار کا بننا۔ کم بخت سب کے سب بے تحاشا کھایا کرتے تھے۔

میرے ایک دوست نے مشورہ دیا۔ "بھائی تو کن چکروں میں پڑا ہوا ہے۔ اگر اس سے شادی کرنی ہے تو شادی کر کے جان چھڑالے۔"

"ہاں شہناز اس قابل تو ہے کہ اس کو بیوی بنا لیا جائے۔"

"تو ختم کرو اس کہانی کو۔"

ایک دن میں اپنا رشتہ خود ہی لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ بڑا بھائی میری بات سن کر بھر گیا تھا۔ "دیکھ بھائی ہم نے شہناز کو پیار کرنے کی آزادی تو دے رکھی ہے لیکن شادی کرنے کی نہیں۔"

"کیا.....!" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ اس کی شادی نہیں کریں گے؟"

"نہیں ہم نے اس کی شادی کا بھی نہیں سوچا اور جہاں تک تم سے ملنے ملانے کا تعلق ہے تو تم پر اور اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے مل سکتے ہو۔ تمہیں کوئی پرالیم نہیں ہوگی، ہم سب بھائیوں کی طرف سے میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

بعد پاکپتن پہنچے۔ شہر سے نکل کر ہماری گاڑی گاؤں جانے والی سڑک پر تھوڑا فاصلہ ہی طے کر پائی تھی کہ پتا چلا کہ اس سڑک کی مرمت ہو رہی ہے اس وجہ سے سڑک بند ہے۔

اب دو صورتیں تھیں۔ یا تو ہم واپس شہر جاتے اور وہاں سے دوسری سڑک پکڑتے یا پھر وہیں سے نہر کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے ”بدھو والی جھال“ سے پہلے کراس کر کے گاؤں جانے والی سڑک پکڑ لیتے۔ واپس جانے کی بجائے میں نے گاڑی نہر کے برابر والے کچے راستے پر ڈال دی اور اسپید کم کر کے چلنے لگا۔ تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہی سنسان علاقہ شروع ہو گیا۔ کہیں کہیں کھیتوں پر کام کرتا کوئی آدمی نظر آ جاتا۔ اس سوچی نہر کے اس کنارے آمد و رفت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ سنسان علاقہ ابھی پندرہ کلومیٹر مزید تھا، اس کے بعد ہی آبادیاں شروع ہوتیں۔ ہم آپس میں ہلکی ہلکی گفتگو کرتے جا رہے تھے میری نظر ایک چرواہے پر پڑی جو بکریوں اور بھینڑوں کے ایک ریوڑ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو کر ”ڈھینگے“ کی مدد سے درخت کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر ریوڑ کے آگے پھینک رہا تھا۔ شاید وہ کوئی بڑی ٹہنی کاٹ رہا تھا کیونکہ وہ زور زور سے کئی جھٹکے دے چکا تھا مگر ٹہنی ابھی نہیں کٹی تھی۔ ڈھینگا ایک ایسا اوزار ہوتا ہے جو ایک لمبے بانس کے سرے پر لوہے کا ایک تیز دھار گول برہمی لگا کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے درخت کے اوپر چڑھ کر ٹہنی کاٹنے سے بھینڑیاں کاٹی جاسکتی ہیں۔ ہمارے اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ٹہنی کٹ گئی۔ یہ ایک بھاری شاخ تھی جو کٹ کر سیدھی اس چرواہے کے سر پر گئی۔ اس کی چیخ واضح طور پر ہم نے سنی۔ وہ تیار کر گرا تھا۔ اپنی دیر میں ہم اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے جلدی سے بریک لگائے اور گاڑی سے اتر پھر اس کی طرف دوڑ لگا کی۔ چیک کیا تو وہ بے ہوش تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے شاخ ایک طرف ہٹا کر اس کے زخم کا معائنہ کیا تو سر میں ایک گہرا سوراخ پڑ چکا تھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو کھیتوں میں کام کرتا ایک آدمی نظر آیا۔ میں نے چیخ کر اسے پانی لانے کو کہا۔ اس نے جواب دیا کہ یہاں پانی نہیں ہے۔ میں قریبی ڈیرے سے لاتا ہوں، اس نے بھی دوڑ لگا دی تھی۔ آسیر سے دوپٹا لے کر میں نے چھاڑ کر پٹیاں بنالیں تاکہ خون روک سکوں مگر پانی ضروری تھا اور وہ ہمارے پاس بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ تھوڑا پانی پلا کر اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچانا ضروری ہے۔ جب تک میں پٹی باندھ کر فارغ ہوا۔ کھیتوں میں کام کرنے

والا آدمی پانی لے کر آتا دکھائی دیا۔ ابھی وہ کنارے ہی رہا تھا کہ چرواہے نے اکھڑے اکھڑے سانس شروع کر دیے اور پانی کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ مارتا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اس کی نبض پکڑی جو نہ تھی۔ واہزن اور سانس ہر چیز بتا رہی تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ میں پانی لانے والے آدمی سے پوچھا کہ کیا وہ اسے جانتا اس نے بتایا کہ یہ اسی کے گاؤں کا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ اور اس کے ورثا کو اطلاع کرے۔ ان کے آگے تک مجھے وہیں رکنا تھا۔ آسیر اور نیچے بھی گاڑی اتر آئے۔ بچوں نے ایسا واقعہ پہلی بار دیکھا تھا، انہوں نے روٹا شروع کر دیا تو میں نے آسیر سے کہا کہ وہ گاڑی بچوں کو لے کر بیٹھ جائے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد والے آئے، ان کے ساتھ روٹی ہوئی عورتیں بھی چرواہے کی لاش کو ایک چارپائی پر ڈالا گیا۔ لاش اور بکری ریوڑ لے کر جب وہ لوگ روانہ ہو گئے تو ہم بھی گاڑی میں کرچل دیے۔

کچھ عرصے تک یہ واقعہ یاد رہا پھر زندگی کی مصروفیت نے سب کچھ بھلا دیا۔

تقریباً ایک سال بعد کا ذکر ہے، میرے سامنے ایسا کیس آیا جس نے مجھے چونکا دیا۔ طرم کو پھانسی کی سزا گئی تھی۔ طرم کا موقف تھا کہ وہ بالکل بے گناہ ہے مگر ثبوت اس کے خلاف تھے۔ میں نے طرم اور مدعی عدالت میں پیش ہونے کی ہدایت کرتے ہوئے اگلے تاریخ دے دی اور دوسرا کیس نمٹانا شروع کر دیا۔ اگلے تاریخ پر طرم اور مدعیان کمرائے عدالت میں موجود تھے۔ کو دیکھ کر میرے ذہن میں کھد بدی ہونے لگی۔ مجھے لگا میں اسے جانتا ہوں۔ مگر بہت کوشش کے باوجود مجھے کچھ نہ آیا۔ کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ دونوں طرف کے اپنے اپنے موکل کے حق میں دلائل دے رہے تھے مگر طرم خلاف ایسے ثبوت مہیا کیے گئے تھے کہ مجھے لگ رہا تھا کہ خارج کرنا پڑے گی۔ کارروائی جاری تھی کہ عدالت وقفے کا وقت ہو گیا۔ وقفے کے دوران میں بھی میرا ذہن سوچ میں الجھا رہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ آ میں طرم کو اپنے کمرے میں لانے کو کہا۔ دوپہای اچھڑپاں پہنا کر میرے سامنے لے آئے۔

”مجھے لگتا ہے کہ میں تمہیں جانتا ہوں یا کہیں نہ۔ مگر کوشش کے باوجود کچھ یاد نہیں آ رہا۔ کیا تم میری یہ آ دور کر سکتے ہو؟“ میں نے نرم لہجے میں اس سے پوچھا

”پوچھنے پر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری۔ وہ ہراسے لہجے میں بول اٹھا۔

”سر، میں نے آپ کو پہچان لیا۔ ہم نے آپ کو بہت لمبا مگر آپ کے بارے میں کچھ بھی نہ جاننے کی وجہ سے کراہو نہیں پائے۔ میں وہی ہوں جسے آپ نے ایک ماہ کی جان بچانے کے لیے پانی لینے بھیجا تھا مگر میرے لیے سے پہلے ہی وہ مر چکا تھا۔ اسی چرواہے کے قتل کے ام میں مجھے پھانسی کی سزا ہوئی ہے۔ میری بے گناہی ثابت صرف آپ سے مگر آپ کہیں نہ ملے۔ پلیز سر، مجھے لیں۔ آپ تو اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں بے گناہ

”مجھے بھی وہ حادثہ یاد آ گیا۔

”اوہ..... مگر وہ تو ایک حادثہ تھا، تم اس میں کیسے پھنس

”میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس حادثے سے دو دن قبل میری اس چرواہے سے دوکان دی تھی۔ اس کا ریوڑ میرے کھیتوں میں گھس کر فصل

راپ کر رہا تھا اور وہ آرام سے کھڑا دیکھ رہا تھا، اس پر میں اسے گالیاں دی تھیں اور دھمکی دی تھی کہ آج کے بعد ایسا

”اتو میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ بس اسی بات پر مرنے لے کے ورثا نے مجھے پھنسا دیا۔ آپ کے نہ ملنے کی وجہ سے

میں نے اسے ہاتھ جوڑ دیے۔

”دیکھو تم بے گناہ ہو، اس بات کا مجھے یقین ہے مگر میں

آتش فاشی زبان کا لفظ ہے جس کو عربی میں نار، ترکی میں اوت، سنسکرت میں آگنی، ہندی اور اردو میں آگ کہتے ہیں۔ سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ لفظ ”آگ“ عام طور پر چیزوں کے احتراق (Combustion) یا جلنے کے نظر آنے والے اثرات کو ظاہر کرتا ہے (آگ کا لفظ وسیع معنوں میں کسی بھی دہکتی ہوئی چیز کے مظاہرے کا احاطہ کرتا ہے) احتراق یا جلنے کے عمل میں جلنے والی چیز کے ایک یا ایک سے زائد جزو کے آکسیجن کے ساتھ کیمیائی ملاپ کے نتیجے میں یہ اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ عام فہم زبان میں جب ہوا کی آکسیجن (O2) کسی کاربنی میٹیریل سے کیمیائی ملاپ کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں حرارت، شعلہ اور روشنی پیدا ہوتی ہے چنانچہ اسی شعلے کو آتش یا آگ کہتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم کے مضامین سے اقتباس تلاش: انظر جلیل صدیقی، کراچی

بارے میں بات نہ کر سکا۔ دوسرے دن پہنچا تو ایک خوشخبری میری منتظر تھی۔ میری تین ماہ کی پھنسی منظور ہو چکی تھی۔ یہ تین مہینے آسیر اور بچوں کے ساتھ سیاحت میں گزارنے تھے۔ تمام پروگرام پہلے سے طے تھا لہذا ہم دوسرے ہی دن روانہ ہو گئے۔ تین مہینے تک گھومنے کے بعد میں واپس گھر آ گیا۔ ان تین مہینوں میں میرا دوستوں اور پچھری کے معاملات سے تعلق منقطع رہا تھا۔ عدالت میں پھر وہی معمول کے کام چل پڑے۔ دوسرے دن مجھے احاطہ وقت کے وقفے کے وقت میں ”چرواہے کے قتل یا موت“ والا کیس یاد آ گیا۔ مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ اس بارے میں صحیح معلومات اسٹیو سے مل سکتی تھیں لہذا میں نے اسٹیو کو بلایا اور اس بارے میں پوچھا تو ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ میری جگہ پر عارضی جج جو تعینات کیا گیا تھا، اس نے پھانسی کی سزا پر فوری عمل درآمد کا حکم دیا تھا۔ اس بے گناہ انسان کو چرواہے کے قتل کا مجرم گردانتے ہوئے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی پھانسی دی جا چکی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ مجھے لگا کہ اس بے گناہ کی موت کا ڈرتے دار میں ہوں۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے وہ شخص ہاتھ جوڑے میرے سامنے آ کھڑا ہوتا اور بری کرنے کی التجائیں کرنے لگتا۔ میری حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ آسیر اکثر مجھے ٹوکے لگی کہ بات کیا ہے، آخر میں نے اسے ساری بات بتادی تو اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی کہ تم نے تو اس کے خلاف فیصلہ نہیں

گہر گہرائی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

ہر باپ اپنی بیٹیوں کی نظر میں بہت بلند مقام رکھتا ہے۔ میری نظر میں بھی میرے ابا بہت اونچا مقام رکھتے تھے مگر ان کا قتل میری اسی نے کیا پھر بھی میں خوش ہوں، وجہ آپ کو میری آپ بیٹی بتائے گی۔

بانو (کراچی)



”کہاں ہیں؟“ میں اندر کمرے کی طرف لگی۔
”وہ کمر میں نہیں ہیں۔“ علیز نے دوسری خبر دی۔ ”ان کو ماموں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اسی بھی گئی ہوئی ہیں۔“
میں جھٹک کر علیز کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”کیا مصیبت ہے بار! ایک تو تین برسوں کے بعد واپس آئے۔ پھر کمر میں بھی نہیں رہے۔ آتے ہی ماموں کے ساتھ چلے گئے۔“

مئی 2012ء

273

ماہنامہ سرگزشت

پریشان تھا۔ ایک شام میں فارم ہاؤس پر تنہا اسی سوچ میں تھا۔ جب میرا ایک دوست وہاں پہنچا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گھر سے جھگڑا کر کے آیا ہے اور کراچی جا رہا ہے۔ آج رات وہ میرے فارم ہاؤس پر گزارنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جھگڑے تو گھروں میں ہوتے ہی رہتے ہیں، تم کو چھوڑ کر نہ جاؤ اور پھر کراچی جانے کے لیے کافی پیسوں کی ضرورت ہوگی، میں بھی فی الحال تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس پر وہ بولا کہ تم کا کوئی مسئلہ نہیں، اس کے پاس بیس ہزار روپے موجود ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے جیب سے رقم نکال کر دکھائی تو میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں اسے آفر دی کہ اگر وہ دس ہزار مجھے دے دے تو فصل اٹھا کر ہی میں بارہ ہزار اسے واپس کر دوں گا مگر اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کراچی جیسے شہر جا رہا ہے، وہاں پتا نہیں کیے حالات پیش آئیں اس لیے اس کے پاس جتنے بھی پیسے موجود ہوں اچھا ہے۔ اس کے آنے سے تھوڑی دیر قبل ہی میرا کھانا آچکا تھا جو ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ رات نو بجے تک ہم اپنے بستر میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے پھر اسے نیند آنے لگی مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تقریباً گیارہ بجے میں اٹھا اور کمرے کے ایک کونے سے رتی اٹھا کر سونے ہوئے دوست کے گلے میں ڈال دی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے گلے میں رتی پڑی دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا مگر میں اچھل کر اس کی پشت کی طرف ہو گیا اور رتی کو زور سے گلے دے کر اس وقت تک مضبوطی سے پکڑے رکھا جب تک وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا نہ ہو گیا۔ آگے کے تمام مرحلے آسانی سے طے ہو گئے۔ اس کی جیب سے رقم نکال کر میں نے اپنی جیب میں ڈالی اور فارم ہاؤس کے محن میں گہرا گڑھا کھود کر اس کی لاش دفنادی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کافی عرصہ گزر گیا، اس کے گھر والے یہی سمجھتے رہے کہ وہ کراچی چلا گیا ہے اور کسی دن آجائے گا۔ میں بھی خوش تھا کہ قتل جیسا جرم کرنے کے باوجود سکون سے پھر رہا ہوں۔ چرواہے والا واقعہ اس واقعے کے ٹھیک سال بعد اسی دن پیش آیا جس دن میں نے وہ قتل کیا تھا اور اسی رات کو میں حوالات میں تھا۔

اس قتل میں بے گناہ ہونے کے باوجود جب میری پھانسی کفر ہو گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے سابقہ قتل کی سزا مل رہی ہے۔ آپ سے التجا ہے کہ دعا کیجئے گا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے معاف فرمادے۔ اس دنیاوی سزا کے بدلے میری آخرت کی سزائیں جائے، فقط بابر۔“



مئی 2012ء

دیا لہذا تم اس کے ذمے دار نہیں ہو مگر مجھے سکون نہ ملا۔ میں یقیناً ایک ایسی غفلت کا مرتکب ہو چکا تھا جس کا تذکرہ ممکن نہ تھا۔ آسیر سے بات کرنے کے ٹھیک دو دن بعد چھٹی والے دن ہم لوگ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب چوکیدار نے اطلاع دی کہ پاکپتن سے کوئی آدمی آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

پاکپتن کا نام سن کر میں نے اسے اندر بلا لیا۔ وہ اندر آیا تو اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بالکل دیہاتی اور آن پڑھ ہے۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی کہ شاید وہ میرے گاؤں کا ہو مگر وہ میرے گاؤں کا نہ تھا۔ آسیر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ”جی فرمائیے؟“ میں نے اس سے پوچھا تو وہ بولا۔

”میرا نام صادق حسین ہے اور میں بابر کا کزن ہوں۔“ بابر پھانسی پانے والے مجرم کا نام تھا۔ اس نے تعارف کروانے کے بعد کہا ”بابر کی آخری خواہش تھی کہ آپ جب بھی واپس آئیں تو اس کا خط آپ تک پہنچا دیا جائے۔ اس کی یہ آخری خواہش پوری کرنے کے لیے میں یہاں تک آیا ہوں۔“

اس نے جیب سے ایک بند لٹاؤ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ آسیر چائے لے کر اچکی تھی۔ شاید اسے نئی ٹیبل بنانا پڑی تھی، بھی وہ اتنی جلدی آگئی تھی۔ صادق حسین چائے پینے میں مصروف ہو گیا جبکہ میں خط پڑھنے لگا۔ خط پڑھ کر میں بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا اور میرے ضمیر کی غلش دور ہو گئی۔ خط میں ایسا کیا تھا، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

”محترم جناب جج صاحب!“

السلام علیکم! مجھے یقین ہے کہ جب میرا یہ خط آپ کو ملے گا، میں پھانسی پا چکا ہوں گا۔ مرنے سے پہلے میں اپنے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹانا چاہتا ہوں۔ مجھے بہتر یہی لگا کہ میں بذریعہ خط ہی کہی، وہ بوجھ آپ سے شیر کروں۔

جج صاحب! پہلے میں سنتا تھا کہ انسان اپنے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں پالیتا ہے مگر اب مجھے اس بات پر مکمل یقین ہو چکا ہے۔ یہ دنیا یقیناً مکافات عمل کا نام ہے۔ میں اس کیس میں بے گناہ ہونے کے باوجود گناہگار تھا، کیوں اس کیس کو سمجھنے کے لیے میری کہانی جاننا ضروری ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد میں نے ملازمت کے بجائے کاشت کاری کو ترجیح دی۔ کچھ زمین اپنی تھی، کچھ ٹھیکے پر حاصل کی۔ میرے پاس جو کچھ تھا، وہ سب میں نے خرچ کر دیا تھا۔ اب فصل کو کھاؤ ڈالنا بہت ضروری تھا اور نہ میری فصل اچھی نہ ہوئی اور مجھے نقصان اٹھانا پڑتا۔ ادھر ادھر سے بہت کوشش کے باوجود نہ تو کہیں سے رقم کا بندوبست ہوا اور نہ ہی کھاؤ ادھار ملی۔ میں بہت

272

ماہنامہ سرگزشت

”یہی تو پر اہم ہے۔“ علیز نے کہا ”ماموں! نہیں ریسیو کرنے اور پورٹ ملگے تھے۔ وہی لے کر آئے تھے۔ ابو نے صرف اپنا سامان رکھا۔ مجھ سے دو چار باتیں کیں۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ تمہاری خیریت معلوم کی ہو ماموں پھر امی کے ساتھ چلے گئے۔“

”کہاں چلے گئے؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”ابو تو جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔“ علیز نے بتایا۔

”ای زبردستی انہیں اپنے ساتھ بڑی خالہ کے یہاں لے گئی ہیں۔ خالو کی تعزیت کے لیے۔“

”This is not Fair“ ”یار! میں نے کہا۔“ ابو کے پاس ہم سے ملنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔“

”ابو کے پاس تو شاید ہوتا ہے لیکن امی ملنے نہیں دیتیں۔“

میں اپنے کمرے میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ذہن میں آنے والی ساری چل رہی تھیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، یہی تماشا دیکھتی آئی تھی۔ ابو انگلینڈ میں رہتے تھے اور اچھا بڑا بزنس تھا ان کا۔ وہ ہر مہینے اتنی رقم روانہ کیا کرتے کہ ہم بہت آرام سے زندگی گزارا کرتے۔ سب کچھ تھا ہمارے پاس۔ اپنا گھر، گاڑی، بینک اکاؤنٹ۔ وہ سب کچھ جو پیسوں سے خریدا جاسکتا ہے۔ سوائے باپ کی محبت اور شفقت کے۔ امی نے ان کو پیسے کمانے کی مشین سمجھ رکھا تھا۔ وہ انہیں پاکستان آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

ابو سے ہماری باتیں فون پر ہوا کرتیں اور اس وقت احساس ہوتا کہ گھر کی بھلا اور سلامتی کے لیے باپ کا ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے۔

ابو تین چار برسوں میں صرف ایک بار آیا کرتے تھے۔ دس پندرہ دنوں کے لیے۔ اور یہ وقت بھی ان کا گھر سے باہر ہی گزارا کرتا تھا۔

امی انہیں گھر میں رہنے ہی نہیں دیتی تھیں۔ شاپنگ، دعوتیں، کبھی فلاں ماموں کے ہاں، کبھی فلاں خالہ کے یہاں۔ ہم دونوں بہنیں انتظار میں رہتیں کہ شاید ان کے پاس اتنی فرصت ہو کہ وہ ہماری طرف دھیان دے سکیں۔

ایک بار میں امی سے الجھ گئی تھی ”ای! آپ نے ابو کے ساتھ کیا سلسلہ لگا رکھا ہے؟“

”کیا مطلب؟“ امی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ابو آتے ہی اتنے بڑی ہو جاتے ہیں، آج فلاں ماموں نے بلایا ہے، آج فلاں خالہ

کے یہاں دعوت ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟“

”دیکھو بیٹا! تمہارے ابو کئی کئی برسوں کے بعد امی واپس آتے ہیں تو خاندان والوں کو تو ان سے ملنے کا حق ہے۔“

”واہ..... کیا منطقی ہے آپ کی۔ خاندان والوں کا ہے لیکن اپنی بیٹیوں کو نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیسی بات کر رہی ہو؟ کیا تم دونوں اپنے ابو سے نہیں ہو؟“

”اگر اسے ملتا کہتے ہیں تو پھر ضرور ملنے ہوں گے۔ میں نے کہا۔“ ناشتے کے وقت صرف دس پندرہ منٹ لیے۔ اس کے بعد آپ انہیں لے کر نکل جاتی ہیں اور رات اس وقت واپس ہوتی ہیں جب ہم سو چکے ہوتے ہیں۔“

”آخر تم دونوں کو ان سے بات کیا کرنی ہوتی ہے؟“

”ملتی ہو، اتنا ہی بہت ہے۔“

میں بھنا کر رہ جاتی۔ میری ایک دوست راشدہ مجھ کو کہا کرتی تھی ”عالیہ! چاہے تم بڑا مانو یا نہ مانو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تمہاری امی ایک انتہائی درجے کی خود غرض عورت ہیں۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ میں کمزور سا احتجاج کرتی۔

”میری جان! ایسا ہی ہے۔“ وہ کہتی ”تمہاری امی دونوں سے انکل کو اس لیے ملنے نہیں دیتیں کہ کہیں اولاد محبت ان پر غالب نہ آ جائے۔“

”لیکن کیوں؟ باپ اولاد سے محبت نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا؟“

”یہی تو پر اہم ہے میری جان! کہ آج رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ آج صرف اور صرف پیسے۔ تمہاری امی یہ جانتی ہیں کہ اگر تمہارے ابو وطن واپس آ گئے تو پھر پیسوں کی ریل بیل کہاں سے ہوا کرے گی اور تمہارے ابو کی وطن واپسی کا جواز کیا ہو سکتا ہے، اولاد کی محبت۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتیں کہ اولاد کی محبت ان پر غالب آ جائے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے ایک گہری سانس لی ”میں اور علیز ابھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اب تم ہی مشورہ دو، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”یہ ایک مشکل امر ہے۔“ راشدہ نے کہا ”ایک طرف تمہارے ابو ہیں اور دوسری طرف تمہاری امی ہیں۔“

”میں نے امی سے ایک بار بات کی تھی۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن وہ یہ سب سننے کو تیار ہی نہیں ہوئیں۔ ناراض ہو جاتی ہیں۔ البتہ ایک کام ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”میں اپنے افضل ماموں سے بات کرتی ہوں۔ وہ بہت سلجھے ہوئے انسان ہیں۔“ میں نے کہا ”اور دوسری بات یہ ہے کہ ابو بھی زیادہ تر ان ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔“

”نہیں..... کیسا سلجھا ہوا انسان ہے جو اولاد کو باپ سے دور رکھنے کی سازش کرتا رہتا ہے۔“

ابو دس پندرہ دنوں کے بعد واپس چلے گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح امی بار بھی ہم دونوں بہنوں سے ان کی ملاقاتیں بہت کم ہوتی تھیں۔ کبھی دو چار بار۔

زیادہ تر وقت امی اور خالو فلاں اور ماموں کے ساتھ گزرا کرتا تھا۔

یہ ایک الٹا کھار دیہ تھا۔ عام طور پر باہر والے جب کچھ دنوں کے لیے واپس آتے ہیں تو جب تک ان کا قیام ہوتا ہے، وہ گھر کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خاندان والوں اور دوستوں کو شکایات ہی ہوا کرتی ہیں۔

لیکن ابو کے ساتھ معاملہ بالکل برعکس تھا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ انہیں ہم دونوں بہنوں سے پیار نہ ہو، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا جب ہم ان سے فون پر بات کرتے۔ وہ اپنا دل کھول کر رکھ دیتے تھے۔

انہوں نے کبھی ہماری کسی فرمائش کو رد نہیں کیا۔ ہم نے جو کہا وہ انہوں نے باہر سے بھیج دیا۔ وہ ایک طرف تو امی کو رقم بھیجا کرتے تو دوسری طرف ہمیں بھی بہت کچھ دیا کرتے۔ اسی لیے ہمیں روپوں پیسوں کی کبھی کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم عیش کی زندگی گزار رہے تھے۔

ان ہی حالات میں میری ملاقات انور حسین سے ہو گئی۔ ایک بہت کامیاب کاروباری نوجوان۔ باپ کی موت کے بعد اس کے پاس کئی فیکٹریز آئی تھیں لیکن وہ ان میں سے ثابت نہیں ہوا جو باپ دادا کی کمائی کو عمارت کر دیتے ہیں بلکہ اس نے اپنی محنت سے مزید اضافہ کر دیا تھا۔

وہ ایک انتہائی مہذب انسان تھا۔ اس کے ہونٹ اور اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک نرم سی مسکراہٹ رقصاں رہتی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ ایک دن اچانک کسی تقریب میں اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔

واقعات اسی طرح آگے بڑھا کرتے ہیں۔ ایک یا دو ملاقاتیں ہوتی ہیں، اس کے بعد انہی بھی اپنا اپنا سا لگنے لگتا ہے۔

ہم نے ایک دوسرے کی حالتوں میں مل کر بہت تیزی سے ایک دوسرے کو گھر پہنچا دیا۔ چونکہ میرے گھر میں سوائے امی اور علیز کے کوئی اور نہیں تھا اس لیے کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ کوئی ایسا نہیں تھا کہ ہمیں ملنے سے روک سکتا۔

ایک بار میں نے انور کی ملاقات امی سے بھی کرادی۔ امی بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں اور علیز ان کا تو بہت خیال تھا کہ ہم دونوں شاید ایک دوسرے ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

میں نے انور کی فون پر ابو سے بھی بات کرادی تھی۔ ابو بھی اس سے گفتگو کر کے بہت خوش ہوئے تھے۔

دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب اس رشتے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، میں اور انور ایک دوسرے کے ہو سکتے تھے۔ پھر شادی کی بات بھی ہونے لگی۔

دونوں طرف سے کوئی ایسا دشوار مرحلہ نہیں تھا اسی لیے سب کچھ طے ہو گیا۔ اس وقت میں نے امی سے کہا ”امی! اب تو شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی ہے۔“

”تو پھر.....؟“

”میرا مطلب ہے کہ اب ابو کو اس موقع پر آ جانا چاہیے۔“

”وہ کیوں؟“ امی بہت سرد لہجے میں پوچھیں۔

اس وقت مجھے قصہ آ گیا تھا ”آپ بھی کمال کرتی ہیں امی۔ بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور آپ سمجھتی ہیں کہ باپ کی موجودگی ضروری نہیں ہے؟“

”ہاں، ایسی کوئی ضروری نہیں ہے۔“ امی نے کہا ”کوئی

شمارہ اپریل 2012ء کی منتخب جج بیانیوں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: عکس ماضی..... طیبہ شیریں مصطفیٰ (اوسلو، ناروے)

☆ دوم: بزنس از بزنس..... ارشاد حسین انصاری (کراچی)

☆ سوم: جدائی..... اختر قزلباش (لندن، یو کے)

☆ چوتھ: (کراچی)

ہو یا نہ ہو، شادی ہو ہی جاتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے ابو وہاں کام میں مصروف ہیں۔ انہیں کیوں ڈسٹرب کرو گی؟

یہ انتہادر بچہ کی خود غرضی تھی۔ یعنی ایک آدمی صرف کام ہی کرتا رہے، مشین ہی بننا ہے۔ ہر قسم کے جذبات اور احساسات سے بے نیاز ہو کر۔

بے چارہ اپنی بیٹی کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکے، حد ہو گئی تھی۔

شادی بھی ہو گئی تھی۔ بہت دھوم دھام سے۔ اس وقت ابو سے فون پر بات ہوئی تھی۔ بہت مبارک باد دے رہے تھے۔

ان کی کسی کو انور نے بھی محسوس کیا تھا۔ شادی کی پہلی رات ہی اس نے پوچھا ”عالیہ! کیا تمہیں شادی کے وقت اکل کی محسوس نہیں ہوئی؟“

”بالکل نہیں۔“ میں سرو لہجے میں بولی ”ان کا ہونا یا نہ ہونا ایک ہی جیسا ہوتا۔“

”کیا مطلب؟“

پھر میں نے بتا دیا کہ ابو سے ہم بہنوں کی ملاقات ہی کہاں ہوتی تھی۔ وہ تو ہمارے لیے اجنبی کی طرح ہیں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسا ہی ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی ”اب احساس ہوتا ہے کہ امی اور ان کے خاندان والوں نے ہم دونوں بہنوں کو ابو سے جان بوجھ کر الگ رکھا ہے۔“

”کمال ہے۔۔۔۔۔ وہ کس لیے؟“

”وہ اس لیے کہ کہیں ابو ہماری محبت میں وطن واپس نہ آ جائیں اور ایک رو بوٹ جو پیسے کما کما کر بھیج رہا ہے، وہ سلسلہ ختم نہ ہو جائے۔“

”انتہا ہو گئی۔“ انور نے کہا ”یہ تو خود غرضی کی عجیب مثال ہے۔“

”ہر گھر میں کہانیاں ہیں انور۔ باہر سے لوگ کچھ اور دکھائی دیتے ہیں، اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔“ میں افسردگی سے بولی ”جبکہ تم نے یہ اندازہ لگالیا ہوگا کہ ابو کتنے نرم دل اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔“

”ہاں، اس کا اندازہ تو ان کی باتوں سے ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ سن کر افسوس ہوا ہے۔“

اس کے بعد کئی دنوں تک میں یہ سوچتی رہی کہ کہیں میں نے انور کو یہ راز بتا کر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ پھر یہ خیال ہوا کہ ایک نہ ایک دن ان کو معلوم تو ہونا ہی تھا۔

شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ انور میری امی سے کچھ کھینچنے سے رہنے لگے تھے۔ یہ ایک فطری امر تھا۔ انہوں نے امی کی فطرت کا اندازہ لگالینے کے بعد اپنے آپ کو ذرا دور ہی کر لیا تھا۔

دوسری طرف علیز انے بھی اپنا جیون ساتھی جن لیا تھا۔ وہ بھی ایک سلکھا ہوا نوجوان تھا، عدیل۔۔۔۔۔ جو کسی کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔

علیز انے جب امی کو اپنی پسند کے بارے میں بتایا تو وہ بھڑک اٹھی تھیں۔ ”ارے کیا ہوا ہے تم کو۔ ایک پتھر سے شادی کرو گی؟“

”کیوں امی! اس میں کیا برائی ہے؟“ علیز انے کہا ”یہ تو بہت قابل احترام شعبہ ہے۔“

”ہوا کرے قابل احترام۔ لیکن اس میں اتنے پیسے تو نہیں ہیں نا۔“

علیز ابھی امی سے یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ آخر کیا ہوا تھا امی کو۔ وہ کیوں ہر شے کو پیسوں میں تولنے لگی تھیں۔ ان کی ویلیوز کہاں چلی گئی تھیں؟

بہر حال علیز اپنی ضد پر اڑی رہی تھی۔ اس نے عدیل کی ملاقات ہم دونوں سے بھی کروادی تھی اور ہمیں بھی عدیل بہت پسند آیا تھا، وہ بہت سلکھا ہوا لڑکا تھا۔

ان دونوں کی مکثی بھی ہو گئی۔ ان ہی حالات میں۔ ابو کو جب اس رشتے کے بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

پھر امی بھی خاموش ہو گئیں۔ عدیل پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی چلا گیا تھا۔ شادی ایک سال بعد اس کی واپسی کے بعد ہوئی تھی۔

ایک دن انور نے مجھ سے کہا ”عالیہ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے اکاؤنٹ میں کتنے روپے ہیں؟“

”پندرہ بیس ہزار کے قریب ہوں گے۔“ میں نے بتایا۔

”جی نہیں، محترمہ! آپ ایک لکھ پتی خاتون ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”آپ کے اکاؤنٹ میں بیس لاکھ روپے ہیں۔“

”بیس لاکھ! میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”یہ بیس لاکھ کہاں سے آ گئے؟“

”اس لیے کہ میں نے جمع کر دئے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

میں شور کرتی رہ گئی کہ اس نے ایسا کیوں کیا، لیکن وہ یہی

کہا رہا کہ یہ سب عام سی باتیں ہیں۔ شوہر اور بیوی کے درمیان کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ اس نے یہ رقم اس لیے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروائی ہے کہ کہیں مجھے بھی کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔

انور ایسا ہی محبت کرنے والا اور بے نیاز قسم کا انسان تھا۔ نوٹ کر محبت کیا کرتا اور آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتا۔ مجھے فخر تھا کہ قدرت نے مجھے ایسا ساتھی دیا ہے۔

زندگی بہت آرام اور سکون سے گزر رہی تھی۔ ابو سے دن پر ہی باتیں ہوا کرتیں۔ ایک بار ابو نے فون پر بتایا ”عالیہ! کچھ دنوں سے میری طبیعت کچھ خراب رہنے لگی ہے۔“

”کیا ہوا ہے آپ کو؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔“ ابو نے بتایا۔

”آپ وطن واپس آ جائیں۔“ میں نے کہا ”آپ کو جتنی صحت کرنی تھی، وہ آپ کر چکے ہیں۔ اب باہر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کون آپ کی دیکھ بھال کرے گا۔“

”لوں آپ پر دھیان دے گا؟“

”سوچ لو، میرا آنا شاید تمہاری امی کو پسند نہ آئے؟“ ابو نے کہا۔

”اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“ میں غصے سے بولی

”اب بہت ہو گئی۔ میں آج ہی امی سے بات کرتی ہوں۔“

میں اسی شام امی کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اس وقت کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر بہت خوش ہو گئی تھیں۔

”عالیہ! تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ انہوں نے کہا۔

”کہاں چلوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں باؤ آ پا کی طرف جا رہی ہوں۔“ انہوں نے بتایا ”وہ شکایت کر رہی تھیں کہ جب سے عالیہ کی شادی ہوئی ہے، اس سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔“

”نہیں امی! مجھے کہیں نہیں جانا۔“ میں نے کہا ”میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں۔“

”کیا ضروری بات ہے؟“

”امی، میں یہ چاہتی ہوں کہ ابو واپس آ جائیں۔“

میں نے بتایا ”کیونکہ اب ان کی صحت اس قابل نہیں رہی کہ وہ باہر کام کر سکیں اور یہ صرف میری نہیں، بلکہ علیز کی بھی خواہش ہے۔“

”نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔“ امی جلدی سے بولیں ”وہ جہاں ہیں، ان کو وہاں رہنے دو۔ وہ وہاں آرام سے زندگی

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2012ء

277

مئی 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت

پورا گھر ایک طرف تھا اور ہم دونوں بہنیں ایک طرف ہو گئی تھیں۔

پتا نہیں کس قسم کی سازش ہونے لگی تھی۔ لیکن ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔ ہمارے لیے تو یہی بہت تھا کہ ابو کی واپسی ہو رہی ہے۔ اب ہم دل بھر کر ان کے ساتھ رہیں گے۔ ان کی شفقتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ ان کی دعائیں لیں گے۔ کیونکہ باپ بھر باپ ہی ہوتا ہے۔ ایک ہفتے کے بعد ابو واپس آ گئے۔

پہلی خوشی تو ان کی واپسی کی تھی اور دوسری خوشی یہ دیکھ کر ہوئی تھی کہ ان کی صحت ٹھیک تھی۔ بلکہ وہ پہلے سے زیادہ سرخ و سفید ہو رہے تھے۔ شاید انہوں نے اپنے آپ پر کنٹرول کر لیا تھا۔

اوہ۔ کیا دن تھے وہ بھی۔

ہم ان سے گپ شپ کرتے، ان کے ساتھ بازار جاتے۔ برسوں کی محرومیوں کا ازالہ شاعرانہ انداز سے ہو رہا تھا۔

اور پھر ایک رات ایک بھونچال سا آ گیا۔

اس رات ابو دیر سے گھر واپس آئے تھے۔ میں نے ہی گیٹ کھولا تھا۔ امی اور علیز اسوجکی تھیں۔ میں نے جب گیٹ کھولا اور ابو اندر آئے تو ایسا لگا جیسے کوئی اجنبی گھر میں آ گیا ہو۔

ان کی سانسوں سے بدبو کے بھکے اٹھ رہے تھے۔ ان کے پاؤں بھی ڈگمگا رہے تھے۔ ان کی آواز لڑکھڑاہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہی ہو گئی تھی۔ میرے خدا! ابو نے شراب پی رکھی تھی۔ شراب کی بو ان کے پورے جسم سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”ابو..... کیا ہوا ہے آپ کو؟“ میں نے بہت دکھ سے پوچھا۔

”جاؤ، سو جاؤ۔“ ابو لڑکھڑاتی آواز میں بولے اور ڈولتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں ابو کو اس حال میں دیکھ کر اندر سے ٹوٹ سی گئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ابو شراب پیتے ہوں گے۔ کمرے میں آئی تو علیز اکو جاگتے ہوئے دیکھا۔

”کیا ہوا.....؟“ ابو واپس آ گئے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

”تو..... اتنی پریشان کیوں ہو؟“ علیز نے پوچھا۔

”کیا ابو میں کوئی خاص بات دیکھ لی ہے؟“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونک گئی تھی۔

”عالیہ! میری بہن..... میں کئی بار ابو کو اس حال میں دیکھ چکی ہوں۔“ اس نے بتایا ”تم کو اس لیے نہیں بتایا کہ تمہیں دکھ ہوتا۔“

”علیز! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ابو شراب ہوں گے؟“ میں نے کہا۔

”اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ علیز نے ایک گہری سانس لی۔

دوسری صبح ابو ناشتے کی میز پر نظر آئے۔ پہلے کی طرح جتنے مسکراتے اور دلچسپ باتیں کرتے ہوئے۔ شاید رات کا خمار اتر چکا تھا۔

ابو کی نسبت امی بہت خاموش تھیں۔

ناشتے کے بعد ابو نے ہم دونوں بہنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے تم دونوں سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اسٹڈی روم میں آ جاؤ۔“

اس کا مطلب یہ تھا کہ ابو امی کے سامنے نہیں بولنا چاہتے تھے۔ ہم ان کے کہنے پر اسٹڈی روم میں آ گئے۔ ابو بھی ہمارے سامنے آ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس وقت وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

”دیکھو بچو!“ ابو نے بات شروع کی ”میں آج اپنے بارے میں تم لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم دونوں نے مجھے نشے کی حالت میں دیکھ لیا یہ ٹھیک ہے کہ میں شراب پیتا ہوں لیکن اس کی ایک کہانی ہے، ایک پس منظر ہے۔“

”رہنے دیں ابو!“ میں جلدی سے بولی ”ہم کچھ نہیں سننا چاہتے۔“

”نہیں، سننا ہوگا۔“ ابو نے کہا ”ورنہ تم دونوں ہی نہ جانے کیا سمجھتی رہو گی اور میں تمہاری نگاہوں میں شرمندہ اور ذلیل ہوتا رہوں گا۔“

”چلیں بتائیں، کیا بات ہے؟“

”بیٹا، میں ایک بار ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا جس کا علاج شراب سے ہو سکتا تھا۔“ ابو نے بتایا ”میں تقریباً ایک مہینے تک شراب کو دوا کے طور پر استعمال کرتا رہا ہوں اور یہ جو الکوحل ہوتا ہے، یہ انسانی جسم میں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ اگر شراب نہ استعمال کروں تو پورا بدن ٹوٹنے لگتا ہے اور اسی بیماری کے دوبارہ ایک کا خطرہ ہو جاتا ہے۔ میں مجبور ہو کر رہ گیا ہوں۔ تم دونوں یقین کر دو کہ شراب نوشی میرا شوق نہیں بلکہ میری مجبوری ہے اور مجبوری بھی ایسی کہ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔“

اس کے بعد ہم کیا کہہ سکتے تھے۔ ہم دونوں خاموش ہو کر رہ گئے۔

ابو کی اس مجبوری نے ہماری زبانوں پر تالے لگا دیے تھے۔ ابو صرف رات کے وقت پیا کرتے تھے اور وہ بھی کبھی باہر جا کر۔ کہاں جاتے تھے، ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

ایک دن میں نے امی سے پوچھ لیا ”امی، کیا آپ کو اندازہ ہے کہ ابو ہر رات کو کہاں جاتے ہیں اور اتنی دیر کہاں رہتے ہیں۔“

”ہاں، میں جانتی ہوں۔“ امی نے ہونٹ سکینز کر بتایا ”ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا ہو کہ تمہارے ابو شراب پیتے ہیں۔“

”ہاں، یہ ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔“ میں نے بتایا ”اب اسی سلسلے میں ایک بات کہنی ہے۔“

”چلو، وہ بھی کہہ دو۔“

”یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ ابو باہر جا کر شراب نوشی کرتے ہیں۔“ میں نے کہا ”نہ جانے باہر کیا حالات ہوں۔ کیا ہو جائے۔ جب ان کے ساتھ ایک مجبوری ہے تو کیوں نہ گھر ہی پر اجازت دے دی جائے۔“

”یہ تم دونوں کی مرضی ہے۔“ امی نے کہا ”میں اس سلسلے میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔“

پھر میں نے ہی ابو سے بات کی ”ابو آپ کو شراب ہی پینی ہے تو گھر لاکر پی لیا کریں۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔ خود امی کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”بیٹا، میں بہت شرمندگی محسوس کروں گا۔“ ابو نے کہا۔

”نہیں، اس میں شرمندہ ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے دلا سادہ ”یہ آپ کی مجبوری ہے۔“

مختصر یہ کہ ابو نے گھر پر ہی شراب نوشی شروع کر دی۔ وہ رات کے وقت کمرے میں بند ہو جاتے اور شراب پیتے رہتے۔ جبکہ امی نے بالکل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

کئی دن گزر گئے۔ ابو کی شراب نوشی ہماری زندگی کا ایک ناخوش گوار سچ تھا جس کو ہم نہ جانے کس طرح برداشت کیے جا رہے تھے۔

پھر ایک رات اچانک ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس وقت ابو گھر پر نہیں تھے، کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ جب زور زور سے دروازے کی کھنٹی بجنے لگی تھی۔

گیٹ پر مجھے ہی جانا پڑا تھا۔ دو پولیس والے کھڑے

ماہنامہ سرگزشت

ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کا ٹیبل تھا، دوسرا انسپکٹر۔

”کیا امتیاز گھر پر ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی نہیں، ابو تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔“ میں نے بتایا ”لیکن بات کیا ہے؟“

”وہ آ جاؤ تو ان سے کہنا کل مقامی تھانے پہنچ جائیں۔“ انسپکٹر نے کہا ”ان کے خلاف رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔“

”رپورٹ! کس بات کی رپورٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”بی بی! ہم تمہارے سوال کا جواب دینے نہیں آئے۔“ انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا ”بتا دینا اس کو۔“

میں نے واپس آ کر جب علیز اور امی کو بتایا تو امی کوئی تبصرہ کے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئیں جبکہ علیز کی پریشانی دیکھنے والی تھی۔

”عالیہ! اب کیا ہوگا؟“ علیز نے پوچھا ”ابو نے کیا جرم کیا ہے؟“

”یہ تو ان کے آنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔“ میں نے کہا۔

رات کو ابو اسی حال میں واپس آئے جس طرح پہلے آیا کرتے تھے حالانکہ درمیان میں انہوں نے گھر میں ہی چٹنا شروع کر دیا تھا لیکن دو چار دنوں سے وہ پھر باہر جانے لگے تھے۔

ہم نے اس وقت ابو کی مدہوشی کی حالت کو دیکھتے ہوئے کچھ نہیں بتایا لیکن جب دوسری صبح ابو کو یہ خبر سنائی تو ان کا رنگ اڑ گیا تھا۔

”ابو بات کیا ہے؟“ علیز نے پوچھا ”پولیس آپ کو کیوں تلاش کر رہی ہے؟“

”میں ابھی نہیں بتا سکتا۔“ ابو بولتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ہم دونوں بہنوں کے برعکس امی کا رویہ بہت حیرت انگیز تھا۔ وہ ہونٹ بچنے خاموش بیٹھی رہی تھیں۔ امی کے رویتے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

کچھ دیر بعد ابو باہر چلے گئے۔ ہم ان کی خیریت سے واپسی کی دعائیں مانگتے رہے تھے۔ ابو کی واپسی بہت دیر میں ہوئی تھی۔

”بتائیں ابو، کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا ”کیوں بلایا تھا پولیس نے؟“

”بیٹا، یہ میرا معاملہ ہے۔ تم لوگ پریشان نہ ہو۔“ ابو

مئی 2012ء

نے دھیرے سے کہا ”میں کسی نہ کسی طرح سنبھال لوں گا۔“
”لیکن بات کیا ہے، کچھ بتا تو چلے۔“

میرے بہت اصرار پر ابو نے بتایا کہ انہوں نے شاید اپنی کسی ضرورت کے تحت کسی سے دس لاکھ روپے لیے تھے جو وقت پر ادا نہیں کر پائے اور اب اس نے ان پر کس کر دیا تھا۔ ابو اس سے دس دنوں کی مہلت لے کر آگئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دس لاکھ کہاں سے لائے جائیں؟

میں نے جب علیز اکو ابو کی اس پریشانی کا بتایا تو وہ بھی چکر کر رہ گئی تھی ”ہائے عالیہ باجی! اب کیا ہوگا؟ بے چارے ابو دس لاکھ کہاں سے لائیں گے؟“
میں نے ابو کی اس پریشانی کا جب امی سے ذکر کیا تو انہوں نے ایک حیرت انگیز بات کہی ”بس خاموش ہو جاؤ تم دونوں، اس چکر میں نہ پڑو۔“

”امی، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ علیز نے حیران ہو کر پوچھا ”ہم کسی غیر کے چکر میں تو نہیں پڑ رہے، یہ تو ابو کا معاملہ ہے۔“
”میں نے ایک بات سمجھا دی ہے نا۔“ امی کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

امی کا رویہ تو شروع ہی سے ابو کے معاملے میں حیران کن رہا تھا۔ اسی لیے ہم نے توجہ نہیں دی۔ سوال پھر وہی تھا کہ ابو کی مدد کیسے کی جائے؟
ویسے اب ان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ بے قراری سے ٹپکتے رہتے تھے۔ انہوں نے بولنا بھی تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔

اور اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ میرے اپنے اکاؤنٹ میں بیس لاکھ تھے۔ کیا وہ پیسے ابو کے کام نہیں آ سکتے تھے؟
باپ سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے انور کی اجازت ضروری تھی کیونکہ یہ پیسے تو امی نے دیے تھے۔

میں نے جب انور کو فون کر کے پوچھا تو وہ بڑے پیار سے بولے ”میری جان! آخر اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔ میں نے تو تمہیں پیسے دیے ہیں۔ اب تم جو چاہے کرو اور اگر وہ تمہارے ابو کے کام آ جائیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی؟“

میں نے جب ابو کو بتایا تو وہ انکار کرنے لگے تھے ”نہیں بیٹا! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے پیسے نہیں

لے سکتا۔“

”ابو، یہ پیسے آپ کو کوئی غیر نہیں دے رہا، آپ کی بیٹی دے رہی ہے اور بیٹی سے آپ کیا تکلف کر رہے ہیں؟“
علیز نے بھی ابو کو سمجھایا۔ پھر ابو پیسے لینے پر راضی ہو گئے تھے۔

یہ خبر جب امی کو ملی تو انہوں نے صرف اتنا کہا ”تم خود اپنے اچھے بُرے کی ذمہ دار ہو۔ میں نے تو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔“
سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی امی پر غصہ ہی آیا تھا۔ نہ جانے وہ کیسی بیوی تھیں جن کو اپنے شوہر کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔

بہر حال امی کی ناراضی کے باوجود میں نے ابو کو دس لاکھ روپے دے دیے تھے۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ابو کی پریشانیوں ایک دم ختم ہو گئی ہوں۔
”ہم دونوں کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ چلو ابو کے سر پر جو مصیبت تھی، وہ ختم ہوئی لیکن یہ تو صرف ابتدا تھی، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بہت اذیت ناک تھا۔“

ایک دن میں علیز اشاپنگ کے لیے گئے ہوئے تھے کہ ہم نے ابو کے ساتھ ایک عورت دیکھ لی۔ ابو اس عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے اور وہ عورت اپنی صورت اور اپنے انداز ہی سے انتہائی ٹھٹھا قسم کی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس طبقے کی معلوم ہو رہی تھی جو انتہائی بدنام طبقہ ہوا کرتا ہے۔ ہم دونوں یہ دیکھ کر گنگ سے رو گئے تھے۔ ہم نے چپ کر ابو کا تعاقب کیا۔ ابو اس عورت کو شاپنگ کر رہا ہے تھے۔

”عالیہ باجی! یہ سب کیا ہے؟“ علیز نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا ”کون ہے یہ عورت؟“
”اس عورت کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا لو کہ وہ کون ہے؟“

میں بہت دکھ سے بولی۔
”لیکن ابو اس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟“
”ان دونوں کی بے تکلفی سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے کہا ”اب چلو، واپس چلتے ہیں۔ مجھ میں مزید دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔“

ہم چپ چاپ گھر واپس آ گئے۔ ابو نے بہت دکھ پہنچا دیا تھا۔ میں نے علیز کو منع کر دیا تھا کہ وہ امی کو نہ بتائے۔ خواہ مخواہ وہ پریشان ہوں گی۔ بہتر ہے کہ ہم پہلے اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ پھر ایسا لگا جیسے قدرت ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہو گئی

ہو۔ وہ سارے بھید کھول رہی ہو جواب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل رہے تھے۔

ایک دن میں کسی کام سے پھر مارکیٹ کی طرف گئی۔ اس دن میں اکیلی تھی۔ میں نے ابو کے ساتھ ایک آدمی کو دیکھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس آدمی کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی پولیس انسپکٹر تھا جو ابو کو بلانے آیا تھا۔

پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ ابو شاید پھر کسی معاملے میں پھنس گئے ہیں لیکن جب وہ دونوں انتہائی دوستانہ انداز میں ہوٹل میں داخل ہوئے تو بہت کچھ سمجھ میں آنے لگا۔

اس کے بعد میرے گھر میں دکھ دینے والے واقعات کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ ایک کے بعد ایک حادثہ۔ اور ان کی ابتدا اس دن ہوئی جب میں نے ابو سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس دن امی اور علیز اکہیں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے ابو سے کہا ”ابو! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔“
”ہاں، کہو۔“

”آپ کس عورت کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں؟“
”کیا؟“ ابو نے چونک کر میری طرف دیکھا ”عالیہ؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“ میں نے کہا ”آپ اس عورت کو شاپنگ کر رہے ہیں۔“
اور امی دن ابو کی شخصیت کے سارے حلقے ایک ساتھ اُتر گئے۔ اس وقت میرے سامنے جو آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میرا باپ نہیں تھا بلکہ کوئی اور تھا۔ کوئی غالم اور بے رحم شخص۔

”ہاں، میں جس عورت کے ساتھ گھومتا پھرتا ہوں، وہ میری Keap ہے، سمجھیں۔“ ابو دہانے لگے ”میں نے اس کو یہاں آتے ہی رکھ لیا تھا۔“

”خدا کے لیے ابو!“ میں کانپ کر رہ گئی تھی ”شرم کریں۔ یہ آپ اپنی بیٹی کے سامنے کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”کیوں، اس میں کیا بُرائی ہے؟“ ابو نے کہا ”جب میں اپنی بیٹی کے سامنے شراب پی سکتا ہوں تو کیا اپنی داشتہ کا تذکرہ نہیں کر سکتا۔“

”خدا کے لیے ابو!“ میں رونے لگی تھی ”یہ آپ نے کیسی باتیں شروع کر دیں۔“

”میں نے شروع نہیں کی، تم نے شروع کی ہیں۔“ ابو نے کہا ”اور جبکہ بات مکمل ہی چکی ہے تو میں یہ بتا دوں کہ

میں اس عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا اور جہاں تک تمہاری ماں کا تعلق ہے تو اب اس میں رکھا ہی کیا ہے۔“

ابو انتہائی شرم ناک باتیں کر رہے تھے۔ میں پورے بدن سے کانپ رہی تھی۔ میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ سب ابو سے سن رہی ہوں۔

علیز اور امی جب واپس آئیں تو اس وقت ابو گھر پر نہیں تھے۔ کہیں جا چکے تھے۔ میں نے روتے ہوئے ان دونوں کو سب کچھ بتا دیا۔

اور اس وقت پہلی بار امی پھٹ پڑیں ”بہت ضد کر کے بلایا ہے تم دونوں نے۔ اب بھگتو ان کو۔ تم دونوں زندگی بھر مجھے خود غرض اور لالچی سمجھتی رہیں۔ تمہارے سامنے یہ بات تھی کہ میں انہیں تم دونوں سے دور کیوں رکھتی ہوں، تمہارے قریب کیوں نہیں آنے دیتی؟ اب پتا چل گیا نا کہ میں ایسا کیوں کرتی تھی؟ صرف تمہارے لیے۔ تاکہ تمہیں احساس نہ ہو کہ تمہارا باپ اس قماش کا انسان ہے۔ اس کی عزت بچانے کے لیے میں نے اسے گھر سے اور تم دونوں سے دور رکھا تھا۔“

”امی! کیا آپ کو معلوم تھا کہ وہ اس قسم کے انسان ہیں؟“ علیز نے پوچھا۔

”ہاں، صرف مجھے نہیں بلکہ پورے گھرانے کو معلوم تھا۔“ امی نے بتایا ”امی لیے تمہارے ماموں اور خالائیں انہیں اپنے ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔ گھر سے دور رکھتے تھے تاکہ تم پر ان کی حقیقت نہ کھل جائے اور تم خود کو ایک عیاش اور بد معاش باپ کی اولاد جان کر اس رشتے ہی سے نفرت نہ کرنے لگو۔“

”میرے خدا!.....!“ میں نے سر ہٹا لیا ”امی! آپ نے ہمیں سمجھایا کیوں نہیں؟“

”کیسے سمجھائی؟ تمہاری آنکھوں پر تو باپ کی محبت کی پٹی بندھی ہو گئی تھی۔“ امی نے کہا ”حالانکہ میں نے اشاروں اشاروں میں تمہیں کئی بار بتایا۔ تم دونوں میرا رویہ دیکھتی رہیں۔ اس کے باوجود تمہیں عقل نہیں آئی۔ اور تم نے اپنے دس لاکھ روپے بھی ان کی عیاشی کے لیے ان کے حوالے کر دیے۔“

”وہ دس لاکھ تو شاید کسی مقدمے کے سلسلے میں تھے۔“ میری آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔

”سب بکو اس ہے۔ یہ ایک ڈراما تھا۔“ امی نے بتایا ”وہ انسپکٹر ریاض ان کا پُرانا دوست ہے۔ یہ مجھے کل ہی پتا چلا

ہے۔ جی ان کی عیاشیوں میں برابر کا شریک ہے۔“
 اسی وقت مجھے یاد آیا کہ امی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ میں نے اسپیکر پر ابو کو ایک ساتھ ہنسنے بولتے ہوئے دیکھا تھا۔ خدا کی پناہ! کتنا بڑا جھوٹ، کیسا فراڈ۔ اور وہ بھی کس کے ساتھ، خود اپنی بیٹی کے ساتھ۔

سچ دو توں رو رہی تھیں اور امی بولے جارہی تھیں۔ ہماری آنکھوں سے پٹیاں اتر گئی تھیں۔ اب احساس ہو رہا تھا کہ امی نے اپنے شوہر کی عزت بچانے کے لیے کیسے کیسے جتن کیے ہوں گے۔ کتنا سبر تھا اس عورت میں۔

جیتا نہیں امی، اب کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔
 سبک جو کچھ ہے، وہ برداشت کرو۔“ امی نے کہا۔
 ”تمہارے لیے تو میرا مشورہ ہے کہ تم اپنی سسرال چلی جاؤ۔ اور بھی کچھ غصوں کے بعد آنے ہی والے ہوں گے۔“
 ”خالیہ باجی تو چلی جائیں، لیکن میرا کیا ہوگا؟“ علیزا نے پوچھا۔

”خالیہ! تم کچھ دنوں کے لیے علیزا کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ امی نے کہا۔ ”ورنہ یہ اس گھر کے ماحول میں مر جائے گی۔“
 ”امی! اور آپ..... آپ کیا کریں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے کیا کرنا ہے؟“ امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”میری قسمت میں جو لکھا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا۔“
 ”مجھ نے امی کو کیا سمجھا تھا اور وہ کیا لگتی تھیں۔ اسی طرح ابو کو ہم کتنا محظوم سمجھتے تھے اور وہ کیسے ظالم ثابت ہو رہے تھے۔ خالیہ نے ایسا کیوں ہوتا ہے، کس لیے ہوتا ہے؟“
 ”بھول چال میں اسی دن علیزا کو لے کر اپنے اپارٹمنٹ آ گئی۔ ہونے شادی کے بعد شہر کے ایک پوش علاقے میں اپنا اپارٹمنٹ بھی خرید لیا تھا۔

یہاں آ کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ابو نے تو ہمیں نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔ ہم ابو کی فطرت پر حیران ہو کر رہے اور امی کی حالت پر افسوس کیا کرتے۔
 اسی رات امی نے فون پر بتایا کہ ابو نے واپس آ کر جب ہم دونوں کو گھر سے غائب پایا تو بہت ہنگامہ کیا تھا۔
 ان کا خیال تھا کہ خود امی نے کسی سازش کے تحت ہم دونوں کو گھر سے دور بھیج دیا ہے۔

بھری صبح ابو کا فون آ گیا۔ ہم دونوں کے موبائل نمبران کے پاس تھے۔ انہوں نے مجھے فون کیا تھا ”کیا بات ہے عالیہ؟“ تمہارے تو ہے، تم چلی کیوں گئیں؟“

”ابو۔ اور آنے والے ہیں۔“ میں نے بہانہ بنایا۔
 ”اپارٹمنٹ بہت دنوں سے گندا پڑا ہوا تھا، میں نے سوچا اسے ٹھیک ہی کر لوں۔“
 ”اور علیزا کو اپنے ساتھ کیوں لے آئیں؟“ ابو نے پوچھا۔

”اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”بہت کام ہے۔ میں! کیلی یہ سب نہیں کر سکتی تھی۔“
 ”میں سب سمجھتا ہوں۔“ ابو دھاڑنے لگے تھے۔ ”یہ سب اس کمینی عورت کی سازش ہے۔“

”ابو۔ خدا کے لیے امی کو ایسا تو نہ کہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”انہوں نے تو کچھ نہیں کہا ہے، ہم دونوں تو خود ہی آئے ہیں۔“
 ”میں کوئی تپہ نہیں ہوں جو سمجھ نہ سکوں۔“ ابو بھونکا رہے تھے۔ ”ٹھیک ہے، دیکھ لوں گا اس کو۔“
 ابو نے دوسری طرف سے فون بند کر دیا تھا۔

یہ ایک نئی اور بھیا تک چوہن تھی۔ نہ جانے وہ امی کے ساتھ کیسا سلوک کرتے۔ میں نے جب علیزا کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ ”میرے خدا! آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کاش ہم نے ابو کو نہ بلایا ہوتا۔ وہ باہر ہی رہتے تو اچھا تھا۔“

”اس زمانے میں ہماری لائف کتنی پرسکون تھی۔“ میں نے کہا۔ ”انہیں بلا کر ہم نے خود اپنے جیروں پر کلھاڑی مار لی ہے۔“
 ایک گھنٹے کے بعد امی کا فون بھی آ گیا، وہ ہمیں سمجھا رہی تھیں ”دیکھو، تمہارے ابو جو کچھ بھی کہتے رہیں، تم دونوں واپس مت آنا۔ کل رات انہوں نے ایک اور حرکت کی تھی۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔
 ”وہ ایک طوائف کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔“ امی نے بتایا۔
 ”کیا!“ میرا دماغ محو کر رہ گیا تھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، گھر لے آئے تھے؟“

”ہاں، گھر لے آئے تھے۔“ امی نے بتایا، ان کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔ ”وہ کم بخت صبح یہاں سے گئی ہے۔“

واپس مت آنا۔ میں کسی نہ کسی طرح ان حالات کا مقابلہ کر لوں گی۔“
 ”کم از کم آپ بھی ہمارے ہی پاس آ جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”لغت سمجھیں اس گھر پر اور ایسے شوہر پر۔“

”ہونا تو یہی چاہیے کہ میں انہیں چھوڑ کر تم دونوں کے پاس ہی آ جاؤں۔ لیکن تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس کے بعد ہماری کیا پوزیشن ہو جائے گی۔“
 ”اس پوزیشن ہی کے خیال نے تو اس حال کو پہنچا دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے ایک چھوٹے سے زخم کو مچھا چھپا کر بنا سوراخ بنا دیا۔ اگر ہم دونوں کو شروع ہی میں سب کچھ بتا دیتیں تو آج ایسی نوبت نہیں آتی۔“

”بہر حال بیٹا! جو ہو گیا وہ ہو گیا۔“ امی دھیرے سے بولیں ”ہاں، ایک بات سچی سے کہہ رہی ہوں، اس پر دھیان رکھنا۔ کسی بھی حال میں اپنے ابو کو اپنے پاس مت بلانا۔ چاہے وہ کچھ بھی کہتے رہیں۔ اپنی محبت کا کتنا ہی واسطہ دیں۔ ان سے ملنے سے انکار کر رہنا، تم بھی اور علیزا بھی۔“
 ”آخر کیوں..... یہ تو بہت سخت قسم کی پابندی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک باپ بیٹی سے ملنے کے لیے آنا چاہے تو بیٹی کس طرح روک سکتی ہے؟“

”کسی طرح بھی ہو، روکنا پڑے گا۔ ایک بار..... اور تم دونوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جس طرح پہلے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن تم دونوں نے میری بات نہیں سنی، بہر حال اب یہ بتا رہی ہوں۔“
 اس کے بعد دو چار دنوں تک خاموشی رہی۔ نہ تو امی نے فون کیا اور نہ ہی ابو کا کوئی فون آیا پھر کافی دنوں بعد ایک دن ابو کا فون آ ہی گیا۔

وہ وہی سب کچھ کہہ رہے تھے جو امی نے کہا۔ وہ ہم دونوں سے ملنے کی خواہش کر رہے تھے۔ ”بیٹا، کئی دن ہو گئے ہیں۔ تم دونوں کو دیکھے ہوئے۔ ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں تمہارے پاس۔“
 ”نہیں ابو! آج تو ہم دونوں گھر پر نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کہاں ہو تم دونوں؟“
 ”ہمیں ایک دوست نے بلایا ہے۔ ہم اس کے گھر پر ہیں۔“

”میں سمجھ گیا۔ یہ حرکت بھی اسی کمینی عورت کی معلوم ہوتی ہے۔“ ابو غصے سے بھنائے ہوئے تھے ”اسی نے منع کر دیا ہوگا کہ باپ سے مت ملو۔ اسی نے زندگی بھر تم دونوں کو

مجھ سے الگ رکھا ہے اور اب پھر اسی چکر میں ہے۔“
 ”ابو ایسی بات نہیں ہے۔ آپ ان کو غلط مت سمجھا کریں۔“

”خاموش!“ ابو زور سے دھاڑے ”کیا غلط ہے اور کیا نہیں ہے۔ میں سب جانتا ہوں، میں اس کا دماغ درست کر دوں گا۔“

”نہیں ابو!“ میں جلدی سے بولی۔ میرے لہجے میں بے پناہ غصہ اور سختی تھی ”آپ امی کو کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ آپ کے لیے بہت بُرا ہوگا۔“

”اچھا..... کیا کر لے گی تو؟“
 ”میں آپ کے خلاف فراڈ کا کیس کر دوں گی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے مجھ سے فراڈ کر کے دس لاکھ روپے لیے ہیں۔ آنے والا اسپیکر آپ کا دوست ہے۔ آپ دونوں مل کر عیاشیاں کرتے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔ میرے پاس سارے ثبوت ہیں۔“

دوسری طرف بالکل خاموشی ہو گئی۔ ابو کو تو قہر ہی نہیں ہو گی کہ میں اتنی بڑی بات کہہ جاؤں گی۔ میں نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔
 لیکن وہ ایسے ہی تھے۔ کاش..... ہم نے انہیں بلایا نہیں ہوتا۔ وہ ہم سے دور ہی بہتر تھے۔

دوسرے دن امی کا فون آ گیا۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں ”بیٹا! کیا ابو سے تمہاری کوئی بات ہوئی تھی؟“
 ”ہاں۔“ میں نے انہیں بتا دیا ”اب کیا بات ہوئی؟“
 ”اب وہ پھر پریشان ہیں۔“ امی نے بتایا ”بار بار یہی کہتے ہیں کہ عالیہ سے ایسی توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے اتنی بڑی بات کہہ جائے گی۔“

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں ابو کے لیے نرمی سی محسوس ہونے لگی۔ شاید مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے غلطی کر دی تھی۔ پھر احساس ہوا کہ وہ اسی قابل تھے۔ ان کے ساتھ جو بھی ہو وہ کم تھا۔

امی نے پھر کہا ”بیٹا، اس کے باوجود میں ایک بار پھر تم دونوں سے کہہ رہی ہوں کہ ان سے ملنے یا انہیں بلانے کی حماقت مت کرنا۔ چاہے وہ سرپنک کر مر جائیں۔“
 ”امی! کہیں ایسا تو نہیں کہ خدا کے یہاں میری گرفت ہو جائے کہ میں نے اپنے باپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔“

”بے وقوف مت بنو۔ ایسے باپ کے لیے کوئی گرفت نہیں ہو گی۔“ امی نے کہا ”خدا بھی دیکھ رہا ہے۔“



نور کا فون

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
سلام تہنیت

بچپن سے مجھے پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا اور آج بھی یہ شوق قائم ہے۔ مہری بچیاں کہتی ہیں کہ معا آپ سارا دن دفتر میں دفتری کاغذات پڑھتی ہیں اور گھر آکر ڈائجسٹ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ اپنی آپ بیٹی بھی لکھ دوں، پہلی کوشش ہے اگر الفاظ کے انتخاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اسے دور کر لیں۔

کوثر زید حسن
(کراچی)

ماسٹر کیا تھا اور مار یہ اسی پر روتی رہی کہ جب میں نے بڑی بیٹیوں کو ماسٹر کرایا ہے تو اسے کیوں نہیں کرایا؟ میں نے اسے یا کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میں کیوں اس کی شادی میں جلدی کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک سال پہلے بتا دیا تھا کہ میرے دل کے ایک وال کی رگیں بند ہو رہی ہیں اور اگر میں نے بروقت علاج اور توجہ نہ کی تو یہ وال ٹا کا رہ ہو جائے گا اور اس

آج میں نے اپنی تیسری اور آخری بیٹی کو بھی رخصت کر دیا۔ مار یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ وہ صرف اکیس برس کی ہے۔ اس نے ایک سال پہلے گریجویشن کیا تھا اور ماسٹر کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ میں اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے بڑی شاور مونا کی شادی چوبیس پچیس برس کی عمروں میں کی تھی۔ دونوں نے

اس کہانی کو اسی طرح ختم ہوتا تھا۔

انور کا فون بھی آ گیا۔ انہیں بھی اس حادثے کی خبر ہو چکی تھی اور وہ فوری طور پر وطن واپس آ رہے تھے۔ ہم نے وہ رات اسی گھر میں گزاری تھی۔ جہاں ہر طرف اچھی اور بُری یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں خالائیں ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ ان کی بہن یعنی میری ای ایک صاحبہ عورت ہے جس نے ایسے شخص کے ساتھ اتنے برس گزار دیے، کوئی اور ہوتی تو بہت پہلے خون کر چکی ہوتی۔

میں خاندان والوں کی ہنگامی میٹنگ بھی ہوئی جس میں طے پایا کہ ای کی رہائی کے لیے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کیا جائے گا۔

اسی رات انور بھی واپس آ گئے۔

وہ ہمیں بہت دیر تک تسلی دیتے رہے، کمال کے آدمی تھے۔ میرے خاندان کی پوری کہانی ان کے سامنے آ گئی تھی۔ یعنی ابوشرابی اور عیاش، ماں قاتل۔ اس کے باوجود وہ ہم دونوں سے یہی کہتے رہے کہ ”ارے عالیہ! اس میں تم دونوں کا کیا قصور ہوا؟ وہ تو اس شخص کی نیچر ہی ایسی تھی۔ ایسا شخص کسی بھی ماحول اور کسی بھی خاندان میں پیدا ہو سکتا ہے۔ البتہ آنٹی کے لیے میں ضرور کوشش کروں گا۔ انہوں نے تم دونوں کو ایسے باپ سے محفوظ رکھنے کے لیے جتنی قربانیاں دی ہیں، اس کا قصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

”واقعی ہمیں اپنی ماں پر فخر ہے۔“ علیز انے کہا۔

عدالت میں ای نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔ انور نے ایک اچھے وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں جس نے دنیا بھر سے شواہد اکٹھے کر کے عدالت کے سامنے پیش کر دیے اور ثابت ہو گیا کہ ابو ایک انتہائی عیاش اور ظالم شخص تھے اور کوئی بھی ان کا خون کر سکتا تھا۔ اس دن جو کچھ ہوا وہ حادثاتی طور پر ہوا تھا۔

عدالت نے ای کو صرف تین برس کی سزا سنائی تھی۔

اور یہ تین برس بھی گزر رہی جائیں گے، ای جیل میں ہیں۔ ہم پابندی کے ساتھ ای سے ملنے جاتے ہیں۔ ای نے یہ بتایا کہ ان کے گھر والوں نے اسی بنیاد پر شادی کی تھی کہ لڑکا ملک سے باہر ہے اور اچھی آمدنی ہے۔ بس اس کے علاوہ انہوں نے کچھ اور جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

اور آج میں بھی یہ سب کچھ لکھتے ہوئے یہ سوچ رہی ہوں کہ اس ملک کے اور نہ جانے کتنے رشتے اسی بنیاد پر طے ہو رہے ہوں گے۔

* *

دو چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اب انور بھی آنے والے تھے کہ ایک مہینے پر پڑوسی کا فون آ گیا۔ وہ مجھے بتا رہے تھے ”عالیہ! میں تمہارا پڑوسی افضل بول رہا ہوں۔“

”جی افضل! انکل! خیریت تو ہے نا؟“

”نہیں بیٹا! خیریت نہیں ہے۔“ افضل صاحب نے کہا

”تم دونوں فوری طور پر گھر آ جاؤ۔“

میں دھک سے رہ گئی۔ خدا جانے کیا بات ہوئی ہوگی۔

میں نے علیز اسے کہا تو وہ بھی زرد پڑ گئی ”عالیہ! باجی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، کیا ہوا ہوگا؟“

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ میں نے کہا ”افضل صاحب

نے کچھ نہیں بتایا ہے۔ فوراً گھر چلو۔“

ہم دونوں اسی وقت روانہ ہو گئے۔

ابو کی لاش گیٹ کے اندر ہی پڑی ہوئی تھی جس پر چادر

ڈال دی گئی تھی۔ ہم دونوں بہنیں چکر کر گر پڑی تھیں۔ یہ

بہت بڑا سانحہ تھا۔

اندر کمرے میں ای پولیس والوں کے نرغے میں

سیر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ہم دونوں ان سے لپٹ کر رونے

لگیں۔

”ای! آپ نے ایسا کیوں کیا، کیوں کر دیا ایسا؟“

”بس بیٹا! ایسی زندگی کا یہی انجام ہوتا تھا۔“ ای

دھیرے سے پولیس۔ اس وقت ان کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو رہا

تھا۔ کوئی تاثر نہیں تھا۔ ان کی آنکھیں بھی دیران ہو رہی

تھیں۔

ای کے سارے رشتے دار جمع ہو چکے تھے۔ ان کا بیان

لیا جا چکا تھا۔ یہ ابتدائی بیان تھا۔ ای بار بار خود اعتراف

کر رہی تھیں کہ ہاں انہوں نے ہی گولی ماری ہے۔ کیونکہ ان

کا شوہر اسی قاتل تھا۔

بہر حال ای کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہم دونوں بہنوں کی

حالت خراب ہو رہی تھی۔ حالانکہ ہمیں سنبھالنے کے لیے پورا

خاندان موجود تھا۔

پھر بھی ہم لٹ تو گئے تھے نا۔ ابو مر چکے تھے اور ای ان

کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ چونکہ انہوں نے

فوری طور پر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا اسی لیے انہیں

دوسری ہی صبح عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دیا جاتا۔ اس

کے بعد یہ کیس چلتا رہتا۔

ہم پر تو اسی دن سے تباہی آنی شروع ہو گئی تھی جس

دن ہم نے ابو کو وطن واپس بلوایا تھا۔ بس وہ آغاز تھا، جس کا

انجام اب ہمارے سامنے آیا تھا۔

سے دوسرا وال بھی متاثر ہوگا۔ میں نے ڈاکٹرز کے بتائے علاج اور احتیاطی تدابیر پر کوئی توجہ نہیں دی تھی میں نے نہ تو کوئی دوا کھائی اور نہ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس گئی۔

اس کے بعد میں نے اپنی ساری توجہ ماریہ کو جلد از جلد اس کے گھر کا کرنے پر مرکوز کر لی۔ ماریہ اور میری دوسری دو بیٹیاں حیران تھیں کہ میں ماریہ کی باری میں اتنی جلدی کیوں کر رہی ہوں؟ ایک بار مونا نے مجھ سے کہا: ”ماما آپ کو کس بات کی جلدی ہے ابھی تو آپ خود بیک ہیں۔ ففٹی ٹو ایئر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ آپ ویسے بھی اپنی عمر سے دس سال کم لگتی ہیں۔“

مونا ٹھیک کہہ رہی تھی، میرے بال قدرتی طور پر سیاہ تھے اور ان میں بہت کم سفید بال آئے تھے۔ میرے چہرے پر جھریاں نہیں تھیں اور جسم بھی مناسب تھا اس لیے دیکھنے والے مجھے چالیس سے زیادہ کی نہیں سمجھتے تھے۔ لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ میں شاکی بڑی بہن لگتی ہوں۔ میں نے مونا سے کہا: ”بس بیٹا مجھے ڈر لگتا ہے کہیں اچانک میرا بلا دانہ آجائے اور یہ آخری فرض پورا ہونے سے رہ جائے۔“

مونا مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ ”پلیز ماما ایسی بات نہ کریں، ابھی آپ کو بہت جینا ہے۔“

”بیٹا ہر انسان اتنا جیتا ہے جتنی اس کی عمر ہوتی ہے اس سے پہلے نہ وہ مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے۔“

ماریہ اور دوسروں کی مخالفت کے باوجود میں نے ماریہ کے لیے رشتے کی تلاش جاری رکھی۔ بالآخر میری ایک کوئیگ کے بیٹے کا رشتہ مجھے پسند آ گیا۔ عطیہ احمد میرے ساتھ ہی بینک میں کام کرتی تھیں اور ہمارے درمیان کیمپلی کی سطح پر تعلقات تھے۔ ان کی دو بیٹیاں ماثرہ اور سارہ میری بیٹیوں کی سہیلیاں تھیں۔ عطیہ کا بیٹا فراز کالج کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ پر کینیڈا چلا گیا تھا۔ وہ تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تھا اور ایک اچھی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ عطیہ اس کے لیے رشتے کی تلاش میں تھی جب اسے پتا چلا کہ میں ماریہ کے لیے رشتے کی تلاش میں ہوں تو ایک دن لانچ پر اس نے مجھ سے کہا: ”کوثر سنو ہم سمدھن کیوں نہ بن جائیں؟“

میں چونکی: ”کیا مطلب؟“

عطیہ ہنسی: ”کس بات کا، سمدھن کا یا سمدھن بن جانے کا؟“

”دونوں کا۔“

”بھئی سیدھی سی بات ہے تم جانتی ہو فراز میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ باہر سے پڑھ کر آیا ہے اور ماشا اللہ اپنی جاب پر سیٹ

ہو گیا ہے۔ میں اب اس کے لیے لڑکی تلاش کر رہی ہوں۔ تمہاری بیٹی سے زیادہ موزوں لڑکی اور کون ہو سکتی ہے۔“

فراز میرا دیکھا بھالا لڑکا تھا اور بہت اچھا تھا۔ عطیہ کی بات فوراً میرے دل میں اتر گئی۔ ”عطیہ میں کچھ دن میں سوچ کر اور سب سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔“

”ہاں.... ہاں آرام سے جواب دو، بس یہ بات یاد رکھنا کہ ماریہ اب میری بیٹی ہے۔“

میں نے ماریہ اور دونوں بیٹیوں سے بات کی۔ باقی رشتے داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس سے اس معاملے میں رائے لی جانی۔ ماریہ راضی تھی، جب کہ ثنا اور مونا تو بہت خوش تھیں۔ ان کی فراز سے ہنسی مذاق اور بے تکلفی تھی۔ انہیں بھی فراز پسند آیا، یوں یہ رشتہ طے ہو گیا۔ عطیہ نے شادی کے لیے چار مہینے کی مہلت مانگی تھی۔ ہمیں بھی اتنا وقت درکار تھا۔ دونوں طرف سے تیاریاں شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چار مہینے کا وقت گزر گیا۔ شادی کا وقت آیا اور میں نے اپنی آخری بیٹی کو بھی رخصت کر دیا۔ شادی اور اس کے انتظامات اتنے اچھے تھے کہ شرکت کرنے والوں نے رشک کیا تھا۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ شوہر کے نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے اکیلے بیٹیوں کو کتنے اچھے طریقے سے پالا، ان کی پرورش کی، پڑھایا لکھایا اور اتنے اچھے انداز میں ان کی شادیاں کیں۔ ماریہ کی طرح ثنا اور مونا کو بھی اچھے شوہر ملے تھے۔ ثنا کا شوہر گیس کے محکمے میں افسر تھا اور مونا کا شوہر سول انجینئر تھا اور اپنی فرم چلا رہا تھا۔

ماریہ رخصت ہو کر چلی گئی۔ شادی ہال سے ثنا اور مونا میرے ساتھ آئی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہروں سے کہہ دیا تھا کہ امی بالکل اکیلی ہو گئی ہیں اور پھر شادی کے بعد بھی کچھ رسومات ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ میرے ساتھ ٹھہریں گی۔ ثنا کے دو بیٹے تھے اور مونا کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ میرے گھر میں ان کے بیڑوم ابھی تک ویسے ہی موجود تھے اس لیے وہ جب آئیں تو اپنے کمروں میں ٹھہرا کر تھیں۔ سچے تھک گئے تھے ان کو لٹا کر وہ میرے پاس آ گئیں۔ مونا نے کہا: ”نام ہم آپ کے شکر گزار ہیں آپ نے کبھی ہمیں پاپا کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔“

”یہ میری محبت اور میرا فرض تھا۔“ میں نے آہستہ سے کہا تو مونا اور ثنا جذباتی ہو گئی تھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میں نے اپنا فرض بہت اچھے طریقے سے نبھایا ہے اور دنیا میں مجھ جیسی مائیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ان کی باتیں سن کر میں سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی میں نے اپنا فرض بہت اچھی طرح نبھایا

ہے۔ میں نے جو کیا وہ واقعی ٹھیک ہے؟ دنیا کا کوئی قانون، کوئی ضابطہ اسے درست مانے گا جو میں نے اپنی بچیوں کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے کیا؟

☆☆☆

میں اسکول سے لوٹی تھی اور گھر میں داخل ہوتے ہی امی اور ابو کے تیز تیز بولنے کی آواز سنی۔ حسب معمول ان میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا ان میں لڑائی ہی دیکھی تھی۔ مجھے نہیں اور میری زندگی میں ایسا کوئی موقع آیا ہو جب میں نے امی ابو کو ایک ساتھ بیٹھے اور چستے بولتے دیکھا ہو۔ صبح سے شام تک وہ مٹنی دیر بھی ساتھ رہتے تھے گھر میں مستقل ایک کشیدگی والا فاصلہ بنا رہا تھا۔ ابو آنو پارٹس کا بزنس کرتے تھے۔ امی گھر دھمتی تھیں لیکن دونوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ میں نہیں ہانتی اس کشیدگی کے پیچھے کیا وجہ تھی؟ ابو کسی کو پسند کرتے تھے اور ان کی شادی امی سے کر دی تھی یا امی کسی کو پسند کرتی تھیں اور ان کی شادی ابو سے ہو گئی یا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی۔ امی ابو نے کبھی اس کی وضاحت نہیں کی۔ ان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں آتا تھا۔ وہ بس معمولی معمولی باتوں پر لڑتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل تھے جن کا حل بہت آسانی سے بغیر لڑے نکل سکتا تھا لیکن وہ ان کے پیچھے گھنٹوں لڑتے تھے اور ان کی لڑائی اس طرح ختم ہوتی تھی کہ ابو گھر سے چلے جاتے تھے یا رات ہو جاتی اور وہ تھک کر نے پر مجبور ہو جاتے۔

میں محض میں چار پائی پر بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی کہ کب لڑائی ختم ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد ابو بولتے ہوئے باہر آئے اور مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ ”کوثر بیٹا تم کب آئیں گے؟“

”جب آپ دونوں لڑ رہے تھے۔“ میں نے سنجی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت میں دس گیارہ سال کی تھی اور مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ امی ابو ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے ہیں۔ ان کی باقی زندگی بھی اسی طرح لڑتے جھگڑتے گزرے گی۔ میں ان کی ایک ہی اولاد تھی۔ قدرت نے مزید نیچے نہیں دیے اور اس جہنم میں ملنے کو میں اکیلی رہ گئی تھی۔ یہ سچ ہے ماں باپ کا گھر چاہے وہ کتنا معمولی کیوں نہ ہو بیٹیوں کے لیے جنت سے کم نہیں ہوتا۔ لیکن میرے لیے یہ گھر جہنم تھا۔ خاص طور سے اس وقت جب امی ابو ساتھ ہوتے اور ان میں لازمی جھگڑا ہوتا تھا۔ اس وقت میرا دل چاہتا کہ چٹخیں مار مار کر روؤں یا گھر سے کہیں

”کیسا ستم ہے کہ اردو اور اردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے، اردو کسی فرقے کی زبان نہیں ہے۔ کسی مذہب کی زبان نہیں ہے، کسی حکومت کی چلائی ہوئی زبان نہیں ہے، کسی خاص نیت سے معنوی گڑھی ہوئی زبان نہیں ہے، یہ تو زندگی کی ریل ٹیل میں انسانوں کے میل جول کا پھل تھا، لوگوں کی ہنسا کی زبان ہے۔“

(ہند کی مشترکہ زبان، اردو اڈاکٹر ذاکر حسین، سابق صدر ہندوستان)
مرسلہ: نصرت بجنوری، کراچی

بھاگ جاؤں۔

آپس میں جھگڑے سے قطع نظر امی ابو دونوں مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میری ایک ایک بات کا خیال رکھتے، ابو نے مجھے ہر چیز لاکر دی ہوئی تھی، امی میری ہر خواہش پوری کرتی تھیں۔ اگر وہ خیال نہیں رکھتے تھے تو گھر کے ماحول کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ میں بچپن سے ترستی رہی کہ بھی اپنے ماں باپ کو آپس میں چستے بولتے دیکھوں اور یقین کریں میری یہ خواہش ایک بار بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی امی ابو ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ان کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ ذرا سی کوئی بات ہوتی اور ان کی لڑائی شروع ہو جاتی تھی۔

امی ابو کی لڑائی ویسی نہیں ہوتی تھی جس میں گالی گلوچ یا نازیبا الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مار پیٹ کی بھی نوبت نہیں آئی۔ بس دونوں تند و تیز اور نوکیلے جملوں سے ایک دوسرے پر حملے کرتے تھے۔ ان کی لڑائی دھیمے انداز میں لیکن مسلسل یوں جاری رہتی تھی جیسے کسی پتھر پر ہلکی دھار سے پانی گرتا ہے اور یہ پانی بالآخر پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔ اس گھر میں وہ پتھر میں تھی جس میں تواتر سے ہونے والے جھگڑوں کی بوندوں نے بالآخر سوراخ کر دیا تھا۔ جب میں اسکول میں داخل ہوئی تو عام بچوں کی نسبت میں نے رونا دھونا نہیں کیا تھا بلکہ خوشی خوشی اسکول جانے لگی تھی۔ کیونکہ جتنی دیر میں اسکول میں رہتی تھی گھر کے ماحول سے بچی رہتی۔ جب چھٹی کا وقت قریب آتا تو مجھے ہول اٹھنے لگتے تھے اور میں گھر کی طرف جاتے ہوئے دعا کرتی کہ ابو گھر پر نہ ہوں لیکن یہ دعا کم ہی قبول ہوتی تھی کیونکہ ابو وہ پتھر کا کھانا گھر پر رکھتے تھے بلکہ تینوں وقت کا کھانا اور شام کی چائے بھی گھر پر ہی ہوتی

تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب امی ابو کی آپس میں نہیں بنتی تھی تو ابو اپنے کام سے اتنی بار گھر کیوں آتے تھے۔ ایک دن میں نے امی سے پوچھ لیا تھا۔

”امی جب آپ اور ابو کی آپس میں نہیں بنتی ہے تو آپ ایک دوسرے کے ساتھ کیوں رہتے ہیں؟“

”اگر ساتھ نہ رہیں تو کیا کریں؟“

”الگ ہو جائیں۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

”نہ صوفی۔“ امی سہم گئیں۔ ”یہ بات پھر منہ سے نہ نکالنا۔“

”تو پھر لڑتے کیوں ہیں؟“ میں نے ٹھک آ کر کہا۔

”تیرے ابو لڑتے ہیں مجھ سے۔“

”ابو بھی یہی کہتے ہیں کہ آپ لڑتی ہیں ان سے اور میں نے آپ دونوں کو کبھی خاموش ہوتے نہیں دیکھا ہے۔“

امی سرد آہ بھر کر بولیں۔ ”بس میری بچی ہماری قسمت میں یہ لکھا تھا۔“

میں اس وقت بچی تھی الفاظ میں امی ابو کو نہیں بتا سکتی تھی کہ انہوں نے اپنی شادی کو قسمت کے کھاتے میں ڈال دیا تھا لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا جو ان کی وجہ سے نفسیاتی مریض بنتی جا رہی تھی۔ ایک دن میں اسکول سے آئی اور حسب معمول مہن میں بیٹھ کر امی ابو کی لڑائی سن رہی تھی کہ نہ جانے مجھے کیا ہوا میں نے زور زور سے ہنسا شروع کر دیا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ میں ہنس رہی ہوں کیونکہ ہنسنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن میں کوشش کے باوجود میں اپنی ہنسی نہیں روک پارہی تھی۔ میری آواز سن کر امی ابو باہر آئے اور انہوں نے مجھے خاموش کرانے کی کوشش کی لیکن میں چپ نہیں ہوئی بلکہ ہنسنے ہنسنے بے ہوش ہو گئی۔

امی ابو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ مجھے لے کر اسپتال کی طرف بھاگے جہاں مجھے داخل کر لیا گیا۔ ڈاکٹرز نے مجھے ہلکے بھروسے پر ایک ڈاؤن تشخیص کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں کسی وجہ سے اپنے اعصاب پر دباؤ برداشت نہیں کر سکتی اور میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے امی ابو کو خبردار کیا کہ اگر وجہ دور نہیں ہوئی تو میرا اگلا دورہ شدید بھی ہو سکتا ہے اور میں ہمیشہ کے لیے دماغی مریض بن سکتی ہوں۔ میں دو دن اسپتال میں داخل رہی اور پھر گھر آ گئی۔ اس کے بعد گھر میں کچھ دن سکون رہا تھا کیونکہ ابو بہت کم گھر آتے تھے اور جب آتے بس میرے پاس بیٹھے رہتے۔ ان چند دنوں میں میں بہت خوش تھی اور میرا خیال تھا کہ شاید اب ہمارے گھر کا ماحول بدل جائے اور ہم بھی نارمل زندگی گزار سکیں۔

لیکن اندرون خانہ امی ابو کیا ملے کر رہے تھے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میرے اسپتال سے آنے کے ایک ہفتے بعد ابو نے اپنا سامان لیا اور گھر سے جانے لگے۔ میں پریشان ہو گئی۔ ”ابو آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔“ ابو نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

”مگر کیوں ابو؟“

”کیونکہ.... کیونکہ ہم دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔“ ابو نے آہستہ سے کہا۔ میں دنگ رہ گئی بارہ سال کی عمر میں مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ طلاق کیا ہوتی ہے لیکن گھر کے انتہائی خراب ماحول کے باوجود میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ امی ابو میں طلاق ہو سکتی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”کیا آپ نے امی کو طلاق دیدی ہے؟“

جب ابو نے سر ہلایا تو میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس بار ہونے والا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں مرتے مرتے بچی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی کتنے دن میری حالت خراب رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اس حقیقت کو قبول کیا کہ امی ابو کے درمیان ہمیشہ کی علیحدگی ہو چکی ہے۔ ابو نے گھر میرے نام کر دیا تھا اور گھر کا سارا خرچ بھی وہی برداشت کر رہے تھے انہوں نے امی کے نام سے بینک اکاؤنٹ کھول دیا جس میں وہ ہر مہینے رقم جمع کر دیتے تھے اور یہ اتنی ہوتی تھی کہ ہمارے گزارے کے لیے کافی تھی۔ ایک مہینے بعد جا کر میری حالت ایسی ہوئی کہ میں اسکول جاسکتی تھی اور جب میں اسکول پہنچی تو وہاں امی ابو کی علیحدگی کی کہانی پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور لڑکیوں نے مجھے اس حوالے سے اتنا ٹھک کیا کہ میں نے مجبوراً امی سے کہہ کر دوسرے اسکول میں داخلہ لے لیا۔

آج سے کوئی چالیس سال پہلے ہمارے معاشرے میں طلاق بہت ہی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ جن ماں باپ کے درمیان علیحدگی ہو جاتی تھی ان کے بچوں کو لوگوں کی بہت باتیں سننا پڑتی تھیں۔ بچی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میری سہیلیاں مجھ سے کتراتے لگی تھیں۔ ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں گلی میں تقریباً ہر گھر میں امی کا آنا جانا تھا اور ان گھروں سے بھی خواتین ہمارے ہاں آتی تھیں لیکن جب امی ابو میں علیحدگی ہوئی تو محلے کی خواتین امی سے بچنے لگی تھیں۔ انہوں نے ہمارے ہاں آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور جب امی ان کے گھر جاتیں تو وہ ان سے روکے انداز میں پیش آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ امی نے بھی دوسروں کے گھروں میں جانا

داخلہ لے لیا۔

آج سے کوئی چالیس سال پہلے ہمارے معاشرے میں طلاق بہت ہی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ جن ماں باپ کے درمیان علیحدگی ہو جاتی تھی ان کے بچوں کو لوگوں کی بہت باتیں سننا پڑتی تھیں۔ بچی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میری سہیلیاں مجھ سے کتراتے لگی تھیں۔ ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں گلی میں تقریباً ہر گھر میں امی کا آنا جانا تھا اور ان گھروں سے بھی خواتین ہمارے ہاں آتی تھیں لیکن جب امی ابو میں علیحدگی ہوئی تو محلے کی خواتین امی سے بچنے لگی تھیں۔ انہوں نے ہمارے ہاں آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور جب امی ان کے گھر جاتیں تو وہ ان سے روکے انداز میں پیش آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ امی نے بھی دوسروں کے گھروں میں جانا

داخلہ لے لیا۔

آج سے کوئی چالیس سال پہلے ہمارے معاشرے میں طلاق بہت ہی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ جن ماں باپ کے درمیان علیحدگی ہو جاتی تھی ان کے بچوں کو لوگوں کی بہت باتیں سننا پڑتی تھیں۔ بچی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میری سہیلیاں مجھ سے کتراتے لگی تھیں۔ ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں گلی میں تقریباً ہر گھر میں امی کا آنا جانا تھا اور ان گھروں سے بھی خواتین ہمارے ہاں آتی تھیں لیکن جب امی ابو میں علیحدگی ہوئی تو محلے کی خواتین امی سے بچنے لگی تھیں۔ انہوں نے ہمارے ہاں آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور جب امی ان کے گھر جاتیں تو وہ ان سے روکے انداز میں پیش آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ امی نے بھی دوسروں کے گھروں میں جانا

چھوڑ دیا۔ لڑکیاں مجھ سے نہیں ملتی تھیں، اتفاق سے امی ابو کے زیادہ رشتے دار نہیں تھے اور جو تھے ان سے ہمارا ملنا جلنا نہیں تھا۔ ہم ماں بیٹی تنہائی کا شکار ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ ماں باپ کے ساتھ رہنا اور ان کی لڑائی برداشت کرنا دنیا میں سب سے اذیت ناک بات ہے لیکن امی ابو میں علیحدگی کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ماں باپ ہوں اور ان میں طلاق ہو چکی ہو تو بچوں کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک امر اور کوئی نہیں ہوتا ہے۔ ابو اب الگ کہیں رہتے تھے اور وہ ہفتے میں ایک بار چند گھنٹوں کے لیے مجھ سے ملنے آتے تھے۔ جب وہ آتے تو امی اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھیں اور اس وقت تک باہر نہیں آتی تھیں جب تک ابو نہیں چلے جاتے تھے۔ اس کے باوجود جب ابو آتے تو محلے والے عجیب نظروں سے ہمیں دیکھتے تھے۔ ان کی نظروں سے جھک آ کر امی نے یہ کرنا شروع کر دیا کہ جب ابو کو آتا ہوتا تو وہ گھر سے کہیں چلی جاتی تھیں اور جب ابو جاتے تب واپس آتی تھیں۔ یہ بہت اذیت ناک دن تھے۔ میں اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ مجھے ان باتوں کا شعور آ گیا تھا جب میں اسکول آتی جاتی تو مجھے دیکھ کر لوگ معنی خیز باتیں کرتے تھے۔ میں گھر آ کر امی کو بتاتی اور روتی تھی۔ امی بھی سوائے رونے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک دن جب ابو آئے تو میں ان سے لڑ پڑی کہ انہوں نے امی کو طلاق دے کر ہماری لیے زندگی اور مشکل بنا دی ہے۔ جب ابو کو پتا چلا کہ محلے والے کیا بات کرتے ہیں تو انہیں غصہ آ گیا تھا۔

”یہ سب جاہل اور گنوار لوگ ہیں اب تم دونوں یہاں نہیں رہو گے۔“

”پھر ہم کہاں جائیں گے؟“

ابو نے جواب دیا۔ ”میرا گلشن اقبال میں ایک پلاٹ ہے میں اس پر مکان بنا کر تم دونوں کو وہاں منتقل کر دیتا ہوں وہاں اچھے لوگ رہتے ہیں اور کوئی تم سے غلط رویہ نہیں رکھے گا۔“

ان دنوں میں میٹرک میں تھی جب ابو نے مکان بنا کر ہمیں وہاں منتقل کر دیا۔ یہ بڑا اور خوب صورت مکان تھا۔ اسے ابو نے میرے نام کر دیا اور پُرانا والا مکان فروخت کر دیا۔ ان کا یہ خیال درست نکلا کہ یہاں اچھے لوگ رہتے ہیں اور وہ ہم سے غلط رویہ نہیں رکھیں گے۔ کسی نے ہمیں تنگ نہیں کیا لیکن جب لوگوں کو پتا چلا کہ امی کو طلاق ہو گئی ہے تو وہ ہم سے ملنے جلنے میں احتیاط برتنے لگے اور اس طرح ملنا جلنا نہیں کرتے تھے جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کرتے

تھے۔ بہر حال اتنا بھی بہت تھا کہ کوئی ہمیں غلط نظروں سے نہیں دیکھتا تھا اور نہ ہم پر آتے جاتے آوازیں کسی جاتی تھیں۔ علاقہ بھی اچھا تھا اور تمام سہولتیں بھی قریب تھیں۔ میں نے میٹرک کر لیا تو یہیں مجھے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔

ابو کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتے تھے اور کس طرح کھانے پینے کا بندوبست کرتے تھے کیونکہ انہیں باہر سے کھانے کی عادت بالکل نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ امی سے لڑائی رہنے کے باوجود گھر پر ہی کھاتے تھے۔ امی ان کے بارے میں سرے سے بات ہی نہیں کرتی تھیں لیکن میں ابو کے بارے میں سوچتی تھی اور کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ انہوں نے دوسری شادی کر لی ہوگی البتہ یہ ابو سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میں کالج میں تھی تب بھی ابو ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آتے تھے۔ ان دنوں وہ کمزور ہونے لگے تھے اور پھر دو سال میں دیکھتے ہی دیکھتے بہت کمزور اور بوڑھے سے ہو گئے تھے حالانکہ اس وقت بھی ان کی عمر پینتالیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن دیکھنے میں وہ ساٹھ کے لگنے لگے تھے۔ میں ابو سے پوچھتی کہ وہ اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہیں تو وہ ٹال جاتے تھے۔ پھر ایک بار وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی اور جب دوسرا ہفتہ بھی ایسے ہی گزر گیا تو میں نے امی سے کہا۔

”مجھے ابو کی فکر ہو رہی ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟“

امی نے کہا۔ ”ان کی دکان سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے مارکیٹ میں ابو کی دکان دیکھ رکھی تھی وہاں پہنچی تو دکان موجود تھی اور ابو کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا بھی تھا لیکن ابو نہیں تھے۔ میں نے ابو کے بارے میں پوچھا تو اس نے نہایت آرام سے کہا۔ ”انہیں قالج ہو گیا ہے جناح اسپتال میں پڑے ہیں۔“

”کیا؟“ میرے منہ سے چیخ نکلی۔ ”کسی نے بتایا نہیں۔“

”مجھے پتا ہی نہیں معلوم تھا کہاں سے بتاتا۔“ وہ بولا۔ میں اور امی بھاگ بھاگ جناح اسپتال پہنچے تو ابو وارڈ میں لاوارثوں کی طرح پڑے تھے اور ان کی دیکھ بھال تو کیا ٹھیک سے علاج بھی نہیں ہو رہا تھا۔ درحقیقت جب ہم ابو کو دیکھنے گئے تو وہ آخری دموں پر تھے۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ ان کے بچنے کا امکان بہت کم ہے کیونکہ انہیں بہت تاخیر سے اسپتال لایا گیا تھا۔ دوسرے دن ابو انتقال کر گئے اس وقت

تھے۔ بہر حال اتنا بھی بہت تھا کہ کوئی ہمیں غلط نظروں سے نہیں دیکھتا تھا اور نہ ہم پر آتے جاتے آوازیں کسی جاتی تھیں۔ علاقہ بھی اچھا تھا اور تمام سہولتیں بھی قریب تھیں۔ میں نے میٹرک کر لیا تو یہیں مجھے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔

ابو کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتے تھے اور کس طرح کھانے پینے کا بندوبست کرتے تھے کیونکہ انہیں باہر سے کھانے کی عادت بالکل نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ امی سے لڑائی رہنے کے باوجود گھر پر ہی کھاتے تھے۔ امی ان کے بارے میں سرے سے بات ہی نہیں کرتی تھیں لیکن میں ابو کے بارے میں سوچتی تھی اور کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ انہوں نے دوسری شادی کر لی ہوگی البتہ یہ ابو سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میں کالج میں تھی تب بھی ابو ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آتے تھے۔ ان دنوں وہ کمزور ہونے لگے تھے اور پھر دو سال میں دیکھتے ہی دیکھتے بہت کمزور اور بوڑھے سے ہو گئے تھے حالانکہ اس وقت بھی ان کی عمر پینتالیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن دیکھنے میں وہ ساٹھ کے لگنے لگے تھے۔ میں ابو سے پوچھتی کہ وہ اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہیں تو وہ ٹال جاتے تھے۔ پھر ایک بار وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی اور جب دوسرا ہفتہ بھی ایسے ہی گزر گیا تو میں نے امی سے کہا۔

”مجھے ابو کی فکر ہو رہی ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟“

امی نے کہا۔ ”ان کی دکان سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے مارکیٹ میں ابو کی دکان دیکھ رکھی تھی وہاں پہنچی تو دکان موجود تھی اور ابو کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا بھی تھا لیکن ابو نہیں تھے۔ میں نے ابو کے بارے میں پوچھا تو اس نے نہایت آرام سے کہا۔ ”انہیں قالج ہو گیا ہے جناح اسپتال میں پڑے ہیں۔“

”کیا؟“ میرے منہ سے چیخ نکلی۔ ”کسی نے بتایا نہیں۔“

”مجھے پتا ہی نہیں معلوم تھا کہاں سے بتاتا۔“ وہ بولا۔ میں اور امی بھاگ بھاگ جناح اسپتال پہنچے تو ابو وارڈ میں لاوارثوں کی طرح پڑے تھے اور ان کی دیکھ بھال تو کیا ٹھیک سے علاج بھی نہیں ہو رہا تھا۔ درحقیقت جب ہم ابو کو دیکھنے گئے تو وہ آخری دموں پر تھے۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ ان کے بچنے کا امکان بہت کم ہے کیونکہ انہیں بہت تاخیر سے اسپتال لایا گیا تھا۔ دوسرے دن ابو انتقال کر گئے اس وقت

تھے۔ بہر حال اتنا بھی بہت تھا کہ کوئی ہمیں غلط نظروں سے نہیں دیکھتا تھا اور نہ ہم پر آتے جاتے آوازیں کسی جاتی تھیں۔ علاقہ بھی اچھا تھا اور تمام سہولتیں بھی قریب تھیں۔ میں نے میٹرک کر لیا تو یہیں مجھے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔

ابو کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتے تھے اور کس طرح کھانے پینے کا بندوبست کرتے تھے کیونکہ انہیں باہر سے کھانے کی عادت بالکل نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ امی سے لڑائی رہنے کے باوجود گھر پر ہی کھاتے تھے۔ امی ان کے بارے میں سرے سے بات ہی نہیں کرتی تھیں لیکن میں ابو کے بارے میں سوچتی تھی اور کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ انہوں نے دوسری شادی کر لی ہوگی البتہ یہ ابو سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میں کالج میں تھی تب بھی ابو ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آتے تھے۔ ان دنوں وہ کمزور ہونے لگے تھے اور پھر دو سال میں دیکھتے ہی دیکھتے بہت کمزور اور بوڑھے سے ہو گئے تھے حالانکہ اس وقت بھی ان کی عمر پینتالیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن دیکھنے میں وہ ساٹھ کے لگنے لگے تھے۔ میں ابو سے پوچھتی کہ وہ اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہیں تو وہ ٹال جاتے تھے۔ پھر ایک بار وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی اور جب دوسرا ہفتہ بھی ایسے ہی گزر گیا تو میں نے امی سے کہا۔

”مجھے ابو کی فکر ہو رہی ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟“

امی نے کہا۔ ”ان کی دکان سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے مارکیٹ میں ابو کی دکان دیکھ رکھی تھی وہاں پہنچی تو دکان موجود تھی اور ابو کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا بھی تھا لیکن ابو نہیں تھے۔ میں نے ابو کے بارے میں پوچھا تو اس نے نہایت آرام سے کہا۔ ”انہیں قالج ہو گیا ہے جناح اسپتال میں پڑے ہیں۔“

”کیا؟“ میرے منہ سے چیخ نکلی۔ ”کسی نے بتایا نہیں۔“

”مجھے پتا ہی نہیں معلوم تھا کہاں سے بتاتا۔“ وہ بولا۔ میں اور امی بھاگ بھاگ جناح اسپتال پہنچے تو ابو وارڈ میں لاوارثوں کی طرح پڑے تھے اور ان کی دیکھ بھال تو کیا ٹھیک سے علاج بھی نہیں ہو رہا تھا۔ درحقیقت جب ہم ابو کو دیکھنے گئے تو وہ آخری دموں پر تھے۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ ان کے بچنے کا امکان بہت کم ہے کیونکہ انہیں بہت تاخیر سے اسپتال لایا گیا تھا۔ دوسرے دن ابو انتقال کر گئے اس وقت

تھے۔ بہر حال اتنا بھی بہت تھا کہ کوئی ہمیں غلط نظروں سے نہیں دیکھتا تھا اور نہ ہم پر آتے جاتے آوازیں کسی جاتی تھیں۔ علاقہ بھی اچھا تھا اور تمام سہولتیں بھی قریب تھیں۔ میں نے میٹرک کر لیا تو یہیں مجھے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔

ان کے سرہانے میں اور امی تھے۔ ابو کا کوئی دوست بھی نہیں تھا اور جس ملازم پر وہ سب سے زیادہ بھروسہ کرتے تھے اس نے انہیں جان بوجھ کر اسپتال پہنچانے میں دیر کی تاکہ وہ بچ نہ سکیں اور سارا کاروبار اس کے ہاتھ میں آجائے۔ اس کی جال اس حد تک کامیاب رہی کہ ابو بچ نہیں سکے تھے لیکن اگلے ہی دن میں نے جا کر دکان پر تالا لگا دیا اور اس لڑکے کو دکان سے بے دخل کر دیا۔ اس نے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو اس پاس کے دکاندار میری حمایت کے لیے سامنے آ گئے۔ یہ ساری آٹو پارٹس کی مارکیٹ تھی اور اس کے صدر نے مجھے تسلی دی کہ وہ دکان فروخت کرانے اور جائز قیمت دلوانے کی پوری کوشش کریں گے۔ بعد میں ان کی کوشش سے قیمت تو مل گئی لیکن یہ نہیں معلوم کہ جائز ملی یا نہیں۔ ابو ایک کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے وہاں سے ان کا معمولی سا سامان اور کچھ رقم کے ساتھ دوپٹک اکاؤنٹس کی چیک بک ملی تھیں۔ ان میں مجموعی طور پر کوئی ستر ہزار کی رقم موجود تھی۔ دکان کی فروخت سے جو ملا وہ ملا کر کوئی دو لاکھ روپے بنے تھے۔ آج سے بیس سال پہلے یہ اچھی خاصی رقم تھی اگر ہم اسے ٹھیک طرح سے خرچ کرتے تو یہ کئی سال چل سکتی تھی۔ ای نے یہ کیا کہ کچھ رقم سے مکان کے اوپر والا پورشن بنوا کر نیچے کا کرائے بردے دیا اور خود ہم اوپر آ گئے تھے۔ کرائے اور کچھ فٹ پازٹ کی آمدنی سے کسی قدر گزارا ہونے لگا تھا لیکن ابو کی زندگی دلی فارغ البالی تو نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا ابو اپنی ساری ہی آمدنی ہمیں دے دیا کرتے تھے اور خود بس گزارے لائق رکھتے تھے۔

یوں ہماری زندگی سے ابو کا باب ختم ہو گیا۔ مالی تنگی ہوئی تو ہم نے اپنی ضروریات محدود کر لیں۔ میں کالج سے آنے کے بعد شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی۔ ابو کے انتقال کے دو سال بعد میں نے بی کام کر لیا۔ میں چاہتی تھی کہ کسی بینک میں جاب کر کے گھر چلاؤں لیکن ای نے ملازمت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ”نہیں صوفی اب اچھا دور نہیں ہے، باہر نکلنے والی لڑکیوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے اور ان کے رشتے مشکل سے ہوتے ہیں، میں چاہتی ہوں تیری شادی کر دوں۔“

”اس کے بعد آپ کا کیا ہو گا؟“

”میرا اللہ مالک ہے۔“

”نہیں ای۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ پلیز مجھے جاب کرنے دیں میں گھر چلاؤں گی۔“

ای نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے

تھے کہ وہ میری بات نہیں مانیں گی۔ پھر انہوں نے میرے رشتے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ ہمارا کوئی جاننے والا تو تھا نہیں اس لیے ای نے رشتے کرانے والیوں سے بات کی اور وہ رشتے لانے لگیں۔ اب آئے دن ہمارے ہاں مختلف قسم کی خواتین آنے لگیں اور ان میں سے بیشتر کا رشتہ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ رشتہ کرانے نہیں بلکہ کوئی چیز خریدنے آئی ہیں اور جب ان کو پتا چلتا کہ ای کو طلاق ہوئی تھی تو وہ اسی وقت رخصت ہو جاتیں اور دوبارہ پلٹ کر نہیں آتی تھیں۔ تنگ آ کر ای نے رشتے کرانے والیوں سے کہہ دیا کہ وہ ان کی طلاق کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا کریں۔ وہ پہلے بتانے لگیں تو دیکھنے کے لیے بھی لوگ آنا بند ہو گئے۔

پھر ای نے کہا کہ فیملی والوں کے بجائے ایسے رشتے تلاش کریں جس میں لڑکا خود شادی کا خواہش مند ہو۔ میں نے ای سے کہا۔ ”ای ایسے لوگ ٹھیک نہیں ہوتے ہیں یا تو وہ پہلی بیوی سے چھپ کر شادی کر رہے ہوتے ہیں یا پھر کوئی اور مسئلہ ہوتا ہے۔“

”تب میں کیا کروں۔“ ای نے بے بسی سے کہا۔ ”خاندان والے تو میرے بارے میں سن کر آنے سے پہلے انکار کر دیتے ہیں ہم اتنی حیثیت والے نہیں ہیں کہ لوگ ہماری خامی نظر انداز کر کے بہر صورت رشتہ کریں۔“

”ای اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے میری عمر تو نہیں نکلی جا رہی؟“

ای کا جواب روایتی تھا کہ وہ اپنی زندگی میں مجھے اپنے گھر کا کر دینا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ رشتے کرانے والیاں آئے دن ایسے رشتے اٹھا لاتی تھیں جس میں کوئی اکیلا لڑکا یا مرد شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اکثر رشتے تو ای نے مسترد کر دیے اور باقیوں کو میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ یہ رشتے..... مشکلک لگ رہے تھے۔ مگر پھر زید حسن کا رشتہ ای کو بھا گیا۔ زید حسن کے ڈی اے میں آفیسر تھا اور اکیلا تھا۔ رشتے دار تو تھے لیکن سب دور پرے کے تھے۔ باپ کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ ماں عرصے سے بیمار تھی اور ایک سال پہلے وہ بہولانے کا ارمان لیے دنیا سے جلیں گئی تھی۔ زید حسن کا اپنا گھر تھا اچھی نوکری تھی۔ تعلیم یافتہ اور اچھے خاندان سے تھا۔ اس کا خاندان دہلی سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ شکل صورت کا بھی مناسب تھا۔ ای نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔

”ای میں اکیلے رہتے رہتے تنگ آ گئی ہوں اگر آپ

نے میری شادی کرنی ہے تو پلیز کسی بڑے گھر میں کریں۔“
”ارے پاگل آج کل تو لڑکیاں مرنی ہیں کہ سسرال چھوٹا ہو یا سسرے سے نہ ہو اور تم ناشکری کر رہی ہو۔“
”امی اس طرح اکیلے رہنے والے پتا نہیں کیسے نکلیں، اگر بعد میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں یا آپ کس سے فریاد کریں گے۔“

”کچھ نہیں ہوتا بیٹا، زید اچھا لڑکا ہے اور پھر خاندان بھی اچھا ہے۔ میں نے پتا کرایا ہے اس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی ہے۔“

”آپ نے بھی رشتہ کرانے والی سے پتا کرایا ہے اسے تو اپنی فیس سے مطلب ہے اس لیے وہ ہر صورت میں رشتہ کرانا چاہے گی بعد میں اس کی بلا سے جو ہوتا رہے۔“
”میری بچی مان جا، ایسا رشتہ بار بار نہیں آتا ہے، مجھے یقین ہے تو زید حسن کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“

ای شروع سے اپنی بات منوانے والی تھیں اور دوسروں کی کمزوری تھیں، شاید ابو سے بھی ان کے اختلاف کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ ابو بھی اسی قسم کے تھے اس لیے ان میں بنی نہیں۔ اس بار بھی مجھے ای کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ انہوں نے زید حسن کے رشتے کے لیے ہاں کر دی اور فوراً ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔ تاریخ بھی صرف دو مہینے بعد تھی۔ میں ای سے احتجاج کرتی رہ گئی کہ کم سے کم چھ مہینے بعد کی تاریخ دیں مگر زید حسن کی جلدی تھی اور اس نے دو مہینے سے زیادہ کا وقت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے ای سے کہہ دیا تھا کہ اسے کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے گھر میں سب کچھ ہے اس لیے ای کو بہت اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ ان کے پاس چھٹی جمع پونجی تھی اس سے کام بن گیا اور میں رخصت ہو کر زید حسن کے گھر آ گئی۔

عام طور سے کہا جاتا کہ شادی کی پہلی رات طے کر دیتی ہے کہ میاں بیوی میں آنے والے دنوں میں کیسے تعلقات ہوں گے۔ لیکن میرے معاملے میں یہ کلیہ غلط ثابت ہوا۔ پہلی رات زید مجھ سے بہت گرم جوش اور محبت سے پیش آیا اور اس کے لیے میرے دل میں شکوک و شبہات تھے وہ خاصی حد تک کم ہو گئے اور میں خوش تھی۔ زید حسن کا گلشن میں ہی اپنا دوسو گز کا خوب صورت گھر تھا۔ جسے اس نے مناسب انداز میں آراستہ کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں صاحب حیثیت لوگ ہی گاڑی رکھتے تھے۔ اس کے پاس سوٹر سائیکل تھی۔ ہمارے لیے یہی بہت تھی۔ زید کی تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی اور وہ خرچ کرنے کے معاملے میں کھلے ہاتھ کا شخص تھا۔

شادی کے پہلے مہینے ہم نے تقریباً روز ہی باہر کھا کھایا تھا۔ اس دوران وہ خوب ہی خرچ کرتا تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ اس کا زیادہ زور گھونٹنے پھرے اور کھانے پینے والی تفریحات پر ہوتا تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق نہ اس پر خرچ کرنے کے لیے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں اس نے مجھے نہ تو کوئی سوٹ یا کر دیا اور نہ ہی کوئی تحفہ دیا۔ کیونکہ مجھے خود بھی ان چیزوں کی اتنی پروا نہیں تھی اس لیے میں نے بھی خیال نہیں کیا۔ ایک بار امی نے پوچھا تو مجھے خیال آیا اور میں نے امی سے کہا۔ ”نہیں زید نے شادی کے بعد مجھے نہ تو کوئی سوٹ لے کر دیا ہے اور نہ ہی کوئی تحفہ دیا۔“

امی کو تعجب ہوا تھا۔ ”یہ کیا شوہر ہے جسے بیوی کی پروا نہیں ہے۔“

”امی وہ ویسے خرچ کرتا ہے شاید اس کا ذہن بھی ایسا نہیں ہے۔ اکیلے رہنے اور پلنے والے لوگوں کو بہت ساری باتوں کا علم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“ میں نے امی کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا لیکن خود میں اندر سے کھٹک گئی تھی اس لیے موقع ملنے ہی میں نے زید سے پوچھ لیا۔

”آپ نے بھی مجھے کوئی چیز گفٹ نہیں کی ہے، لوگ تو شادی کے بعد اپنی بیویوں کو ڈھیر سارے گفٹ دیتے ہیں۔“
”وہ اجتناب کرتے ہیں۔“ زید نے آرام سے کہا۔
”بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، کپڑے اور چیزیں لا دو جنہیں بیویاں ایک دو بار پہن کر پھینک دیں۔ کپڑے اور دوسری چیزیں ہیں نا تمہارے پاس۔“
”چلیں میرے پاس ہیں لیکن آپ کوئی معمولی سی چیز لے آتے۔“

”معمولی ہا۔۔۔ اس نے تہہ بہ لگایا۔“ میں معمولی سی چیز لاتا تو کہیں کہ یہ کیا لے آیا ہوں، بیوی کو اتنی معمولی سی چیز دیتے ہیں۔“ اس نے میرے انداز کی نقل اُتاری۔ ”میری جان، چھوڑو ان چکروں کو کھاؤ پیو اور سسرے کرو بس یہی زندگی ہے۔“
صرف کھانے پینے کو زندگی قرار دینے والے زید کا یہ حال تھا کہ اس کے پاس درجنوں بہترین سوٹ اور دوسرے لمبوسات تھے۔ الماری میں ایک پورا ریک پر فیمو اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک درجن اعلیٰ درجے کے جوتوں کے جوڑے تھے۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنے لیے کئی بار یہ چیزیں لے کر آیا تھا جب میں نے ان کا حوالہ دیا تو اس کا موز خراب ہو گیا اور اس نے کہا۔ ”جاہل عورتوں کی سی باتیں مت کرو، میں باہر جاتا ہوں اچھے گریڈ کا

المیر ہوں مجھے یہ سب میٹھین کر کے رکھنا پڑتا ہے۔“
مجھے بحث کرنے کی عادت نہیں تھی اور دوسری بات یہ کہ امی کے اول دن سے مجھے اس بات کا خوف تھا کہ کہیں میرے گھر میں بھی امی ابو والے جھگڑے نہ ہوں اس لیے میں انتہائی حد تک کوشش کرتی تھی کہ لڑائی جھگڑے والی بات سے دور رہوں۔ زید نے بھی جلد اس بات کو محسوس کر لیا اس لیے جب میں کوئی اختلافی بات کرتی تو وہ جھگڑا کرنے والا لہجہ اپناتا اور میں فوراً چپ ہو جاتی۔ شادی کے دوسرے مہینے میں امید سے ہو گئی لیکن پتا چلا۔۔۔۔۔ دیر سے چلا تھا۔ جب دو کو پتا چلا تو اس نے کہا۔ ”یہ کیا مصیبت ہے ابھی تو ہم دھڑکی انجوائے کر رہے ہیں۔“

”زید یہ مصیبت نہیں ہماری اولاد ہے اور میری تو لڑائی ہے میرے جلدی جلدی اور بہت سارے بچے ہوں۔“
”بہت سارے بچے۔“ اس نے بد مزگی سے کہا۔ ”تمہارا باپ تو ہے نہیں انہیں کون پالے گا؟“
”ان کا باپ پالے گا۔“
”باپ کے پاس فالتو پیسا نہیں ہے، صوفی معاملہ ختم کراؤ۔“

میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“
”مطلب صاف ہے تم ایپورشن کرالو ابھی تو اشارت ہے معاملہ آسانی سے ختم ہو جائے گا۔“
”میں ایسا نہیں کروں گی۔“

اس بات پر ہمارا پہلا جھگڑا ہوا اور زید نے مجھے تھپڑ بھی مار دیا۔ میں ششدر رہ گئی تھی۔ پھر میری تھپڑ مار ڈال دینے والی اہمیت آڑے آ گئی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی امداد مان گئی۔ لیکن جب میں نے لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے بتایا۔ ”دیر ہو گئی ہے اب تو تیسرا مہینہ ہے اور اس مہینے ایپورشن خطرناک ہو سکتا ہے خاص طور سے اب تمہارا پہلا موع ہے۔ کیس بگڑ گیا تو تمہاری جان کو بھی اہمہرہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے تم دو بارہ ماں نہ بن سکو۔“

میں نے لہجہ کو بتایا تو اس نے ماتھے سے انکار کر دیا پھر لیڈی ڈاکٹر سے بات کی تب کہیں جا کر اسے یقین آیا۔ مگر وہ جھنجھلا گیا تھا بہت دنوں تک اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی جیسے اس معاملے میں میرا کوئی قصور ہو۔ اب وہ مجھے باہر لے کر نہیں جاتا تھا۔ اکیلے جاتا اور اکثر رات گئے آتا تھا۔ میں اکیلی گھر میں اس کا انتظار کرتی رہ جاتی تھی۔ ایک رات وہ آیا تو اس کے قدم اور زبان بہک رہی تھی، منہ سے عجیب سے بدبو آ رہی تھی میں ستائے میں رہ گئی۔

”آپ۔۔۔ آپ پی کر آئے ہیں۔“

”ہاں تو۔۔۔؟“ اس نے تسخرانہ انداز میں پوچھا۔

”آپ شراب پینے لگے ہیں؟“

”پینے نہیں لگا ہوں عرصے سے پیتا آیا ہوں۔“ وہ یوں اور کپڑے بدلنے چلا گیا۔ کپڑے بدل کر آیا تو بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس رات میں دیر تک اپنے نصیب پر روتی رہی اور مجھے یقین ہو گیا کہ شادی کے معاملے میں میں اپنی ماں سے زیادہ بد قسمت ثابت ہوئی ہوں۔ ابو میں یہ خرابیاں نہیں تھیں۔ ان کی امی سے نہیں بنتی تھی لیکن ان میں کردار کی خامیاں نہیں تھیں۔ وہ اپنی ذات سے زیادہ ہمیں اہمیت دیتے تھے۔ جب کہ زید کو صرف اپنی پروا تھی۔ ہونٹنگ پریکٹروں اڑا دینے والے کو گھر میں چند سو کا سودا ڈالنے کی توفیق بھی اس وقت ہوتی تھی جب میں اس سے بار بار کہتی تھی۔ شادی کے بعد اس نے شاید ہی کبھی میرے ہاتھ میں کوئی رقم دی تھی۔ اپنے چھوٹے سوٹے اخراجات کے لیے بھی مجھے اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ کئی بار مانگنے پر ایک بار رقم ملتی تھی اور وہ بھی جتا جتا کر۔

”میں نے تمہارا ذمہ نہیں لیا ہوا ہے۔“

”تو میرا ذمہ کس پر ہے؟“

”جوان ہو پڑھی لکھی ہو کہیں بھی نوکری مل سکتی ہے خود کماؤ۔“

”میں تو خود نوکری کر کے کمانا چاہتی تھی۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”لیکن ای نے شادی کر دی۔ ان کا خیال ہے کہ عورت کا اصل مقام گھر ہے دفتر نہیں۔“

”اب اپنی ماں سے کہو وہ تمہیں خرچہ دیا کرے۔“ زید من لے لاہوا لائی سے کہا۔

میں نے امی کو ابھی تک اپنے گھر کے حالات سے بے خبر رکھا تھا۔ وہ میری ماں بننے کی خبر پر خوش تھیں اور جلدی جلدی میرے گھر آتی تھیں۔ میں بڑی مشکل سے زید حسن کی حرکتیں ان سے چھپاتی تھی۔ ایک بار میری طبیعت خراب تھی امی رکنے آئی تھیں۔ زید حسن حسب معمول پی کر آیا تو امی حیران ہو گئیں۔ میں نے یہ مشکل چھپایا کہ وہ پیسے ہوئے ہے۔ میں نے امی سے کہا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے صبح بھی طبیعت ایسے ہی چلے گئے تھے۔ پھر اگلے روز میں نے زید حسن کی طبیعت ٹھیک ظاہر کر کے امی کو گھر بھیج دیا۔ رات میں نے زید سے کہا۔ ”آپ کم سے کم امی کا خیال کر لیتے ان کے سامنے پی کر نہ آتے۔“

”پینے سے خدا نے روکا ہے جب میں اس کے سامنے

پی سکتا ہوں تو تمہاری ماں کے سامنے کیوں نہ بی کر آؤں۔“ اس نے حسب معمول بے پروائی سے کہا۔ ”میں نے چھپایا نہیں ہے۔“

”ہاں شادی سے پہلے رشتے کے ساتھ آپ نے بوسل بھی بھیجی تھی۔“ میں نے طنز کیا۔

ان حالات میں میں نے ٹٹا کو جنم دیا۔ آپ یقین کریں ایک کھاتے پیتے شخص کی بیٹی نے سرکاری اسپتال میں جنم لیا جہاں سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میں دو دن وہاں لاوارثوں کی طرح داخل رہی اور وہاں پہنچانے کے بعد زید حسن پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ اسی میری دیکھ بھال کرتی رہیں اور حیران ہوتی رہیں کہ یہ کس قسم کا شخص ہے۔ انہوں نے مجھے اسپتال سے گھر پہنچایا۔ میں نے منت سماجت کر کے اسی کو زید حسن سے جھگڑا کرنے سے روکا، میں جانتی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اُلٹا وہ ای سے بدتمیزی کرتا اور میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اب اسی کو کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا کہ زید حسن کس قسم کا شخص ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”میری بچی مجھے معاف کر دے میں نے کس شخص سے تیرا نصیب چھوڑ دیا ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”امی یہ واقعی میرا نصیب ہے میں اس سے کسی صورت نہیں بچ سکتی تھی۔“

بیٹی سے زید حسن کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسے اٹھاتا تک نہیں تھا۔ پیار کرنا تو دور کی بات ہے، اگر میں کہیں معروف ہوں اور شہرور رہی ہو تو وہ اسے چپ بھی نہیں کراتا تھا۔ گویا وہ صرف میری بیٹی تھی۔ اس کے اخراجات بھی وہ بہت مشکل سے دیتا تھا۔ میرے اصل حالات کا علم ہونے کے بعد بے چاری ای اپنی محدود آمدنی میں سے بھی مجھے کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں۔ وقت گزرتا رہا۔ ٹٹا کے ایک سال بعد مونا دنیا میں آئی۔ اس بار میں نے شروع میں زید کو بتا دیا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ معاملہ ختم کرنے کو کہے گا لیکن اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ یوں ایک سال بعد میری دوسری بچی بھی دنیا میں آ گئی تھی۔ میری ذمے داری بڑھ گئی تھی اور زید حسن کی طرف سے مالی تنگی برقرار تھی۔ ای بھی کتنا کرتیں۔ مہنگائی بڑھ رہی تھی اور کرائے کی محدود رقم خود ان کے گزارے کے لیے ناکافی تھی۔

ایک رات زید حسن جلدی گھر آ گیا۔ وہ کھانا باہر سے لایا تھا اور حیرت انگیز طور پر بچپوں کے لیے چیزیں بھی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سائینڈ بزنس بھی کر رہا ہے اور اس سے کچھ نفع ملا ہے۔ میں نے سوچا کہ معمول کی آمدنی سے وہ شراب پی سکتا ہے اور بزنس کی آمدنی سے نفع ملا تو گھر اور ماہنامہ سرگزشت

بچپوں کے لیے لایا ہے۔ مجھے اس کی بات پر ایک فیصد اعتبار نہیں آیا تھا۔ مگر میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بعد زید حسن کا رویہ کسی قدر بدل گیا۔ وہ جلدی گھر آنے لگا۔ مجھ سے اور بچپوں سے اچھے انداز میں پیش آتا اور ہماری لیے چیزیں بھی لاتا تھا اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ ہمارے لیے اور بھی کچھ کرنا چاہتا ہے لیکن مالی تنگی کا شکار ہے اس لیے جتنا کرنا چاہتا ہے اتنا کر نہیں پاتا ہے وہ زیادہ کمانے کے لیے بزنس بڑھانا چاہتا ہے لیکن فی الحال اس کے پاس رقم نہیں ہے۔ ایک ہفتے بعد رات کو میں بچپوں کو سلا کر خود بھی سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ زید نے کہا۔

”صوفی تمہارا مکان بیچنا چاہیں تو اچھی قیمت میں بک سکتا ہے۔“

میں چونک گئی۔ ”میرا مکان کون سا ہے؟“

”جس میں تمہاری امی رہ رہی ہیں۔“

”وہ ای کا ہی ہے۔“

”لیکن تمہارے باپ نے تمہارے نام کیا ہے۔“

”زید حسن وہ مکان امی کا ہے جب تک ای زمرہ ہیں۔“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”آئندہ مجھ سے اس بارے میں بات نہ کیجئے گا۔“

زید حسن خاموش ہو گیا اور خلاف توقع اس نے مجھ سے لڑائی بھی نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ میرے قطعی جواب سے وہ چپ ہو جائے گا۔ لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ وہ میرے علم میں لائے بغیر ای کے پاس چلا گیا۔ اس نے ای سے پتا نہیں کیا کہا کہ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر مکان بیچنے پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ زید نے ان سے کہا کہ وہ انہیں اپنے مکان کے اوپر ایک کمرہ بنا کر دے گا۔ جب ای نے مجھ سے بات کی تو میں حیران رہ گئی۔ ”امی آپ کیسے راضی ہو گئیں؟“

”بیٹا تمہاری اور تمہاری بچیوں کی بہتری کے لیے۔“

”امی مجھے زید حسن پر قطعی اعتماد نہیں ہے۔ وہ اس مکان کو بیچ کر کھانے کے چکر میں ہے۔“

”وہ کوئی بزنس کرنا چاہ رہا ہے۔“ ای نے دبے انداز میں کہا۔

”نہیں ای میں یہ مکان کسی صورت فروخت نہیں کروں گی۔“

ای پریشان ہو گئیں۔ ”لیکن میں زید کو ہاں کہہ چکی ہوں۔“

”میں اسے دیکھ لوں گی۔“ میں نے فکر مندی سے

مجھے اندازہ تھا کہ زید حسن کا رجحان کیا ہوگا۔ لیکن اس کا اتنا شدید ہوگا یہ میں نے سوچا نہیں تھا جب میں نے اپنا بیٹے سے انکار کیا تو وہ طلاق کی حد تک چلا گیا۔ میرے ماں بھائی تھے۔ ای کی طلاق کا انجام میرے سامنے تھا میں نے صورت یہ داغ نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے مجبوراً مجھے ہاکی بات ماننا پڑی۔ مکان بک گیا اور اس کے رقم زید حسن کو مل گیا۔ میں چلی گئی اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ رقم ہاتھ نہ آئی ہی زید حسن کا پہلے والا رویہ لوٹ آیا اب اسے نہ لگاؤ تھا اور نہ بچپوں کی۔ اس نے ای کو اوپر کمرہ بنا کر دیا۔ کادعدہ بھی بھلا دیا تھا اور اب وہ بے چاری گھر کے چکر میں پڑی تھیں۔ زید حسن کا ان سے رویہ بھی ٹھیک نہیں تھا اور اکثر وہ ان سے طنز یہ انداز میں باتیں کرتا تھا۔

دراصل زید حسن سمجھ گیا تھا کہ میں گھر بیچانے کے لیے اس کی ہر جائز ناجائز بات ماننے پر مجبور ہوں گی اور وہ اس کا ہار لاندہ اٹھاتا۔ اس وقت ابو کا دیا مکان کئی لاکھ میں بکا تھا اور اس نے یہ رقم عیاشیوں میں اڑا دی۔ وہ جب گھر آتا تو لڑنے میں دھت ہوتا تھا۔ اس نے سونے سا نیل بیچ کر ایک پرانی گاڑی لے لی تھی۔ ایک دن شام کو میں پیدل مونا کو لے کر اگلے کے پاس گئی تھی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کچھ دیر چلے میں نے زید کو دفتر فون کیا تھا اور اس سے جلد آنے کو کہا تھا کہ مونا کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ مگر اس نے کہا کہ اسے کام ہے اور وہ جلدی گھر نہیں آ سکے گا اس لیے میں خود گاڑی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ جب میں اسے ڈاکٹر کو دکھا کر اسے آ رہی تھی تو میں نے سڑک پر زید حسن کی کار دیکھی اس میں وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ وہ لڑکی میں اتنا کم تھا کہ اسے لے کے کنارے کھڑی اپنی بیوی اور بچی نظر ہی نہیں آئی تھیں۔ میں صدمے سے سن رہی تھی۔ مجھے زید حسن پر پہلے ہی شک تھا کہ وہ دوسری عورتوں کے چکر میں بھی ہے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ انہیں اس طرح سرعام لے کر گھر لے گا۔ وہ دراصل گھر کے دوران جس طرح اس لڑکی سے سر جوڑے ہوئے تھا اس سے ان کے درمیان تعلق واضح تھا۔

میں اب تک زید کی ساری حرکتیں برداشت کرتی آئی تھی۔ وہ شراب پیتا تھا اور رات دیر گئے تک گھر آتا تھا۔ وہ میرا اور بچپوں کا خرچ نہیں دیتا تھا۔ گھر کا سامان تنگی ترشی سے لاتا تھا۔ میں سب برداشت کرتی رہی لیکن اس کی یہ حرکت میری برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس رات میری زید حسن سے پہلی منجیدہ جسم کی لڑائی ہوئی اور میں نے پہلی بار ہی اسے برابر کی ستائی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔ ”زید حسن میں نے تمہاری ہر

بات برداشت کرتی لیکن یہ برداشت نہیں کروں گی۔“

”تو نہ کرو۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ”تم یہ مت سمجھنا میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔“

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔ ”کیا کر لو گی تم.... بولو کیا کر لو گی؟“ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ ”تم لفظوں کی مار ہو تم۔“

اس کے الفاظ میں ایسا پتھر پین تھا کہ میں سرد پتھر بن گئی۔ میرے اندر اُبلتا اور کھولتا ہوا لہو ایک دم جم گیا تھا۔ میرا رجحان دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔ ”اب اپنی اوقات میں رہنا.... ورنہ....“

ای خوف زدہ تھیں انہوں نے بھی جھگڑا اس لیا تھا بعد میں انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”میری بچی اس سے نہ لڑا کر اب تو ہمارے سر پر کوئی جھت بھی نہیں ہے۔ اگر اس نے کچھ ایسا ویسا بول دیا تو ہم کہاں جائیں گے؟“

مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ زید حسن نے مجھے طلاق دے دی تو ہم کہاں جائیں گے بلکہ مجھے لفظ طلاق سے ہی خوف آتا تھا۔ میں جانتی تھی اس کے بعد میری اور میری بچیوں کی زندگی کتنے سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ میں کسی صورت یہ تہمت اپنے اوپر نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے زید حسن کی ہر زیادتی کی طرح اس کی یہ حرکت بھی سہنے لگی۔ وہ اپنے معمولات میں مشغول رہا تھا۔ امی سے سب دیکھتیں اور کڑھتی رہتی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر اس بات پر کھڑکی رہیں کہ انہوں نے زید حسن سے خد کہ کے میری شادی کرائی اور اس کے نتیجے میں جیسی ای نے گزاری تھی، میں اس سے بھی بُرے حال میں زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔

کل دن سے ای کی طبیعت خراب تھی۔ انہیں بھوک نہیں لگ رہی تھی اور جو کھائیں تو اُلٹی کی صورت میں باہر آ جاتا تھا۔ میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی تو اس نے ڈھیر سارے ٹیسٹ لکھ دیے۔ میرے پاس رقم نہیں تھی کہ ان کے ٹیسٹ کرائی میں نے زید سے کہا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔ ”آج کل میرا ہاتھ تنگ ہے۔“

”ہمارے لیے آپ کا ہاتھ کبھی کھلا بھی ہوتا ہے؟“

”بکومت اور تمہاری ماں کو یہاں رکھا ہوا ہے یہی میرا احسان ہے۔“ وہ غرا کر بولا۔

”میری ماں پر احسان ہے یا اسے تم نے در بدر کر دیا ہے اس کی جھت چھین لی ہے۔“

”مکان تمہارا تھا اس کا نہیں تھا۔“

”میرا تھا تو تم نے کس خوشی میں غم کرایا؟“
 ”میاں بیوی کی چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔“ اس نے
 پھر روایتی ڈھٹائی سے کہا۔ میں ای کی بیماری کی وجہ سے مجبور تھی
 اس لیے میں نے بات بڑھانے سے گریز کیا اور اس سے کہا۔
 ”پلیز زید ای کی طبیعت بہت خراب ہے اور میرے
 پاس رقم نہیں ہے۔“

”تو کسی سرکاری اسپتال میں لے جاؤ۔“
 ”وہاں تک جانے کے لیے بھی تو ٹیکسی رکشے کا کرایہ
 چاہیے ہوتا ہے۔“

مجبوراً زید نے مجھے کچھ رقم دی اور میں ای کو ایک
 سرکاری اسپتال لے گئی۔ وہاں انہیں ہپاٹائٹس تشخیص ہوا۔
 اس زمانے میں یہ بیماری اتنی عام نہیں تھی اور اس کا علاج بھی
 بہت مشکل اور مہنگا پڑتا تھا۔ ای کا سرکاری اسپتال میں علاج
 ہوتا رہا لیکن ان کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے
 جواب دے دیا اور ایک دن اسپتال سے ان کی میت گھر آئی
 تھی۔ ان دنوں میں ای اور بچیوں کے چکر میں حال سے بے
 حال ہو گئی تھی۔ ای کے انتقال نے میرے ہوش ہی گم کر
 دیے تھے اتنی بڑی دنیا میں خدا کے بعد ایک وہی تو میرا سہارا
 تھیں۔ زید کی بے اعتنائیاں میں اس لیے بھی سہ جاتی تھی کہ
 میرے پاس ای تھیں اب وہ بھی نہیں رہی تھیں۔ کتنے دن
 میں تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ مگر کب تک آخر بچیوں کی خاطر
 مجھے خود کو سنبھالنا پڑا تھا۔

زید کی بے حس کا وہی عالم تھا۔ اس نے میت والا ون
 مشکل سے گھر میں گزارا اور اس کے بعد اگلے ہی روز سے
 اپنے معمولات شروع کر دیے تھے۔ گھر کی طرف سے اس کی
 لاپرواہی ویسی ہی تھی۔ ثنا اور مونا اب بڑی ہو رہی تھیں۔ ثنا
 چار سال کی تھی اور مونا تین سال کی۔ میں انہیں اسکول میں
 داخل کرانا چاہتی تھی۔ زید اس پوزیشن میں تھا کہ چاہتا تو
 انہیں کسی اچھے پرائیویٹ اسکول میں پڑھا سکتا تھا لیکن اپنی
 آمدنی کا ایک ایک روپیہ اس نے اپنی عیاشیوں کے لیے رکھا
 ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ثنا اسکول جانے کی عمر کو پہنچ
 گئی ہے اسے کسی اسکول میں داخل کرانا ہے۔“
 ”تو کرو۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”کیسے کرا دوں اسکول کی۔“ فیس اور دوسرے
 اخراجات کے لیے رقم ہونی چاہیے۔“
 ”پرائیویٹ اسکول کے بجائے سرکاری اسکول میں کرا
 دو وہاں فیس نہیں ہوتی بس کتابیں اور یونیفارم لینا ہوگا۔“
 ”زید حسن۔“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم

اپنی بچیوں کو سرکاری اسکول میں پڑھاؤ گے؟“
 ”تو کیا ہوا؟“ وہ بدحرکی سے بولا۔ ”کیا سرکاری
 اسکول میں بچے نہیں پڑھتے ہیں تمہاری انوکھی بچیاں ہیں۔“
 ”زید حسن تمہاری حیثیت ہے تم اپنی بچیوں کو
 پرائیویٹ اسکول میں پڑھا سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے اسکول کی
 فیس اس ایک بوتل کی قیمت سے کم ہی ہوگی جو تم ایک رات
 میں پی جاتے ہو۔“

”بکومت۔“ وہ غرا کر بولا۔ ”میرے پاس فالتور تم
 نہیں ہے۔ اپنی بچی کو پڑھانا ہے تو سرکاری اسکول میں داخل
 کر دو ورنہ اسے گھر میں بیٹھے رہنے دو۔“

میں ثنا کو سرکاری اسکول میں داخل نہیں کرانا چاہتی
 تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے اپنی بچیوں کے لیے کرنا ہے تو
 خود ہی کرنا ہے ان کے باپ سے کسی قسم کی توقع کرنا حماقت
 تھی۔ لیکن میں سوائے جاب کے اور کیا کر سکتی تھی۔ جاب کی
 صورت میں گھر میں بچیوں کو کون دیکھتا؟ وہ ابھی اس قابل
 نہیں ہوئی تھیں کہ اپنی دیکھ بھال خود کر سکیں۔ میں ای فکر میں
 تھی کہ ان دنوں میں مجھے پھر چکر آنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ
 اس کیفیت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے جا کر ڈاکٹر کو دکھایا
 تو اس نے تصدیق کر دی کہ میں ماں بننے والی تھی۔ اس بار
 میں خود تپ پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میری دو بچیاں باپ کے
 ہوتے رُل رہی تھیں تیسرے کو دنیا میں لا کر کیا کرنی ہے میں نے
 ڈاکٹر سے بیورشن کی بات کی تو اس نے شوہر کی اجازت کے
 ساتھ پانچ ہزار کا خرچ بھی بتا دیا۔

زید نے بیورشن کی اجازت تو بے خوشی دیدی لیکن جب
 پانچ ہزار کا سوال سامنے آیا تو اس نے صاف انکار کر
 دیا۔ ”میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔“

”لیڈی ڈاکٹر اتنی رقم مانگ رہی ہے۔“
 ”تو منع کر دو اور پیدا کرو اس بچے کو بھی۔“ اس نے
 زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی تمہیں بچے پیدا کرنے کا
 شوق ہے نا؟“

یوں ماریہ کا دنیا میں آنا بھی مقدر بن گیا۔ اس بار مجھے
 کتنی مشکل ہوئی میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس بار مجھے صبح
 معنوں میں اندازہ ہوا کہ ای میری کتنی ساری مشکلیں آسان
 کر دیا کرتی تھیں۔ اب مجھے سہارا دینے والا کوئی نہیں تھا اور
 ہر چیز سے مجھے اکیلے ہی نمٹنا تھا۔ ماریہ دنیا میں آئی تو میں کتنے
 دن طبیعت خرابی کی وجہ سے بستر پر پڑی رہی۔ اس حالت
 میں بچیوں کو بھی دیکھنا ہوتا تھا ان کی خوراک اور گھر کے
 دوسرے کام بھی دیکھنا پڑتے تھے اور ماریہ کو بھی سنبھالنا ہوتا

لہذا آج میں سوچتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں نے وہ
 افسوس کس طرح گزارا تھا اور اتنی ساری مشکلات سے کس
 طرح نبرد آزما ہوئی تھی۔ یہ مشکلات اس وقت سوا ہو گئیں
 اب زید کی طرف سے مجھے کوئی مدد نہیں ملی نا جسمانی اور نہ
 مالی مدد۔ حد یہ کہ وہ گھر میں وہی بارہ ایک بجے داخل ہوتا تھا
 اور میں صبح سے بے حال ہونے کے باوجود اس وقت تک
 ہانگی رہتی تھی جب تک زید گھر نہ آ جاتا۔ ورنہ ذرا سی دیر
 ”لے پروہ چراغ پا ہو جاتا تھا اور اتنا شور کرتا کہ بچیاں جاگ
 پاتی تھیں اور مجھے دوبارہ ان کو سنانا پڑتا تھا۔

گھر کی یہ حالت تھی کہ سوائے زید کے ذاتی سامان گھر
 میں آسائش کا ذرا سا بھی سامان نہیں تھا۔ میرے جینز کا فرنیچر
 تھا اور بس۔ میرا یہ حال تھا کہ کپڑوں کے چند جوڑے رہ گئے
 تھے۔ انہیں اول بدل کر پہنتی تھی۔ بچیوں کے پاس بھی چند
 کپڑے تھے۔ ایک سوٹ وہ اس وقت تک پہنتی تھیں جب
 تک وہ چھوٹا نہ ہو جاتا۔ ان کی اکثر فریکس اپنے پرانے ہو
 جانے والے کپڑوں کو کاٹ کر بناتی تھی۔ ان کے پاس
 نھلونے نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ پرانے بوسیدہ جوتے
 اور چپلیں پہنتی تھیں۔ اپنی بچیوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل
 خون کے آنسو روتا تھا۔ یہ اس شخص کی بچیاں تھیں جو ہر مہینے
 ہزاروں روپے عیاشی میں آزادیتا تھا۔

میں زید حسن سے بہت پہلے الگ ہو چکی ہوئی اگر مجھے
 لفظ طلاق سے خوف نہ آتا۔ میرے اندر اس شخص کے لیے ذرہ
 بردبار گنجائش نہیں رہی تھی۔ مگر ماریہ کے بعد مجھے رہ رہ کر خیال
 آنے لگا کہ اب مجھے اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔ اس کے
 ساتھ میں اور میری بچیاں جتنی اذیت میں تھیں اس سے بہتر
 تھا میں اس سے الگ ہو جاتی۔ ممکن ہے اس وقت مجھے اس
 سے زیادہ سخت حالات دیکھنے پڑتے لیکن کم سے کم یہ اذیت تو
 نہ ہوتی کہ میں اور میری بچیاں شوہر اور باپ کے ہوتے
 ہوئے بھی بیوہ اور یتیموں کی سی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ پھر
 طلاق کا خیال میرے اندر پختہ ہونے لگا تھا۔ میں اپنے اندر
 ہمت پیدا کرنے لگی کہ زید سے طلاق مانگ سکوں۔ اس کے
 بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ فوراً میرا مطالبہ مان لے گا۔
 اصل میں میں خود کو طلاق لینے پر تیار کر رہی تھی۔ پھر ایک دن
 رات گئے جب زید حسن گھر آیا تو میں نے سوچ لیا آج میں
 اس سے بات کروں گی۔ اس روز اس کی حالت ہمیشہ سے
 زیادہ تباہ تھی۔ وہ بہ مشکل اپنے بچروں پر کھڑا تھا اور اس کا چہرہ
 عنابی سا ہو رہا تھا۔ وہ کھٹنا ہوا بیڈ روم میں پہنچا اور بستر پر
 ڈھیر ہو گیا۔ وہ یوں گہرے سانس لے رہا تھا جیسے اس سے

سانس نہیں لیا جا رہا ہو۔ اس نے میری طرف دیکھا۔
 ”صوفی.... مجھے پانی دو میری طبیعت خراب ہو رہی
 ہے۔“
 ”کیا ہوا تمہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 وہ اپنا ہایاں ہاتھ مسلنے لگا۔ ”شاید مجھے ہارٹ ایکٹ
 رہا ہے۔“

”ہارٹ ایکٹ؟“
 ”ہاں مجھے.... کچھ عرصے سے.... تکلیف تھی لیکن میں
 نے توجہ نہیں دی۔“ وہ ڈوبتے انداز میں بولا۔
 ”ہاں تم نے اس بیماری کو بھی بیوی بچے سمجھ لیا ہوگا۔“
 میں نے طعنے لگا۔ ”توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہو
 گی۔“

”پلیز یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے تم کال کر کے
 ایسولینس منگواؤ اور مجھے اسپتال لے چلو۔“
 لیکن جب تک ایسولینس آتی اور زید حسن کو اسپتال
 پہنچایا جاتا اس وقت تک ہارٹ ایکٹ نے اس کی جان لے لی
 تھی۔ جب میں صبح اس کی لاش لے کر گھر آئی تو مجھے یقین
 نہیں آ رہا تھا کہ جس شخص سے میں طلاق مانگنے جا رہی تھی وہ
 خود دنیا سے گزر گیا ہے اور مجھے بیوہ کر گیا ہے۔ کئی دن تک
 مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ تھکے والے اور چند جاننے والے اس
 موقع پر کام آئے اور انہوں نے مجھے اور بچیوں کو سنبھالنے
 رکھا۔ زید حسن کے دفتر والے آئے تو اس کی تنخواہ لیتے آئے
 تھے اور پہلی بار مجھے پتا چلا کہ اس کی تنخواہ کتنی تھی یہ جان کر
 میری اس سے نفرت دو چند ہو گئی تھی۔ وہ اتنا کمارہا تھا کہ ہمیں
 بہت اچھی طرح رکھ سکتا تھا لیکن وہ....

میری بچیوں کا نصیب دیکھیں کہ باپ کے مرنے کے
 بعد قسمت کا در کھلا۔ انہیں اچھا لباس، اچھی خوراک اور اچھا
 اسکول باپ کے مرنے کی وجہ سے نصیب ہوا۔ صرف تنخواہ ہی
 نہیں اس کا اچھا خاصہ فنڈ اور پنشن بھی مجھے ملی اور سب سے
 حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں کوئی ایک
 لاکھ کے قریب رقم موجود تھی۔ گاڑی اور گھر بھی تھا۔ رقم ہاتھ
 میں آتے ہی میں سب سے پہلے گھر اور بچیوں کی ضروری
 چیزیں لائی۔ ثنا اور مونا کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرایا جو
 نزدیک ہی تھا۔ میں ڈرائیونگ نہیں جانتی تھی اس لیے گاڑی
 فروخت کر دی۔ میرے پاس رقم تھی اور میں کئی سال آرام
 سے گھر میں بیٹھ کر اپنا اور بچیوں کا گزارا کر سکتی تھی لیکن
 میں نے رقم کو بچیوں کے لیے محفوظ کرنے کا سوچا اور خود
 ملازمت کے لیے کوشش شروع کر دی۔

میں بی کام تھی اس لیے جلد مجھے ایک بینک میں ملازمت مل گئی۔ تنخواہ اتنی تھی کہ میں اس میں آرام سے اپنا گھر چلا سکتی تھی۔ ماریہ چھوٹی تھی اس لیے اپنے ساتھ دفتر لے آتی تھی اور دفتر کے برابر میں واقع ڈے کیئر سینٹر میں چھوڑ دیتی۔ بینک آف ہونے کے بعد اسے ساتھ لے کر گھر آتی۔ گھر کے لیے میں نے ایک نو عمر لڑکی نوری کو ملازمہ رکھ لیا۔ صبح میں دفتر جاتے ہوئے ثنا اور مونا کو اسکول چھوڑتی جاتی تھی۔ دوپہر میں نوری بچیوں کو اسکول سے لے آتی۔ اس وقت خواتین کو دو بجے چھٹی دے دی جاتی تھی۔ میں بھی گھر آ جاتی۔ ماریہ دو سال کی ہوئی تو اسے بھی نوری کے پاس گھر پر چھوڑنے لگی۔ وہ نوری سے مانوس ہو گئی تھی اس کے ساتھ رہ جاتی تھی۔ تین سال کی عمر میں اسے موچیوری میں ڈال دیا اور وہ بھی بہنوں کے ساتھ اسکول جانے لگی۔ بچیوں کی طرف سے ذرا فراغت ملی تو میں نے ایم اے میں داخلہ لیا اور ماسٹر کرنے پر بینک میں مجھے آفیسر گریڈ میں ترقی مل گئی۔ تنخواہ بڑھی اور دوسری بہت ساری سہولیات ملنے لگیں۔

گھر میں دو بیڈروم اور ایک ڈرائنگ روم تھا میں نے بینک سے قرض لے کر ایک بیڈروم اور لاؤنج بنوا لیا۔ لاؤنج میں ہی اوپن امریکن کچن بنوایا اور جو پہلے چھوٹا سا کچن تھا اسے ہاتھ روم بنا دیا۔ گھر کا اندرونی اور بیرونی حصہ اس طرح تبدیل کر لیا کہ وہ نیا جدید ڈیزائن کا بنگلا لگنے لگا تھا۔ ثنا اور مونا بڑی ہو گئی تھیں ان کو الگ بیڈروم دے دیا اور ماریہ میرے ساتھ ہی سوتی تھی۔ ماریہ شادی تک میرے ساتھ ہی رہی تھی۔ ثنا اور مونا اس پر کہتیں کہ وہ میری لاڈلی ہے بھی میں نے اسے شادی تک اپنے ساتھ رکھا۔ میری تنخواہ اچھی تھی اور میں نے موجود رقم بھی ایسی بچت اسکیموں میں لگا دی تھی جہاں وہ کئی گنا زیادہ ہو کر ملتی۔ یہ میں نے بچیوں کی شادی کے لیے رکھ دی تھی۔ ان کی تعلیم اور آنے والے دوسرے اخراجات کے لیے میں رقم جمع بھی کرتی تھی۔

اللہ نے کرم کیا اور میں نے نہ صرف بچیوں کو اچھی تعلیم دلوائی بلکہ ان کی شادیاں بھی اچھے طریقے سے اور اچھے گھرانوں میں کیں۔ جب رشتہ لانے والے سنتے کہ میں جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی اور میں نے خود محنت کر کے بچوں کو پالا ہے تو وہ بہت متاثر ہوتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ اس رات زید حسن کو ہارٹ ایکٹ نہ ہوتا اور وہ میرے ماتھے پر طلاق دے دیتا تو کیا آج میں اپنی بچیوں کی اتنے اچھے طریقے سے پرورش کر سکتی تھی؟ ان کو اتنی آسائشیں اور سہولتیں دے سکتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ طلاق کی صورت میں میں

ماہنامہ سرگزشت

خالی ہاتھ زید حسن کے گھر سے بچیوں کو لے کر نکلتی اور شاہ بہت محنت کے بعد بھی ان کو اس مقام تک نہ پہنچا سکتی اور ان کی شادیاں اتنے اچھے طریقے سے کر سکتی تھی۔

اگر میں طلاق یافتہ ہوتی تو میری بچیوں کے لیے آلے والے رشتے صرف یہی سن کر واپس چلے جاتے اور آج وہ اپنے گھروں میں خوش و خرم نہ ہوتیں۔ شاید یہی سوچ کر میں نے ایسبولینس کے لیے فوری کال نہیں کی تھی۔ میں سکون سے بیٹھی زید حسن کو دیکھتی رہی جس کا چہرہ پسینے میں بھگ رہا تھا اور اس کی سانس رک کر چلنے لگی تھی۔ جب تک وہ ہوش میں رہا مجھ سے الٹا کرتا رہا کہ میں ایسبولینس کے لیے کال کروں یا کسی پڑوسی کو بلا لاؤں جو اسے اسپتال لے جائے جہاں اس کی جان بچ جائے۔ میں اس کی التجائیں یوں سنتی رہی جیسے آج تک میری فریادیں سننا آیا تھا، بے حسی اور پتھر پن کے ساتھ۔ آج میں اس کے لیے بے جس اور پتھر ہو گئی تھی۔ جب وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کی نبض بھی تقریباً ڈوب گئی تو میں نے ایڈمی کی ایسبولینس کے لیے کال کیا۔ دس منٹ میں ایسبولینس آئی اور زید حسن کو کارڈیو پمپل کیا لیکن وہ راستے میں دم توڑ چکا تھا۔ اسپتال میں ڈاکٹرز نے ریکی کارروائیاں کیں اور اس کی موت کا اعلان کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ میں نے اس کی موت کا سن کر خوشی محسوس کی تھی اور اس وقت میرا خیال تھا کہ آئندہ بھی اس معاملے میں ضمیر مجھے تنگ نہیں کرے گا۔

لیکن یہ میرا خیال تھا، جب سارے کام نمٹا کر میں رات سونے کے لیے لیٹی تو یہ سوال اکثر میرے سامنے آکھڑا ہوتا کہ میں نے زید حسن کو قتل کیا ہے؟ کیا میں اس کی قاتل ہوں؟ بے شک وہ ہارٹ ایکٹ سے مرا تھا لیکن میں نے طبی امداد کے لیے جان بوجھ کر تاخیر کی تھی اس لیے میں اس کی موت کی ذمے دار تھی۔ میں خود کو بہلاتی تھی کہ وہ شخص اسی قاتل تھا۔ اس نے میری اور میری بچیوں کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی اور اپنے اعمال کی بھینت پڑھا تھا۔ دل کا مرض اس کی عیاشیوں کی وجہ سے اسے لگا تھا۔ اس کے باوجود میرا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا تھا بالآخر میں خود کو مجرم سمجھتی تھی، ضمیر کی یہ خلش کم سہی لیکن کسی چھوٹی سوئی کی طرح مسلسل مجھے چبھتی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی جب ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میرے دل کا ایک وال بند ہو رہا ہے تو میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اس کا علاج نہیں کراؤں گی اور انتظار کروں گی کہ یہ مرض مجھے کہاں تک لے کر جاتا ہے۔ شاید یہ میرے اس جرم کا کفارہ بن جائے۔



دراصل عدنان نے سیکولر ازم کے مفہوم کو چلک دار بناتے ہوئے مذہبی باندیوں کو اٹھانے کی کوششوں کا آغاز کیا تھا اور جبر کے خاتمے کی کوششیں کی تھیں۔ بوڑھا تاجر بھی ایک مذہبی آدمی تھا۔ اندھا کیا جا ہے، دوا نکھیں... بس وہ عدنان کا حامی بن گیا لیکن عسکری حلقے وزیر اعظم سے سخت ناراض تھے۔ 1960ء میں فوج نے بغاوت کر دی۔ پھر خون بہا، پھر لاشیں گریں اور انقلاب نو کی بنیاد پڑی۔

☆☆☆

اس گرم صبح ریڈیو دیر تک خاموش رہا اور مضطرب بوڑھا اپنے کمرے میں ٹھہلا رہا۔ اُس کے باپ نے بھی دفتر جانے سے اجتناب برتا اور بچوں کو باہر گلی میں کھیلنے سے منع کر دیا گیا کیونکہ فوج اقتدار پر قبضہ کر چکی تھی۔ ”ہم نے ترکی کے دشمنوں کو گرفتار کر لیا ہے!“ طویل خاموشی کے بعد جب ریڈیو کی نشریات شروع ہوئیں تو یہ پہلا جملہ تھا جو استنبول کے پاسیوں کی سماعتوں سے نکرایا۔ ”اوہ خدایا!“ بوڑھے کی بیوی نے کہا۔ بوڑھا خاموش رہا۔

گھر میں سکوت طاری تھا۔ وہ سب خوف زدہ تھے۔ ”یہ عدنان میندرلیس کو قتل کر دیں گے۔“ دوپہر کے وقت بوڑھے کی بھرائی ہوئی آواز نے کونسی کا سکوت توڑا۔ جلد یہ اطلاع بوڑھے تک پہنچ گئی کہ استنبول کے قرب و جوار سے خامے افراؤ گرفتار کیے گئے ہیں۔ وہ جس زدہ یا سیت سے بھرپور دن تھا۔ مایوسی نے ہر ایک کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

چند دنوں بعد بوڑھے کی پیشگوئی نے حقیقت کا روپ اختیار کر لیا۔ عدنان اور اس کے ساتھیوں کو غدار قرار دیتے ہوئے تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ جب پھانسی کی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی بوڑھے نے آہ بھرتے ہوئے کہا ”یہاں سچ بولنے کی ممانعت ہے۔ ان درندوں کے سامنے سچ بولنا گناہ ہے۔“ ”لیکن آپ تو ہمیں ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کرتے ہیں؟“ کم سن اور خان بول اٹھا۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ غلطی کر بیٹھا ہے، کیونکہ کمرے میں اچانک گہرا سکوت اور یا سیت چھا گئی تھی۔

”چلو بھاگو یہاں سے!“ دادی نے اسے ڈانٹا اور وہ ان کے کمرے سے بھاگ نکلا۔ اس روز اس نے دادی کا اچھا بھلا جس میں وہ مزید خونخوار، مزید بوڑھی نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

ملک میں اتار ترک کے نظریات کی تجدید کے لیے زور و شور سے کام جاری تھا۔ حالات بدلنے کے دعویٰ کیے جا رہے تھے جن میں سے زیادہ تر جھوٹ پر مبنی تھے تاہم اور خان حقیقتاً بدل رہا تھا جس کی وجہ اُس کے تایا اٹکل آفندی کی اچانک استنبول آمد تھی۔ اٹکل آفندی نے کئی برس قبل روزگار کی تلاش میں ترکی سے کوچ کیا تھا۔ کہہ کر تو یہ گئے تھے کہ بیرون ملک جا کر خاندان کے استحکام کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں گے، مگر جلد اُن کے خطوں کی آمد مسلسل کھو بیٹھی۔ چند برسوں بعد پتا چلا کہ انہوں نے باہر بیاہر چالیا ہے۔

اور خان کے خاندان والے تو انہیں بکسر بھول چکے تھے لیکن ایک روز وہ اپنی خورد بیوی اور اپنی بیٹی یا سمین کے ساتھ اچانک وار دھو گئے اور سب حیران رہ گئے۔ گوری چٹی یا سمین جلد ہی گھر کے بچوں میں مقبول ہو گئی۔ وہ تھوڑی تک چڑھی تھی جس کی وجہ سے ابتدا میں اور خان کا اس سے جھگڑا بھی ہوا لیکن جلد ہی وہ آپس میں مکمل مل گئے۔ اب وہ دونوں گھنٹوں باغ میں کھیلتے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے، درختوں پر چڑھتے، قہقہے لگاتے۔ اور سوکیدا اپنے چھوٹے بھائی اور اس کی نئے دوست کو دور بیٹھا ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے دیکھتا رہتا۔

اور خان کو بچپن میں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ غربت بھی کوئی چیز ہے۔ اس کے پاس تمام سہولیات تھیں پھر ایک روز اُس کے بابا کی نئی کار ایک پُرانی خستہ حال بستی میں داخل ہوئی۔ تب اس نے پہلی بار پسماندگی کو انتہائی قریب سے دیکھا۔ پہلے پہلے مناظر نے اُس کے ذہن پر اُمت نقوش چھوڑے۔ دماغ میں سوال کلبلانے لگا ”میں ان بچوں سے کیوں کر مختلف ہوں؟“

اس نے بابا سے بھی پوچھا لیکن باپ کا رو باری معاملات میں ایسا الجھا تھا کہ اُس کی جانب توجہ نہیں دے سکا۔ بعد میں اُس نے یا سمین کے سامنے یہ سوال رکھا تو اُس نے کانڈھے اچکا کر کہا ”وہ غریب ہیں، اور ہم امیر!“ ”کیا مطلب؟“ اور خان امیر غریب کی تفریق سے لاعلم تھا۔

”ہاں، ہمارے پاس پیسے ہیں، ان کے پاس نہیں لیکن ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔“ اس کی نئی آنکھوں میں معصومیت تھی۔

ایک برس بعد اٹکل آفندی نے اپنے باپ سے لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ اُس وقت تک اور خان کو قطعی

اندازہ نہیں تھا کہ وہ یا سمین سے محبت کرنے لگا ہے۔ یا سمین سے جدائی کے بعد تنہائی نے اسے آن گھیرا۔ کئی دنوں تک اس نے رنگوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس دوران سوکیدا خاموشی سے اُس کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے اور خان کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اور خان خود بدلتے ہوئے حالات کا ادراک کرے اور دھیرے دھیرے اُسے واقعی احساس ہونے لگا تھا کہ گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ”لوگ خاموش ہوتے جا رہے ہیں۔ سب ایک دوسرے سے کھینچے کھینچے سے رہتے ہیں۔“ وہ خود سے کہا کرتا تھا۔

اور پھر ایک روز یہ عقدہ بھی کھل گیا۔ دراصل گھر میں پیدا ہونے والے تناؤ کا سبب اٹکل آفندی تھے جنہوں نے جائداد میں اپنے حصے کا تقاضا کر دیا تھا۔

اُس دوپہر اُس کے ماں باپ اونچی آواز میں بحث کر رہے تھے اور وہ پاس ہی کھڑا ہے۔ ”آفندی چاہتا ہے کہ اُسے اس کا حصہ دے دیا جائے۔ جائداد فروخت کرنی پڑے گی۔“ مسلسل یا سر پاک اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

”یہ کس طرح ممکن ہے؟ ہمارے بچے ہیں۔ مشترکہ گھر، مشترکہ کاروبار ہے۔ ہم کہاں جائیں گے؟“ وہ چلائی اور اُس کا حسین چہرہ بڑ گیا۔

اس روز اور خان کو اندازہ ہوا کہ اس کا خاندان اتنا امیر بھی نہیں، جتنا وہ خود کو سمجھتا تھا۔ بچوں کو وہ اس بابت سوچتا رہا، پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسے لگنے لگا کہ وہ اپنے پیارے گھر کو جلد کھو دے گا۔

چند روز بعد اُس کے ذور کے چچا جو گزشتہ کئی برسوں سے اوپری منزل میں ٹھہرے ہوئے تھے کوٹھی چھوڑ گئے اور وہ حصہ کرائے پر چڑھا دیا گیا۔

☆☆☆

اگر مطالعہ ایک ”مرض“ ہے تو یہ مرض اُسے اپنے بابا سے لگا!

وہ اپنے باپ کے قدموں کا تعاقب کرتے ہوئے کتب خانے میں داخل ہو جاتا جہاں کتابوں کی نو اس کے تھنوں سے ٹکراتی۔ گوکہ اُس وقت اُسے کتابوں کی اہمیت کا ادراک نہیں تھا تاہم وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ پڑھنے لکھنے والے بڑے قابل لوگ ہوتے ہیں۔

کتب خانے میں پندرہ سو سے زائد کتابیں تھیں۔ ایک حصہ مذہبی کتابوں کے لیے وقف تھا، ایک ادبی کتابوں کے

لیے۔ ملکی وغیر ملکی ادب کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یا سمین کی جدائی کے بعد جس درونے اور خان کو جکڑا تھا، مطالعے کے طفیل اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اور پھر ایک روز اس پر انکشاف ہوا کہ اس کا شفیق بابا نہ صرف ایک سنجیدہ قاری ہے، بلکہ ایک اچھا لکھاری بھی ہے۔

”آپ لکھتے بھی ہیں؟“ اس نے حیرت کے ساتھ اپنے باپ سے دریافت کیا جو کتب خانے میں بیٹھا ایک ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔

”اوہ، ہاں!“ وہ مسکرایا۔ ”ادھر آؤ۔“ وہ اپنے بیٹے کو اپنے نوٹس دکھانے لگا۔

”اوہ، یہ تو فرانس میں آپ کے قیام کے زمانے کی یادیں ہیں!“ ڈائری کی ورق گردانی کرنے کے بعد اور خان نے کہا۔

”ہاں!“ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اُس کا بیٹا اُس کا پہلا قاری تھا جس کی آنکھوں میں اپنے بابا کی تحریریں پڑھنے کی قوی خواہش نظر آتی تھی۔ ایسی خواہش جسے اُس کا باپ اپنے بھائیوں، اپنے دوستوں کی آنکھوں میں کبھی نہیں دیکھ سکا۔

اس ملاقات کے بعد وہ ہر اتوار اور خان کے لیے چاکلیٹ لانے لگا۔ غالباً یہ اپنے پہلے قاری کو لبھانے کی کوشش تھی۔

بابا کی ڈائری پڑھتے پڑھتے ایک روز اور خان کے اندر سویا ادیب جاگ اٹھا۔ وہ میز کے سامنے قلم اور دودات لے کر بیٹھ گیا۔ یہ سفر اُسے نئی دنیا میں لے گیا۔

جو پہلا خیال ذہن میں کوندا وہ اپنی شناخت سے متعلق تھا۔ اُسے یاد تھا، چند ماہ قبل جب وہ ایک غریب بستی میں داخل ہوا تھا تو وہاں پچھلے پرانے کپڑوں میں ملبوس بچوں کو دیکھ کر اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے!

اب اور خان ورق سیاہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا۔ ٹھیک ان لمحات میں جب وہ سر جھکائے کچھ لکھ رہا تھا، کوٹھی کے سامنے سے گزرتا ایک بوڑھا شخص ٹھٹک گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر کوٹھی کی جانب دیکھا۔ نگاہ کھڑکی پر جا ٹھہری جہاں وہ گہری سوچ میں مستغرق ایک معصوم چہرہ دیکھ سکتا تھا۔

اُس نے نیچے کو پوچھا۔ ”میری پیشگوئی کبھی غلط ثابت نہیں ہوتی!“ بوڑھا نجومی دل ہی دل میں مسکرایا اور قدرے بلند آواز میں بولا۔ اس کی

آواز پہنچے تک پہنچی تو اس نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا۔

☆☆☆

اور خان نے رابرٹ کالج سے ابتدائی تعلیم حاصل کی جو استنبول کا سب سے بڑا، قدیم اور مہنگا نجی اسکول تصور کیا جاتا تھا۔ بھاری فیس کے باوجود اور خان کے باپ نے اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے اسی ادارے کا چناؤ کیا تھا۔ یہاں قدم رکھنے کے بعد وہ اپنے وسیع مطالعے اور رنگوں کے استعمال میں مہارت کے طفیل جلد ہی دیگر طالب علموں میں مقبول ہو گیا، خصوصاً لڑکیاں تو اس کی دیوانی تھیں۔

”اور خان، کیا تم میرا اچھا بنا دو گے؟“ ایک دوشیزہ سوال کرتی۔ ”ڈیز، مجھے تاریخ کے مضمون میں شدید پریشانی کا سامنا ہے، ذرا میری مدد کر دو، پلیز!“ نیلی آنکھوں والی دوسری لڑکی درخواست کرتی۔

شریلے اور خان نے خود کو ان بھیلیوں سے دور ہی رکھا۔ دراصل ان ہی دنوں وہ تازہ تازہ کسی کے عشق میں مبتلا ہوا تھا اور یہ تھا اس کا پیارا شہر استنبول!

اسے اپنے قدیم شہر کی گلیاں اچھی لگنے لگی تھیں۔ وہ گھنٹوں آوارہ گردی کرتا لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے چل نہیں سکا۔ جلد ہی وہ گھر اور کالج تک محدود ہو گیا۔ دراصل ان دنوں ملک کے حالات انتہائی مخدوش تھے۔ سیاسی صورت حال ابتر تھی۔ فوج نے اقتدار سیاست دانوں کو ختم کر دیا تھا لیکن جگہ جگہ سیاسی حکومت ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں ناکام رہی جس کے لیے وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں فوج کی آمرانہ پالیسیوں کو ڈتے دار ٹھہراتی تھی۔ دوسری جانب ملک کے ان حصوں میں جہاں کروڑ آباد تھے بغاوت زور پکڑتی جا رہی تھی۔ استنبول میں بھی اندیشوں نے چہرے سیاہ کر رکھے تھے۔

”کچھ ہونے والا ہے!“ لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہتے پھر چوتک کر ادھر ادھر دیکھتے کہ کہیں کسی نے سن تو نہیں لیا۔

ان ہی دنوں اس نے عجیب و غریب خواب دیکھنے شروع کیے، جن میں سے چند تو بے حد خوفناک ہوتے۔ وہ صبح بیدار ہونے کے بعد خوابوں کو الفاظ کی صورت ڈائری میں قلم بند کرنے کا ارادہ باندھتا لیکن ناکام رہتا۔ وہ بے رنگ خوابوں کو اپنی پینٹنگز میں اتارنے کی بھی کوشش کرتا لیکن یہاں بھی بات نہیں بنتی۔

اسکول ہی کے زمانے میں اس کی دوستی ظلیل سے ہوئی، ایسی دوستی جس کی جلد مثالیں دی جانے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کے راز دار تھے اور بہترین مشیر تھے۔ دونوں اکثر

ساتھ دیکھے جاتے۔ ظلیل نے بھی اس کی دیکھا دیکھی مصوری کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہاں، مطالعے کے میدان میں وہ اس کا ساتھ دے سکتا تھا اور ساتھ دیا بھی۔

آنے والے برسوں میں ظلیل اور خان کی تحریروں کا پہلا قاری، پہلا ناقد بننے والا تھا مگر اس وقت دونوں ہی کو اس کا ادراک نہیں تھا۔

پھر ایک روز ظلیل ایک اچھوتے مشورے کے ساتھ وارد ہوا۔ ”ہمیں آرکیٹیکٹ بننا چاہیے!“ اس مشورے نے اور خان کو تجسس سے بھر دیا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ ان دنوں ظلیل کا گھر زیر تعمیر تھا اور وہ گھنٹوں ٹھیکے دار کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ اس نے بجری، اینٹ اور سینٹ کے ملاپ سے عمارت بننے دیکھی تو سوچا کہ اسے اور اس کے دوست کو یہی پیشہ اپنانا چاہیے۔

جلد ہی دونوں دوستوں نے اعلان کر دیا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ مستقبل میں آرکیٹیکٹ ہی بنیں گے۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے استنبول ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لے لیا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ظلیل کو گھریلو حالات کی وجہ سے یونیورسٹی چھوڑنی پڑی جس کے بعد اور خان بھی آرکیٹیکٹ بننے میں دلچسپی کھو بیٹھا۔

”میں بے مقصدیت اور بے سمتی کا شکار ہو گیا ہوں!“ اس نے مایوسی سے خود سے کہا۔

وقت کے دھارے میں بہتا اور خان بوڑھے نجوی، اس کی پیشگوئی کو پوری طرح بھلا چکا تھا۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ قسمت اپنا فیصلہ کر چکی ہے۔

☆☆☆

”ہمارے سیاست دان فوجی آمروں کی توسیع کے سوا کچھ نہیں!“

سرخ نے اسے چونکا دیا۔ یہ ایک معروف باغی صحافی کا انٹرویو تھا جس نے حکومت وقت پر شدید تنقید کی تھی۔ اس کی جرات اظہار نے اور خان کو بہت متاثر کیا۔ چند روز بعد اسے اطلاع ملی کہ اس باغی صحافی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

”کہیں اسے بھی قتل نہ کر دیا جائے!“ اس کے ذہن میں عدنان میندریس کو تختہ دار پر لٹکانے کی یاد تازہ تھی۔

خوش قسمتی سے وہ صحافی اپنی جان سے نہیں گیا لیکن اسے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ جس اخبار میں اس کا انٹرویو شائع ہوا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔ تب اور خان کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ملک میں اظہار کی آزادی نہیں۔

یہی سوچے سوچے وہ ایک روز ایک سرسبز پارک میں جا

بیٹھا۔ وہی پارک جہاں برسوں قبل اپنے دادا کی معیت میں وہ ایک پراسرار مستقبل بین سے ملا تھا۔

خاصے غور و فکر کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا ”میں صحافی بنوں گا!“

یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جو مستقبل میں اسے ناول نگاری کی جانب لے گیا۔

☆☆☆

”آمرانہ پالیسیاں ترک کرو، غریبوں کو ان کا حق دو!“ ہر طرف سرخ جھنڈے، جوشیلے لوجوان، احتجاجی ریلیاں!

ترقی پسند فکر نے حکومتی گرفت کو کمزور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ملک کے دیگر علاقوں کی طرح استنبول میں بھی مارکی سوچ کے حامل لوجوان سڑکوں پر نکل آئے تھے جن کے ساتھ قوم پرست اور مذہبی جماعتیں بھی کھڑی ہو گئیں۔ حالات بگڑنے لگے۔

گوکہ اسے بھی مارکی فکر نے متاثر کیا تھا اور وہ چپ کر لینن کی کتابیں پڑھا کرتا تھا لیکن کبھی خود کو کبھی طور پر اس سوچ سے منسلک نہیں کر سکا۔ یونیورسٹی ان دنوں اکثر بند رہا کرتی تھی اور اور خان اپنے کمرے میں بیٹھ کر رنگوں سے کھیلا کرتا تھا۔

سات برس کی عمر میں رنگوں کے عشق میں گرفتار ہونے والا اور خان تاحال خود کو دریافت نہیں کر سکا تھا۔ سب ہوتے ہوئے بھی کوئی کمی تھی۔ عجیب سی بے گلی تھی۔

اکثر اس کا باپ کمرے میں جھانکتا، اسے کینوس کے سامنے کھڑا دیکھتا اور خاموشی سے آگے بڑھ جاتا۔

اعتماد کے ان ہی دنوں میں ایک روز، نہ جانے کتنے برسوں بعد راہ چلتے اچانک اس کی ملاقات اپنی چچا زاد یا سمین سے ہوئی۔

بازار میں جب ان کا سامنا ہوا، وہ گھبرا گیا کیونکہ اب وہ پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی، تاہم جلد ہی خود کو نارمل کرتے ہوئے اس سے گفتگو کرنے لگا۔

اس ملاقات سے قبل وہ سوچا کرتا تھا کہ یا سمین کی یاد آج بھی اس کے دل میں ہے لیکن اپنی پہلی محبت سے برسوں بعد وہ بدھونے کے تجربے نے اسے احساس دلایا کہ وہ اب اس کے عمر سے نکل چکا ہے۔ اب تو اسے فقط ایک شے سے محبت ہے اور وہ ہے استنبول!

گھر لوٹنے کے بعد اس نے یا سمین کا اچھا بنایا اور یہ اریڈز اک اسے روانہ کر دیا جس پر اس نے لکھا ”ہماری دوستی

کا پہلا اور آخری ٹھکانہ!“

اس دن 22 سالہ اور خان نے مصوری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ یہی وہ موقع تھا جب اس نے صحافی بننے کا ارادہ ختم کر تھی فیصلہ کیا کہ وہ حقیقتاً ایک ناول نگار ہے۔

”اس شہر کی کہانیاں بیان کرنا ہی میری زندگی ہے، میرا پیشہ ہے۔“ اس نے جوش سے لرزتے ہوئے نعرہ لگایا۔

اگر اس وقت بوڑھا نجوی وہاں ہوتا تو اس پر جوش لوجوان کو دیکھ کر ضرور مسکرا دیتا کیونکہ وہ تو یہ پہلے ہی سے جانتا تھا!

اور خان کو اپنے ناول کے لیے ایک مضبوط کردار، متاثر کن پلاٹ کی ضرورت تھی۔ وہ ایک ایسی صورت حال تخلیق کرنا چاہتا تھا جو قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ سکے۔

غور و فکر کے بعد اس نے اپنے بھائی سوکید کی شخصیت کا چناؤ کیا۔ اسے سامنے رکھتے ہوئے لکھنا شروع کیا اور کہانی آگے بڑھنے لگی۔ مستقبل میں سوکید کا کردار اس کے کئی ناولز میں نظر آیا۔

ناول شروع کرنے سے قبل اس نے سوکید کو بھی مطلع کیا ”تم میرے ناول کا ایک اہم کردار ہو!“

جواب میں سوکید مسکرایا۔ مستقبل میں سوکید انکس کے مضمون پر تحقیق کر کے اپنی شناخت بنانے والا تھا لیکن اس وقت وہ فقط اور خان کے ناول کا ایک کردار تھا۔

لوجوان اور خان نے اپنے بچپن کی کہانی، اس وقت کے حالات اور گھریلو ماحول کو برتتے ہوئے اپنے پہلے ناول کا آغاز کر دیا اور کرب کے اتھاہ سمندر میں اتر گیا۔

☆☆☆

”ناول بے کار ہے... اسے چھاپنا گھانے کا سودا ہوگا... تم کبھی بڑے لکھاری نہیں بن سکتے... تم میں تجربے کی کمی ہے...“

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں نہرے جملوں نے اسے توڑ دیا تھا۔ وہ گزشتہ چار برس سے اپنے پہلے ناول کی اشاعت کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

اس نے 1974ء میں اپنی مادری زبان میں لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس وقت عمر ہی کیا تھی، فقط 22 سال جو ادب کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے، زندگی کی تنہیم کے لیے کوئی خاص عمر نہیں لیکن وہ لکھتے ہوئے اپنی تحریر میں کئی طور پر شامل ہو جاتا تھا۔ یہی اس کی انفرادیت تھی۔

”اندھیرا اُجالا“ (Darkness and Light) اس کی پہلی کاوش تھی اور ہر لوجوان ادیب کی طرح وہ اسے

شاہکار تصور کرتا تھا۔ اور وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کہ اس کتاب کے مسودے کو 1979ء میں غیر مطبوعہ ناولوں کے مقابلے میں قومی ایوارڈ سے نوازا جا چکا تھا لیکن اب اسے کوئی چھاپنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ ناول استنبول میں مقیم ایک امیر خاندان کی تین نسلوں کی کہانی بیان کرتا تھا جو حقیقتاً اس کی اپنی کہانی تھی۔

ناکامیوں کے اُن دنوں میں وہ اکثر خوابوں میں خود کو ایک ایسے شخص کے طور پر دیکھتا جو رائٹنگ ڈیسک کے سامنے بیٹھا ہے اور گھنٹوں گزر جانے کے باوجود لکھنے سے قاصر ہے۔ یہ خواب اسے انسردہ کر دیتے۔

چند دوستوں نے سنجیدہ ادب سے دامن چھڑا کر کمرشل رائٹنگ کی جانب آنے کا بھی مشورہ دیا جہاں شناخت بنانا زیادہ آسان تھا، لیکن اس نے انکار کر دیا۔

”میں صبر، خوشی، احتیاط اور یقین کے ساتھ لکھتا ہوں اور جو کچھ لکھتا ہوں، اس پر کامل یقین رکھتا ہوں۔“ وہ جواب دیتا۔

”پھر تو کامیابی کا حصول آسان ثابت نہیں ہوگا!“ ناصح منہ بنا کر کہتے۔

”میں جانتا ہوں۔“ وہ جواب دیتا۔

اُس وقت تک اور خان کے ”دے دے“ کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ خاندان بکھر گیا تھا، کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا اور معاشی مسائل کا غریب منہ کھولے کھڑا تھا۔

اُن کلچرل دنوں میں دلکش ایلن اُس کی غم گسار بنی رہی۔

ایلن اُس کی سب سے گہری دوست تھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھنے والی تہذیب یافتہ لڑکی تھی، اس پر مستزاد بلا کی حسین تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایسی لڑکی تھی جس کے لیے اچھے رشتوں کی کمی نہیں تھی لیکن وہ لکھنے کے عشق میں مبتلا ایک نوجوان کو دل دے بیٹھی۔ حالانکہ سہیلیوں نے کئی بار سبھایا ”اس وجہ سے نوجوان کا مستقبل تاریک ہے، اسے لکھنے لکھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا۔“

لیکن اس نے بھی ان تبصروں کو اہمیت نہیں دی، ہمیشہ اور خان کی دل جوئی کرتی رہی۔

اور خان اور ایلن کی دوستی کا بنیادی سبب ان کے یکساں خیالات اور یکساں طرز پرورش تھی۔ ایلن سے پہلی ملاقات کی یاد آج بھی اور خان کے ذہن پر نقش تھی۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا، کس طرح اُس دو شیزہ نے اپنے تہذیبی اطوار سے نورانی اُسے گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہ تو اُسے بعد میں پتا چلا کہ ایلن نے بھی اُسی اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی

جس کا وہ طالب علم رہا تھا۔

بے روزگاری اور نا کامیوں ہی کے زمانے میں ایک روز اس نے ایلن کو روایتی ترک مردوں کے انداز میں شادی کی پیشکش کر دی تھی۔

”ہمیں سانس لینے کے لیے یکساں فضا میسر تھی۔ ہم ایک سے ماحول میں پروان چڑھے۔ تم بھی ان ہی سڑکوں پر گھومتی رہیں، جس پر میں نے آوارہ گردی کی، سواب میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ۔ کیا تمہیں میرا ساتھ قبول ہے۔“

”ہاں، مجھے قبول ہے!“ پُر اعتماد ایلن نے ازراہ مذاق شرماتے ہوئے جواب دیا۔

”زبردست!“ نوجوان ادیب نے خوشی سے ناچنا شروع کر دیا۔

حالانکہ وہ دن جشن منانے کے لیے قطعی سازگار نہیں تھے۔ 1980ء میں فوج نے ایک بار پھر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہزاروں افراد کو مارشل لاء ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ کئی کو تخریب کاری کا مجرم قرار دے کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ کئی کو موت کا حق دار ٹھہرایا گیا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اور خان خوش تھا کہ ایلن نے ”ہاں“ کر دی ہے۔

جلد اُسے ایک اور خوش خبری ملی۔ ایک پبلشر نے اُس کا پہلا ناول چھاپنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ نجوی کی پیشگوئی حقیقت کا روپ دھار رہی تھی!

گوکہ Cevdet Bey and Sons کے عنوان سے شائع ہونے والی اُس کی کتاب پر چند حلقوں نے شدید تنقید کرتے ہوئے اسے روایتی ترک ادب کو سیوا ڈالنے کی کوشش قرار دیا لیکن سنجیدہ ناقدین نے اُسے سراہا۔

اُسی برس اُس نے اپنی محبوبہ سے شادی کر لی۔ جس روز شادی کی تقریب تھی، شہر کے حالات بڑے ہی غیر متوقع اور ڈرامائی انداز میں بگڑ گئے یہاں تک کے اس کے اہل خانہ تقریب ملتوی کرنے کے بارے میں سوچنے لگے لیکن کہتے ہیں ناں جہاں چاہ، وہاں راہ! اس کے بھائی سوکید کا ایک دوست پولیس میں تھا جس نے انھیں بھرپور تحفظ فراہم کرنے کا یقین دلایا اور شہر کے مخدوش حالات کے باوجود برات گئی اور دہن کو لے آئی۔

شادی نے تو جیسے اس کی قسمت ہی بدل دی۔ اگلے ہی برس اسے اپنے ناول کے لیے ”کمال ایوارڈ“ جیسے اہم قومی اعزاز سے نوازا گیا جو ایک بڑی کامیابی تھی۔ اُسی زمانے میں اس نے اپنے دوسرے ناول ”خاموش گھر“ (The Silent

House) پر کام شروع کیا۔

اس کے پاس لکھنے کے علاوہ کوئی ہنر نہیں تھا اور قلم مردوری سے حاصل ہونی والی آمدنی پر گزر بسر ممکن نہیں تھا لیکن سہولت یہ تھی کہ اُس کی بیوی بھی بطور مورخ خود کو منوانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی اور اس کوشش کے طفیل چار پیسے ہاتھ آ جاتے تھے۔

جدوجہد کے اُن ہی دنوں ”خاموش گھر“ منظر عام پر آیا جو ایک ہی خاندان کے تین افراد کی کہانی بیان کرتا تھا جو اپنی دادی سے ملنے استنبول کے نزدیک آباد ایک چھوٹے سے قصبے کا رخ کرتے ہیں۔

ردِ عمل حیران کن رہا!

”تاریخ کو اچھوتے اسلوب اور منفرد تکنیک میں بیان کر کے اور خان نے کمال کر دیا!“ ایک سینئر نقاد نے تبصرہ کیا۔

اور یہ سچ تھا، واقعی اُس نے ناول میں تاریخ نویسی کو نئی بلندیوں سے ہم کنار کر دیا تھا۔

جب ناول کو قبول عام کی سند حاصل ہو گئی، اُسے ایوارڈز سے نوازا گیا، اور خان نے جشن کا انتظام کیا جس میں اپنے دوستوں کے علاوہ اُن سخت دل پہنچ سڑوں کو بھی مدعو کیا جنہوں نے اس کا پہلا ناول چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ موقع کے عین مطابق اُن میں سے کوئی بھی تقریب میں شریک نہیں ہوا۔

”تمہیں اس ناول کا آئینہ کیسے سوچا؟“ ایک ہم عصر ادیب نے دعوت والے روز دریافت کیا۔

”اپنی پیاری دادی سے!“ اور خان مسکرایا۔

”کیا مطلب؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”وہ اکثر نیند میں بوڑھاپا کرتی تھیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ عالم غنودگی میں بھی اُن کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ انتہائی بامعنی ہوتے۔ سو مجھے خیال آیا کہ ایسا ناول لکھا جائے جس میں نیند اور بیداری کے درمیان کے تعلق کو دریافت کیا جائے۔“

”شان دار!“ ہم عصر ادیب نے اُس کا کام دعا تجتبیایا۔

جلد ہی اُسے بڑی ادبی تقریبات میں مدعو کیا جانے لگا۔ لوگ اُس سے آٹوگراف لینے لگا۔ ”خاموش گھر“ کے قارئین میں نوجوانوں کی اکثریت تھی جن میں لڑکیاں بھی تھیں۔ چند لڑکیاں تو اُس کی دجاہت کی وجہ سے اُس کے عشق میں مبتلا ہو گئیں۔

ایسی ہی ایک حسینہ نے اُسے شادی کی بھی پیشکش کر دی لیکن جب اُسے پتا چلا کہ اُس کا محبوب معصوف شادی شدہ ہے

تو وہ بچھڑ گئی۔

”وہ کون خوش نصیب ہے؟“ اس نے یاس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”وہ میرے گاؤں ہی کی ایک لڑکی ہے، بس والدین نے بچپن ہی میں رشتہ طے کر دیا تھا۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

بعد میں جب اس نے یہ قصہ ایلن کو سنایا وہ ہنس ہنس کر دہری ہو گئی۔

☆☆☆

ایک جانب متاثر تھی، دوسری جانب تنقید! اور خان کے لیے حالات بگڑ رہے تھے کیونکہ جوں جوں وہ شہرت حاصل کرتا جا رہا تھا، حامدین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

اب اس پر کھلے الفاظ میں یہ الزام عائد کیا جانے لگا تھا کہ اس کی تحریروں میں ہم عصر ادیبوں کا رنگ اتنا چڑھ گیا ہے کہ وہ ادبی تخلیقات کے بجائے سرزد لگتی ہیں۔ البتہ اُسے تنقید کی پروا نہیں تھی۔

اور خان کے مانند جلد ایلن کی قسمت بھی بدلنے والی تھی۔ جس روز اسے امریکا کی کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک کی اسکالر شپ ملی۔ میاں بیوی نے جشن منایا۔

”میں اپنے خواب کے بہت قریب ہوں جان!“ اُس نے فرط جذبات سے کانپتے ہوئے کہا۔

”ہاں، اور مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب رہو گی!“ اس نے اپنی بیوی کی حسین زلفوں میں پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”لیکن مجھے ایک بات کا ڈکھ ہے۔“ اچانک وہ اداس ہو گئی۔

”اور وہ کیا؟“ اور خان نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”مجھے تم سے دُور رہنا پڑے گا۔“ اس نے سسکی لی۔

”قطعاً نہیں!“ اور خان نے اپنی بیوی کو بانہوں میں بھر لیا۔ ”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ جہاں تم ہو گی میں بھی وہاں ہوں گا۔“ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

اور خان کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ ایلن کے جانے کے چند روز بعد جب اور خان کرسی پر بیٹھا میز پر بکھرے کاغذات کو گھور رہا تھا، فون بجا اور اُسے ایک انوکھی خوشخبری ملی۔

اُسے کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں وزیٹنگ اسکالر کی ملازمت مل گئی تھی۔ اُسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اور خان نے فوراً اپنی بیوی کو فون ملایا۔ ”میں بھی آ رہا

ہوں جان!“

”کیا مطلب؟“ میلوں دور بیٹھی ایلن اُس کی بات سمجھ نہیں سکی۔ جب اس نے اپنی بیوی کو تفصیلات بتائیں، وہ حیران رہ گئی۔

☆☆☆

پراسرار خواب اُس کے تعاقب میں تھے۔

”آقا کون ہے، غلام کون؟ میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں، وہ کہاں ختم ہوتا ہے؟ میں وہ کیوں ہوں، جو میں ہوں؟“ تاریک خوابوں میں ایک بے چہرہ شخص اُس کا تعاقب کرتا، پیچیدہ سوالات کرتا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ اس وقت اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوتا۔

دھیرے دھیرے بیداری کی کیفیت میں بھی کوئی اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا ”آقا کون ہے، غلام کون؟“

چند دنوں تک اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد وہ کلی طور پر ان سرگوشیوں کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ انہوں نے ٹھوس سوالات کی شکل اختیار کر لی۔ ان ہی سوالات کا جواب وہ اپنے نئے ناول ”سفید قلعہ“ (The White Castle) میں ڈھونڈنے والا تھا۔

1985ء میں اورخان بھی نیویارک پہنچ گیا اپنی بیوی، اپنی محبوبہ کے پاس! اب ایک نئی دنیا اس کے سامنے تھی۔

نیویارک میں قدم رکھنے کے بعد جس پہلی چیز نے اُس کی توجہ مبذول کروائی، وہ وہاں کے زرخیز کتب خانے تھے جہاں وہ ٹھنڈوں بیٹھا مطالعہ کرتا رہتا۔ وہ عجیب گھر کا بھی رُخ کرتا جہاں وہ تاریخ کے ارتقائی سفر کا مشاہدہ کرتا۔

”امریکا کے کتب خانوں نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔“

ایک روز اُس نے کھانے کی میز پر اپنی بیوی سے کہا۔

”ہاں! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ یہ لائبریریاں میری سوکن ہیں۔“

اس جملے کے اختتام پر کھانے کی میز سیاں بیوی کے تہمتوں سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

اُس کا ناول ”سفید قلعہ“ (The White Castle) شائع ہو چکا تھا، جو ایک اطالوی اسکالر کی کہانی بیان کرتا تھا، ایسے اسکالر کی جو خلافت عثمانیہ کے دور میں قیدی بن کر ترکی آتا ہے۔ اس ناول کا ردِ عمل شاندار رہا تھا۔ جلد ہی اس نے عوام میں قبولیت حاصل کر لی جس کی اسے خوشی تھی لیکن اندر ہی اندر وہ مضطرب تھا۔

”مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے انصاف کرنے میں ناکام رہا۔“ اس نے ترکی میں مقیم خلیل کو خط لکھا۔ چند روز بعد جب خط کا جواب آیا تو اس کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔

دراصل ”سفید قلعہ“ نے ایک ترک مصنف نواد کریم کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس ناول میں اس کی کتاب (Istanbul in the Time of the Kanuni) سے پورے پورے پیرا گراف نقل کیے گئے ہیں۔ اس نے مختلف ادبی پلیٹ فورمز پر اس مسئلے کو بڑی شدت سے اٹھایا۔

ایسی ہی ایک تقریب میں خلیل بھی موجود تھا۔

جب نواد کریم تف اڑا رہا تھا خلیل نے ڈرتے ڈرتے کہا ”سر آپ بڑے آدمی ہیں، اورخان نو جوان ہے۔ وہ آپ سے متاثر ہے، اسی وجہ سے آپ کے کام سے استفادہ کیا۔“

”استفادہ؟“ وہ پھٹ پڑا۔ ”میاں، یہ سیدھا سیدھا سرقہ ہے! میں اس بد معاشی کو دیکھ لوں گا۔“

خلیل نے گہرا سانس لیا اور اپنے دل میں اورخان کو مخاطب کیا۔ ”دوست، انکل تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔“ خط میں اس نے اورخان کو تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ اورخان نے تنقید کے جواب میں خاموش رہنے کو ترجیح دی اور اپنے نئے ناول پر کام کرتا رہا۔

☆☆☆

”دبی گلیاں، دبی بازار، دبی لوگ... پیارے استنبول میں لوٹ آیا ہوں!“

استنبول کا عاشق چند برس امریکا میں گزارنے کے بعد واپس آ گیا تھا، تاہم وہ خالی ہاتھ نہیں تھا۔ ان برسوں میں اس نے جم کر دنیا بھر کے ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ خصوصاً روسی ادب نے تو اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ پھر امریکا میں قیام کی وجہ سے اُس کی مقبولیت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ ”سفید قلعہ“ کا Victoria Holbrook نامی ایک صاحب نے انگریزی میں ترجمہ بھی شروع کر دیا تھا۔

1990ء میں جب اس ناول کا ترجمہ امریکا اور برطانیہ میں شائع ہوا، جیسے جہلکے بج گیا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور مابعد جدیدیت کی تحریک کے تحت مشرق میں تخلیق کیے جانے والے چند بہترین ناولوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ ”نیویارک ٹائمز“ نے تو اپنے تبصرے میں پیشگوئی بھی کر دی۔ ”مشرقی ادب کے اُفق پر ایک نیا ستارہ نمودار ہو چکا ہے۔“

تبصرہ حقائق پر مبنی تھا کیونکہ جلد مغرب میں اورخان کے کام کو مزید پذیرائی ملنے والی تھی۔ دوسری جانب مغرب میں ”سفید قلعہ“ کی قبولیت نے فرید کریم کو چٹا پھر تاہم بنادیا تھا۔ وہ ہر محفل، ہر مجلس میں اب کھل کر اورخان پر تنقید کرنے لگا۔

اورخان کے پاس تنقید نگاروں پر توجہ دینے کے لیے وقت ہی کہاں تھا؟ وہ 1985ء میں اپنے ناول ”سیاہ کتاب“ (The Black Book) پر کام شروع کر چکا تھا جس کی تکمیل کے دوران اُس نے انوکھی اور ناقابلِ بیان مسرت کا تجربہ کیا تھا۔ ناول مکمل کرنے کے بعد اس نے خلیل کو خط لکھا:

”میری عمر 33 برس ہے۔ میں نیویارک میں مقیم ہوں اور اکثر خود سے اپنے بارے میں، اپنی تاریخ کے بارے میں انتہائی مشکل اور پیچیدہ سوالات کرتا ہوں۔ میں کتب خانوں میں تاریخ کھنگالتا ہوں۔ سڑکوں پر مشرقی اور مغربی ثقافتوں کے جداگانہ رنگ دیکھتا ہوں، ان کے ملاپ کے اشکال کا مشاہدہ کرتا اور ایک بڑا ناول لکھنے کے لیے خود کو تیار پاتا ہوں۔ یہ ناول سیاہ کتاب ہی ہے!“

یہ ناول واقعی اُس کی زندگی بدلنے والا تھا تاہم کامیابی مفت ہاتھ نہیں آتی۔ اس منصوبے کی تکمیل کا زمانہ بے قراری اور اضطراب سے بھرپور تھا۔ لکھنے کے دوران وہ ایک اندھے شخص کے مانند آگے بڑھتا رہا۔ کئی بار لگا کہ وہ ناول کا پلاٹ کھودے گا۔

ایلن کو اُس جیجان کا اندازہ تھا، جس میں اس کا شوہر جلا تھا جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کے درمیان چند جھگڑے بھی ہوئے لیکن جلد اس نے خود کو سنبھال لیا، البتہ دونوں کے درمیان سردمہری درآئی تھی جو شاید کئی روز قائم رہتی کہ ایک شب ایلن نے اپنے شوہر کو بستر کے کنارے بیٹھ کر آنسو بہاتے دیکھا اور حیران رہ گئی۔

”کیا ہوا جان؟“ اُس نے آگے بڑھ کر اورخان کو ہانپوں میں بھر لیا۔

”میرا... ناول... مکمل ہو گیا ہے!“ وہ ہچکیوں میں فطانتا ہی کہہ پایا۔

”مبارک ہوا!“ اس نے اورخان کا ہاتھ چوما۔

استنبول لوٹنے کے بعد اورخان نے دوستوں کو اس ناول کی تکمیل کی اضطراب بھری کہانی کئی بار تفصیلاً سنائی۔

یہ ناول ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتا تھا جس کی بیوی بے پناہ ہو جاتی ہے اور وہ اُس کی تلاش میں نکلتا ہے۔

1990ء میں شائع ہونے کے بعد اس نے کامیابی کے

ریکارڈ توڑ دیے۔ زرخیز اور پیچیدہ اسلوب نے اسے نو جوانوں میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول کا درجہ دلا گیا۔ فوراً ہی اس کے ترجمہ پر کام شروع ہو گیا اور وہ استنبول کی ادبی محافل کی جان بن گیا۔

”اب استنبول مجھے اور بھی پیارا لگنے لگا ہے!“ ایک روز اس نے خود سے کہا۔

☆☆☆

”تم باپ بننے والے ہو!“ جب ایلن نے اس کے کان میں سرگوشی کی، وہ مسرت کے ایک ایسے تجربے سے بھر گیا جسے لفظوں کا فسوں گر خود بھی الفاظ کی صورت بیان کرنے سے قاصر تھا۔

وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھا اور اب قدرت اسے ایک اور نعمت سے نوازنے والی تھی۔ گوکہ وہ مغربی فکر کا حامل ایک روايتی مسلمان تھا لیکن اس دن اورخان نے اپنے رب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔

1991ء میں اُس کے گھر ایک منہمی پری آگئی جس کا نام ”سیاہ کتاب“ کی ہیروئن کے نام پر ”رویہ“ رکھا گیا جس کے معنی خواب کے ہیں اور واقعی اورخان کے لیے تو یہ سب ایک خواب ہی تھا۔

☆☆☆

”قلم کا اسکرین پلے لکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے دوست؟“ جب اس سے یہ سوال ہوا، وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی قلم لکھنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ غور و فکر کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ یہ تجربہ بھی کرنا چاہیے۔

1992ء کا سال فلم کے اسکرپٹ پر کام کرتے گزرا جو ”خفیہ چہرے“ کے عنوان سے پردے پر پیش ہوئی اور بہت پسند کی گئی لیکن فلم کی کامیابی کے باوجود اورخان کو شدت سے یہ احساس ستانے لگا کہ قلم اُس کا میدان نہیں۔ اُس وقت تک ناول ”سیاہ کتاب“ کا انگریزی ترجمہ خاصی داد بخور چکا تھا۔

1995ء میں اس کا اگلا ناول ”نئی زندگی“ (New Life) مارکیٹ میں آیا اور ادبی سمندر میں تلاطم مچا گیا۔ اس ناول نے ترکی کی تاریخ میں سب سے تیزی سے فروخت ہونے والی کتاب کا درجہ حاصل کر لیا۔ دوسری جانب مغرب نے بھی اس پر کام شروع کر دیا۔

اب اورخان ترکی میں ایک معروف اور بارسوخ سماجی شخصیت کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔ ایک دن اس نے سوچا:

”ادب کی خدمت کافی نہیں، مجھے قلمی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا ہوگا!“

اس خیال کے ساتھ جب اُس نے غور و فکر شروع کیا تو احساس ہوا کہ اس کے ملک میں جمہوریت کا اُس طرز پر بھی اطلاق نہیں ہو سکا جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ آج بھی کروڑوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے، حلقہ بندی کی جاتی ہے۔ ”مجھے کروڑوں کے حق میں آواز اٹھانی ہوگی!“ اُس نے اپنی بیوی کے سامنے اعلان کر دیا۔

جب یہ اطلاع غلیل کو ملی، وہ دوڑا دوڑا اُس کے گھر آیا ”کیا بالکل ہو گئے ہو؟ ویسے ہی تم تنازعہ ہو، ایسے میں بہتر ہے کہ لکھنے لکھانے کا کام کرو۔ اس چکر میں مت پڑو!“

”میں حتمی فیصلہ کر چکا ہوں!“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”میرے بھائی، تمہیں نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے!“ غلیل نے کہا۔

”میں تیار ہوں!“ اس نے کہا۔ اس وقت اورخان کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کروڑوں کی حمایت کا فیصلہ آنے والے وقت میں اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔

جلد اورخان اُس ادبی گروہ کا حصہ بن گیا جو کروڑوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کے باعث تنازعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اورخان تو ویسے ہی تنازعات کا شکار تھا، اب لعن طعن کرنے والوں میں مزید اضافہ ہو گیا، دھمکیاں بھی ملنے لگیں لیکن اس نے حکومتی دباؤ کے سامنے جھکے سے انکار کر دیا۔

جب تنقید بڑھنے لگی تو غلیل نے ایک بار پھر متنبہ کیا ”سنجیدہ رہو، کہیں تمہارے لیے استنبول میں رہنا مشکل نہ ہو جائے!“

”مجھے اس شہر سے عشق ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے میں یہیں رہوں گا۔“ اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں وہ اپنے ناول ”میرا نام سرخ ہے“ My Name Is Red پر کام کر رہا تھا۔ اسراریت سے بھرپور اس ناول میں تاریخ کو اچھوتے اسلوب اور منفرد تکنیک سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ساتھ ہی سولہویں صدی کے اواخر میں مشرق اور مغرب کے درمیان بڑھتے تناؤ کی بھرپور منظر کشی کی گئی تھی۔

اشاعت کے بعد ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مغربی ماہرین نے پیشگوئی کر دی کہ ناول کا ترجمہ ہوتے ہی ادبی دنیا میں جھلمکے بچ جائے گا۔ یوں تو ماضی میں بھی اورخان کو قابل مترجم میسر آئے لیکن اس ناول کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کی ذمہ داری امریکا کی ڈیوکیو یونیورسٹی میں مطالعہ

ترکی کا مضمون پڑھانے والے Erdag Gökner نے اٹھائی۔

جس روز یہ خبر اخبارات کی زینت بنی استنبول کے ایک کافی ہاؤس میں بیٹھے اورخان کے مخالف ادیب نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا ”دیکھا، اس بد معاش کو پھر ایک بڑا مترجم مل گیا۔“

”ہاں۔“ زور درخ نقاد نے سگریٹ سلگایا۔ ”مغرب متعصب ہے۔ اچھے اچھوں کو چھوڑ کر اس شخص کو پروموٹ کیا جا رہا ہے جو کروڑوں کے ایٹھو سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

اس طرح کے مکالمے کئی جگہ سننے میں آئے لیکن اورخان کو ان کی پروا نہیں تھی۔ بالآخر 2001ء میں ناول کا انگریزی ترجمہ دنیا بھر میں شائع ہو گیا۔ مغربی ماہرین کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی، واقعی جھلمکے بچ گیا۔ فرانسیسی ترجمے پر بھی فوراً ہی کام شروع کر دیا تھا۔ دیگر زبانوں کے مترجم بھی اس کی جانب دوڑے۔

اگلے برس اس ناول کے انگریزی اور فرانسیسی تراجم کو اعلیٰ ترین بین الاقوامی اعزازات سے نوازنے کا اعلان کر دیا گیا۔ ایک ایوارڈ کے ساتھ 127,000 ڈالر جیسی خطیر رقم بھی ملی۔

ایک بار پھر استنبول کے کافی ہاؤسز میں اورخان پر لعن طعن کی گئی۔ مغرب کو متعصب قرار دیا گیا۔

”یہ ناول بھی سرقہ ہے۔ اور کچھ نہیں!“ اُس کے ایک ہم عصر ادیب نے کہا۔

”میاں، وہ ہمارا تمہارا کام چوری کر کے اپنے ناولوں میں پیش کر رہا ہے اور مغرب میں انہیں شاہکار قرار دیا جا رہا ہے، نف ہے!“ نقاد نے گلاس بھرتے ہوئے منہ بنایا۔

”اس پر تو ڈالروں کی بارش ہو رہی ہے۔“ میز پر بیٹھے ایک پبلشر نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ یہ شخص اُن پبلشروں میں سے ایک تھا جنہوں نے اس کا پہلا ناول چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔

تنقید بے کار ثابت ہوئی۔ اس ناول کو 24 زبانوں کے قالب میں ڈھالا گیا۔

اب اورخان ایک بین الاقوامی ادیب بن گیا تھا، تاہم اس کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اب بھی دن میں کئی کھینے میز پر ورق بچھائے، ہاتھ میں قلم تھا، گہری سوچ میں مستغرق بیٹھا رہتا۔

ایک انٹرویو میں اس کی بین الاقوامی شہرت اور ناولوں

سے حاصل ہونے والی آمدنی کی بابت سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا:

”میری زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ میں اب بھی روزانہ کام کرتا ہوں۔ میں گزشتہ 30 برس سے ادب تخلیق کر رہا ہوں۔ ابتدائی 10 برس مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی لیکن اس وقت کسی نے نہیں پوچھا کہ میاں تم کھاتے کھاتے کیا ہو۔ اگلے دس برس میرے ہاتھ کچھ پیسے ضرور آئے، لیکن اس بار بھی کسی نے اُن کے استعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ اب گزشتہ 10 برس میں جو رقم میں نے خرچ کی ہے، لوگ کیوں توقع کر رہے ہیں کہ میں اس کی تفصیلات بتاؤں گا!“

یوں تو ”میرا نام سرخ ہے“ کو شان دار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا لیکن جس رائے نے اورخان کو مسرت سے بھر دیا، وہ اُس کی ماں کی رائے تھی۔

ایک روز جب وہ اپنی لائبریری میں بیٹھا تھا، اس کی ماں خاموشی سے اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔ جب مٹا کی مہک اس کے نتھنوں تک پہنچی، وہ مڑا۔ اس نے کھڑے ہونے کا ارادہ باندھا لیکن ماں نے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

چند ساعت خاموشی چھائی رہی پھر اس شفیق عورت نے ایک غیر متوقع سوال کیا ”تم نے ناول کیسے لکھ ڈالا؟“

”کیا مطلب؟“ وہ ہڑبڑا گیا۔

”میں اسے پڑھ کر تحسیر ہو گئی۔“ اس کی ماں نے گہرا سانس لیا۔ اورخان خاموشی سے سنتا رہا۔

”میں نے تمہارے تمام ناول پڑھے ہیں لیکن کوئی مجھے حیران نہیں کر سکا کیونکہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ تمام ناولوں میں مجھے وہی کچھ پڑھنے کو ملا جس کی میں توقع کر رہی تھی لیکن یہ ناول... اس میں کچھ ایسا تھا جو میں نے آج تک تم میں نہیں دیکھا۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ چند ساعتیں الفاظ کا چناؤ کرنے میں صرف کیں پھر لائبریری میں اُس کی آواز گونجی:

”مجھے ناول کا مصنف اورخان، اُس اورخان سے زیادہ مصلاحت اور قابل نظر آیا جو میرا بیٹا ہے جسے میں جانتی ہوں۔“

اورخان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کی ماں اسے شان دار الفاظ میں اس کے کام کو طراج تحسین پیش کرے گی۔

”شکریہ!“ اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

”تمہارا شکریہ۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹا!“ اس نے آگے بڑھ کر اورخان کا ماتھا چوم لیا۔

☆ ☆ ☆

2002ء میں اُس کا اگلا ناول ”برف باری“ (Snow) شائع ہوا جس میں اُس نے مشرق، خصوصاً ترکی میں مذہبی گروہوں کے بڑھتے اثر اور مغرب کے بارے میں پائے جانے والے سخت نظریات کو موضوع بنایا۔ چونکہ اس میں اورخان نے اپنے کلچر اپنے معاشرے کی خامیوں کو اجاگر کیا تھا، اس لیے وہ توقع کر رہا تھا کہ اس پر کڑی تنقید کی جائے گی۔ وہ درست تھا لیکن سو فیصد نہیں!

تنقید تو بہت ہوئی۔ گالیاں دینے والوں کی تعداد میں بھی ناول کی اشاعت کے ساتھ یک مشت اضافہ ہو گیا۔

”ایسے ناولوں کو نوجوانوں سے دور رکھا جانا چاہیے!“ ایک رجعت پسند اخبار نے سرخی لگائی۔

”اب کیا اس بیہودہ ناول کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا جائے گا؟“ ایک نقاد نے سوال اٹھایا۔

لیکن تنقید کرنے والوں کی کوشش لا حاصل رہی۔ قارئین خاص طور پر نوجوانوں نے اسے بہت پسند کیا۔

”شاید میں قارئین کے ذہن پڑھنے میں ناکام رہا۔“ ایک روز اس نے اپنے پبلشر سے کہا۔ ”میں سمجھتا تھا کہ اس ناول کو زبرد کر دیا جائے گا لیکن اس نے تو فروخت کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔“

”اورخان، تم وہی لکھتے ہو جو تم خود پڑھنا چاہتے ہو۔ خوش قسمتی سے تمہارے اور قارئین کے ذہنوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو تم لکھتے ہو، وہ ویسا ہی ادب پڑھنا چاہتے ہیں!“ پبلشر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

2004ء میں ”برف باری“ کا انگریزی ترجمہ شائع ہو گیا۔ مغربی ناقدین نے اسے سال کی دس بہترین کتابوں میں سے ایک قرار دیا۔ ترکی کے ناقدین نے اس رائے پر ناک بھوں چڑھا دیں۔

☆ ☆ ☆

بظاہر وہ ایک خوش و خرم ازدواجی زندگی گزار رہا تھا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔

شہرت کے اس سفر میں، سماجی سرگرمیوں کے دوران، قلم دوات سے دوستی کے باعث وہ گزشتہ چند برسوں سے گھر کو، اپنی بیوی کو بڑی طرح نظر انداز کرنے لگا تھا۔

اس کا ایک سبب وہ خوفناک خواب اور پراسرار سرگوشیاں بھی تھیں جو اسے حقیقت سے دور نکیل کی دنیا میں لے جاتیں

اور وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جاتا۔ دوسرا سبب لڑکیاں تھیں۔ مقبولیت کے باعث اب وہ لڑکیوں میں گھرا رہتا۔ اسے محبت سے موصول ہوتے، ٹیلی فون آتے، کبھی کبھار کوئی دیوانی گھر کا دروازہ بھی کھٹکھٹا دیتی۔

ابتدا میں تو ایلین اسے شہرت کے بد اثرات سمجھتی رہی اور خود کو اپنی تحقیقی و تدریسی سرگرمیوں میں مصروف رکھا۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اورخان اس میں دلچسپی کھو رہا ہے۔ ”کیا اب میں پہلے جیسی خوبصورت نہیں رہی؟“ ایک دن اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود سے سوال کیا۔ خاموش آئینہ جواب میں فقط ان جھریوں کا عکس دکھاتا رہا جو دھیرے دھیرے اس کے چہرے کا حصہ بنتی جا رہی تھیں۔ آئینہ یہ پیغام بھی دے رہا تھا کہ وہ فریبی کی جانب مائل ہے۔ نئے نئے تجربات سے گزرنے والا اورخان آہستہ آہستہ بندھنوں سے آزاد ہوتا جا رہا تھا تاہم وہ خود اس عمل سے لاعلم تھا۔

آخر ایک رات بہت سوچ بچار کے بعد ایلین نے اورخان سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔

وہ حیران رہ گیا۔ ”کیا کہا تم نے؟“ ”وہی جو تم نے سنا!“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”میں غور کر چکی ہوں، تم بھی غور کر لو۔ گڈ نائٹ!“ یہ کہہ کر اس نے لائٹ بند کر دی اور اورخان کو تاریکی میں تنہا چھوڑ دیا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا ایلین یونیورسٹی جا چکی تھی۔ اس نے تنہائی میں معاملات پر غور کیا اور جلد اسے احساس ہو گیا کہ وہ اب اپنی بیوی کو نظر انداز کرنے لگا ہے۔ پھر مزید غور کرنے پر اس نے چاہا کہ وہ واقعی ایلین سے مزید محبت نہیں کرتا مگر وہ اسے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔

شام میں ایلین نے پھر یہ مسئلہ اٹھایا۔ اس بار اورخان غصے میں آ گیا۔ ”کیوں؟ تم مجھ سے کیوں الگ ہونا چاہتی ہو؟“ ”تم جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے!“ اس نے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ ساری رات جاگتا رہا۔ اپنی ازدواجی زندگی کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ صبح غلیل کی طرف نکل گیا جو اتنی سویرے اسے گھر کے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دونوں دوست قریبی پارک میں جا بیٹھے جہاں اُن کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ جب سورج آسمان پر چھٹنے لگا، تب ان کا مکالمہ اختتام کو پہنچا۔

غللیل کی باتوں نے اسے احساس دلایا کہ موجودہ

حالات میں وہ ایلین کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ علیحدگی کا حتمی فیصلہ کر چکی ہے۔ ”اگر ایسا ہے، تو ایسا ہی صحیح!“ اورخان نے گہرا سانس لیا۔

2002ء میں وہ دونوں علیحدہ ہو گئے لیکن اس وعدے کے ساتھ وہ ہمیشہ دوست رہیں گے اور دونوں ہی نے یہ وعدہ نبھایا!

☆ ☆ ☆
”تم غدار ہو... باز آ جاؤ ورنہ تمہیں جہنم رسید کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“

اس نے بے نام تجسس کے ساتھ اس خط کو کئی بار پڑھا جو اسے چند منٹ قبل موصول ہوا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اسے لگا تار دھمکیاں مل رہی تھیں جن کے پیش نظر دوستوں نے اسے حکومت سے سیکورٹی مانگنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لایا۔

2003ء میں اس کی یادداشتوں پر مبنی کتاب ”استنبول“ شائع ہوئی، جس میں اس نے اپنے محبوب، پیارے شہر کو موضوع بنایا۔ ساتھ ہی اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کی تفصیلات فراہم کیں۔

جن دنوں آپ بیتی کی طرز پر تحریر کردہ اُس کی کتاب ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنی ہوئی تھی، ایک دوست نے اُس سے کہا:

”کمال کر دیا برادر! کتاب کے دونوں حصے ہی شان دار ہیں۔ یہ فیصلہ صادر کرنا واقعی مشکل ہے کہ پہلا حصہ جو استنبول کے بارے میں ہے، زیادہ بہتر ہے یا وہ حصہ جس میں تم نے اپنی زندگی کے ابتدائی 22 برس کا احاطہ کیا ہے۔“

اورخان مسکرایا ”شکریہ دوست لیکن میں تمہیں سچ بتاؤں۔ میری یادداشتوں کا فقط ایک ٹکڑا کتاب کا حصہ بن سکا ہے، اگر میں تفصیلات لکھتا تو کتاب کئی جلدوں میں پھیل جاتی!“

چند روز بعد ایک تقریب میں صحافت کی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں نے اس سے سوال کیا ”کیا آپ بیتی لکھنا مطلبیہ کا اظہار نہیں؟“

”نہیں!“ اورخان نے نفی میں سر ہلا ”میرے نزدیک سوانح عمری لکھنا ماضی کو محفوظ کرنے کا عمل نہیں بلکہ اس سے جان چھڑانے کی کوشش ہے!“

”کیا آپ نے ماضی سے جان چھڑائی؟“ ایک من چلے نے سوال کیا۔

”کہہ سکتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔
”کہہ سکتے ہیں!“ من چلے نے دہرایا۔ ”نوٹ کر لو، اہم ترین سرخی ہے!“ اور ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔
☆ ☆ ☆

کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ وہ لکھتے لکھتے ایک ایسے موڑ پر آ جاتا جہاں آگے تاریکی ہوتی۔ وہ روزمرتا، لیکن الفاظ مجھد ”ہاتے اور کہانی آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ لکھنے سے ادب گیا، اُس نے لمبی چٹھیوں پر ہانے کا اعلان کر دیا۔ اورخان کا ارادہ یورپ گھومنے کا تھا۔

”اچھے دنوں کے تعاقب میں جا رہے ہو اورخان!“ اس کے پبلشر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھے دن...“ اُس نے گہرا سانس لیا۔ ”پروہ دن جب تم توجہ کے ساتھ اپنے کسی ناول کا ایک ورق مکمل کر لو، پھر میرے لیے اچھا دن ہوتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں، تمہارے لیے لکھنا ہی سب کچھ ہے!“ ماضی نے جواب دیا۔

”بے شک میرے لیے لکھنا ہی سب کچھ ہے۔ ورق ماننے رکھ کر ماضی کو کھنگالنا میرے لیے بہت بڑے تجسس ہوتا ہے، کبھی کبھار قلم، ورق اور میز مجھ سے کہتے ہیں، چھٹی لے مارا گھومو پھر دو۔ پھر ملتے ہیں۔“

کچھ روز بعد وہ سوٹ کیس اٹھائے انٹرپورٹ پر کھڑا ہوا۔ یورپ میں اُس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ بڑے بازار ناموں اور ادبی جریڈوں میں اُس کے انٹرویوز ہوئے۔

اٹلی میں قیام کے دوران وہاں کے ایک معروف دانشور سے وابستہ جمیل سی آنکھوں، سنہری زلفوں والی خدیوہ مہانی نے اُس سے انٹرویو کے لیے رابطہ کیا۔ جب وہ مقررہ وقت پر ہوئی اورخان اُس کے حسن سے ششدر رہ گیا۔

گھنگو کے دوران وہ بار بار اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ جب انٹرویو اختتام کو پہنچے تو تھا، حسیہ نے سوال کیا ”آپ کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ نظر آتی ہے۔ اس خوشی کا مالک کیا ہے؟“

”اوہ، میں نے کبھی غور نہیں کیا۔“ وہ تھوڑا جھجک گیا۔ چند مامعت خاموش رہا۔ اس دوران جمیل سی آنکھیں اس پر تکی رہیں۔

پھر اس کے لب وا ہوئے ”دراصل مجھے لکھنے سے عشق ہے۔ میں ان چند خوش نصیبوں میں سے ہوں جنہوں نے اپنے ان کو پیشہ بنالیا ہے۔ شاید یہی میری مسرت کا بنیادی سبب ہے۔“

”کیا کامیابیوں کا، شہرت کا یہ سفر آسان رہا؟“ دو شیزہ

نے سوال کیا۔
”قطعاً نہیں! یہ انتہائی سخت تھا، بہت تلخ! اور آج بھی مشکلات سے بڑ ہے۔“
”مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو چیلنج پسند ہیں!“ سنہری بالوں والی لڑکی مسکرائی۔

”شاید!“ وہ بھی مسکرا دیا۔
☆ ☆ ☆

”تم مذہب اور ملک کے غدار ہو، میں تمہیں قتل کر دوں!“ جتنی دیر میں وہ یہ سمجھ پاتا کہ یہ جیلے کس کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، تو کیلے پتھر سے ہونے والا وار اُس کا کندھا زخمی کر چکا تھا۔

وہ لڑکھڑا گیا لیکن جلد ہی اسے مضبوط ہاتھوں نے سنبھال لیا۔ ابھی اسے یورپ سے لوٹے چند ہی دن ہوئے تھے اور آج وہ استنبول کے مرکزی ثقافتی مرکز میں منعقد ایک تقریب میں شرکت کے لیے آیا تھا جس کے اختتام پر اُسے مداحوں نے گھیر لیا۔ وہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اُن کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا کہ ایک جنونی شخص نے اس پر حملہ کر دیا۔

خوش قسمتی سے اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی، حملہ آور کو بھی قابو میں کر لیا گیا۔ گو کہ وہ معمولی زخمی ہوا تھا لیکن ذرائع ابلاغ نے اس خبر کو بہت ہی سنسنی خیز انداز میں پیش کیا جس کی وجہ سے بین الاقوامی میڈیا کی توجہ بھی اس واقعے کی جانب مبذول ہو گئی۔

دوسرے روز پھر اُس کے مخالفین بار میں بیٹھے اسے مجرا بھلا کہہ رہے تھے۔ ”بڑے نازک مزاج ہیں اورخان صاحب، معمولی زخمی کیا ہوئے کہ ان کے مداح فکر مند ہو گئے۔“ ایک شاعر نے قہقہہ لگایا۔

”ارے جناب، یہاں تو کئی ادیب اور صحافی قتل ہو چکے ہیں اور یہ فقط زخمی ہوئے لیکن بین الاقوامی میڈیا خوب شور مچا رہا ہے۔“ ایک صحافی نے کہا۔

دوسری جانب اورخان کے دوستوں نے اسے بڑی سنجیدگی سے یہ مشورہ دیا کہ وہ ملک چھوڑ دے کیونکہ کردوں کے حمایت کی وجہ سے حکومت اس سے سخت ناراض ہے۔

اورخان کا جواب واضح تھا ”نہیں، کبھی نہیں! میں یہ ملک، یہ شہر کبھی نہیں چھوڑوں گا۔“

ان ہی دنوں فرید کریم اور دیگر ادیبوں کی جانب سے اس کے خلاف سر قے کا گیس دائر کر دیا گیا تھا جسے کورٹ نے

منی 2012

ماہنامہ سرگزشت

67

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سماعت کے بعد خارج کر دیا۔

”کورٹ بھی اس کے ساتھ ہے!“ مقدمہ خارج ہونے کے بعد ایک ادیب نے دانت میٹھے ہوئے کہا تھا۔ وہ بے جاہرہ قطعی نہیں جانتا تھا کہ جلد ترکی کی عدالتیں اور خان کے خلاف بھرپور کارروائی کرنے والی ہیں۔

☆☆☆

2005ء میں اورخان کی مشکلات دوچند ہو گئیں جس کی ایک وجہ اُس کی باغیانہ روش، جدید سوچ تھی اور سچ بولنے کی عادت!

اُس نے سوزر لینڈ میں صحافیوں کے وفد کو دیے جانے والے ایک انٹرویو کے دوران یہ کہہ دیا تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی میں تیس ہزار کروڑوں اور ایک لاکھ آرمینیائی باشندوں کا قتل عام ہوا لیکن بد قسمتی سے آج اس بارے میں بات کرنے کی اجازت نہیں!

یہ انتہائی حساس موضوع تھا۔ انٹرویو شائع ہوتے ہی ترکی میں کھلبلی مچ گئی۔ مخالف نے اسے سستی شہرت حاصل کرنے کی گھنیا چال قرار دیا۔ سڑکوں پر احتجاج ہوا۔ اس سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ترکی کے آئین کی ایک شق کے مطابق کسی بھی شخص کو ریاست اور پارلیمنٹ کی توہین کی اجازت نہیں۔ اسی شق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک نیشنلسٹ وکیل کمال نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جسے قابل سماعت قرار دیتے ہوئے مقدمہ شروع کر دیا گیا۔

اورخان مخالف لابی بھی حرکت میں آگئی۔ اسے جیل میں ڈالنے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔

”اورخان ملک اور مذہب کا دشمن ہے!“ دیواروں پر چانگک ہو گئی۔

”اس بد معاش کو گرفتار کرو!“ سیکڑوں افراد یہ کہتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ اس کے مخالفین نے ملک بھر میں ریلیوں کو منظم کیا۔ اس کی کتابیں احتجاجی مظاہروں کے درمیان نذر آتش کی گئیں۔ اُس کے پبلشر پر بھی حملہ ہوا۔

خبر خواہوں نے ایک بار پھر ترکی چھوڑنے کا مشورہ دیا لیکن وہ ہٹ دھرم انسان تھا، اس نے اپنا ملک چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ”مجھے موت قبول ہے، لیکن اپنے وطن سے دوری نہیں!“

اُن ہی دنوں اورخان نے ”بی بی سی“ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا ”میرا مقصد صرف یہ پیغام دینا تھا کہ ہر شخص کو اظہار کی آزادی ہونی چاہیے جو ترکی کی بقا کی واحد امید ہے۔ میں کسی کی دل آزاری کا سبب نہیں بننا چاہتا تھا!“

ساتھ ہی اُس نے ایک مقامی ٹی وی چینل کو انٹرویو دے دیے ہوئے یہ بھی کہا ”میں نے مرنے والے کروڑوں اور آرمینیائی باشندوں کی بات کی تھی لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ انہیں ترکوں نے قتل کیا۔“

ان بیانات کے بعد معاملہ ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن بولنے کی عادت شاید اورخان کے منہ کو لگ گئی تھی۔ ان معتدل بیانات کے چند روز بعد اُس نے جرمنی میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں ایوارڈ وصول کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر بانگ دہل کہا ”میں واضح الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ پہلی جنگ عظیم میں ایک لاکھ آرمینیائی باشندے اور تیس ہزار کروڑوں کا قتل عام ہوا!“

ملک میں پھر اس کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا۔ دوسری جانب بین الاقوامی دنیا حیران تھی کہ مشرق کے سب سے بڑے ادیب کو کیوں تنازعات میں کھینچا جا رہا ہے۔ مغرب کے ایک بڑے نقاد نے اپنے میں مضمون میں لکھا ”مجھے حیرت ہے! اسلامی تصوف کی روایت کو جدید ناول میں برستے ہوئے مشرق اور مغرب کے درمیان پل کا کردار ادا کرنے والے اس ادیب کے خلاف معاندانہ رویہ کیوں اختیار کیا جا رہا ہے؟“

دیگر قدر آدرشخصیات نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ جوزے مارگو، گارسیا مارکیز اور جان اپڈیک سمیت اس عہد کے سات بڑے ادیبوں نے اُس کی حمایت میں ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔ یورپی یونین، یورپین پارلیمنٹ اور انٹرنیشنل انٹیلیجنس بھی اورخان کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔

اسی گہما گہمی کے دوران ”ٹائم میگزین“ نے اُن سوافرہ کی فہرست شائع کر دی جنہوں نے میگزین کے نزدیک اپنا انتھک محنت اور نظریات سے دنیا بدل دی تھی۔ اورخان کا نام فہرست میں شامل تھا۔

ان ہی دنوں ایک اہم واقعہ ہوا۔ یورپی یونین نے ترکی کے عدالتی نظام پر اپنے تحفظات کا اظہار کر دیا۔ ترکی میں سرگرم سازشی افراد کو یکدم یہ احساس ہو گیا کہ بین الاقوامی دباؤ کے باعث اُس کے خلاف کارروائی کرنا اب اتنا آسان نہیں۔ اسی باعث جنوری 2006ء میں کورٹ نے اورخان کے خلاف دائر کیے جانے والے کیس کو خارج کر دیا۔

ایک بار پھر مخالفین سڑکوں پر آگئے انہوں نے کورٹ کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔

”یہ مغرب پرستی ہے... اورخان کے دوستوں نے اسے بچالیا۔“ احتجاجی سرگرمیوں کے دوران اس قسم کے نعرے بلند

ہوتے رہے۔

اس کے خلاف درخواست دائر کرنے والے وکیل کمال نے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانے کا اعلان کر دیا۔

دوسری جانب 2006ء کے وسط میں اورخان کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے وزٹنگ فیکلٹی کے طور پر منسلک ہو گیا۔

”امریکا کے قدیم کتب خانوں میں آرہا ہوں!“ اس نے جہاز میں سوار ہوتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

عام خیال تھا کہ وہ ترکی چھوڑ دے گا لیکن وہ جلد ہی اہول لوٹ آیا، اپنے اس گھر میں جس سے اسے محبت تھی!

☆☆☆

ہر سال کی طرح اس برس بھی ادبی حلقوں میں یہ بحث لہری ہوئی تھی کہ اس بار کسے ادب کے نوبل انعام سے نوازا جائے گا۔ بیش تر ماہرین شام سے تعلق رکھنے والے علی احمد کو مضبوط ترین امیدوار قرار دے رہے تھے۔ چند تو اس پر شرطیں بھی لگا چکے تھے لیکن 12 اکتوبر 2006ء کو سویڈش اکیڈمی نے اعلان کر دیا کہ اس برس اورخان پاک کو اس اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا جائے گا۔

جب اسے یہ اطلاع ملی وہ ششدر رہ گیا۔ گوکہ وہ گزشتہ اسی برسوں میں متعدد اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کر چکا تھا، لیکن اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے نوبل انعام سے بھی نوازا جائے گا۔

ٹیلی فون کا تانتا بندھ گیا۔ سینکڑوں گلے اس کے نام آئے۔ شام میں تمام دوست اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کی لمباتی بیوی بھی ان میں موجود تھی۔ مقدمے اور شدید ترین تنقید کے وارے کے بعد آج پہلی بار اورخان خود کو بہت ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔

البتہ اس اعلان نے کہ اورخان کو نوبل انعام سے نوازا جائے گا، اس کے مخالفین کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ اب وہ واضح الفاظ میں کہنے لگے کہ یہ ایوارڈ مغرب سے وفاداری کا انعام ہے!

7 دسمبر 2006ء کو اُس نے سویڈش اکیڈمی میں ”ابا کا“ کے عنوان سے ایک لیکچر دیا جسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ناقدین کے مطابق ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والی نادر روزگار شخصیات کی جانب سے اس موقع پر جانے والے مضامین میں اورخان کا مضمون بہترین قرار دیا گیا۔ اس اعلیٰ ترین ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

ایوارڈ وصول کرنے کے بعد اورخان نے دل میں کہا

”میں اورنجیب ایک جیسے ہیں۔ دونوں ہی گواہوں نے مستحب ٹھہرایا اور غیروں نے سر پر بٹھایا۔“

ان جملے کی ادائگی کے بعد یک لخت وہ ماضی میں پہنچ گیا، ایک سبز زار میں، گھنے درخت کے نیچے بیٹھے ایک نجومی کے رویہ... جس کی زمانہ شناس آنکھوں میں مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

تب اچانک اورخان کو یوں قہر کا وہ واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد آیا اور اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ”اگر دے دے زندہ ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ وہ نجومی تھا تھا!“

دھمکیوں، تنقید اور ستائش کے ساتھ اورخان نے اپنا سفر جاری رکھا۔

2006ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے ہونے والے معاہدے کے تحت نے اُس نے اگلے برس بھی امریکا کا سفر کیا۔ وہ 2007ء میں منعقد ہونے والے کینس فلم فیسٹول کا جیوری ممبر رہا۔ 2008ء میں اس کا نیا ناول The Museum of Innocence منظر عام پر آیا۔

اسی برس برطانیہ کے Prospect Magazine اور امریکا کے Foreign Policy کی جانب سے منعقد ہونے والے ایک پول میں ووٹ کرنے والوں نے اسے دنیا کا چوتھا بارسوخ اور اہم ادیب قرار دیا۔

2009ء میں اس نے ناول کے موضوع پر اپنے ہم عصر ادیبوں کے ساتھ لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔

☆☆☆

محبت ایک بار پھر دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

وہ ایک سانولی، بڑی بڑی آنکھوں، سیاہ بالوں والی ہندوستانی عورت کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ معروف ادیبہ کرن ڈیسا کی کا ذکر ہے، جسے 2006ء میں اپنے ناول The Inheritance of Loss کے لیے مین بکر پرائز سے نوازا گیا تھا۔

کافی عرصے سے دونوں کو ساتھ دیکھا جا رہا تھا تاہم دونوں یکساں ادبی نظریات کے حامل تھے، اس لیے ابتدا میں کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی اورخان کے سیاسی و ادبی مخالفین لٹھ لے کر اسی کے پیچھے بڑے ہوئے تھے، مقدمہ بھی چل رہا تھا، ایسے میں کس کو خیال آتا کہ ہمیشہ مسکرانے والا اورخان محبت میں مبتلا ہو گیا لیکن جلد یہ عقدہ کھل گیا۔

جنوری 2010ء کی حسین مج، ایک انٹرویو میں اور خان نے یہ قبول کر ہی لیا کہ وہ کرن سے محبت کرتا ہے۔ جب کرن سے اس بارے میں پوچھا گیا، اس نے باحیا مشرقی عورت کی طرح خاموش رہنے کو ترجیح دی۔ تنازعات نے اس معاملے میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس انٹرویو کی اشاعت کے چند روز بعد ایک 32 سالہ ترک مصورہ کیرولین نے میڈیا کے سامنے یہ دعویٰ کر دیا کہ اور خان تو حقیقتاً اس کی زلف کا اسیر ہے۔

میڈیا نے اس خبر کو خوب مروج سالانہ کراچیاں۔ دونوں کی امریکا میں شائع کرتے ہوئے ایک تصویر بھی ذرائع ابلاغ کے ہاتھ لگ گئی۔ جب صحافیوں نے اس خبر پر مصورہ سے رابطہ کیا، اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ”جی ہاں، وہ تصویر حقیقی ہے، وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔“

”اور کرن ڈیسا کی؟“ ایک چالاک صحافی نے سوال کیا۔ ”بھئی ان کا تعلق فقط ادبی نوعیت کا ہے، اصل میں تو میں ہی اس کی محبوبہ ہوں۔“

صحافیوں کے ہاتھ ایک خبر لگ چکی تھی۔ اب وہ اور خان کا تعاقب کرنے لگے۔ اور خان نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ کیرولین سے اس کا کوئی رشتہ نہیں اور وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

”پھر آپ اس کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کرتے؟“ ایک صحافی نے سوال کیا۔

”ضرور میں ایسا کروں گا۔“ اور خان نے کہا لیکن عملاً اس نے ایسا نہیں کیا۔ قانونی نوٹس بھیجنے کے بجائے اس نے اپنے وکیل کے توسط سے اس نٹ کھٹ مصورہ کو ایک رسمی نوٹس بھیج دیا جس میں اسے اس قسم کے بیانات دینے سے باز رہنے کا مشورہ دیا گیا۔

اس نوٹس کے بعد یہ صاحبہ خاموش ہو گئیں اور پھر بڑے عرصے بعد جنوری 2012ء میں ٹی وی پر نظر آئیں۔ اس ٹی وی پروگرام میں کیرولین نے ایک بار پھر یہ دعویٰ کیا کہ گزشتہ تین برسوں میں اُس کی اور خان سے متحد ملاقاتیں ہو چکی ہیں، اس کے پاس اور خان کی ای میل بھی محفوظ ہیں جن کا مواد یہ ثابت کر سکتا ہے کہ وہ درست ہے۔

انٹرویو نشر ہونے کے بعد غلیل نے اسے فون کیا ”بھئی محترمہ پھر شروع ہو گئیں۔“ اس کی آواز میں شوخی تھی۔

”بس برادر، میں انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔“ اور خان نے جواب دیا۔ دوسری طرف سے غلیل کا قہقہہ سنائی دیا۔

☆☆☆

مارچ 2011ء میں اور خان کو ایک خوش خبری ملی۔ اس کے مخالف وکیل کمال کی جانب سے دائر کردہ مقدمے کا فیصلہ آ گیا تھا۔ چند الزامات میں اُسے بری کر دیا گیا تھا، جبکہ چند میں قصور وار قرار دیتے ہوئے معمولی جرمانہ ادا کرنے کا حکم جاری کیا گیا تھا۔

اخبارات میں اس خبر کو نمایاں کر کے شائع کیا گیا، کسی نے قابل تحسین قرار دیا، کسی نے اس فیصلے پر تنقید کی، البتہ مغربی میڈیا نے اسے خوش آئند قرار دیا۔

اور خان کے ہم عصر ادیب، نقاد اور پبلشر جوزفنگ کی گہما گہمی میں اس معاملے کو بھلا بیٹھے تھے، ایک بار پھر اسے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کافی ہاؤسز اور بار میں اکٹھے ہونے لگے۔

”بھائی تو بل انعام کے ساتھ ان صاحب کو تقریباً ڈیڑھ ملین امریکی ڈالر ملے تھے اور جرمانہ کتنا ہوا ہے؟ فقط مجھے ہزار لیرا ہو نہ؟“ ایک شاعر نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

”حالانکہ وہ چور ہے، سرقہ کرتا ہے۔“ ایک ہم عصر ادیب بولا۔

”بس دوست قسمت!“ اور خان مخالف گروپ کے ایک پبلشر نے جام بھرتے ہوئے کہا۔

”ہاں جناب قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہے۔“ زور درخ نقاد بولا۔

ہو سکتا ہے کہ اور خان کے مخالفین درست ہوں، شاید قسمت واقعی اس پر مہربان رہی ہو لیکن اس کی اچھوتی صلاحیتوں، کہانی بیان کرنے کی بھرپور قابلیت، محنت اور جرأت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وہ عوامل تھے جنہوں نے اسے اس عہد کا نمایاں ترین ادیب بنا دیا ہے۔

اب تک اس کے ناولوں کا 60 زبانون میں ترجمہ ہو چکا ہے، جن میں سے کئی زبانون کے تو وہ نام بھی نہیں جانتا۔ اس کے ناولوں نے ایسے کئی ممالک میں فروخت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اندازاً اب تک اُس کی 11 ملین کتابیں دنیا بھر میں فروخت ہو چکی ہیں۔ جو اعزازات ملے ان کی تعداد شاہ سیکڑوں سے تجاوز کر چکی ہے، تاہم ان حوالے سے اسے غلیل نہیں بدلا۔ وہ آج بھی بلا ناغہ میز کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں کا کرتا ہے۔ آج بھی استنبول میں مقیم ہے، اس شہر میں جو اس کے بیشتر ناولوں کا موضوع بنا، جس کا وہ عاشق ہے، جہاں دفن ہونے کی خواہش کا وہ بارہا اظہار کر چکا ہے۔

ایک وہ دور تھا جب دنیا میں دو سپر پاورز کا وجود تھا اور طاقت کا توازن برقرار تھا۔ دنیا دو بلاکوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت! امریکا بہادر سرمایہ دارانہ نظام کا علم بردار تھا اور سوویت یونین اشتراکیت (کیونزم) پر یقین رکھتا تھا۔

ان دونوں بلاکوں میں سرد جنگ جاری تھی۔ امریکا اور سوویت یونین کبھی کھل کر آمنے سامنے نہیں آئے تھے، بس اپنے مہروں کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے جیسا کہ سوویت یونین نے 71ء کی جنگ میں پاکستان کے ساتھ کیا۔

دونوں ممالک کی چیرہ دستیوں اپنی جگہ لیکن دنیا میں طاقت کا توازن بہر حال برقرار تھا اور امریکا کو یوں دنیا بھر کا چودھری بننے کی آزادی نہیں تھی۔

یہ تو اس دور کا پس منظر ہے۔ میں یہاں عالمی سیاست پر گفتگو کر کے آپ کو بور نہیں کروں گا۔

اس دور میں ”آہنی پردے“ کے پیچھے بے شمار ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے۔ بے شمار افراد نے کیونزم کی دلدل سے

گھبرا کر راہ فرار اختیار کرنا چاہی لیکن ان میں سے چند ہی خوش قسمت ایسے تھے جنہیں ”آزادی“ نصیب ہو سکی۔ انہی آزادی کے پروانوں میں چیکوسلواکیہ کا ایک نوجوان رابرٹ ہیبر بھی تھا۔

جب 1968ء میں سوویت یونین نے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کیا تو رابرٹ ان دنوں نوجوان تھا۔ اسے اپنے وطن پر کیونسٹوں کا قبضہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ وہ پر رونق بازار جہاں ہر دم زندگی کی رونقیں عروج پر رہتی تھیں، جہاں جوان، بوڑھے، بچے کبھی کے چہروں پر زندگی کی چمک تھی، اب وہاں کے گلی کوچوں میں سوویت یونین کی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک دغنائے پھرتے تھے۔ عوام کی جائداد اور مال و دولت کو یہ حق سرکار ضبط کر لیا گیا تھا اور اشتراکیت کے نام پر نہ صرف انہیں بلکہ ان کی روحوں کو بھی غلام بنالیا گیا تھا۔

رابرٹ کے لیے یہ صورت حال سوہان روح تھی۔ اس نے آزاد فضا میں آنکھ کھولی تھی اور ایک آزاد ملک کے شہری کی حیثیت سے ہوش سنبھالا تھا۔ وہ زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتا تھا، بہت آگے جانا چاہتا تھا لیکن اشتراکیت کے اس

جنون آزادی

سلیم فاروقی

ہر شخص آزاد زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ بھی آزاد فضا میں سانس لینے کا خواہش مند تھا کیونکہ وہ پورا ملک ایک قید خانہ بن چکا تھا۔ اس کھلی جیل سے فرار کے لیے اس نے ایک نایاب طریقہ اپنایا۔

بیوی بچوں کے ساتھ فرار ہونے کی دلچسپ کہتا



جن نے اس کے اور اس جیسے دوسرے نوجوانوں کے پر کتر دیے تھے۔

چیکوسلواکیہ پر سوویت یونین کے قبضے کے فوراً بعد یعنی 1968ء میں وہ قومی سائیکل ٹیم کا ممبر بن گیا تھا۔ سائیکلنگ تو اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ سوویت یونین کے قبضے سے بہت پہلے اس نے سائیکلنگ شروع کی تھی اور جس برس اس کے ملک پر قبضہ ہوا، اسی برس اسے سائیکلنگ کے ایک مقابلے میں آسٹریا کے شہر ویانا جانے کا موقع ملا۔

ویانا کی خوش حالی دیکھ کر اسے رشک بھی آیا اور اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی کہ کاش میں ملک پر قبضے سے قبل ہی ویانا آ جاتا تو اس کھٹن کا شکار نہ ہوتا۔

وہاں مختلف ملکوں کے سائیکلسٹ تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی کی دمک اور آنکھوں میں آزادی کی چمک تھی۔ ان کی سائیکلیں بھی بہت خوبصورت اور جدید انداز کی تھیں۔ ان کے مقابلے میں رائیٹ کی سائیکل بہت بھدی اور بے ڈھنگی تھی، وہاں مضبوطی میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔

ویانا کے پُر رفتی بازار اور گلی کو بچے دیکھ کر اسے اپنے ملک کا شہر پر آگ یاد آیا جہاں ہمہ وقت خمست کے ڈیرے رہتے تھے، جہاں ہر شخص ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہتا تھا، جہاں باپ، بیٹے سے اور بیٹا باپ سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ مبادا ان میں سے کوئی سرکاری خبر ہو اور سزا کے طور پر اسے کسی کڑی مشقت پر لگا دیا جائے یا حالات زیادہ سنگین ہوں تو اتنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جائے۔

رائیٹ نے اپنی انتھک محنت اور لگن سے بہت جلد ایتھلیٹ کی حیثیت سے اپنا ایک مقام بنالیا تھا لیکن یہ سن کر اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا کہ ”آزاد دنیا“ میں اس سے کہیں کم تر درجے کے ایتھلیٹ دولت میں کھیل رہے ہیں۔ انہیں دنیا کی ہر آسائش میسر ہے، دنیا میں کہیں بھی آنے جانے پر کوئی قلعہ نہیں ہے۔ کوئی پراسرار انداز میں ان کی نگرانی نہیں کرتا۔۔۔ رائیٹ کو ہر لمحہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اس سال اس کی ملاقات چیکوسلواکیہ کی ایک حسینہ جینا کاچلی کو داسے ہوئی۔

اس سے مل کر رائیٹ لمحے بھر کو اپنے تمام غم، تمام محرومیاں بھول گیا۔ جینا جیوگرافک سروے آفس میں نقشہ نویس تھی۔

رائیٹ دیکھتا تھا، قوی سٹم پر جانا پچانا جاتا تھا، پھر جینا اس سے متاثر کیوں نہ ہوتی؟ رائیٹ خود بھی پہلی ہی نظر میں

اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا تھا۔ دونوں میں چند ملاقاتیں ہوئیں تو رائیٹ نے اپنے جذباتوں کا کھل کر اظہار کر دیا۔ جینا تو گویا اس انتظار ہی میں تھی۔ اس نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ ان دونوں کی ملاقاتیں رنگ لائیں اور دونوں جلد ہی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

شاید یہی وہ دور تھا جب رائیٹ کو زندگی میں کچھ رہنمائی محسوس ہوئی۔

جینا ایک اچھی اور محبت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی۔ وہ ہر قدم پر رائیٹ کے ساتھ رہتی تھی۔

جب رائیٹ کے آنگن میں اس کی بیٹی جانا کی قلعاریاں گونجیں تو زندگی کچھ اور حسین ہو گئی۔ پھر ننھے رچرڈ کی آمد نے ان کے خاندان کی گویا تکمیل کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنی بھاری ذمہ داریوں کا احساس بھی ہوا۔ معروف اور نامور کھلاڑی ہونے کے ناتے اس کا معیار زندگی چیکوسلواکیہ کے دوسرے لوگوں کی نسبت خاصا بہتر تھا۔

اس کی بیوی جینا کی آمدنی بھی بڑی نہیں تھی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں کہیں بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ اس وقت کار رکھنا عام حیثیت باشندوں کے لیے ایک خواب تھا لیکن رائیٹ اور جینا نے اپنی مجموعی آمدنی سے پس انداز کر کے ایک کار بھی خرید لی تھی۔

اس کے باوجود اسے اپنا ملک ایک قید خانہ محسوس ہوتا تھا۔ خاردار تاروں سے گھرا ہوا ایک ایسا قید خانہ جہاں سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

اسے اپنے ہم وطنوں خصوصاً نوجوانوں پر حیرت بھی ہوتی تھی اور ان کے بے جس رویے پر صدمہ بھی ہوتا تھا۔ شاید ان لوگوں نے اس ”قید خانے“ کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لیا تھا لیکن رائیٹ کے دل میں آزادی کی تڑپ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بہترین تعلیم کے ساتھ ساتھ بہترین تربیت بھی دے اور انہیں بہترین انسان بنائے لیکن سوویت یونین کے ساتھ رہتے ہوئے اس کا تصور بھی محال تھا۔ وہاں بچوں کو وہی تعلیم دی جاتی تھی جو ریاست مناسب سمجھتی تھی۔ گویا وہاں انسان نہیں ردیوٹ تیار ہوتے تھے جو ریاست کے لشکروں پر کام کر سکیں۔ ان کی اپنی سوچ صفر ہو۔

وہ اپنے بچوں کو اس مشینی پیشہ ورانہ زندگی سے نجات دلانا چاہتا تھا لیکن کیسے؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

ایک عرصے تک دنیا اس بات سے بے خبر رہی کہ ”آہنی پردے“ کی پیچھے کیا کچھ ہوتا ہے، گزرنے والا ہر سال پہلے کے مقابلے میں رائیٹ کے لیے زیادہ اذیت ناک بننا جا رہا تھا۔ بالکل کسی جیل کے قیدیوں کی طرح خوراک کے لیے طویل قطاریں لگتی تھیں اور ہر سال ان کی طوالت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہی حال اسپتالوں کا تھا۔ وہاں بھی مریضوں کی لمبی لمبی قطاریں ہوتی تھیں۔ اچھی خوراک کے حصول، حتیٰ کہ تجھیز و تدفین کے مواقع پر بھی سہولیات حاصل کرنے کے لیے رشوت کا چلن عام تھا۔ رشوت کی یہ ادائیگی رائیٹ کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔ وہ کبھی کبھی یہ سوچتا تھا کہ یہ کیسی اشتراکیت ہے؟ ان لوگوں کے قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ ان کا نعرہ تو یہی ہے کہ سب انسان برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے لیکن عملاً ایسا نہیں تھا۔

وہاں بھی ایک مراعات یافتہ طبقہ ایسا تھا جسے دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔ چیکوسلواکیہ کے عام شہریوں کے لیے ایک مخصوص، کمزور سے کپڑے کا لباس تھا۔ اس کے برعکس مراعات یافتہ طبقہ بہترین اسپورٹس لباس پہنتا تھا، بہترین خوشبوئیاں استعمال کرتا تھا پھر اپنی گاڑیوں میں گھومتا تھا۔

حکومت کا دعویٰ تھا کہ روٹی، کپڑا اور مکان ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور ریاست ہر انسان کو یہ سب کچھ مہیا کرے گی۔

ریاست عوام کو یہ چیزیں مہیا بھی کر رہی تھی لیکن ان اشیاء کا معیار انتہائی پست تھا۔

ہر شادی شدہ جوڑے کو مکان کے لیے درخواست دینا ہوتی تھی۔ نمبر آنے پر انہیں مکان الاٹ کر دیا جاتا تھا۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ اس مکان کا تعمیراتی معیار کیا ہوتا تھا؟ رائیٹ نے بھی مکان کے لیے درخواست دے رکھی تھی لیکن 1972ء میں اسے یہ جان کا شدید صدمہ ہوا کہ لسٹ میں اس کا نام پہلے نمبر پر تھا جو معقول نذرانہ نہ دینے کے باعث اٹھارہویں نمبر پر چلا گیا ہے۔ ریاستی اہلکاروں نے اس کا جواز یہ گھڑا کہ رائیٹ کے اندر ابھی سیاسی جذبہ نامکمل ہے اور وہ ریاست کے نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔

ممکن ہے یہ وجہ بھی رہی ہو، رائیٹ کھل کر تو نہیں لیکن اچھے چھپے الفاظ میں حکومت پر تنقید کر دیا کرتا تھا۔

وہ ایک بڑی تعمیراتی کمپنی میں سپروائزر تھا اور اس کا واسطہ دن بھر سیکڑوں لوگوں سے پڑتا تھا۔ ممکن ہے ان میں ہی سے کسی نے تجبیری کردی ہو اور رائیٹ ریاست کی نظروں میں

محتوب ٹھہرا ہو۔ رائیٹ اگر قوی ہیر و اور نامور شخصیت نہ ہوتا تو ممکن ہے، اسے سپروائزر کے عہدے سے ہٹا کر مزدوری پر لگا دیا جاتا لیکن اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود رائیٹ کا خیال تھا کہ محض رشوت نہ دینے کی وجہ سے اسے مکان نہیں ملا۔

اس واقعے سے رائیٹ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے اور ورجینا نے اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں سے اُدھار لے کر ایک گھر تعمیر کر لیا۔ اس سے ان کا بجٹ بڑی طرح متاثر ہوا لیکن یہ مکان اس مکان سے لاکھ درجے بہتر تھا جو حکومت کی طرف سے اسے ملنے والا تھا۔

رائیٹ کو دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب اس کے بچوں نے اسکول جانا شروع کیا۔

ایک روز اسکول کے پرنسپل نے اسے اور جینا کو بلایا۔ یہ ظاہر اس کا مقصد رائیٹ اور جینا سے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں مشورہ کرنا تھا لیکن پرنسپل نے دراصل دونوں میاں بیوی کو اس لیے بلایا تھا کہ وہ بچوں کی مذہبی تعلیم کا سلسلہ فوری طور پر موقوف کر دیں۔

رائیٹ اور جینا بنیادی طور پر مذہبی تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انہوں نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا اور تعلیم حاصل کی تھی، وہ آزاد ماحول تھا۔ انہوں نے مذہب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے گرجا بھی جایا کرتے تھے۔

پرنسپل نے کہا ”مسٹر رائیٹ! آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہبی تعلیم اور کمپوزم ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ مذہبی تعلیم سے بچے نہ صرف کنفیوز ہو جائیں گے بلکہ عملی زندگی میں بالکل ناکارہ ہو کر رہ جائیں گے۔“

اس نے مذہبی تعلیم و تربیت کا کچھ ایسا جھانک نقشہ کھینچا گویا مذہبی تعلیم اس کے دونوں بچوں کو گمراہی کے راستے پر ڈال دے گی۔

رائیٹ کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے جانا اور رچرڈ سے منع کیوں نہیں کیا کہ وہ اسکول میں کسی کو بھی اپنی مذہبی تعلیم کے بارے میں نہ بتائیں۔ رائیٹ اور جینا بچوں کو مذہبی تعلیم گھر پر دیا کرتے تھے۔

اس وقت تو رائیٹ نے مصلحتاً پرنسپل کی بات سے اتفاق کیا لیکن دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بچوں کو ہر قیمت پر مذہبی تعلیم دلاؤں گا۔

اس نے فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

قدم قدم پر ریاست کے خیر پھیلے ہوئے تھے۔ کون جانے اس کے پڑوسی ہی حکومت کے تجربوں۔ بہ ظاہر رابرٹ کے تعلقات ان سے بہت اچھے تھے لیکن وہاں تو ہر شخص ایک ان جانے خوف کے سائے میں جی رہا تھا۔ ممکن ہے اس کے بچے ہی کسی سے اس کا تذکرہ کر بیٹھے تو رابرٹ حکومت کا محبوب ٹھہرتا۔ یوں بھی اس کا ریکارڈ اچھا نہیں تھا لیکن قوی سلط پر ایک نام وراثتیت اور سائیکسٹ ہونے کے ناتے اسے نظر انداز کیا جاتا رہا تھا۔ لیکن آخر کب تک؟ کب تک وہ حکومت کی نظروں سے بچا رہ سکتا تھا۔

اسے ایک دفعہ اس ذہنی اذیت سے بھر گزرنے پڑا جب اس کی بیٹی شدید بخار میں مبتلا تھی۔ اسپتال کے باہر مریضوں کی ایک طویل قطار تھی۔ اس نے جینا کو آفس بھیج دیا کہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ چھٹی نہیں کر سکتے تھے اور خود بیٹی کو لے کر قطار میں بیٹھ گیا۔

بیٹی کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی اور مریضوں کی قطار بھی کہ چوتھی کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

اولی ڈی میں جولیڈی ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ رہی تھی، وہ انتہائی بے چارہ اور سپاٹ چہرے والی ایک کمسن عورت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی یہاں لا کر بٹھا دیا گیا ہو۔ وہ مسکینی انداز میں ہر مریض سے ایک سوال کرتی، ضرورت پڑتی تو نبض بھی دیکھ لیتی ورنہ وہ مریض کی طرف دیکھے بغیر گئے لکھنے میں مصروف رہتی۔

خدا خدا کر کے سواد گھٹنے میں رابرٹ کا نمبر آیا۔ ”کیا تکلیف ہے؟“ میزبان اور سپاٹ چہرے والی لیڈی ڈاکٹر نے رابرٹ سے یوں پوچھا جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کر رہی ہو۔

”بیٹی کو بہت شدید بخار ہے ڈاکٹر! میرا خیال ہے کہ اسے نمونیا ہو گیا ہے۔“

”اپنا خیال اپنے پاس رکھو مسٹر!“ ڈاکٹر نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا ”ڈاکٹر تم ہو یا میں ہوں؟“

”لیکن آپ اس کی حالت تو دیکھیں..... یہ.....“

”میں اس کی حالت دیکھ چکی ہوں۔“ ڈاکٹر نے بیٹی کی طرف دیکھے بغیر ایک پرچی پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے تو اسے ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔“ رابرٹ نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اپنا اور میرا وقت ضائع مت کریں۔“ کرخت چہرے والی ڈاکٹر نے اسے گھورتے ہوئے کہا ”ابھی مجھے بہت مریض بھگتانے ہیں۔“

”آپ مریض بھگتاتی ہیں؟“ رابرٹ آپ سے باہر ہو گیا۔ ”یہ انسانی جانوں کا سوال ہے۔ میں.....“

”دیکھیے مسٹر، میرے پاس بحث کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔ کاؤنٹر سے دوائیں اور یہاں سے جائیں۔ آپ کے پیچھے والے مریض پریشان ہو رہے ہیں۔“

”میں آپ کی شکایت کروں گا۔“ رابرٹ بے ساختہ بولا۔ ”آپ شاید مجھے پہچانتی نہیں ہیں۔“

”میں آپ کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔“ ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں کہا ”اسی لیے اتنی دیر سے آپ کی بات سن رہی ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اسے سیکورٹی کے ذریعے اٹھا کر باہر پھینکا ہوتا۔ آپ میرے کام میں دخل اندازی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیے۔“

رابرٹ دوا کی پرچی لیے بغیر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے دل میں کہا لعنت ہے ایسے ملک پر جہاں سوائے ذلت اور توہین کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اس کی بیٹی بخار میں بڑی طرح پھینک رہی تھی۔ اسے بغیر نسخے کے کہیں سے بھی دوا نہیں مل سکتی تھی۔ وہ غصے میں وہاں سے اٹھ کر آیا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ میں اپنی بیٹی کے لیے دوا کا بندوبست کہاں سے کروں؟

اچانک پشت سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، وہ ستائیس اٹھائیس سال کی ایک خوبصورت سی عورت تھی۔

”مسٹر جابرٹ!“ اس نے کہا ”آپ تو یقیناً مجھے نہیں جانتے ہوں گے لیکن میں آپ کو جانتی ہوں۔ میرا نام پاؤلا ہے اور میں ایک میڈیسن کینی میں اسٹنٹ منیجر ہوں۔“

آئیے، میں آپ کو اپنے کونے پر دوائیں دلا دوں۔“

”لیکن مس پاؤلا! دوا کا نسخہ تو میں نے اس تک چڑھی ڈاکٹر سے لیا ہی نہیں۔“

”اس کی آپ فکر مت کریں۔“ پاؤلا نے کہا ”میں بی فارمیٹ ہوں اور دواؤں کے بارے میں ان ڈاکٹروں سے زیادہ جانتی ہوں۔ آئیے میرے ساتھ۔ پہلے میں آپ کی بیٹی کا معائنہ کر لوں۔“

”میری جیب میں ابھی اتنے پیسے نہیں ہیں مس پاؤلا!“ رابرٹ نے صاف کوئی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ معصوم اور خوبصورت لڑکی بغیر کسی مالی فائدے کے یہ خدمات سرانجام نہیں دے گی۔

”پیسوں کی ضرورت نہیں ہے مسٹر رابرٹ! آپ قوی

ہو جانے پہچانے جاتے ہیں۔ میں تو یوں بھی آپ کی فہم ہوں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گی۔ بس اب آپ دیر مت کریں۔ بیٹی کا بخار بڑھتا جا رہا ہے۔“

پاؤلا اسے وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسری عمارت میں لے گئی۔ وہاں اس کا چھوٹا سا کیمین تھا۔ اس نے بیٹی کا معائنہ کیا۔ اس کا نمبر پچ چیک کیا، اس شخص کوپ سے اس کے بچے اور پٹھ کا معائنہ کیا اور بولی ”آپ کا خیال درست تھا۔ آپ کی بیٹی کو نمونیا کا حملہ ہوا ہے لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ابھی آپ کو دوا میں لادیتی ہوں۔ تین دن کی دوا میں آرام آ جائے گا۔ اگر اس کے باوجود بیٹی صحت یاب نہ ہو تو آپ تین دن بعد میرے پاس آ جائیں۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اس لمحے پہلی دفعہ رابرٹ کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ ملک اب رہنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ قید خانہ تو اسے پہلے ہی لگا تھا لیکن لوگوں سے سلوک بھی قیدیوں کی طرح کیا جاتا تھا۔ اس میں تصور وہاں کام کرنے والے افراد کا بھی نہیں تھا۔ اس ”قید خانے“ میں ہر شخص بےزار تھا۔ ہر طرف خود غرضی اور نفسی کا دور دورہ تھا۔ اسے اس ڈاکٹر کا خیال آیا، صبح سے لے کر دوپہر تک اسے سیکڑوں مریض بھگتانا پڑتے تھے۔ انہیں اتنی قلیل تھیں کہ ہر شخص آنے والے کل سے خوف ادا تھا۔ ایسے میں کسی سے بھی خوش خلقی کی توقع رکھنا عبث تھا۔ وہاں پاؤلا جیسے ہمدرد لوگ بھی تھے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

تھوڑی دیر بعد پاؤلا ایک پنکٹ میں دوائیں لے کر واپس آ گئی اور اسے سمجھانے لگی کہ کون سی دوا کس وقت اور کتنی مقدار میں دینا ہے۔ اس کے علاوہ وہ نزلے، زکام، طار اور سردرد کی بہت سی گولیاں بھی لے آئی تھی۔ وہاں تو سردرد کی ایک گولی حاصل کرنا بھی محال تھا۔

پاؤلا نے دوا کی ایک خوراک تو جانا کو وہیں کھلا دی اور رابرٹ کو تاکید کی کہ ہر چھ گھنٹے بعد اپنی بیٹی کو یہ دوائیں کھلائے۔

”مس پاؤلا!“ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟“ رابرٹ نے کہا۔

”میرا شکریہ ادا کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔“

”اسکرانک!“ آئندہ ہونے والی سائیکل ریس میں آپ کو الی ہیتنا ہے۔“

”میں پوری کوشش کروں گا۔“ رابرٹ نے کہا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ آئندہ ہونے والی سائیکل ریس تک وہ ریٹائر

ہو جائے گا۔ اسکوٹش، والی ہال اور ٹینس کے کھلاڑیوں کا کیریئر زیادہ دیر تک نہیں چلتا کیونکہ ان کھیلوں میں بہت زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہی حال سائیکلنگ کا ہے۔ رابرٹ نے تو پھر بھی اپنی محنت، لگن اور مشق سے مقررہ مدت سے کئی سال زیادہ گزار لیے تھے۔ وہ بین الاقوامی مقابلوں میں تو حصہ نہیں لے سکتا تھا البتہ قومی سطح پر وہ اب بھی ناقابل شکست تھا اور سائیکلنگ کر رہا تھا۔

وہ جانا کو لے کر گھر پہنچا تو اس کا سوڈ بہت خراب تھا۔ ڈاکٹر کے رویتے نے اسے بہت دل برداشتہ کر دیا تھا۔ اگر پاؤلا نہ آ جاتی تو شاید اس کی بیٹی اب تک مر چکی ہوتی۔

اس نے بیٹی کو احتیاط سے میز پر لٹا دیا۔ اس کا بخار خاصا کم تھا اور وہ پرسکون انداز میں سو رہی تھی۔ جینا ابھی تک آفس میں تھی اور اس کا بیٹا چڑھ چکا تھا اسکو ل سے نہیں لوٹا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا ”میری بات غور سے سنو رابرٹ! اب یہ ملک اس قابل نہیں ہے کہ اس میں مزید رہا جائے، میں بہت جلد یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

”کیسے؟“ اس کے کانوں میں اس کی اپنی آواز گونجی۔

”کیسے؟“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا ”لوگ آخر جیلوں سے بھی فرار ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، میں محافظوں کے ہاتھوں مارا جاؤں گا..... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روز روز کے مرنے سے تو بہتر ہے کہ ایک ہی دفعہ محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاؤں۔“

ایک دفعہ اگر میں اس زنداں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر جینا اور دونوں بچوں کو بھی اس قید سے رہائی دلا دوں گا۔“

وہ جتنا اس بات پر غور کرتا، اتنا ہی اس کا ارادہ پختہ ہوتا جاتا۔

چیکو سلواکیہ کی سرحدوں کی چاروں طرف بہت مضبوط، خاردار تار لگے تھے۔ ان خاردار تاروں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر محافظوں کے برج بنے تھے، اس کے علاوہ وہاں ہمہ وقت سنتری پہرے پر ہوتے تھے۔ یہ منحوس خاردار تار ہی کیونکہ اور آزاد دنیا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

رابرٹ کا گھر چیکو سلواکیہ کے شہر برائی سلاوا میں تھا۔ یہ شہر سرحد کے بالکل ساتھ تھا۔ اس سے محض چند فرلانگ کے فاصلے پر آہنی جنگل کی رکاوٹ تھی۔ اس میں جابہ جات خفیہ برج تھے جہاں ہر دم سچ و چاق و چوبند سنتری موجود رہتے تھے۔

اس کے بعد تقریباً دس بارہ فٹ بلند خاردار تاروں کی دو باڑیں تھیں جو چیکو سلواکیہ اور آسٹریا کی سرحد کے ساتھ کھڑی کر دی گئی تھیں۔

ان تمام سرحدی انتظامات کا جائزہ رابرٹ نے دور بین سے بہت باریک بینی کے ساتھ لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس جیسے بہترین ایتھلیٹ یہ رکاوٹیں دوراتوں میں پار کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ محافطوں کی گولیوں سے بچ سکے۔

اس نے ایک دن جینا کو اعتماد میں لے کر کہا ”جینا! میں اس جہنم سے نکل آ گیا ہوں اور ایک دو برس مزید یہاں رہا تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔“

جینا نے حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ بُرے سے بُرے حالات میں بھی اس نے ہمیشہ جینا کو حوصلہ دیا تھا، اب وہ خود ہی ایسی مایوسی کی باتیں کر رہا تھا۔

جینا نے کہا ”رابرٹ! ہمارے پاس خدا کا دیا کچھ تو ہے۔ رہنے کو مکان ہے، باعزت روزگار ہے، خوبصورت بچے ہیں۔ ٹھوٹے پھرنے کے لیے گاڑی ہے اور اس ملک میں تمہارا ایک نام ہے۔ لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم اس ملک میں بسنے والے دوسرے شہریوں کی نسبت پچاس فی صد زیادہ کماتے ہیں اور.....“

”لیکن اس کے باوجود یہ ایک قید خانہ ہے جینا!“ رابرٹ نے کہا۔ ”کسی پرندے کو سونے کے بنجرے میں بند کر کے اسے بہترین خوراک کھلائی جائے تو کیا وہ خوش رہ سکے گا؟“

”لیکن رابرٹ! یہ تو ہمارا مقدر ہے۔ اپنے مقدر سے کون لڑ سکتا ہے؟“

”میں نے اپنے مقدر سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ رابرٹ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”تم جانتی ہو کہ میں بغیر لڑے ہار ماننے کا قائل نہیں ہوں۔ اب وہ چاہے سائیکل ریس ہو یا زندگی کی ریس۔“

”لیکن اس ریس میں ہارنے کا مطلب سمجھتے ہو تم؟“ جینا نے کہا۔

”ہاں، میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جیسے کسی ہوا باز کے لیے پہلی غلطی آخری ہوتی ہے، اسی طرح میرے لیے بھی یہ کوشش آخری ہوگی۔ پھر یا تو میں آزاد فضا میں سانس لوں گا یا پھر زندگی کی قید سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤں گا۔“

”لیکن تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ تم یہ آہنی رکاوٹیں کیسے عبور کرو گے؟ محافطوں کی حفاظتی نظروں اور سرچ لائٹس کی تیز روشنیوں سے کیسے بچو گے؟“

”میرے ذہن میں ابھی کوئی واضح منصوبہ نہیں ہے لیکن میں نے یہ ضرور طے کر لیا ہے کہ مجھے اس زنداں سے ہر قیمت پر نکلنا ہے۔“

”اگر میں کچھ دیر کے لیے تمہاری بات مان بھی لوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دو بچوں کی موجودگی میں سرحد پار کریں اور محافطوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تمام رکاوٹیں پار کر جائیں؟“

”ہم نہیں، صرف میں۔“ رابرٹ نے کہا ”نی الحال صرف میں یہاں سے جاؤں گا، پھر بعد میں تم لوگوں.....“

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟“ جینا نے قدرے بلند آواز میں کہا تو رابرٹ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں جینا!“ رابرٹ نے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے اس فرار کے بعد حکومت ہمیں زندہ رہنے دے گی؟ وہ مجھے اور بچوں کو دوسروں کے لیے عبرت کا نمونہ بنادے گی تاکہ پھر کوئی اس قسم کے فرار کا تصور بھی نہ کرے۔“

چند لمحے کو رابرٹ بھی ستانے میں رہ گیا۔ اس نے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کا فرار زیادہ دن پوشیدہ نہ رہتا۔ پھر حکومت نہ صرف اس کا مکان اور گھر کا دوسرا سامان ضبط کرتی بلکہ اس کی بیوی بچوں کے ساتھ اتنا ہی سادہ سلوک کرتی کہ لوگ سن کر ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے۔

”دیکھو رابرٹ! اب تم اکیلے نہیں ہو کہ اپنی سائیکل پر فرار ہو کر ویانا پہنچ جاؤ گے۔ اگر تم نے واقعی یہاں سے فرار کا عہد کر لیا ہے تو پھر ہم سب تمہارے ساتھ جائیں گے، کیوں اور کیسے..... یہ سوچنا تمہارا کام ہے؟“

”گویا تم اس منصوبے میں میری بالکل مدد نہیں کرو گی؟“

”میں تو ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے ہر قدم پر تمہاری مدد کی ہے تو اب کیسے پیچھے ہٹ سکتی ہوں۔“ ”بس تو پھر طے ہو گیا۔“ رابرٹ نے ہنس کر کہا ”لیکن ابھی اس منصوبے کی بھگ بھی کسی کے کان میں نہیں پڑنا چاہیے ورنہ فرار سے پہلے ہی میں فائرنگ اسکوڈ کے سامنے گھڑا کر دیا جائے گا۔“

اس دن کے بعد سے رابرٹ مسلسل اسی مسئلے پر غور کرتا رہا کہ اپنے خاندان سمیت یہاں سے کیسے فرار ہوا جائے؟ ابھی وہ سوچتا کہ وہ کوئی ہوائی جہاز ہائی جیک کر لے اور اسے گن پوائنٹ پر کسی بھی امریکی ریاست میں لے جائے لیکن

یہ منصوبہ خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابل عمل بھی تھا۔ نئی دفعہ اس نے سوچا کہ جینا کو بھی سائیکلنگ کی پریکٹس کرا دے، پھر وہ دو سائیکلوں پر فرار ہو سکتے ہیں لیکن جینا میں اب نہ تو وہ توانائی تھی، نہ پچیس برسوں میں اتنا دم تھا کہ وہ مسلسل دوراتوں تک سائیکل چلا سکتی، وہ بھی ایک بچے اور کچھ ضروری سامان سمیت۔ ہاں وہ خود بہت آسانی سے سائیکل پر یہ سفر کر سکتا تھا۔

وہ دن رات اسی ادھیڑ بن میں رہنے لگا۔

ان ہی دنوں چیکو سلواکیہ میں ایک لرزہ خیز واقعہ پیش آیا۔ اسی طرح کی آزادی کے متوالے ایک نوجوان نے فرار کی کوشش کی لیکن وہ سرحدی محافطوں کی نظروں میں آ گیا اور ان لوگوں نے اسے بھون کر رکھ دیا۔ نہ صرف وہ اپنی جان سے گیا بلکہ اس کے پورے خاندان پر عتاب نازل ہو گیا۔ اس کی دو بہنوں کو کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ ماں باپ کو جیل میں ڈال دیا گیا اور ان کے گھر کا تمام سامان حکومت نے ضبط کر لیا۔

رابرٹ نے یہ خبر بہت تھل سے سنی۔ جینا نے بھی اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ چیکو سلواکیہ کے سرکاری اخبارات اور ٹیلی وژن بار بار اس واقعے کی تشہیر کر رہے تھے۔ گویا وہ عوام کو ایک طرح سے دمھکی دے رہے تھے کہ یہاں سے بھاگنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے؟

اس لرزہ خیز واقعے کے بعد بھی رابرٹ کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی اور اس کا ذہن مسلسل اسی مسئلے میں الجھا رہا کہ یہاں سے کیسے فرار ہوا جائے؟

وہاں میڈیا پر قدغن کا یہ عالم تھا کہ چیکو سلواکیہ میں کسی بھی غیر ملکی اخبار اور جریدے کا داخلہ ممنوع تھا۔ ٹیلی وژن پر بھی صرف وہی کچھ دکھایا جاتا تھا جو ریاست عوام کو دکھانا چاہتی تھی۔ البتہ ان کیونسٹ ممالک کے اخبارات اور رسائل وہاں ضرور آتے تھے جو سوویت یونین کے زیر تسلط تھے۔ اس دور میں میڈیا اتنا برقع رقا رہتا تھا بھی نہیں، نہ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کی تھی۔ لے دے کر ایک ٹیلی فون کا ذریعہ تھا لیکن اس کے ذریعے بھی غیر ممالک سے رابطہ کرنا گویا گناہ ”قیمت تھا۔“

ایسے دہشت زدہ ماحول میں رہنے والے لوگوں کی بہت کو داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ کیونز م اور کارل مارکس کا نظریہ یہ ظاہر بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے تھا لیکن اس کی مکمل تفسیر انسانیت کے لیے اتنی ہی تباہ کن تھی۔ دنیا کا کوئی بھی نظام اگر عدل و انصاف پر قائم ہو تو اس میں بنی نوع

انسان کے لیے بہتری ہی بہترین ہوتی ہے۔ کیونز م میں سب کے لیے بھلائی اور برابری کا دعویٰ تھا لیکن عملی طور پر ایسا نظر نہیں آتا تھا۔

رابرٹ اپنے ایک ساتھی سائیکلسٹ سے ملنے گیا۔ وہ حال ہی میں غیر ملکی دورے سے واپس آیا تھا اور نہ جانے کس طرح کچھ غیر ملکی رسالے بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ رسالے انگریزی میں تھے۔ اس کا دوست انگریزی سے نا بلند تھا، وہ کام چلانے کے لیے انگریزی کے چند جملے بول لیتا تھا۔ اس کے برعکس رابرٹ کو غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا بھی شوق تھا۔ اس نے انگریزی میں بھی اچھی خاصی شہد مبہر سیدھا کر لی تھی۔

اس کا دوست تو محض رسالوں کی خوبصورت تصویروں اور بہترین چھپائی سے متاثر ہو کر وہ رسالے لے آیا تھا۔

جب رابرٹ نے اس سے یہ رسالے عاریتاً مانگے تو اس نے فراخ دلی سے وہ رسالے رابرٹ کو تحفہ دے دیے اور بولا ”دیکھو رابرٹ! اگر تم ان رسالوں کی وجہ سے پکڑے جاؤ تو میرا نام ہرگز مت لیتا۔“

”تم فکر مت کرو۔“ رابرٹ ہنس کر بولا ”اگر میں پکڑا بھی گیا تو مرتے مر جاؤں گا لیکن تمہارا نام میری زبان پر نہیں آئے گا۔“

اسی ایک واقعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سوویت یونین اور اس کے زیر تسلط علاقوں کے لوگ کس قدر ذاتی اذیت برداشت کر رہے تھے۔ ان ممالک میں تحریر و تقریر کی آزادی تو بہت دور کی بات تھی، غیر ملکی لٹریچر بھی ان لوگوں کے لیے شجر ممنوعہ تھا اور لوگ یوں چھپ چھپا کر غیر ملکی لٹریچر پڑھتے تھے جیسے کسی گناہ کے مرتکب ہو رہے ہوں۔

رابرٹ نے ان رسالوں کو اپنے مکان کے تہ خانے میں چھپا دیا اور جینا تک کو خبر نہ ہونے دی۔ وہ رات کی تنہائی میں ان رسالوں کو پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کوشش اس لیے کہ اس کی انگریزی بھی بھئی بھئی تھی۔

ایک دن رسالے میں چھپا ہوا ایک مضمون پڑھ کر اچھل پڑا۔ اس مضمون میں مشرقی جرمنی کے دو خاندانوں کے فرار کی داستان بھی جو کیس کے غباروں کے ذریعے مغربی جرمنی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اس نے وہ مضمون ایک دفعہ پڑھا، دوسری دفعہ پڑھا پھر رات بھر میں کئی دفعہ پڑھا ڈالا۔ انگریزی زبان سے معمولی سی واقفیت کے باعث بار بار پڑھنے سے وہ مضمون اس کی سمجھ میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے خوشی میں ایک

نعرہ لگایا۔ اس نے اپنے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔

وہ دو مہینے تک یہ مضمون پڑھتا رہا اور شدید محنت کے بعد وہ اس مضمون کی جزئیات کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ اس نے اس مضمون کو اتنی بار پڑھا تھا کہ وہ اسے حفظ ہو گیا تھا۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے اپنا منصوبہ ایک رات جینا کو بتا دیا۔

جینا نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے رابرٹ کے ذہنی توازن پر شک ہو۔

اس نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا ”رابرٹ! ہم کسی غبارے میں بھلا کیسے فرار ہو سکتے ہیں؟ پھر ہم چار افراد ہیں، کیا غبارہ اتنا بڑا اور طاقت ور ہوتا ہے کہ وہ ہمارا وزن نہ صرف اٹھالے گا بلکہ تیز رفتاری سے ہمیں سرحد پار بھی لے جائے گا؟“

”بالکل لے جائے گا۔“ رابرٹ نے پُر جوش لہجے میں کہا اور بولا ”میں ابھی اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے خانے کی طرف بڑھا۔

جینا بھی سمجھی کہ وہ رات کی سوچ اور مایوسی نے اس کے شوہر کے ذہن پر اثر ڈالا ہے۔

رابرٹ تھوڑی دیر بعد خانے سے باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی رسالہ تھا جس میں مشرقی جرمنی کے خاندانوں کے فرار کے بارے میں مضمون شائع ہوا تھا۔

جینا انگریزی سے تو نااہل تھی لیکن اس رسالے میں ان غباروں کی رنگین تصاویر بھی تھیں جس میں وہ خاندان فرار ہوئے تھے۔

پھر رابرٹ نے جینا کو سمجھایا کہ جب وہ لوگ مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی تک کا سفر غبارے میں کامیابی سے طے کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔

”میں نے تو مشرقی اور مغربی جرمنی کا فاصلہ بھی نوٹ کر رکھا ہے۔ یہ فاصلہ چیکو سلواکیہ اور ویانا سے کہیں زیادہ ہے۔“

”لیکن اس قسم کے غبارے کی تیاری بھی تو ایک مرحلہ ہوگی رابرٹ!“ جینا نے کہا۔

”اس مضمون میں وہ سب کچھ ہے جس کی مدد سے ہم نہ صرف گیس کا وہ غبارہ تیار کر سکتے ہیں بلکہ اس میں کامیابی سے فرار بھی ہو سکتے ہیں۔ میں گزشتہ دو ماہ سے نہ صرف اس مضمون میں سرکھپا رہا ہوں بلکہ مختلف لائبریریوں کی خاک بھی چھانتا رہا ہوں اور اب میں بہت اعتماد سے اس قسم کا غبارہ بنا سکتا ہوں۔“

”اگر واقعی ایسا ہو جائے تو.....“

”ایسا ضرور ہوگا جینا!“ رابرٹ نے ایک عزم سے کہا۔ ”ہاں، اس میں فنی فنی چالیں ہیں۔ آریا پارا اگر ہم مخصوص بلندی پر پہنچنے سے پہلے ہی محافظوں کی نظروں میں آگئے تو ہمارا نصیب لیکن مرتے وقت بھی کم سے کم مجھے یہ اطمینان تو ہوگا کہ میں نے اس جہنم سے فرار کی ایک کوشش تو کی تھی۔

ہاں اگر تم خوف زدہ ہو تو ابھی.....“

”کیسی باتیں کرتے ہو رابرٹ!“ جینا منہ بنا کر بولی

”جب میں نے زندگی کے بہترین پل تمہارے ساتھ گزارے ہیں تو پھر موت بھی تمہارے ساتھ کسی خوشی قبول کر دوں گی۔ بس مجھے بچوں کی فکر ہے۔ ان بے چاروں نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟“

”اس مضمون زدہ ماحول میں روز روز مرنے سے تو بہتر ہے کہ وہ ایک ہی دفعہ مر جائیں۔“ پھر وہ چونک کر بولا ”لیکن ہم تصویر کا تاریک پہلو ہی کیوں دیکھ رہے ہیں؟ میں ایک اسپورٹس مین ہوں، میں نے اپنے تجربے سے ہی یہ سیکھا ہے اور میرے استادوں نے بھی مجھے یہی سمجھایا ہے کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی اگر ہم نے یہ سوچ لیا کہ ہم ہار جائیں گے تو پھر ہار ہی جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم یہ عزم لے کر میدان میں اتریں کہ ہمیں ہر صورت میں اور ہر قیمت پر جیتنا ہے تو پھر جیت ہمارا مقدر ہوتی ہے۔“

”ہاں، واقعی.....“ جینا نے کہا ”ہمیں ابھی امید رکھنا چاہیے۔“

”بس، اب تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ اور غبارے کی تیاری کے سلسلے میں میرا ہاتھ بھی بٹاؤ۔“

یہ 1982ء کے اوائل کی بات ہے۔ جب رابرٹ نے فرار کا حکم ارادہ کر لیا۔ وہ روزانہ کاموکی ریکارڈ رکھنے لگا۔ ہوا کا رخ معلوم کرنے کے لیے اس نے شہر کی ریفرنسری سے نکلنے ہوئے دھوئیں کی مدولی۔ اس نے خاص طور پر یہ نوٹ کیا کہ کن ایام میں تیز ہواؤں کے جھکڑ ویانا کی سمت چلتے ہیں۔

مہینے میں کم از کم دو بار ایسا ہوتا تھا جب تیز ہواؤں میں چیکو سلواکیہ کی سمت سے ویانا کی طرف جاتی تھیں۔ موسم کے حالات بھی اس کے حق میں تھے۔ ہوائیں اگر مخالف ہوں تو اسے فرار ہونے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔

وہ روزانہ کے موسمی حالات کا ایک باقاعدہ چارٹ مرتب کر رہا تھا۔ اس کی کامیابی کا دارومدار اس موسمی چارٹ پر تھا۔

یونیورسٹی کی تمام لائبریریوں سے کیسی غباروں کے بارے میں اسے جتنی بھی معلومات میسر آسکیں، اس نے وہ

مب ازیر کر لیں۔ یہ تو اسے اسکول کے زمانے ہی سے علم تھا کہ گرم ہوا ہلکی ہو کر اوپر اٹھتی ہے۔ اگر وہ گرم ہوا کسی غبارہ نما ہڈ میں بھردی جائے تو وہ اسے بھی اوپر لے جائے گی۔ لہذا وہی مسئلہ تھا ہوا کے رخ کا۔

اپنا آپریشن اسے ان دنوں میں شروع کرنا تھا جب ہوا کا رخ ویانا کی طرف ہوتا۔ اس سلسلے میں اس کے پاس سال کے ایک ایک مہینے اور ہر مہینے کے ایک ایک دن کا ریکارڈ موجود تھا جو اس نے ازیر کر لیا تھا۔ البتہ خالص گیس کے غباروں کے بارے میں اسے تمام لائبریریوں سے صرف نئے صفحات ہی مل سکے جن کا ایک ایک لفظ اس نے حفظ کر لیا۔ یوں بھی غیر ملکی رسالے میں چھپنے والے مضمون نے اس کی معلومات میں بے پناہ اضافہ کیا تھا اور اب وہ ہر طرح سے تیار تھا۔

سب سے پہلے اس نے خانے میں بیٹھ کر گیس کے اس غبارے کا ڈیزائن تیار کیا۔ اس غبارے میں اتنی گنجائش تھی کہ اس میں چار افراد بآسانی سوار ہو سکتے تھے۔

اکتوبر کے اوائل تک اس کا سپر و رک ہر طرح سے مکمل ہو گیا۔ رابرٹ نے غبارے کی ہر ہر جزئیات پر بہت اچھی طرح غور کیا تھا کیونکہ اگر اس کا یہ منصوبہ ناکام ہو جاتا تو پھر اس کا پورا خاندان ختم ہو جاتا۔

اس بڑے غبارے کی تیاری کے لیے اسے اٹھارہ سو مربع گز سائٹ نما کپڑے کی ضرورت تھی۔

جب سے مشرقی جرمنی کے جوڑے کے فرار کی خبر آئی تھی، پولیس نے اس کپڑے کی بڑی مقدار میں خریداری پر نظر رکھنا شروع کر دی تھی۔ رابرٹ نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس کپڑے کو تھوڑی تھوڑی مقدار میں مختلف دکانوں سے خریدا اور اپنے کام میں جت گیا۔

اس کا خانہ ہی اس کا ورک شاپ تھا۔ جب دونوں بچے سو جاتے تو رابرٹ اور جینا خاموشی سے خانے میں اتر کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

یہ انتہائی تھکا دینے والا کام تھا۔ رابرٹ ڈیزائن کے مطابق کپڑے کی پیٹرن کاٹتا اور جینا انہیں سینے میں لگ ہاتی۔ اس کام میں انہیں بہت سی راتیں کالی کرنا پڑیں۔

غبارہ بنانے کے لیے رابرٹ سائٹ نما کپڑے کے ٹکڑے لہان لایا تھا اور ہر ٹکڑے کی لمبائی پچانوے فٹ تھی۔ عام حالات میں اگر کوئی رابرٹ اور جینا کو چار گنا معاوضے پر بھی کام کرنے کو کہتا تو وہ انکار کر دیتے لیکن رابرٹ کے دل میں آزادی کی تڑپ فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو جینا بھی

آزادی اور خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ غبارے میں سوار ہونے کے لیے رابرٹ نے ہلکی لیکن مضبوط اسٹیل کا ایک ایسا جنگلا بھی تیار کر لیا جس میں چار افراد بہت آسانی سے کھڑے ہو سکتے تھے۔

اس جنگلے کو غبارے سے باندھنے کے لیے تینتیس مضبوط رستوں کی ضرورت تھی۔ رابرٹ نے مختلف دکانوں سے انتہائی مضبوط قسم کی رسیاں بھی خرید لیں اور جنگلے کے وزن کو سہارا دینے کے لیے اس نے درمیان میں کوہ پیاؤں والی ایک انتہائی مضبوط رسی کا انتخاب کیا۔

یہ کام انہوں نے اکتوبر کے اوائل میں شروع کیا تھا اور اب دسمبر شروع ہو چکا تھا۔ کرکس کے موقع پر اس ویران اور وحشت زدہ شہر میں زندگی کے آثار نظر آ جاتے تھے۔ لوگ دکانوں پر شاؤنگ کرتے نظر آتے، بچوں کے کچھ بھدے کھلونے بھی مارکیٹ میں آ جاتے جن کے رنگ اور ڈیزائن ایک ہی ہوتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کھلونے بنانے والی فیکٹریاں صرف ایک ہی سانچے پر سارے کھلونے نکالتی ہیں۔

بازاروں میں اس کے باوجود کرکس کی چہل پہل تھی لیکن جینا اور رابرٹ اپنے کام میں مصروف تھے۔ ابھی سلاکی کا بہت سا کام باقی تھا۔

رات رات بھر جانے کی وجہ سے ان دونوں کی صحت پر بھی بُرے اثرات مرتب ہو رہے تھے، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور دونوں میاں بیوی شکل ہی سے بیمار دکھائی دیتے تھے۔

رات بھر جانے کے بعد جب وہ اپنے کام پر جاتے تو اکثر اوقات اونگھنے لگتے۔

اس سلسلے میں رابرٹ اور جینا دونوں کو اپنے افسران بالا سے جھڑکیاں بھی سننے کو ملی تھیں اور انہیں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو ان کی شکایت حکام بالا تک پہنچادی جائے گی۔

رابرٹ ان کی تلخ و ترش باتوں کو محض اس لیے سہہ جاتا تھا کہ اب اس کا مشن تقریباً تکمیل کے قریب تھا۔

رات رات بھر جانے کے باوجود ان کے کام کی رفتار بہت سست تھی۔ وہ گویا چھ آدمیوں کا کام تھا جو وہ دونوں کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی دوسری ذمہ داریاں بھی نبھانا ہوتی تھیں۔ دفاتر کو جانا، بچوں کو اسکول چھوڑنا، کھانا پکانا، کپڑے اور برتن دھونا، سبھی کچھ لازمی تھا۔

یہ دیکھ کر جینا نے کرکس کے بعد اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تاکہ اپنا تمام تر وقت غبارے کی تیاری میں

لگا سکے۔ انہیں ہر دم یہ خوف بھی رہتا تھا کہ اگر کسی پڑوسی کے کان میں بھٹک بھی پڑ سکتی تو ان کی بقیہ زندگی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی یا انہیں نشانِ مہرت بنانے کے لیے قاتلنگ اسکوڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔

جینا کے کل وقتی کام کی بدولت ایسٹرک رابرٹ کا غبارہ آزمائشی پرواز کے لیے تیار تھا۔

اس رات دونوں میاں بیوی نے اپنے طور پر چھوٹا مونا جشن منایا۔ بچوں کو لے کر باہر گئے۔ کھانا بھی باہر ہی کھایا اور مہینوں بعد جب وہ رات کو بستر پر لیٹے تو انہیں ایسی نیند آئی کہ انہیں اپنی سہلہ بدھ نہ رہی۔

اس خوشی میں رابرٹ نے دوسرے دن چھٹی کی درخواست بھیج دی۔

بچوں کو ابھی کچھ بھی علم نہیں تھا کہ ان کے والدین کس ادھیڑ میں مصروف ہیں۔ اس وقت اس کی بیٹی جانا کی عمر چودہ سال تھی اور رچرڈ اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ دونوں بچے خاصے سمجھے جاتے تھے لیکن رابرٹ نے اس حد تک احتیاط برتی تھی کہ اپنے بچوں کو بھی اپنے منصوبے کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔

غبارے کی آزمائشی پرواز کا مرحلہ آیا تو بہت سوچ بچار کے بعد رابرٹ نے اپنے آبائی گاؤں لوجکا کی غیر آباد پہاڑیوں کا انتخاب کیا۔ لوجکا اس کے شہر برائسی لاوا سے تقریباً ساڑھے پانچ سو کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

وہ اس موقع پر بھی بچوں کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب غبارے کی آزمائشی پرواز کامیاب ہو جائے گی تو وہ اپنے دونوں بچوں کو بھی اس راز میں شریک کر لے گا۔ پھر فوراً ہی وہ غبارے میں سوار ہو کر اپنے نئے سفر پر نکل جائیں گے۔

رابرٹ نے غبارے کا تمام ساز و سامان اس وقت گاڑی میں رکھا جب پورے شہر پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔ اکثر ان دونوں کو راتوں کو بھی ڈیوٹی پر جانا ہوتا تھا اس لیے بچے ان کی غیر موجودگی کے عادی تھے۔

پھر جینا اور رابرٹ انتہائی خوشی کے عالم میں لوجکا کی طرف روانہ ہو گئے۔ جوش میں رابرٹ نے گاڑی کی رفتار انتہائی تیز کر دی۔ جینا نے اسے ٹوکا "ٹارل اسپید سے چلو رابرٹ! اگر ٹریفک کے کسی اہلکار کو شبہ ہو گیا تو وہ ہمیں لوجکا پہنچنے سے پہلے ہی دھر لے گا۔ گاڑی کی تلاشی ہوگی اور ہمارا تیار کیا ہوا غبارہ اور دوسرا ساز و سامان برآمد ہوگا تو ہمارے پاس اس کی موجودگی کا کوئی بھی جواز نہیں ہوگا۔"

"کبھی تو تم ٹھیک ہو۔" رابرٹ نے رفتار آہستہ کرتے

ہوئے کہا "لیکن ہمیں صبح سے پہلے واپس بھی آنا ہے۔" "ہم اگر معمول کی رفتار سے بھی چلتے رہے تو صبح تک واپس آجائیں گے۔ غبارے کی آزمائشی پرواز میں ہمیں کتنی دیر لگے گی، زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا یا چالیس منٹ!"

ابھی وہ یہ گفتگو کر رہے تھے کہ انہیں سڑک کے کنارے ٹریفک پولیس کی گاڑی دکھائی دی جس کی چھت پر نیلی روشنی کا بلب گردش کر رہا تھا۔ تشویش ناک بات یہ بھی کہ ٹریفک پولیس کا ایک اہلکار انہیں روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ "مارے گئے۔" رابرٹ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور گاڑی سڑک کے کنارے لگا دی۔

اس نے اپنی جگہ سے اترنے کی کوشش نہیں کی۔ ٹریفک اہلکار ٹھہرتا ہوا اس کی طرف آیا اور کرخت لہجے میں بولا "لائسنس!"

رابرٹ نے خاموشی سے لائسنس نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

ٹریفک پولیس کے اہلکار نے ٹارچ کی روشنی اس کے کارڈ پر ڈالی اور بولا "مسٹر رابرٹ! آپ کی رفتار مقررہ حد سے کچھ زیادہ تھی۔"

"آفسر! شاید میرا اسپید میٹر درست کام نہیں کر رہا ہے۔" رابرٹ نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

ٹریفک پولیس کے اہلکار نے مسکرا کر کہا "اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ مشہور ایجنسیٹ اور معروف سائیکلسٹ مسٹر رابرٹ ہیں؟"

"آپ نے بالکل درست پہچانا آفسر!" رابرٹ نے کہا "اصل میں مجھے فوری طور پر اپنے آبائی قصبے لوجکا پہنچنا ہے۔ میرے بھائی کی حالت بہت نازک ہے۔ شاید اسی وجہ سے میری گاڑی کی رفتار کچھ زیادہ تھی۔"

"احتیاط سے کام لیں مسٹر رابرٹ!" پولیس والے نے کہا "میں تو آپ کا فین ہوں، ویسے میں نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں لیکن ہر آدمی تو آپ کے ساتھ رعایت نہیں کرے گا۔" "تھینک یو ویری مچ آفسر!" رابرٹ نے طویل سانس لے کر ممنونیت سے کہا "میں اب پوری احتیاط سے ڈرائیونگ کروں گا۔"

اچانک ٹریفک پولیس والے نے اپنی جیب سے ایک نوٹ نکالی تو رابرٹ کا خون خشک ہو گیا۔ وہ نوٹ بک رابرٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "مسٹر رابرٹ! سوری! اس وقت میرے پاس آؤ گراف بک تو نہیں ہے۔ آپ اس نوٹ بک پر مجھے آؤ گراف دے دیں تاکہ میں بھی فخر سے

اپنے ساتھیوں اور بچوں کو دکھاسکوں کہ قوی سٹج کے ایک معروف ایجنسیٹ سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔" یہ سن کر رابرٹ کی جان میں جان آئی اور اس نے پولیس والے کو آؤ گراف دے دیا۔ پولیس والے نے انتہائی لادب و احترام سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

اس مرتبہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے رابرٹ خاص محتاط تھا۔

لارڈ ہنفر کی رکاوٹ کے لوجکا پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ رابرٹ اس علاقے میں پیدا ہوا تھا، اس کا بچپن اور لڑکپن اسی علاقے میں گزرا تھا۔ وہ یہاں کے پہاڑی سلسلے سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ وہ سیدھا اس غیر آباد پہاڑی سلسلے تک پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر دونوں میاں بیوی نے تھرموس نکال کر گرم کافیا پی اور تازہ دم ہونے کے بعد اپنے مشن میں مصروف ہو گئے۔

رابرٹ نے اپنے بنائے ہوئے دو سواپی پونڈز کے کنارے کو پہاڑیوں میں ایک کھلی اور ویران جگہ پر جڑوا، پھر ایک بجلی کے کھمبے سے اس میں ہوا بھرنے کی کوشش کی، پتھرا پلانے کے لیے رابرٹ نے کار کی بیٹری کے علاوہ ایک فاضل بیٹری بھی اس میں جوڑ دی۔ پتھرا پوری رفتار سے گھوما لیکن غبارہ نہ پھول سکا اور رابرٹ نے ایک دفعہ، دو دفعہ پھر کی دفعہ غبارہ پھلانے کی کوشش کی لیکن ہوا ساٹن نما کپڑے کے مساموں اور سوئی کے سوراخوں سے خارج ہو رہی تھی اور لہارہ تھا کہ پھولنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جینا تو اس صورت حال سے بُری طرح مایوس ہوئی۔

رابرٹ نے جھنجھلا کر غبارے اور دیگر اجزاء کو وہیں چھپایا اور برائسی لاوا لوٹ آیا۔ وہ اس مسئلے سے نمٹنے کا کوئی حل سوچ رہا تھا۔

آخر اسے ایک حل سوجھ ہی گیا۔ رابرٹ اور جینا اگلی رات پھر لوجکا جا پہنچے۔ رابرٹ اپنے ساتھ کئی ٹیکن آئل پینٹ بھی لے گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس پینٹ کو کپڑے پر لگا کر اس کے سوراخ بند کر دے گا۔

اس نے راتوں رات غبارے کے کپڑے پر پینٹ بھرا لیکن اس کا نتیجہ زیادہ خراب نکلا۔ پینٹ خشک ہو کر جگہ جگہ سے جھج گیا اور کپڑا بھی بُری طرح سکڑ گیا اور ان کا بنایا ہوا غبارہ محض کاٹھ کباڑ کا ایک ڈھیر بن کر رہ گیا۔

یہ دیکھ کر رابرٹ پر ایسی مایوسی اور جھنجھلاہٹ طاری ہوئی کہ اس نے ایک تیز دھار کھپڑی سے اپنے ہی بنائے ہوئے غبارے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر مزید جھنجھلاہٹ میں اس

ڈھیر کو آگ لگا دی۔ یوں اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی اور جینا کی چھ ماہ کی شدید محنت کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس لمحے اسے یہ بھی خوف نہیں تھا کہ آگ کے شعلے دیکھ کر کوئی محافظ ادھر آ نکلا تو رابرٹ اسے اس آگ کا کیا جواز پیش کرے گا؟

جینا تو اتنی مایوس ہوئی کہ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ چھ ماہ تک دن رات جاگ کر اس نے اس غبارے کی سلائی کی تھی، مشین چلا چلا کر اس کی پنڈلیاں اکڑ گئی تھیں، نیند پوری نہ ہونے کے باعث اس کا وزن کم ہو گیا تھا، چہرے پر بے رونگی چھا گئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔

یہی حال رابرٹ کا بھی تھا۔ پاس نے برائسی لاوا واپس جاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس عزم کا اظہار کیا کہ ہمارا یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو کیا ہوا؟ ہم پھر کوشش کریں گے اور اس وقت تک کوشش کرتے رہیں گے جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔

اس مرتبہ اس نے ایسے کپڑے کا انتخاب کیا جس میں سے ہوا نہیں گزر سکتی تھی، یہ کپڑا پہلے کپڑے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ قیمتی تھا لیکن رابرٹ پر تو آزادی کا جنون طاری تھا، وہ اپنی اور جینا کی تمام جمع پونجی اس منصوبے پر لگا بیٹھا تھا۔ وہ کپڑا برساتیاں بنانے کے کام آتا تھا۔ رابرٹ نے پہلے کی طرح وہ کپڑا بھی پچاس مختلف دکانوں سے خریدا اور دونوں میاں بیوی ایک مرتبہ پھر سرگرم عمل ہو گئے۔

غبارے کی تیاری کے سلسلے میں اس کی رسائی ایسے لوگوں تک بھی ہوئی تھی جو غیر ملکی اشیا اسمگل کر کے چیکوسلواکیہ میں لاتے تھے۔

انہی دنوں اس کے ہاتھ خوش قسمتی سے ایک ویڈیو کیسٹ لگ گئی۔ اس امریکی ویڈیو کیسٹ میں پولیس سے اڑنے والے غبارے کی پرواز کے مناظر تھے۔ یہ مناظر مرحلہ وار دکھائے گئے تھے۔ اس فلم میں مکمل طور پر تیار کیے گئے ایک برز کی تفصیل بھی تھی۔

رابرٹ نے وہ فلم اتنی بار دیکھی کہ اس کا ایک ایک منظر رابرٹ کے ذہن پر نقش ہو گیا اور کئی ماہ کی مشقت کے بعد وہ بالکل ویسا ہی ایک برز تیار کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

چھ ماہ تک مختلف لائبریریاں چھاننے کے بعد رابرٹ یہ بھی جان چکا تھا کہ عام گیس کے سلنڈروں میں ملنے والی گیس غبارے میں ایجنڈن کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے۔ ابھی غبارے کی تیاری کا طویل اور تھکا دینے والا کام باقی تھا۔ رابرٹ نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور

کہیں سے جعلی ملازمت کا ایک کارڈ بھی حاصل کر لیا، ورنہ چیکوسلواکیہ کی حکومت میں بے روزگاروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کو حکومت گرفتار کر لیتی تھی، پھر انہیں کسی بھی کام پر لگا دیتی تھی۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد جینا اور رابرٹ دونوں انتہائی تندرستی سے غبارے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پڑوسیوں میں یہ خبریں پھیلا دیں کہ میں جلد ہی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر منتقل ہو رہا ہوں۔ اس کے ساتھ اس نے اپنے مکان کے لیے گاہک کی تلاش شروع کر دی۔

جلد ہی اسے اپنے مکان کا ایک گاہک مل بھی گیا لیکن ابھی اس کی مشکلات کم نہیں ہوئی تھیں۔ مکان فروخت کرنے کے لیے قانون کے مطابق رابرٹ مقامی ہاؤسنگ اتھارٹی سے منظوری لینے کا پابند تھا۔

مقامی ہاؤسنگ اتھارٹی نے مختلف حیلوں، بہانوں سے اسے منظوری دینے سے انکار کر دیا۔ اصل میں ہاؤسنگ اتھارٹی کو اپنے ایک ممبر کے لیے اس مکان کی ضرورت تھی۔ وہ ممبر اس مکان کی قیمت اتنی نہیں دے رہا تھا جتنی رابرٹ کو ملنا چاہیے تھی۔ آخر تک آ کر رابرٹ نے کھائے کا سودا کر لیا اور مکان اسی ممبر کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

اس نے گھر کے قیمتی سامان، ٹیلی ویژن، فریج اور فرنیچر وغیرہ پہلے ہی بیچ دیا تھا اور اب وہ روایتی کے لیے بالکل تیار تھا۔ اب رابرٹ کے لیے ایک اور آزمائش پیدا ہو گئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ جولائی اور اگست کے دوران میں سرحد عبور کر جائے گا لیکن جولائی اور اگست میں تیز ہواؤں کا رخ جنوب کی جانب تھا۔ رابرٹ کے شہر برٹس لاوا سے دیا نا شمال کی طرف تھا۔ گویا ہوا بالکل اس کے مخالف سمت چل پڑی تھی۔

اس دوران میں جینا نے اسے مشورہ دیا کہ اس غبارے کی آزمائش پرواز بھی کر لی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی عین وقت پر ہمیں دھوکا دے دے۔

رابرٹ اس مرتبہ بہت پر یقین تھا۔ اس نے غبارے کی تیاری میں ہر پہلو پر نظر رکھی تھی۔ اس کے باوجود اسے جینا کا مشورہ پسند آیا اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی شہر لوجا روانہ ہو گیا تھا کہ وہاں کے ویرانوں میں اپنے غبارے کی آزمائش پرواز کر سکے۔

اس غبارے میں گزشتہ غبارے کی نسبت چار گنا زیادہ لاگت آئی تھی۔ اس نے نہ صرف غبارے کا جنگل مضبوط اسٹیل

سے بنایا تھا بلکہ اس کا کپڑا بھی انتہائی قیمتی تھا۔ پھر اس نے غبارے کو ہوا میں اٹھانے کے لیے گیس کے چار برنز بھی تیار کیے تھے تاکہ اگر ایک برنز کام نہ کرے تو دوسرے سے کام لیا جائے۔ وہ بھی ناکارہ ہو جائے تو تیسرے برنز کو آزمایا جائے۔

پھر غبارے کی رفتار بڑھانے کے لیے بھی بے یک وقت دو برنز معاون ثابت ہو سکتے تھے۔

وہ ایک مرتبہ پھر اس ویرانے میں موجود تھا۔

جینا کا دل آنے والے لمحات سے بڑی طرح دھڑک رہا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ کہیں ان کا یہ تجربہ بھی ناکام نہ ہو جائے۔ ناکامی کی صورت میں انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جینا اور رابرٹ دونوں اپنی اپنی ملازمتیں چھوڑ چکے تھے۔ گھر کا سودا ہو چکا تھا، گھر کا تمام سامان بھی فروخت ہو چکا تھا اور اب اگر وہ ناکام ہوتے تو ان کے لیے دوبارہ اس ملک میں رہنا پہلے سے کہیں زیادہ دشوار بلکہ ہولناک ہوتا۔

رابرٹ نے اس مرتبہ بجلی کے پتے کی بجائے بجلی سے چلنے والے ایک بلور (Blower) کا بندوبست کر لیا تھا۔ پتے کے مقابلے میں وہ بلور بہت تیزی اور قوت سے ہوا خارج کرتا تھا۔ رابرٹ نے اس بلور کو کارکی بیٹری سے منسلک کیا اور اسے آن کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غبارے میں ہوا بھرنے لگی اور دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ آسمان کی طرف تن گیا۔

رابرٹ نے خوشی میں نعرہ لگایا "ہرا!..... میں کامیاب ہو گیا۔"

جینا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ ڈیڑھ سال کی شدید محنت آخر رنگ لے آئی تھی۔

رابرٹ اچھل کر غبارے کے جنگل پر چڑھ گیا۔ پھر ہاتھ پڑھا کر جینا کو بھی اوپر کھینچ لیا اور دونوں مارے خوشی کے رقص کرنے لگے۔

جینا کا خیال تھا کہ گیس برنز جلا کر غبارے کی پرواز کی آزمائش بھی کی جائے لیکن رابرٹ نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔

اس نے جینا سے کہا "اصل مرحلہ غبارے کی تیاری کا تھا جو ہم نے سر کر لیا ہے۔ برنز بھی ضرور کام کریں گے، اس وقت اگر ہم نے برنز استعمال کیا تو اس سے بہت تیز آواز پیدا ہوگی، پھر غبارہ فضا میں بلند ہو جائے گا تو اس کا شعلہ دور سے دیکھا جائے گا۔ میں کامیابی کے اتنے قریب آ کر کسی بھی قسم کا ریسک نہیں لے سکتا۔"

رابرٹ نے غبارے کے والو کھول کر ہوا خارج کی اور اسے دوبارہ اپنی گاڑی کی ڈکی میں رکھ کر اپنے شہر روانہ ہو گیا۔ جولائی کا مہینا آدھا گزر چکا تھا لیکن ابھی تک تیز و تند ہواؤں کا رخ تبدیل نہیں ہوا تھا۔

اب رابرٹ براس لختی ملک میں ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ جولائی کے بعد اگست میں بھی ہوا کے رخ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تو رابرٹ نے سرحد عبور کرنے کے لیے چیکوسلواکیہ کے ایک شمالی سرحدی قصبے موڈوبیا کا انتخاب کیا۔

وہ علاقہ اس کے لیے بالکل اچھی تھا اس لیے اسے وہاں کے راستوں اور حالات کا بالکل علم نہیں تھا لیکن اسے یہ یقین ضرور تھا کہ شمال مغربی ہوا موڈوبیا سے اس کے غبارے کو بہت تیز رفتاری سے اور آسانی کے ساتھ آسنریا پہنچا دے گی۔

اس موقع پر اس کی قوی شہرت اور سائیکلنگ کام آئی۔ اس نے اپنی سائیکل پر اس پورے علاقے کا سروے کیا۔ وہ اگر ایتھلیٹ نہ ہوتا تو اسے بہت دشواریوں کا سامنا ہوتا لیکن اب تو اس کے پاس یہ جواز موجود تھا کہ وہ اپنی پریکٹس کے لیے سائیکلنگ کر رہا ہے۔ محافطوں میں سے بھی بیشتر لوگ اسے نام اور شکل سے پہچانتے تھے اس لیے علاقے کا سروے کرنے میں ذرہ برابر دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

وہ دراصل ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جو درختوں کے جھنڈ میں سرحد سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہو۔

جلد ہی اسے ایک ایسی مناسب جگہ مل گئی۔ وہ جگہ قدرے ویرانے میں تھی اور درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی تھی لیکن ان درختوں کے درمیان میں ایسی مسطح زمین تھی جہاں سے غبارے کو یہ آسانی اڑایا جاسکتا تھا۔

اگست کے بعد ستمبر کا مہینا آیا تب بھی رابرٹ کے شہر کی ہواؤں کے رخ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن رابرٹ کو اب اس کی فکر بھی نہیں تھی۔ وہ اب مخالف ہواؤں کے ذریعے دوسری جگہ سے سرحد پار کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ستمبر میں اس نے دونوں بچوں کو اسکول جانے سے روک دیا۔ دونوں بچوں نے جب حیرت کا اظہار کیا تو رابرٹ نے مسکرا کر کہا "تم لوگ آئندہ ہفتے سے آسنریا میں پڑھو گے۔"

دونوں بچوں نے غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ رابرٹ نے انہیں بھی اعتماد میں لے کر اپنا پورا منصوبہ بتا دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ کسی کے سامنے بھولے سے بھی اس بات کا تذکرہ مت کرنا ورنہ ہم چاروں کی جان بھی ہانکتی ہے۔

دونوں بچے اتنے سمجھ دار تو تھے ہی کہ اپنے باپ کی بات بہ آسانی سمجھ سکیں۔ ملک کے حالات سے تو وہ بھی واقف تھے۔ اب ان دونوں کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ ان کے والدین کی پراسرار سرگرمیاں کس سلسلے میں تھیں۔

وہ ستمبر 1983ء کی رات تھی جب رابرٹ اکیلا اپنی منتخب جگہ پر گیا اور غبارے کو درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر واپس آ گیا۔

سات ستمبر 1983ء کی چٹیلی صبح انہوں نے روانگی کا منصوبہ بنالیا۔ اس دن گھر کا ہر فرد خوش تھا۔

جینا نے جب کچھ ضروری سامان سوٹ کیسوں میں ٹھونس شروع کیا تو رابرٹ وہ سامان ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا اور بولا "ہمیں غبارے میں کم سے کم وزن رکھنا ہوگا تاکہ غبارہ تیزی سے اوپر اٹھ سکے اور سرحد پار جاسکے۔" آخر ان لوگوں نے ایک ایک جوڑی کپڑے اور ٹوتھ برش اور پیسٹ کے علاوہ تمام سامان وہیں چھوڑ دیا۔

رابرٹ کو گھر کی فروخت سے جو رقم ملی تھی، اس سے اس نے اپنا قرض چکا یا اور بچی ہوئی رقم اپنے پاس محفوظ کر لی۔

پھر وہ رچرڈ کے ہمراہ گرجا گھر گیا اور اپنی اور اپنے خاندان کی سلامتی کی دعا مانگی۔

اسی روز سہ پہر کے وقت وہ اپنی منزل کی طرف گاڑن ہو گئے۔

ان سب کے دل آنے والے لمحات کے خوف سے لرز بھی رہے تھے اور انہیں یہ خوشی بھی تھی کہ وہ بہت جلد اس قید خانے سے فرار ہو جائیں گے۔

رابرٹ مناسب رفتار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے غبارہ چھپا رکھا تھا۔

اس وقت شام کا دھندلا تیزی ہی پھیل رہا تھا اور درختوں کے جھنڈ میں تو کچھ زیادہ ہی تاریکی تھی۔

ان سب لوگوں نے مل کر بھاری بھر کم غبارے کو درختوں کے جھنڈ سے نکال کر زمین پر پھیلا دیا۔ تیزی سے کام کرنے کے باوجود انہیں اس کام میں پورا ایک گھنٹا لگ گیا۔

رابرٹ نے غبارے کے جنگل کے گرد اسٹین لیس اسٹیل کی موٹی چادر بھی لگائی تھی تاکہ اگر سرحدی محافظ ان پر فائرنگ کریں تو وہ کسی حد تک اس فائرنگ سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر اس نے زمین میں کھونٹے گاڑ کر جنگل کے کون کھونٹوں سے باندھ دیا۔ ابھی جنگل کے ہر کونے کے ساتھ اس نے پروٹین گیس کی ایک ٹنگی پہلے ہی فٹ کر دی تھی۔

انہیں صرف ایک گھنٹے پرواز کرنا تھی۔ اس کے بعد اگر

کہیں سے جعلی ملازمت کا ایک کارڈ بھی حاصل کر لیا ورنہ چیکو سلواکیہ کی حکومت میں بے روزگاروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کو حکومت گرفتار کر لیتی تھی، پھر انہیں کسی بھی کام پر لگا دیتی تھی۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد جینا اور رابرٹ دونوں انتہائی تندی سے غبارے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پڑوسیوں میں یہ خبریں پھیلادیں کہ میں جلد ہی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر منتقل ہو رہا ہوں۔ اس کے ساتھ اس نے اپنے مکان کے لیے گاہک کی تلاش شروع کر دی۔

جلد ہی اسے اپنے مکان کا ایک گاہک مل بھی گیا لیکن ابھی اس کی مشکلات کم نہیں ہوئی تھیں۔ مکان فروخت کرنے کے لیے قانون کے مطابق رابرٹ مقامی ہاؤسنگ اتھارٹی سے منظوری لینے کا پابند تھا۔

مقامی ہاؤسنگ اتھارٹی نے مختلف حیلوں، بہانوں سے اسے منظوری دینے سے انکار کر دیا۔ اصل میں ہاؤسنگ اتھارٹی کو اپنے ایک ممبر کے لیے اس مکان کی ضرورت تھی۔ وہ ممبر اس مکان کی قیمت اتنی نہیں دے رہا تھا جتنی رابرٹ کو ملنا چاہیے تھی۔ آخر تک آکر رابرٹ نے گھائے کا سودا کر لیا اور مکان اسی ممبر کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

اس نے گھر کے قیمتی سامان، ٹیلی وژن، فریج اور فرنیچر وغیرہ پہلے ہی بیچ دیا تھا اور اب وہ روٹنگی کے لیے بالکل تیار تھا۔ اب رابرٹ کے لیے ایک اور آزمائش پیدا ہو گئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ جولائی اور اگست کے دوران میں سرحد عبور کر جائے گا لیکن جولائی اور اگست میں تیز ہواؤں کا رخ جنوب کی جانب تھا۔ رابرٹ کے شہر برائسی لاوا سے ویانا شمال کی طرف تھا۔ گویا ہوا بالکل اس کے مخالف سمت چل پڑی تھی۔

اس دوران میں جینا نے اسے مشورہ دیا کہ اس غبارے کی آزمائش پرواز بھی کر لی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی عین وقت پر ہمیں دھوکا دے دے۔

رابرٹ اس مرتبہ بہت پُر یقین تھا۔ اس نے غبارے کی تیاری میں ہر پہلو پر نظر رکھی تھی۔ اس کے باوجود اسے جینا کا مشورہ پسند آیا اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی شہر لوجکاروانہ ہو گیا تھا کہ وہاں کے ویرانوں میں اپنے نئے غبارے کی آزمائش پرواز کر سکے۔

اس غبارے میں گزشتہ غبارے کی نسبت چار گنا زیادہ لاگت آئی تھی۔ اس نے نہ صرف غبارے کا جنگلہ مضبوط اسٹیل

سے بنایا تھا بلکہ اس کا کپڑا بھی انتہائی قیمتی تھا۔ پھر اس نے غبارے کو ہوا میں اٹھانے کے لیے گیس کے چار برنز بھی تیار کیے تھے تاکہ اگر ایک برنز کام نہ کرے تو دوسرے سے کام لیا جائے۔ وہ بھی ناکارہ ہو جائے تو تیسرے برنز کو آزمایا جائے۔

پھر غبارے کی رفتار بڑھانے کے لیے بھی بے یک وقت دو برنز معاون ثابت ہو سکتے تھے۔

وہ ایک مرتبہ پھر اس ویرانے میں موجود تھا۔

جینا کا دل آنے والے لحاظ سے بُری طرح دھڑک رہا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ کہیں ان کا یہ تجربہ بھی ناکام نہ ہو جائے۔ ناکامی کی صورت میں انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جینا اور رابرٹ دونوں اپنی اپنی ملازمتیں چھوڑ چکے تھے۔ گھر کا سودا ہو چکا تھا، گھر کا تمام سامان بھی فروخت ہو چکا تھا اور اب اگر وہ ناکام ہوتے تو ان کے لیے دوبارہ اس ملک میں رہنا پہلے سے کہیں زیادہ دشوار بلکہ ہولناک ہوتا۔

رابرٹ نے اس مرتبہ بجلی کے سچکے کی بجائے بجلی سے چلنے والے ایک بلور (Blower) کا بندوبست کر لیا تھا۔ سچکے کے مقابلے میں وہ بلور بہت تیزی اور قوت سے ہوا خارج کرتا تھا۔ رابرٹ نے اس بلور کو کارکی بیٹری سے منسلک کیا اور اسے آن کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غبارے میں ہوا بھرنے لگی اور دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ آسمان کی طرف تن گیا۔

رابرٹ نے خوشی میں نعرہ لگایا ”ہرا..... میں کامیاب ہو گیا۔“

جینا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ ڈیڑھ سال کی شدید محنت آخر رنگ لے آئی تھی۔

رابرٹ اُٹھ کر غبارے کے جنگلے پر چڑھ گیا۔ پھر ہاتھ پڑھا کر جینا کو بھی اوپر گھسیٹ لیا اور دونوں مارے خوشی کے رقص کرنے لگے۔

جینا کا خیال تھا کہ گیس برنز جلا کر غبارے کی پرواز کی آزمائش بھی کی جائے لیکن رابرٹ نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔

اس نے جینا سے کہا ”اصل مرحلہ غبارے کی تیاری کا تھا جو ہم نے سر کر لیا ہے۔ برنز بھی ضرور کام کریں گے، اس وقت اگر ہم نے برنز استعمال کیا تو اس سے بہت تیز آواز پیدا ہوگی، پھر غبارہ فضا میں بلند ہو جائے گا تو اس کا شعلہ دور سے دیکھا جائے گا۔ میں کامیابی کے اتنے قریب آ کر کسی بھی قسم کا ہسک نہیں لے سکتا۔“

رابرٹ نے غبارے کے والو کھول کر ہوا خارج کی اور اسے دوبارہ اپنی گاڑی کی ڈکی میں رکھ کر اپنے شہر روانہ ہو گیا۔ جولائی کا مہینا آدھا گزر چکا تھا لیکن ابھی تک تیز و تند ہواؤں کا رخ تبدیل نہیں ہوا تھا۔

اب رابرٹ پر اس سختی ملک میں ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ جولائی کے بعد اگست میں بھی ہوا کے رخ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تو رابرٹ نے سرحد عبور کرنے کے لیے چیکو سلواکیہ کے ایک شمالی سرحدی قصبے موڈوبو یا کا انتخاب کیا۔ وہ علاقہ اس کے لیے بالکل اچھی تھا اس لیے اسے وہاں کے راستوں اور حالات کا بالکل علم نہیں تھا لیکن اسے یہ یقین ضرور تھا کہ شمال مغربی ہوا موڈوبو یا سے اس کے غبارے کو بہت تیز رفتاری سے اور آسانی کے ساتھ آسٹریا پہنچا دے گی۔

اس موقع پر اس کی قوی شہرت اور سائبرنگٹک کام آئی۔ اس نے اپنی سائیکل پر اس پورے علاقے کا سروے کیا۔ وہ اگر ایتھلیٹ نہ ہوتا تو اسے بہت دشواریوں کا سامنا ہوتا لیکن اب تو اس کے پاس یہ جواز موجود تھا کہ وہ اپنی پریکٹس کے لیے سائبرنگٹک کر رہا ہے۔ محافظوں میں سے بھی بیشتر لوگ اسے نام اور شکل سے پہچانتے تھے اس لیے علاقے کا سروے کرنے میں ذرہ برابر دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

وہ دراصل ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جو درختوں کے جھنڈ میں سرحد سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہو۔

جلد ہی اسے ایک ایسی مناسب جگہ مل گئی۔ وہ جگہ قدرے ویرانے میں تھی اور درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی تھی لیکن ان درختوں کے درمیان میں ایسی مسطح زمین تھی جہاں سے غبارے کو بے آسانی اڑایا جاسکتا تھا۔

اگست کے بعد ستمبر کا مہینا آیا تب بھی رابرٹ کے شہر کی ہواؤں کے رخ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن رابرٹ کو اب اس کی فکر بھی نہیں تھی۔ وہ اب مخالف ہواؤں کے ذریعے دوسری جگہ سے سرحد پار کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ستمبر میں اس نے دونوں بچوں کو اسکول جانے سے روک دیا۔ دونوں بچوں نے جب حیرت کا اظہار کیا تو رابرٹ نے مسکرا کر کہا ”تم لوگ آئندہ ہفتے سے آسٹریا میں پڑھو گے۔“

دونوں بچوں نے غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھا، رابرٹ نے انہیں بھی اعتماد میں لے کر اپنا پورا منصوبہ بتا دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ کسی کے سامنے بھولے سے بھی اس بات کا تذکرہ مت کرنا ورنہ ہم چاروں کی جان بھی ہاسکتی ہے۔

دونوں بچے اتنے سمجھ دار تو تھے ہی کہ اپنے باپ کی بات بے آسانی سمجھ سکیں۔ ملک کے حالات سے تو وہ بھی واقف تھے۔ اب ان دونوں کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ ان کے والدین کی پراسرار سرگرمیاں کس سلسلے میں تھیں۔

وہ چوتھ ستمبر 1983ء کی رات تھی جب رابرٹ اکیلا اپنی منتخب جگہ پر گیا اور غبارے کو درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر واپس آ گیا۔

سات ستمبر 1983ء کی چمکیلی صبح انہوں نے روانگی کا منصوبہ بنالیا۔ اس دن گھر کا ہر فرد خوش تھا۔

جینا نے جب کچھ ضروری سامان سوٹ کیسوں میں ٹھونسا شروع کیا تو رابرٹ وہ سامان ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا اور بولا ”ہمیں غبارے میں کم سے کم وزن رکھنا ہوگا تاکہ غبارہ تیزی سے اوپر اٹھ سکے اور سرحد پار جاسکے۔“ آخر ان لوگوں نے ایک ایک جوڑی کپڑے اور ٹوتھ برش اور پیسٹ کے علاوہ تمام سامان وہیں چھوڑ دیا۔

رابرٹ کو گھر کی فروخت سے جو رقم ملی تھی، اس سے اس نے اپنا قرض چکا یا اور بچی ہوئی رقم اپنے پاس محفوظ کر لی۔

پھر وہ رچرڈ کے ہمراہ کر جا کر گھر گیا اور اپنی اور اپنے خاندان کی سلامتی کی دعا مانگی۔

اسی روز سہ پہر کے وقت وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

ان سب کے دل آنے والے لحاظ کے خوف سے لرز بھی رہے تھے اور انہیں یہ خوشی بھی تھی کہ وہ بہت جلد اس قید خانے سے فرار ہو جائیں گے۔

رابرٹ مناسب رفتار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے غبارہ چھپا رکھا تھا۔

اس وقت شام کا دھندلا تیزی سی پھیل رہا تھا اور درختوں کے جھنڈ میں تو کچھ زیادہ ہی تاریکی تھی۔

ان سب لوگوں نے مل کر بھاری بھر کم غبارے کو درختوں کے جھنڈ سے نکال کر زمین پر پھیلا دیا۔ تیزی سے کام کرنے کے باوجود انہیں اس کام میں پورا ایک گھنٹہ لگ گیا۔

رابرٹ نے غبارے کے جنگلے کے گرد انہیں لیس اسٹیل کی موٹی چادر بھی لگائی تھی تاکہ اگر سرحدی محافظ ان پر فائرنگ کریں تو وہ کسی حد تک اس فائرنگ سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر اس نے زمین میں کھونٹے گاڑ کر جنگلے کو ان کھونٹوں سے باغداد دیا۔ آہنی جنگلے کے ہر کونے کے ساتھ اس نے پروہین گیس کی ایک ٹنکی پہلے ہی فٹ کر دی تھی۔

انہیں صرف ایک گھنٹے پرواز کرنا تھی۔ اس کے بعد اگر



زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر

لیکن اس داستان کے مسافر کا سفر طویل، سنسنی خیز اور دلچسپ ہے

حساس اور نرم دل کرداروں کا سفاک و سنگ دل حریفوں سے تصادم

رنگین سنگین واقعات جو نازک جذباتوں اور دل گداز لہجوں میں پروان چڑھتے ہیں

ان کے لیے جوا چھپی کہانیوں کے رسیا ہیں

سطر سطر اپنی گرفت میں رکھنے والی اس یادگار سلسلے وار کہانی

آخری اتروں تماشائے عشق مزاج آشنا اور جنت

کے تخلیق کار ناصر ملک کے قلم سے

سسپنس کے تازہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

برنز میں آگ کتنے سے ایسی زیر دست روشنی پیدا ہوئی کہ چند لمحوں کے لیے ان سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ غبارے کا وزن خاندان کے تمام افراد اور سامان سمیت تقریباً نصف ٹن تھا۔ رابرٹ کی مختلط فطرت کے پیش نظر یہ وزن غبارے کی نسبت کافی کم تھا۔ برنز سے خارج ہونے والی نوسو درجے سینٹی گریڈ کی حرارت سے غبارہ فوراً ہی اوپر اٹھ گیا۔ اس غبارے کی گولا کی یعنی محیط ایک سو پچاس فٹ تھا اور بلندی میں یہ غبارہ سات منزلہ عمارت کے برابر تھا۔

خاندان کے چاروں افراد جگے کے اس پلیٹ فارم پر ایک دوسرے سے چپے ہوئے کھڑے تھے جو صرف ایک مربع گز تھا۔

رابرٹ نے چیخ کر جینا سے کہا "زمین سے بندھی ہوئی رسیاں کاٹ دو۔"

جینا نے فوراً ہی رسیاں کاٹ دیں۔ غبارہ میں فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے اوپر اٹھنے لگا۔ گیس برنر کی آواز اتنی کرج دار تھی کہ ان لوگوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہرے ہو جائیں گے۔ آگ کے شعلے اتنے خوف ناک تھے کہ بچوں کے ساتھ ساتھ جینا بھی سبھی جا رہی تھی۔

رابرٹ نے ایک ہاتھ گیس برنر کے والو پر رکھا ہوا تھا تاکہ اگر کسی وجہ سے غبارے میں آگ لگ جائے تو وہ فوراً گیس کا والو بند کر دے۔

غبارہ جوں جوں فضا میں بلند ہو رہا تھا، ان کے دل خوشی سے جھوم رہے تھے۔

اچانک ہی ان کی خوشی نے دم توڑ دیا اور خاندان کے ہر فرد کا چہرہ مرجھا گیا۔

گیس برنر کا شعلہ اچانک ہی چھوٹا ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی غبارہ نیچے آنے لگا تھا۔

آزادی کی کوشش اور کامیاب پرواز کے جوش میں رابرٹ کو یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ غبارے کی ایک ٹنگی میں سے سارا ایندھن تقریباً استعمال ہو چکا تھا۔

رابرٹ نے چیخ کر جینا سے کہا "جینا! غبارے کی دوسری ٹنگی کھولو۔"

جینا دوسری ٹنگی کی طرف لپکی اور وہ اسے کھولنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ غبارہ زمین پر آ رہا۔

رابرٹ نے مایوسی سے سر جھکا اور آنے والے خوفناک لمحات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ابھی کچھ ہی دیر میں انہیں گھیر لیا جائے گا اور اگر فوری طور پر انہیں گولیوں سے نہ بھونکا گیا تو پھر چیکو سلوا کیہ کی کوئی عدالت ان

مقدور ساتھ دیتا تو وہ آسٹریا پہنچ جاتے۔

رابرٹ نے جنگے کے ساتھ احتیاطاً اپنی سائیکل بھی باندھ دی تھی تاکہ اگر انہیں زیر دست نیچے اترنے پر مجبور کیا جائے تو فرار کے لیے کم سے کم کوئی سواری تو میسر ہو۔ رابرٹ کو یقین تھا کہ وہ اپنی سائیکل پر جینا اور دونوں بچوں کے ساتھ فرار کی کوشش کر سکتا ہے۔

رابرٹ نے کار کے انجن کے ساتھ بلور سے ہوا خارج کرنے والا پائپ فٹ کر دیا اور وہ لوگ اندھیرا مزید گہرا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

اچانک رابرٹ کو وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک انسانی ہیولا دکھائی دیا۔ رابرٹ نے سرگوشی میں سب کو بالکل خاموش رہنے کی تاکید کی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ سکتے میں رہ گئے اور ان لوگوں نے سانس تک روک لی۔ ان کے دل بڑی طرح دھڑک رہے تھے۔ جینا اور رابرٹ کو اپنی شدید محنت اور جمع ہوئی ضائع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کی زندگیوں کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔

وہ کوئی سرحدی محافظ تھا جو چند منٹ بعد کسی دوسری سمت مڑ کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

اتنے ہی عرصے میں رابرٹ کا جسم پسینے میں تر ہو گیا تھا۔ جینا اور دونوں بچوں کی بھی یہی حالت تھی۔ سرحدی محافظ کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک اپنے کشیدہ اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔

جینا نے اس موقع پر پانی کی بوتل نکالی اور سب کو دو دو گھونٹ پانی پلایا تاکہ ان کے خشک حلق تر ہو سکیں۔ پھر جینا نے کافی کا تھرماس نکالا اور اس میں سے کافی کا ایک ایک کپ نکال کر خالی تھرماس وہیں پھینک دیا۔

کافی پینے سے ان کی کھوئی ہوئی توانائی خاصی حد تک لوٹ آئی۔

دس بجے کے قریب رابرٹ نے ہوا کا رخ معلوم کرنے کے لیے ایک ٹشو ہوا میں اچھالا اور یہ جان کر اس نے سکون کا سانس لیا کہ ہوا ان کے موافق تھی۔

رابرٹ نے کار کا انجن اشارت کیا اور ہوا خارج کرنے والے پائپ کے ذریعے غبارے میں تیزی سے ہوا بھرنے لگا۔ اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ کار کے انجن کی آواز سن کر کوئی سرحدی محافظ ادھر نہ نکل آئے۔

تھوڑی ہی دیر میں غبارے نے گولا کی اختیار کر لی۔ رابرٹ نے ویلڈروں والے دستانے ہاتھوں میں پہنے اور گیس برنر کو آگ دکھادی۔

پر سازش اور غداری کا مقدمہ قائم کر کے انہیں فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دے گی یا پھر انہیں سوویت یونین کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا جہاں اکثر اس قسم کے قیدیوں کا مقدر سائبیریا کا مقام ہوتا تھا۔

جب کچھ دیر گزرنے کے بعد بھی ہر طرف خاموشی چھائی رہی، انہیں کسی محافظ کی سرچ لائٹ دکھائی نہ دی، کسی کی کرخت آواز سنائی نہیں دی تو ان کے دل میں پھر سے جینے کی امنگ پیدا ہو گئی۔ یہ تائید غیبی ہی تو تھی کہ اتنی چند ہیادینے والی روشنی اور برز کے شعلے کی گرج دار آواز بھی سرحدی محافظوں کو اس طرف متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔

راہٹ نے غبارے کا جائزہ لیا۔ وہ زمین کی طرف آتے ہوئے درختوں کی ٹہنیوں میں الجھ کر دو تین جگہ سے پھٹ گیا تھا۔

فوری طور پر غبارے کی مرمت کرنے کا وقت تھا، نہ موقع۔ راہٹ نے دل ہی دل میں دعا کی کہ کاش یہ غبارہ اس حالت میں پرواز کے قابل ہو جائے، راہٹ جانتا تھا کہ اسے جو کچھ کرنا ہے، بہت تیزی سے کرنا ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ کوئی سرحدی محافظ اس وقت ادھر نہیں آیا تو بعد میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ پھر اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ ایندھن کی جو حرارت اس وقت غبارے میں موجود تھی، وہ ضائع ہو گئی تو پھر اس کا دوبارہ اٹھنا بہت مشکل ہوگا۔

اس نے گیس سلنڈروں کو ٹھیک کر کے دوبارہ برز کو شعلہ دکھایا، پھر فضا چکا چوند ہو گئی اور غبارہ اوپر اٹھنے لگا۔ اس مرتبہ جینا نے تیسری ٹنکی پہلے سے تیار کر دی تھی تاکہ اس قسم کا حادثہ دوبارہ رونما نہ ہو جائے۔

راہٹ نے برز کو پوری قوت سے تھاما ہوا تھا۔ اگر برز کسی طرف جھک جاتا تو غبارے میں آگ لگ سکتی تھی۔

اچانک ان کے چہروں پر سرچ لائٹ کی تیز روشنی پڑی تو خطرے کے احساس سے ان سب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ سرحدی محافظوں نے پہلے تو ٹریسر گولیوں کی مدد سے سمت معلوم کرنے کی کوشش کی، پھر رائفلیں گرجنے لگیں۔

اس موقع پر راہٹ کی احتیاط کام آئی اور اس نے اسٹیل کی جو پلیٹ جھنگے کی چاروں طرف لگا رکھی تھی، گولیاں اس سے اجٹ کر گزریں لیکن اس اسٹیل کی پلیٹ سے وہ زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ دور مار رائفل کی کوئی گولی ان میں سے کسی کو لگ بھی سکتی تھی یا کوئی گولی سلنڈر سے ٹکرا کر اسے ناکارہ کر سکتی تھی۔

راہٹ نے برز کو پورا کھول دیا اور وہ غبارے کو بہت

تیزی سے بادلوں کے اوپر اُٹ گیا۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ بہت زیادہ بلندی پر جا کر غبارہ تیز دھند ہواؤں کے نرغے میں آ کر چکر کھانے لگے گا، پھر ایندھن ختم ہوتے ہی زمین پر گر جائے گا۔

راہٹ نے امریکا کی بنی ہوئی ویڈیو فلم کو اپنے ذہن میں دہرایا اور غبارے کو اتنی بلندی پر لے گیا جہاں ہوا سبک رفتار تھی، تیز ہوائیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں اور اب ان کا غبارہ بہت ہموار انداز میں محو پرواز تھا۔ بادلوں کو اڑانے والی ہواؤں کے نرغے سے نکلنے کے لیے اس نے ایندھن کی مقدار میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر وہ نہ صرف سرحدی محافظوں کی فائرنگ سے محفوظ ہو گیا بلکہ تیز دھند ہوائیں بھی نیچے رہ گئیں اور وہ سبک رفتاری سے منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔

گیس کا دوسرا سلنڈر تقریباً خالی ہو چلا تھا۔ راہٹ نے بیچ کر جینا سے کہا ”تیسرا سلنڈر کھول دو۔“ جینا نے گیس کا تیسرا سلنڈر بھی کھول دیا۔ راہٹ نے خالی ہونے والے دونوں سلنڈر نیچے پھینک دیے۔

راہٹ کے پاس ایک طاقت ور دوربین بھی تھی۔ وہ دوربین کے ذریعے مسلسل زمین کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے بادلوں کے بیچ سے کہیں کہیں زمین نظر بھی آ رہی تھی۔ وہ گھڑی دیکھ کر سرحد کا اندازہ کر رہا تھا۔ اسے اب نیچے کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

اس سے قبل کہ غبارے کے ایندھن کا تیسرا سلنڈر بھی خالی ہوتا، راہٹ غبارے کو افقی رخ پر چلاتے ہوئے ایندھن کی مقدار بہت درج کم کرتا گیا اور غبارہ زمین کی طرف آنے لگا۔ وہ تیسرے گیس سلنڈر کو اتنی احتیاط سے استعمال کر رہا تھا کہ وہ اسے وقفے وقفے سے بند کر دیتا تھا۔

جینا کو خدشہ تھا کہ وہ ابھی چیکو سلواکیہ کی سرحد سے باہر نہیں نکلے ہیں اور وہ اس ملک کی کسی قسم چوکی کے نزدیک جا آئیں گے۔

راہٹ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو ابھی چوتھے سلنڈر کا ایندھن ان کے پاس موجود ہے۔ کسی بھی خطرے کی صورت میں وہ چوتھے سلنڈر کا برز کھول کر غبارے کو دوبارہ فضا میں بلند کر کے اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچا سکتا تھا۔

چند منٹوں بعد ان لوگوں کو زمین نظر آئی۔ راہٹ نے تن بہ تقدیر ہو کر غبارے کو زمین پر اترنے دیا۔ غبارہ انگور کی بیلوں سے ٹکرایا اور پختہ سڑک سے آدھے فرلانگ کے فاصلے

پر ایک کھیت میں جا اُترا۔

ان سب کے ذہنوں میں اب سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ اس وقت چیکو سلواکیہ کی سرحد میں ہیں یا سرحد پار کر کے اپنی منزل کو پا چکے ہیں؟ اس پرواز میں بچپن منٹ لگے تھے اور راہٹ کا خیال تھا کہ اتنے وقت میں ہم نے سرحد عبور کر لی ہوگی۔

جینا کا خیال تھا کہ چیکو سلواکیہ کے اس سرحدی قصبے سے آسٹریا تک تقریباً ایک گھنٹے کی پرواز تھی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ مسلسل محو پرواز رہے۔ ان کا غبارہ ایک دفعہ اڑنے کے بعد زمین پر بھی گرا تھا اور دوبارہ اڑنے میں اسے پندرہ منٹ تو لگے ہی ہوں گے۔ بہر حال اب تو وہ زمین پر اتر ہی چکے تھے۔ اب یہ سب کچھ سوچنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ جو کچھ ہونا ہوگا، وہ ابھی چند منٹوں میں ہو جائے گا۔

وہ غبارے سے اتر کر جب انگور کی بیلوں میں چھپنے کی کوشش کر رہے تھے تو گاڑیوں کے انجن کے شور اور ان کی ہیڈ لائٹس سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ انہیں دیکھ لیا گیا ہے۔ اب یہ تقدیر پر منحصر تھا کہ آنے والے دوست ہیں یا دشمن؟ ان کے گرد کئی گاڑیاں تھیں جن کے ہیڈ لیمپس کی روشنیوں میں ان کی آنکھیں چند ہیاریں تھیں۔

راہٹ نے سڑک کی طرف رینگنے کی کوشش کی تو جینا ہڈیانی انداز میں بولی ”اتنی جلدی مت کرو راہٹ! پہلے گاڑی کی نمبر پلیٹ پڑھو۔“

چند لمحوں بعد راہٹ دو آدمیوں کے نرغے میں تھا۔ جینا کا دل بیٹھ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بیچ بیچ کر روئے، جانا اور رجڑے تو رونا شروع کر دیا تھا۔

چند لمحوں بعد راہٹ دو اجنبیوں کے ساتھ واپس آیا۔ ان میں سے ایک نے نرم لہجے میں جینا سے کہا ”میں آپ کو آسٹریا میں خوش آمدید کہتا ہوں مادام!“

تھوڑی دیر بعد راہٹ اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد آسٹریا کے سرحدی قصبے فالکن شائن کی آبادی کے درمیان کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں اس وقت فالکن شائن کا میز بھی موجود تھا۔

میز نے ہنستے ہوئے راہٹ سے کہا ”ہم لوگ گزشتہ آدھے گھنٹے سے اس غبارے کو اپنے قصبے کی سمت پرواز کرتا دیکھ رہے تھے اور دعا کر رہے تھے کہ کہیں غبارہ سرحد پار کرنے سے پہلے ہی نہ گر جائے۔“

انگور کی ایک شاخ غبارے کے جھنگے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ شاخ انگوروں سے لدی ہوئی تھی۔ راہٹ نے وہی

شاخ کھینچ کر جھنگے سے نکالی اور میٹھے انگوروں کے ذریعے اپنا اور اپنے خاندان کا منہ میٹھا کیا۔ گویا انگور کی یہ شاخ ان کی آزادی کا پہلا ثمر تھی۔

راہٹ اور اس کے خاندان نے کچھ دن فالکن شائن کے لوگوں کی میزبانی کا لطف اٹھایا پھر آسٹریا کے نئے شہری کی حیثیت سے راہٹ کی پہلی ڈیڑے داری بھی گئی کہ وہ ایک غبارے کی امپورٹ پر آسٹریا کی حکومت کو کسٹم ڈیوٹی ادا کرے۔ راہٹ کے پاس مکان بیچنے کے بعد خاصی رقم محفوظ تھی۔ اس نے آسٹریا شہری کی حیثیت سے اپنی پہلی ڈیڑے داری بہت خوشی خوشی پوری کی۔

چند دن بعد راہٹ اپنے خاندان کے ساتھ آسٹریا کے ایک خوش حال قصبے دارن برن منتقل ہو گیا۔ وہاں سابقہ تجربے کی بنیاد پر اسے ایک بڑی اور معروف تعمیراتی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ جینا کو بھی اس کی اہلیت کے لحاظ سے بہترین ملازمت ملی۔

راہٹ نے اپنے دونوں بچوں کو آسٹریا کے ایک اچھے اسکول میں داخل کر دیا۔

رجڑے نے ہنس کر کہا ”ڈیڈی! جس وقت آپ نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ آسٹریا کے کسی اسکول میں پڑھوں گا تو مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن آپ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔“

”میں نے پورے دو برسوں تک اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی تھی بیٹا! مجھے یقین تھا کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔“

راہٹ کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تو اس نے ایک دفعہ پھر سائیکلنگ شروع کر دی اور بہت جلد آسٹریا میں اس سے کہیں زیادہ نام، شہرت اور دولت کمائی جتنی اس نے چیکو سلواکیہ میں کمائی تھی۔

راہٹ خاندان کے فرار کے بعد چیکو سلواکیہ میں شہریوں پر عرصہ حیات مزید تنگ ہو گیا۔ وہ بے چارے برسات میں سینے کے لیے برساتی کو بھی ترس گئے۔ حکومت نے نہ صرف اس کپڑے کے فروخت پر پابندی لگا دی تھی بلکہ برساتیوں کی فروخت بھی قانوناً ممنوع قرار پائی تھی کہ مبادا کوئی اور سر پھر اید ساتیاں خرید کر ان سے غبارہ بنا لے۔

راہٹ اور جینا کے دونوں بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں لیکن اس خاندان کو غبارے کا وہ ہولناک سزا اب بھی یاد آتا ہے تو ان کے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں۔

بازنی ڈول

محمد اختر

دوسرا اور آخری حصہ

وہ خواب نگر کی شہزادی تھی۔ اس کا حسن جہاں گیر فتنہ سامانی کا سبب تھا۔ اس کے عشاق اس کا نام لے لے کر آہیں بھرتے اور وہ ان کے دلوں کو ٹھوکروں میں رکھتی۔ اس کے حسن کی خیزی کو مدنظر رکھ کر اسے مشورہ دیا گیا کہ اپنے حسن کی جادوگری سے علاقے کے باہر جو دنیا ہے، اسے بھی محظوظ کرو اور اس نے یہ مشورہ مان لیا۔ اس راہ پر چل پڑی جو دولت و شہرت سے نوازتا ہے۔ جب آگے بڑھی تو پھر بڑھتی ہی چلی گئی۔ راستے کی بردیوار خود ہی گرتی چلی گئی۔ عکس و فن کی اس دنیا میں اس کا راج قائم ہو گیا تھا۔ وہ فن کی دیوی کہلانے لگی۔ آج بھی اس کی پرستش اسی انداز میں ہوتی ہے۔

عالمی شہرت یافتہ ڈیزائنر کا نام ڈیوڈ آرنلڈ ہے

وہ دیکھتے گیتوں میں تو بہترین تھی ہی ان دنوں تیز اور پُر شور گیتوں میں وہ یہ بھی ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ وہ ہر قسم کے گیت گانگتی ہے اور بہتر انداز میں گانگتی ہے۔

”دی ڈفرنس بیٹوین اس (The Difference) کو ماریا نے خوب جم کر گایا، اگرچہ زیادہ دھیمائیت تھا مگر سازندوں نے بھی گیت سنتے ہی بے ساختہ کہہ دیا ”لو! اس گیت کو تم نے ایسے رچاؤ سے گایا ہے کہ ماریا کیری ذہن میں تازہ ہو گئی۔“

جینفر نے سر کے اشارے سے شکریہ ادا کیا تو سیٹھر گزرنے لگا ”یہ محض تعریف نہیں لو! اگر اس گیت کو ماریا کیری کے الہم میں شامل کر دیا جائے تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ تم نے اس گیت کے ساتھ اتنا ہی انصاف کیا ہے جتنا ماریا کرتی۔“

جینفر نے صرف اتنا کہا ”اس گیت کے رومانی بولوں نے مجھ پر سحر طاری کر دیا تھا۔ میں جیسے ان کے تاثر میں کھوسی گئی۔“

”کنڈنٹ فاؤنڈ اینڈ دھر مین (another man) Couldn't found) ایک ایسا گیت تھا جو بوائے فرینڈ کے لیے گایا گیا تھا۔ اگرچہ اس کی زندگی میں ابھی تک بوائے فرینڈ یا کوئی مرد نہیں آیا تھا مگر اس کے باوجود اس کے دھیمے گیت کو اس نے اس قدر رچاؤ کے ساتھ نہایت خواب ناک انداز میں اس طرح گایا گویا یہ اس کے دل کی آرزو ہو۔“

ماہنامہ سرگزشت

تک تو پہنچنے میں ناکام رہی مگر اس نے یہ باور کرا ہی لیا کہ وہ رومانوی دھنوں اور شاعری کو بہت بہتر انداز میں سمجھ سکتی ہے۔ نہ صرف سمجھ سکتی ہے بلکہ بھرپور انداز میں گانگتی سکتی ہے۔ یہ گیت ایسا تھا کہ اس کو سن کر جینفر کے بارے میں ہر شخص کی رائے یکسر تبدیل ہو گئی۔ اس کی آواز ایسی پختہ اور بھرپور عورت کے تاثر میں رچی ہوئی تھی جو محض اپنے عشق کے نل پر دنیا فتح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی ہو اور جینفر اس بات کا باقاعدہ طور پر ثبوت پیش کر رہی تھی۔ اسے دنیا فتح کرنے کا موقع مل رہا تھا اور وہ ظاہر کر رہی تھی کہ کم سن ضرور ہے مگر کسی سے کم نہیں ہے۔

رقص والے تیز ٹریک کی نسبت جینفر دھیمے اور مدہم سُروں والے گیت بہت آسانی سے گانگتی تھی اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ دھیمے گیتوں میں شاعری کے ساتھ اپنے جذبات شامل کرنے کا موقع بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ تیز اور بیجان انگیز گیتوں میں ایسے مواقع کم ہی ملتے ہیں۔ تاہم ”کانٹ اسٹینڈ ان دی وے آف لو“ (of love)

تک تو پہنچنے میں ناکام رہی مگر اس نے یہ باور کرا ہی لیا کہ وہ رومانوی دھنوں اور شاعری کو بہت بہتر انداز میں سمجھ سکتی ہے۔ نہ صرف سمجھ سکتی ہے بلکہ بھرپور انداز میں گانگتی سکتی ہے۔ یہ گیت ایسا تھا کہ اس کو سن کر جینفر کے بارے میں ہر شخص کی رائے یکسر تبدیل ہو گئی۔ اس کی آواز ایسی پختہ اور بھرپور عورت کے تاثر میں رچی ہوئی تھی جو محض اپنے عشق کے نل پر دنیا فتح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی ہو اور جینفر اس بات کا باقاعدہ طور پر ثبوت پیش کر رہی تھی۔ اسے دنیا فتح کرنے کا موقع مل رہا تھا اور وہ ظاہر کر رہی تھی کہ کم سن ضرور ہے مگر کسی سے کم نہیں ہے۔

”گیت کے الفاظ بہت سادہ ہیں مگر اس کا پیغام یہی ہے کہ اگر کوئی لڑکا میرا جسم دیکھنے اور آسودہ ہونے کا خواہش مند ہے تو پہلے اسے میرے دل میں جھانکنا ہو گا۔“

”یہ گیت تم نے لکھا ہے کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ پیغام ہے تمہاری طرف سے کسی بھی لڑکے کے لیے۔“



”اگر یہ پیغام ہو سکتا ہے تو اس میں کوئی قباحیت نہیں“ میں خود کو ان مخصوص کرداروں میں جکڑے ہوئے نہیں دیکھ سکتی جو صرف عورتوں کے لیے موزوں خیال کئے جاتے ہیں۔“

جینفر نے اس کے بعد باقاعدہ شاعری شروع کر دی۔ تاہم ناقدین کا کہنا ہے کہ اس کی شاعری میں بیان کیے گئے موضوعات عمومی موضوعات سے مختلف ہیں۔ (جینفر کی تمام شاعری اب اس کی ذاتی ویب سائٹ پر بھی جاری کر دی گئی ہے) مختصراً جینفر کا یہ البم اس کے لیے ایک اعزاز تھا۔ اس البم کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ نہ صرف لکھ سکتی ہے بلکہ بہت اچھا لکھ سکتی ہے۔ جب کسی نواور گلوکارہ کا موزانہ ماریا کیری جیسی پختہ کار گلوکارہ سے کیا جائے لگے تو سمجھ لیتا چاہیے کہ اس میں ضرور کوئی بات ہے۔ یہ اسی کم عمر لڑکی کا البم تھا جس کا پہلا البم تین برس قبل منظر عام پر آیا تھا۔ اس وقت اسے نسیمی لڑکی کی شناخت دی گئی تھی مگر تین سال بعد میں اس کا ایج ایک بھرپور عورت کا سا بن گیا۔ البم کا سرورق اس کی جوانی کے ابال اور ہیجان انگیز جنسیت کو ظاہر کر رہا تھا مگر گیت اس کی شخصیت کا انوکھا زاویہ پیش کر رہے تھے۔ تمام گیتوں میں اس کی شخصیت کا رومانی پہلو سامنے آتا تھا۔ ایسا رومانی پہلو جو کسی نوخیز جنس زدہ امریکی لڑکی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس البم کے بعد تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وہ موسیقی کی دنیا میں بہر طور ایک مقام رکھتی ہے۔ اب موسیقی کی دنیا میں اسے سنجیدگی سے لے جانے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے ایسا شاندار البم دیا تھا کہ بے شمار لوگ چونک کر رہ گئے تھے مگر یہ اس کی بد قسمتی کا تسلسل تھا کہ البم ہاتھوں ہاتھ نہیں بک سکا۔

یہ صورت حال ایک بار پھر اسے شکستہ کر دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ ”پارٹی آف فائو“ کے سیٹ پر بھی دل گیر نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھی اداکار اس کی کیفیت کو محسوس کر رہے تھے۔ اسے دلاسا دے رہے تھے سمجھا رہے تھے کہ اس ناکامی میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ البم کی تشریح مناسب انداز میں ہوتی تو یہ البم ”ہاٹ کیک“ بن جاتا۔

”ہاں لو! اس البم میں سب کچھ ہی تو تھا! میں البم کو اکثر سنتی رہتی ہو۔ اچھی اور دل کو چھو لینے والی شاعری خوبصورت آواز۔ ہر چیز تو موجود ہے اس میں۔“

”تو پھر یہ ہٹ کیوں نہیں ہوا؟“

اس کی ماں نے کہا ”کسی ناکامی کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے یہ تمہارے حوصلے اور بہت کا امتحان ہو پھر یہ

بات بھی توجہ نظر رکھو کہ البم کی تشریح نہیں ہوئی۔“

”جینفر تو گیت پیش کیے گئے تھے۔ اس سے بھی فرق نہیں پڑا۔“

”ایک آدھ مرتبہ جینفر پر گیت چلا دینے سے بات نہیں بنتی۔ تم پارٹی آف فائو میں ہر مہینے گھر گھر دیکھی جا رہی ہو۔ ان لوگوں سے غلطی ہوئی کہ اس زادی سے تمہارے نام کو منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو تمہارا البم شہرت حاصل کرنے میں وقت نہ لیتا لیکن میں سمجھ رہی ہوں کہ ”لیٹس گو بیک“ کو ایسے پرندے کی طرح بے آسرا چھوڑ دیا گیا ہے جیسے کسی پرندے کو اس کے گھونسلے سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ اڑ بھی سکے گا یا نہیں۔“

ماں کی اس بات میں وزن تھا۔ وہ صورت حال کو سمجھ رہی تھی مگر کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ البم پسند کیا گیا تھا۔ اس کے معیار پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی تھی۔ اس کی کارکردگی کسی مقام پر تنقید کا نشانہ نہیں بنی جو بھی البم کے بارے میں بات کرتا، توجہ نظر آتا مگر پھر بھی مالی اعتبار سے البم ناکام رہا تھا۔ یہ تشریح کا دور ہے، بغیر تشریح کے کسی شے کی فروخت کا تصور احمقوں کی جنت میں رہنے کے برابر ہے۔ شائقین موسیقی کو اس بات کا علم ہی نہیں ہو سکا کہ جینفر کا اس قدر عمدہ البم میوزک اسٹوروں میں موجود ہے۔ اگر لوگوں کو پتا چلتا تو اس کی فروخت پر ضرور اثر پڑتا۔ یہ جینفر کی بد قسمتی ہی تھی کہ البم کے حوالے سے نہ تو کوئی تعارفی پروگرام ہوا۔ نہ اس کے انٹرویو نشر ہوئے، نہ اخبارات اور جرائد میں خبریں شائع ہوئیں، یوں البم اسٹوروں کی شیلفوں میں پڑا رہ گیا۔

اس واقعہ کا ایک ہی اطمینان بخش اور مثبت پہلو ہے جس سے جینفر کو تسکین مل رہی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس نوخیز عمری میں بہت اچھا البم تیار کر دیا تھا۔ وہ اس البم کو دیکھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی اور سمجھ سکتی تھی کہ اس نے ایک قابل تعریف کام کر دکھایا ہے۔ یہ البم اس کے لیے اس بنا پر اہم تھا کہ وہ اسے ایک بچی کا البم نہیں سمجھتی تھی، بعد میں شوہر کے ایک جریدے کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا تھا ”یہ کسی بارہ سالہ بچی کا کام نہیں تھا۔ بلکہ ایک عورت کا البم تھا۔ میں اپنے آپ کو بھرپور اور پُر شباب عورت کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی کہ میں بڑی ہو گئی ہوں“ یہ گیت کوئی بچی یا نا پختہ لڑکی نہیں کہہ سکتی، اس گیت میں پیش کیا جانے والا خیال ایک بھرپور اور جہاندیدہ عورت کے ہی ذہن میں آ سکتا ہے۔“

اس کا البم فروخت نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی اٹلانٹک ریکارڈز والے جینفر کو ناکام نہیں سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ اس البم کو خود انہوں نے ہی ڈبویا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی وجہ سے جینفر کے کیریئر کی ناکامیوں میں ایک اور گہبیر اضافہ ہو گیا مگر وہ اس ناکامی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اب البم کو ناکام البم کے بجائے اچھا البم کہہ کر اس کا تذکرہ کیا جا رہا تھا مگر جینفر کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ پارٹی آف فائو کے ذریعے اپنے ناظرین کا حلقہ بڑھانے میں مصروف تھی۔ اب لی دی پر اس کے دیکھنے والوں کی کثیر تعداد کے ساتھ اس کے چاہنے والوں کی بھی بڑی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ پارٹی آف فائو ہرگز رتے دن کے ساتھ مقبولیت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جینفر کی شہرت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کامیابی اور شہرت کے کاندھے پر سوار ہو کر اب آئندہ چند دنوں میں اگر اس نے البم جاری کیا تو وہ اٹلانٹک ریکارڈز والوں کی طرح ناکام نہیں ہو گا۔ اب اس کی سمجھ میں آچھی طرح آگیا تھا کہ میوزک کمپنی والوں سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ وہ البم کی ریلیز کے موقع پر یہ طے ہی نہیں کر پائے کہ وہ جینفر کے ساتھ کیا کریں۔ البم کے تمام گیت اور موسیقی بالغ نظر افراد کے لیے تھی مگر البم کو اس قدر سیکسی اور ہیجان انگیز تھا۔ جو ایک طرف تو حقیقت سے بہت دور تھا اور محض نوجوانوں کو ہی اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ ایسے نوجوانوں کو جن کے نزدیک خوبصورت اور پُر کشش جسم اذیتیں ترجیح ہوتی ہے۔ موسیقی سمجھنے کا ذوق اور شوق ان میں کم ہی ہوتا ہے۔ سارہ ریوز کے کردار میں جو ناظرین اسے لی دی پر دیکھ رہے تھے وہ بھی اُلجھ کر رہ گئے تھے انہوں نے سارہ ریوز کا جو ایج اپنے ذہن میں بنالیا تھا، البم کا کور اس ایج کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ یہ بات جینفر کے چاہنے والوں کے لیے پریشان کن تھی۔

جنوری 1996ء میں پارٹی آف فائو نے بہترین ڈراما سیریز کا گولڈن گلوب ایوارڈ حاصل کر لیا۔ اب سیریز کے تمام اداکار ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے کی خوشیوں اور دکھوں کے علاوہ زندگیوں تک میں شریک ہو چکے تھے۔ جلد ہی اس سیریز میں سیلنگز کے دادا کے کردار میں کیرل اوکوز کو بھی شامل کر لیا گیا۔ کیرل اوکوز ”آل ان دی فیم“ اور ”ان دی ہیٹ آف نائٹ“ کے ذریعے پہلے ہی لی دی ناظرین میں

بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کی شمولیت نے سیریز کی شہرت کو مزید بڑھا دیا مگر اس وقت تک سیریز کے ہر کردار کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں فوکس والے دوسرے سیزن میں سیریز کو منسوخ نہ کر دیں۔ گولڈن گلوب ایوارڈ ملنے کے بعد ناقدین کی زبردست پذیرائی سے ادارے والے مجبور ہو گئے اور جب تیسرے سیزن کی اقساط کی بھی منظوری دے دی گئی تو تمام اداکاروں نے سکھ کا سانس لیا۔ اب جینفر کی شمولیت کے بعد سیریز نے رومانی انداز اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ سارہ ریوز کا کردار سیریز کا مقبول ترین اور مستقل کردار بن گیا تھا۔ اسی سیریز کے دوران جینفر کی ملاقات دوسری مرتبہ جیری لنڈن سے ہوئی۔ پہلی مرتبہ جیری لنڈن نے جینفر کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ دونوں ”مال دیش“ نامی ایک فلم کے لیے آڈیشن دے رہے تھے۔ جیری لنڈن کو وہ اس وقت بھی بہت اچھی لگی تھی مگر وہ کچھ مایوس سا ہو گیا تھا کیونکہ جینفر اس وقت محض پندرہ برس کی تھی اور اب ایک بار پھر وہ دونوں ”پارٹی آف فائو“ میں آمنے سامنے تھے۔ جیری لنڈن کو مگر ”مٹن ہال بروکے“ کر کردار میں کاسٹ کیا گیا تھا۔ اب سیریز نے تھلکے چھٹا شروع کر دیا تھا۔ بے شمار پھینٹوں کی موجودگی اور متعدد ڈراما سیریز کے ہنگاموں میں بھی ”پارٹی آف فائو“ کے آن ایئر جاتے وقت لوگ گھروں میں لی دی کے سامنے سے نہیں ہٹتے تھے۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ سارہ ریوز یعنی جینفر لوہیٹ، جو لیا سیلنگ (نیوی کیمبل) کی دوست ہے، وہ جزوی ملازمت کے طور پر کچھ بیسے کمانے کے لیے سیلنگ خاندان کے ہاں ملازمت شروع کر دیتی ہے۔ یہ ظاہر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ جیب خرچ ہی لینا چاہتی ہے۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ بلی رچی جان سے مرثی تھی، حالانکہ ریوز فیملی کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔

پارٹی آف فائو میں سارہ کا کردار جینفر کی زندگی کے اصل کردار سے بہت مشابہ ہے۔ وہ لوگوں کو خوش کرنا چاہتی ہے اور بلی کو خوش کر کے خوش رہتی ہے۔ اسے بلی سے شدید محبت تھی مگر بلی اپنی پہلی محبوبہ کی موت کا صدمہ جھیل رہا تھا۔ اس کی محبوبہ جل (ستین وارڈ) کو کین کے نشے کی عادی تھی اور اس نشے نے اس سے زندگی چھین لی تھی۔ بلی کو نہیں معلوم تھا کہ سارہ اس پر مرتی ہے۔ جبکہ سارہ کی ساری کوششیں ہی اس نکتے کے گرد گھوم رہی تھیں کہ بلی اس کے دل کی حالت سے آگاہ ہو جائے اور اس کوشش میں وہ ہر حد سے گزرنے پر تیار تھی۔

جینفر لو کے پاس اب سیریز کا سب سے بہترین کردار

تھا۔ بہترین اسکرپٹ اور بہترین کہانی تھی۔ ٹیلی ویژن پر مسلسل چھ برس جدوجہد کے بعد آخر وہ اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جلد ہی اس پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ اب وہ اشار بن گئی ہے۔ ایسی اشار جسے دیکھ کر لوگ پہچان لیتے ہیں۔

جینفر کے گھر کے قریب سیون ایون ہائی اسکیم کی دکان تھی وہ اکثر وہاں سے گزرتے ہوئے آکس کریم لینے لگ جاتی تھی۔ ایک دن وہ آکس کریم لے کر نکل رہی تھی دو لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔

جینفر نے ان کی طرف دیکھا اور اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں وہ ان دونوں لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ وہی لڑکیاں تھیں جنہوں نے اسکول میں اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ وہ اس پر کوک پھینکتی تھیں۔ راہ چلتے ٹانگ اڑا دیتی تھیں یا لڑکوں کے ساتھ مل کر اس کے کردار کے بارے میں اوجھیں باتیں کرتیں اور نازیبا جملے کہتی تھیں۔

جینفر انہیں یوں سامنے دیکھ کر ڈر گئی۔ ان کے ہاتھ میں آکس کریم تھی اسے خدا تھا کہ وہ آکس کریم اس کے منہ پر مار دیں گی۔ جینفر نے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ”کیا بات ہے؟ تم کیا چاہتی ہو“ میرا راستہ کیوں روک لیا؟

ایک لڑکی آگے بڑھی اور جھکتے ہوئے بولی ”میں ان پچھلی حرکتوں پر ناوم ہوں! پارٹی آف فائیو ہمیں بہت پسند ہے۔ آپ کے کردار سے ہم بہت متاثر ہیں۔ آپ کی اداکاری نے ہمیں آپ کا پرستار بنا دیا ہے اگر برا نہ مٹاؤ تو ہمیں آؤگراف دے دو۔“

جینفر نے ان دونوں کی طرف دیکھا اس کا دل جلیوں اُچھلنے لگا۔ یہ اس کا زندگی کا ایک عمدہ لمحہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتوں کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تمام مناظر ایک ایک کر کے گھومنے لگے اور پھر اس نے سخت کبجے میں ہونے والی جواب دیا ”مجھے افسوس ہے! میں تم دونوں کو آؤگراف نہیں دے سکتی مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ بائیں۔ بائیں۔“

یہ کہہ کر جینفر آگے بڑھ گئی۔ وہ اس سے بھی زیادہ سخت کبجے میں چاہتی تھی مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ ان کی سطح تک آنا نہیں چاہتی تھی۔

جینفر کے لیے یہ تبدیلی بہت اہم تھی جو لڑکیاں کل

تک اس کی دشمن تھیں۔ اب اس کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ شوہر کے شوق اور اس کی مصروفیت کے باعث اس نے اسکول میں برسوں لوگوں کی باتیں سنی تھیں۔ سب اسے کم تر اور گھٹیا لڑکی سمجھتے آئے تھے مگر اب ثابت ہو گیا تھا کہ وہ معمول نہیں ہے اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اسے اچھی اداکارہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور یہ بات تو وہ خود بھی جانتی تھی کہ وہ گلوکارہ بہت اچھی ہے۔

روزی کمانے کے شوق اور جنون میں جینفر نے اپنی تعلیم سے منہ موڑا تھا۔ وہ اس وقت اس عمر میں تھی جو جوان لڑکیوں کی آنکھوں میں سپنوں اور خوابوں میں شہزادوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اب وہ کام کے ساتھ ساتھ جو نیرہائی اسکول کی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی مگر اس کی ساری بڑھائی ”پارٹی آف فائیو“ یا دیگر سبس پر ہی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور نو عمر اداکارہ لیس پیٹرٹ بھی اس کے ساتھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ پوری سیریز کی کاسٹ میں وہ واحد لڑکی تھی جس کی عمر اٹھارہ برس سے کم تھی۔

باقی لوگ بارہ اور بعض اوقات چودہ پندرہ کھٹے بھی کام کرتے تھے مگر جینفر اور لیس اپنی کم عمری کی وجہ سے قانون کے سامنے مجبور تھیں۔ انہیں صرف ساڑھے دس کھٹے سیٹ پر گزارنے کی اجازت تھی۔ اس دوران منظر کی عکس بندی کے دوران وہ پڑھتی تھی۔ جینفر نے عادت بنالی تھی کہ وہ اپنی ریکارڈنگ سے پہلے سیٹ پر پہنچ جاتی تھی اور اپنی تین کھٹے کی بڑھائی سیٹ پر ہی کھل کر لیا کرتی تھی۔ شوٹنگ کے دوران بہت شور شرابا ہوتا ہے۔ ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے مگر جینفر نے ان ہنگاموں اور شور شرابے کے دوران بھی اپنی توجہ کتابوں اور اسباق کی طرف لگانے کی عادت ڈال لی تھی۔

لوگ شوٹنگ سیٹ پر اسے کتابیں پڑھتے اور اسکول کا کام کرتے دیکھتے توجہ سے انگلیاں منہ میں داب لیتے۔ یہ ان کے لیے حیرت انگیز منظر تھا۔ یہ نہیں تھا کہ جینفر کو سیٹ پر ہونے والے ہنسی مذاق میں مزہ نہیں آتا تھا۔ وہ بہت انجوائے کرتی تھی مگر بڑھائی کے دوران بھول جاتی تھی کہ وہ کہاں بیٹھی ہے۔ سیٹ پر آنے والے انہیں کتابوں میں گم دیکھتے تو بولتے ”یہ کیسی فنکارہ ہے؟ یہ تو ایب نارل ہے یا ذہنی مریض ہے۔ ان کے اطراف میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے اور یہ کتاب میں گم ہیں۔“ جینفر ان کی کسی بات کا جواب نہ دیتی جواب دینے کے لیے کتاب پر سے نظر ہٹا پڑتی ہے۔ وہ کتاب میں لکھے

کھٹے لفظوں کو گھول کر پی رہی تھی اس کے کانوں میں جو جملے اُڑنے لگے جا رہے تھے وہ انہیں دوسرے کان سے نکال دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی میں کام ہی کچھ نہیں ٹھیک ہے دولت جینے کے لیے بہت ضروری ہے مگر زندگی تعلیم کے بغیر اُدھوری ہے۔ وہ اُدھوری نہیں رہنا چاہتی تھی۔ پوری اور بھرپور عورت بننا چاہتی تھی۔ اسے اپنے مطلب کا اسکرپٹ اور اپنی مرضی کا ماحول مل گیا تھا۔ تمام اداکار اور ادارہ اس کی بہت مدد کر رہا تھا۔ اس ٹیم میں اچھے اداکاروں کی علاوہ بہت اچھے مکالمے لکھنے والے بھی شامل تھے۔ جینفر کے لیے بعض اوقات وہ مکالمے بھی تبدیل کر دیے جاتے تھے جن کی او ایٹنگ جینفر کے لیے مشکل ہوتی تھی مگر ایک چیز ایسی تھی جس کو تبدیل کرنے پر کوئی تیار نہیں تھا اور وہ تھا ذرا سے میں نیلی اور جینفر کا کردار۔ جینفر اس سیریل میں جو اداکاری کر رہی تھی۔ وہ اس کی نفسیاتی تبدیلیوں کے عین مطابق تھا۔ سارہ اور جینفر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جینفر زندگی میں تبدیلیوں کے جس عمل سے گزر رہی تھی عین وہی صورت حال سارہ کے کردار کے ساتھ بھی تھی۔ خود جینفر کو بھی اب یہی محسوس ہونے لگا تھا کہ اس میں اور سارہ میں ذرا برابر بھی فرق نہیں ہے۔ حقیقی زندگی میں جینفر کو کسی لڑکے سے لپٹنے، چمکنے اور فلا بازیاں کھانے کی شدت سے طلب محسوس ہونے لگی تھی۔ سیریز میں سارہ ریوز بھی یہی محسوس کر رہی تھی۔ سارہ ریوز اور نیلی ایک دوسرے کی طلب میں دیوانے ہو رہے تھے مگر اپنی اس کیفیت کے اظہار سے خوف کھا رہے تھے۔ جینفر اپنے تمام جذبات اور اندرونی کیفیات کو سارہ ریوز کے کردار سے باہر لا رہی تھی۔ جب نیلی فٹ بال ٹیم کے ساتھ پریکٹس کے دوران زخمی ہو گیا تو سارہ تڑپ اُٹھی وہ اسے دلا سادیئے اور پُرسکون کرنے کے لیے اس کے قریب تر آگئی مگر جب اسے پتا چلا کہ اسے دراصل اپنی آنجھانی محبوبہ سمجھتا ہے اس کے وجود میں اپنی محروم شدہ محبت تلاش کرتا ہے۔ اس کی شخصیت میں اپنی پرائی مجبور کا عکس دیکھتا ہے۔ تو وہ تڑپ اُٹھی اور اس سے قطع تعلق پر مجبور ہو گئی۔ محبت میں ٹھوکر کھانے والی اور دکھ کو اپنے سینے میں پرورش دینے والی لڑکی کا رول اس نو بھوری سے وہی لڑکی کر سکتی ہے جو حقیقی زندگی میں ایسی کیفیت سے گزر رہی ہو۔

2 اکتوبر 1995ء کی رات تھی۔ جینفر اپنی سہیلی سے انہیں کر رہی تھی۔ ول فریڈل نام کا ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکا اسی وقت اس کی سہیلی سے ملنے آیا۔ جینفر نے اسے

دیکھا تو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ پہلی مرتبہ وہ کسی لڑکے کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی۔ اس کی سہیلی جہاندیدہ تھی۔ سمجھ گئی۔ اس کی چیتا دوست دل ہار بیٹھی ہے اس نے کہا ”لو! یہ میرا دوست ول فریڈل ہے۔ تمہیں اس سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔“

”ہیلو!“ ول فریڈل نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جینفر نے اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ میں دے دیا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی اور ہتھیلی بھی مردانگی سے بھرپور تھی۔ جینفر کے پورے جسم میں آگ لگ گئی۔

”ہائے! میں لوہوں۔ جینفر لوہوٹ!“

”جس قدر اچھی تم خود ہو نام بھی اتنا ہی اچھا ہے! کیا ہم اکیلے کہیں نہیں مل سکتے؟“ اس نے سرگوشی میں کہا ”تو جینفر گھبرا گئی۔ اس نے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

”اس کا فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہو گا! میں انتظام کر دوں گی۔“

3 اکتوبر کو یعنی اگلے ہی روز جینفر اس لڑکے کے ساتھ زندگی کی پہلی بلا سنڈ ڈیٹ پر گئی اس کی سہیلی نے اس ملاقات کا انتظام کر دیا تھا۔ اس کے گھر کا پچھلا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ رات نو بجے کے بعد لو اپنی امی سے اجازت لے کر اپنی سہیلی سے ملنے کا کہہ کر گھر سے نکل گئی۔ آج اس نے بہترین تراش خراش کا لباس پہنا تھا، میک اپ پر بھی توجہ دی تھی۔ شرٹ کے اوپری بٹن بھی کھول رکھے تھے۔ وہ کم عمر لڑکی نظر آنا نہیں چاہتی تھی تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ مقررہ دروازے سے گھر میں داخل ہو گئی۔ اس کی سہیلی کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ پندرہ منٹ انتظار کرانے کے بعد ول فریڈل آگیا۔ جینفر لو کی سہیلی کچھ تیار کرنے کا ہمانہ بنا کر بیٹھ گئی۔ دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ دونوں پر ہی گھبراہٹ طاری تھی ’لو پہلی مرتبہ کسی سے چھپ کر ملنے آئی تھی۔ چند لمحوں تک باوجود کوشش کے وہ دونوں ہی ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکے۔ آخر ’ول نے جھجک ختم کرنے کے لیے وہی کچھ کیا جو امریکی لڑکے اور لڑکیاں جھجک ختم ہونے کے بعد کرتے ہیں‘ جینفر کے ہوئے پھل کی طرح اس کی بانہوں میں سامنی۔ کچھ دیر بعد دونوں کی جھجک ختم ہوئی تو باتوں کا دور چلا۔ ول فریڈل اچھا لڑکا تھا۔ باتوں سے کسی کا بھی دل جیت لینے کا گر جانتا تھا۔ جینفر اس کی باتوں کی بارش میں بھیجی چلی گئی اور جب ملاقات ختم ہوئی تو اس کا دل چیخ چیخ کر

کہہ رہا تھا "یہی ہے میرا شہزادہ" یہی ہے میرا شہزادہ۔ میں اسی شہزادے کے انتظار میں جوان ہوئی ہوں۔"

مگر جینفر کے لیے یہ بات کسی روگ سے کم نہ تھی کہ پہلی ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کی نوبت نہ آسکی۔ ان دونوں کی عمروں میں فرق تھا۔ وہ جینفر سے عمر میں تین سال بڑا تھا، مگر پھر بھی ملاقات کے دوران اسے بے بی کہہ کر چھیڑتا رہا اور جب پہلی ملاقات کے بعد کئی دن تک دل نے اس سے رابطہ نہیں کیا تو وہ اندر ہی اندر بکھرنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ مینے گزر گئے۔ وہ دل کو دل دے چکی تھی، مگر اس کا فون نمبر تک لینا بھول گئی تھی۔ وہ اپنی سہیلی سے بھی نمبر نہیں لینا چاہتی تھی اس طرح اسے پتا چل جاتا کہ دل نے اسے چھیننے کے بعد اس سے جان چھڑائی ہے۔ یہ اس کے لیے سبکی دالی بات تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اسے مل گیا ہے مگر "پارٹی آف فائو" کی سارہ کی طرح وہ بھی اس معاملے میں ناکام ہو گئی تھی۔ اس کا مطلوبہ محبوب اس کی طرف دیکھنے اور اس سے مراسم رکھنے پر بھی تیار نہیں تھا۔ وہ کوشش کے باوجود دل کا خیال اپنے دل سے اور اس کا نام اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کس کو جا کر اپنے دل کا حال سنائے؟ کیسے بتائے کہ اس کا محبوب اس کی طرف نظر بھر کر دیکھنے پر بھی تیار نہیں ہے۔ ایک مرتبہ اپنی جھلک دکھا کر اسے محبت کا غم دے کر اس سے دور ہو گیا ہے۔

جب معاملہ اس کی برواشت سے باہر ہو گیا تو وہ دل کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گئی۔ دل کا گھر اس کے گھر کے قریب ہی تھا۔ دل کا اپارٹمنٹ جس بلڈنگ میں تھا اس کے دروازے پر چوکیدار نے اسے روک لیا اور پوچھا "کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟"

جینفر نے کہا "میں دل برینڈل کی دوست ہوں۔ اس سے ملنے آئی ہوں۔ اس کا اپارٹمنٹ کون سا ہے؟"

چوکیدار نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ شاید وہ ٹی وی نہیں دیکھتا تھا۔ اس نے لو کو نہیں پہچانا۔ اسے وہیں بٹھایا اور انٹرکام پر دل کے اپارٹمنٹ میں رابطہ کیا۔ دوسری طرف دل تھا۔ چوکیدار نے ریسور لو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لو نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسور کن سے لگایا اور دل کی آواز پہچان کر بولی "دل! یہ میں ہوں تمہاری لوبا!"

"اوہ۔ ہاں۔ کیسی ہو لو؟ کوئی کام ہے کیا؟"

اس کے لیے میں اجنبیت تھی، لو کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اس سے ہم آغوش ہونے کے بعد بھی

کوئی اس سے اس روکھائی سے بات کر سکتا ہے اس کا تو خیال تھا کہ دل اس کی آواز شناخت کرتے ہی اسے اوپر بلا لے گا یا خود ہی نیچے اس سے ملنے آجائے گا۔ اس نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا "ہاں، بہت ضروری کام ہے، کیا تم نیچے نہیں آؤ گے؟"

دل برینڈل نے بات بتاتے ہوئے کہا "وہ دراصل! میں گھر میں بہت مصروف تھا۔ اس لیے۔ ہاں بولو کیا کام ہے؟"

"میں قلم دیکھنا چاہتی ہوں دل!" لو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو دیکھ لو۔ یہ بات مجھے بتانے کی تو نہیں ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے دل تمہیں! میں تمہارے ساتھ قلم دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"مگر لو۔ میں نے بتایا کہ میں ذرا۔"

"میں کچھ نہیں سنتا چاہتی میں یہاں باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں، تم تیار ہو کر فوراً نیچے آ جاؤ، ہم دونوں قلم دیکھیں گے اور پھر ذرا آؤٹنگ بھی کریں گے۔ میں کھلی ہوا میں چہل قدمی بھی کرنا چاہتی ہوں، مگر تمہارے ساتھ۔"

یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ اسے امید تھی کہ دل ضرور نیچے آئے گا۔ وہ تو بے کی دہائی میں جوان ہونے والی لڑکی تھی۔ اس دور کی لڑکیوں کا یہی اسٹائل تھا۔ یعنی لڑکیاں جو چاہتی ہیں وہ کر کے ہی دم لیتی ہیں، مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی اس کے سوا۔ اب وہ دروازے پر ہی بیٹھ کر دل کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ دل کو اس میں ذرا بھی دلچسپی ہو گی تو وہ ضرور آئے گا۔ یا کم از کم انٹرکام پر دوبارہ رابطہ کرے گا۔

مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ بہت دیر تک دروازے پر بیٹھی رہی۔ نہ تو دل آیا، نہ اس نے انٹرکام پر رابطہ کیا۔ وہ اکیلی بیٹھی اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ سوچتی رہی کہ آخر اس میں کیا کمی ہے؟ کیا وہ پُرکشش اور بھرپور نہیں؟ کیا وہ حسین اور جاذبِ نظر نہیں؟ وہ دل کے ساتھ کچھ وقت گزار چکی تھی۔ ایسا کچھ وقت جس کے دوران بہت کچھ ہو گیا تھا۔ اس کے اور دل کے درمیان ایک تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ دنوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ لو کو بہت پسند آیا تھا۔ لڑکی اس کی ہوتی ہے جس کو وہ پسند کرتی ہے مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ اب لو سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ دل نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ یا تو وہ دل کو پسند نہیں

آئی، یا وہ اس کی مقبولیت کی وجہ سے خوف زدہ تھا۔ لو نے خود اس کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے وقت ذرا بھی نہیں ہچکچائی تھی، مگر لگتا تھا کہ دل نے چند گھنٹوں کی رفاقت سے لطف اندوز ہونے کے بعد اسے مسترد کر دیا ہے۔

وہ نونے دل اور تھکے قدموں سے واپس گھر آئی۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ پہلی مرتبہ جس پر دل آیا تھا۔ اس نے دل دکھایا تھا۔ اس نے تو نہ جانے کیسے کیسے پنے دیکھ لیے تھے۔ من چاہا لڑکا مشکل سے ملتا ہے۔ اس کا من چاہا لڑکا اس کو چھوڑ کر گزر گیا تھا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ دکھی ہو کر اپنے خول میں بند ہوئی چلی گئی، اپنی زندگی کے پہلے دکھ اور پہلی محبت کو بھی اپنے دل سے نہ نکال پائی۔

رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ اس نے اپنی ماں کی محبت اور دیکھ بھال کی پھرتی تلے خود کو کسی حد تک سنبھال لیا۔ چند ہفتے اس کی یادوں کی نذر ہو گئے۔ اب اسے ہر خوبصورت لڑکے میں دل کا ہی چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ ایسے کسی بھی نازک لمحے میں وہ اکیلی ہو جاتی اور اندر ہی اندر سکنا شروع کر دیتی۔

دل کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اور پھر اچانک اسے کسی اور کی طرف سے آؤٹنگ کی پیش کش ہو گئی۔ وہ تھا اداکار جو اے لارنس۔ وہ اداکار ہی نہیں، لو کی طرح گلوکار بھی تھا اور بہت حد تک دل پیمینک واقع ہوا تھا۔ اس نے ایک روز لو کو دکھی دیکھ کر اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ نڈھال ہی ہو گئی۔ وہ جو اے لارنس کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کے افسرز اور اسکیڈلز بھی اس سے پوشیدہ نہیں تھے، مگر اس نے اس وقت جینفر کے آنسو خشک کیے تھے جب وہ اندر ہی اندر سسک رہی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ دونوں کو ہی اندازہ ہو گیا کہ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ لہذا انہوں نے پہلی محبت کی ناکامی کا غم بھلانے کے لیے اس کے ساتھ محبت کے عہد و بیان کرنے میں مصروف ہو گئی۔ یوں اس کے دل کا معاملہ سدھرتا چلا گیا۔

حقیقی زندگی میں وہ ایک ڈگر پر چل رہی تھی۔ دوسری طرف پارٹی آف فائو امریکی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں مقبولیت کے لیے ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔ جینفر لوبا باقاعدہ طور پر اپنی آف فائو کی مستقل رکن بن گئی تھی۔ اس کی ذاتی زندگی کی طرح سیریز میں اس کا سارہ والا کردار بھی جذباتی

آتا رہا تھا۔ اسی بنا پر اس کی شہرت روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ سارہ کا کردار نہ صرف اس کے کیریئر پر اثر انداز ہو رہا تھا بلکہ اس کی ذاتی زندگی پر بھی بھرپور اثر ڈال رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سارہ ریز اور جینفر لوبا اصل میں ایک ہی شخصیت ہیں۔ اب رسائل و جرائد میں جینفر کی زندگی کم اور سارہ ریز کی زندگی زیادہ ڈسکس ہونے لگی تھی۔ جینفر لوبا کی بات ہوتی تو لوگ اس سے سارہ ریز کو مراد لیتے تھے اور جب سارہ ریز کی بات ہوتی تو اس سے جینفر لوبا مراد لیتی تھی۔ وہ اس کردار میں اس حد تک ڈوب گئی تھی کہ خود کو اور اپنی نجی زندگی کو بھی بھول گئی۔ سیریز کی کہانی اب یوں چل رہی تھی کہ سارہ ریز نے پوری سیریز کے مستقل اور بنیادی کرداروں کے بجائے خود ہی مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ پہلی سارہ سے کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتا اور اپنے دوست کو اس بات کی اجازت۔۔۔ دے دیتا ہے کہ وہ سارہ کے ساتھ "ڈیٹ" پر جا سکتا ہے، جب سارہ اس کے ساتھ ڈیٹ پر گئی تو دونوں کو گھومتے پھرتے اور پرائیویٹ دقت گزارتے دیکھ کر پہلی کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ اس سے یہ بات برداشت نہیں ہو سکی۔ اسے سارہ کی طلب شدت سے محسوس ہو رہی تھی، مگر وہ اسی طرح سارہ کی طرف بڑھنا نہیں چاہتا جس طرح دل جینفر کی طلب کے باوجود اس سے رابطہ منقطع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جینفر ان کرداروں میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ وہ سارہ اور پہلی کے کرداروں کو حقیقی سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سارہ اور پہلی دو مختلف جسموں، مگر ایک روح کے مالک ہیں۔ بہت سارے پہلوؤں سے وہ ایک دوسرے کا ذکر اور ایک دوسرے کی مونث ہیں۔ یہ محبت کی پُر ازت شکل تھی۔ وہ ایک دوسرے سے ہی چھپاتے تھے پھر دسمبر 1995ء میں ان ائیر جانے والی قسط میں جب وہ کرداروں چارلی اور کرشن کی شادی ہوتی ہے تو سارہ اور پہلی ایک دوسرے کا بوسہ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ اس قسط نے جینفر لوبا کی زندگی میں بھونچال پیدا کر دیا۔ اس کے نام نفرت انگیز خطوط کی بھرمار ہو گئی۔ اس قسم کے خطوط اسے اب بھی ملتے تھے جس موزو قسط آن ائیر گئی، اس سے اگلے دن آنے والی ڈاک میں جینفر کے نام کئی خطوط تھے جو زیادہ تر اس جملے سے شروع ہو رہے تھے یہ سارہ عوف جینفر ہمیں تم سے شدید نفرت ہے مگر ہر خط کے آخر میں اس قسم کے جملے ضرور